خصوصی شمارہ
۵۰واں
سہ ماہی
ممبئی
افکارِ رضا
مُدیر
محمد زُبیر قادری

امام احمد رضا بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے افکار کی ترویج کا علمی علم بردار

خصوصی شمارہ

سہ ماہی افکارِ رضا ممبئی

مدیرِ اعلیٰ	محمد زبیر قادری (موبائل: 98679 34085)
مدیر	مولانا صادق رضا مصباحی
منیجر	محمد اسحٰق برکاتی (موبائل: 93239 54522)
ماہ	اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۷ء / رمضان المبارک تا ذی قعدہ ۱۴۲۸ھ
سال	جلد ۱۳ شمارہ ۴ (۵۰ واں شمارہ)
قیمت	۹-۵۰ روپے
ای میل	editor@fikreraza.net
ویب سائٹ	www.fikreraza.net
رابطہ	**Tehreek-e-Fikr-e-Reza** C/o. AJMERI BOOK DEPOT, 251-253, MAULANA AZAD ROAD, SHOP NO.8, ZAINAB TOWER, MUMBAI - 8
تقسیم کار (پاکستان میں)	**Markazi Majlis-e-Reza** **P.O. Box: 2206, Lahore, Pakistan**
تقسیم کار (ہندستان میں)	کتب خانہ امجدیہ، ۴۲۵ مٹیا محل، جامع مسجد، دہلی-۶ Ph: 011-32484831, Telefax: 011-23243187 kkamjadia@yahoo.co.uk

پرنٹر پبلشر محمد اسحٰق محمد عمر نے پرنٹ ٹاپ پرنٹنگ پریس 18، شنکر بلڈنگ، ناگپاڑہ، ممبئی۔ 400008 سے چھپوا کر دفتر 167، ڈم ٹمکر روڈ، ناگپاڑہ، ممبئی۔ 008 400 سے شائع کیا۔

اللہ کے نام سے شروع جو بہت مہربان رحمت والا

متوسلینِ رضا

باب اوّل : تاثرات

(صفحہ ۱۰ تا ۱۸)

باب دوم : حیات

(صفحہ ۱۹ تا ۱۰۰)

باب سوم : خدمات

(صفحہ ۱۰۱ تا ۱۶۹)

باب چہارم : فکریات

(صفحہ ۱۷۰ تا ۲۲۵)

باب پنجم : اسلوبیات

(صفحہ ۲۲۶ تا ۲۶۱)

باب ششم : شعریات

(صفحہ ۲۶۲ تا ۲۸۶)

باب ہفتم: اثرات

(صفحہ ۳۸۷ تا ۴۳۶)

باب: منظومات

(صفحہ ۴۳۷ تا ۴۴۴)

اداریہ

ساتھی ہے کوئی اور نہ کچھ زادِ سفر ہے
اللہ پہ بھروسہ ہے محمد (ﷺ) پہ نظر ہے

سہ ماہی افکارِ رضا کا ۱۳ ویں سال کا ۵۰ واں اور آخری شمارہ حاضر خدمت ہے۔ اب تک یہ رسالہ بلا قیمت ہند و پاک و بیرون ممالک بھیجا جاتا رہا۔ افکارِ رضا نے آپ کو کیا دیا، یہ تو آپ سب جانتے ہی ہیں۔ ہم نے افکارِ رضا کے ذریعے صرف مسلکِ اہلِ سُنّت کی ترویج و اشاعت کا کام کیا۔ کبھی کوئی بلند بانگ دعوے نہیں کیے۔ اپنے قلم سے اپنی بڑائی جتانے کا فن ہمیں نہیں آتا۔ لیکن اللہ کے فضل و کرم سے ہم نے کبھی زرد صحافت کے ذریعے اسے چمکانے، قارئین کی تعداد بڑھانے اور دنیوی منفعت کا ذریعہ بنانے کی کوشش نہیں کی۔ افکارِ رضا نے کبھی جماعت میں متنازعہ و اختلافی باتیں پھیلا کر آپس میں انتشار نہیں پیدا کیا۔ ہم نے صرف یہ چاہا کہ رضویات پر ٹھوس علمی و تحقیقی کام اہلِ علم و ادب تک پہنچے، اس میں ہم کافی حد تک کامیاب رہے۔ البتہ کبھی کبھار ہماری نااہلی اور کم علمی کے باعث غیر معیاری اور ہلکی تحریریں بھی شائع ہوگئیں، جس کے لیے ہم معذرت خواہ ہیں۔

۱۹۹۲ء سے احقر نے تحریک فکر رضا کا آغاز کیا۔ اُس وقت ممبئی کے ناگ پاڑہ علاقے کے چند احباب کے جزوی تعاون سے دینی لٹریچر کی اشاعت کا کام شروع کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ جس سے چاہے اپنے دین کا کام لے۔ احقر کی پیدائش روایتی سُنّی گھرانے میں ہوئی، جہاں نیاز، فاتحہ، مولود وغیرہ مراسم ہوا کرتے تھے، لیکن پس منظر کوئی مذہبی نہیں تھا۔ اللہ رب العزت نے توفیق عطا فرمائی، دل میں دینی خدمت کا شعور بیدار کیا۔ صرف دنیوی تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود دینی کاموں کی طرف متوجہ کیا، جو گزشتہ ۱۷ سالوں سے جاری ہے۔ سہ ماہی افکارِ رضا کے علاوہ رضویات و دیگر موضوعات پر ہم نے تقریباً ۱۰۰ سے زاید کتب اردو، انگریزی اور ہندی زبانوں میں شائع کیں اور اکناف عالم کو سیراب کیا۔ گو کمیت کے حساب سے ہمارا کام کم ہے لیکن کیفیت اور "وزن" کے حساب سے کوئی کیا اندازہ لگا سکتا ہے۔

افکارِ رضا کی ابتدا کی وجہ یہ بنی کہ ہم نے دیکھا کہ ہندستان میں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا کو صرف زبانی حد تک ہی یاد کیا جاتا ہے (الا ماشاء اللہ)۔ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا کے افکار و نظریات کے فروغ کے لیے کوئی ٹھوس مستقل کام نہیں ہو رہا ہے۔ اُن کی فکر، حیات و خدمات کے بارے میں ٹھوس تحقیقی کام بہت کم ہوا۔ ہندستان میں اعلیٰ حضرت کا خانوادہ، خلفا، مریدین، محبین، معتقدین، منتسبین کی تعداد کروڑوں میں ہونے کے باوجود یہاں اعلیٰ حضرت پر مستقل بنیادوں پر کوئی تحقیقی کام

ہوتا نظر نہیں آتا۔ جب کہ پاکستان میں ۱۹۶۵ء سے لے کر آج تک امام احمد رضا کے افکار ونظریات پر مستقل تحقیقی و اشاعتی کام جاری ہے۔ یہاں تو یہ حال ہے کہ اگر کوئی شخص یونی ورسٹی کی سطح پر اعلیٰ حضرت پر ریسرچ ورک کے جذبے رجسٹریشن کرائے، اور اپنی تحقیق کے سلسلے میں متعلقہ اشخاص سے تلاشِ مواد کی کوشش کرے تو اُسے ناکامی و مایوسی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہاں تعاون تو دور کی بات ہے، حوصلہ افزائی کے چند کلمات کہنا بھی لگتا ہے کہ شرم و عار کا باعث ہے۔ اس کے برعکس پڑوسی ملک میں آپ اگر جائیں تو چند ماہ میں ہی آپ کا تحقیقی مقالہ مکمل ہوجائے۔

امام احمد رضا کون ہیں؟ کیا ہیں؟ ہم اُن کے گُن کیوں گاتے ہیں؟ اُن کے نعرے کیوں لگاتے ہیں؟ ان سب کے جوابات ان شاء اللہ آپ کو اسی شمارے میں مل جائیں گے۔ مجھ جیسے کم علم، بے بصیرت میں اتنی استطاعت نہیں کہ مَیں امام موصوف سے متعلق کچھ خامہ فرسائی کرسکوں۔ احقر کا کام تو صرف یہ ہے کہ اہلِ علم و تحقیق سے علم لینا اور اکنافِ عالم میں پھیلا دینا۔ اس سے استفادہ کرنے والے، اسے آگے بڑھانے والے اپنی دعاؤں سے نوازیں گے تو ان شاء اللہ اپنا بیڑہ پار ہے۔

ایک چیونٹی روضۂ رسول کی زیارت کی متمنی اور خواہش مند تھی۔ لیکن اُس کے لیے وہاں پہنچنا محال تھا۔ چلتے چلتے جانے کی کوشش بھی کرتی تو عمر راستے میں ہی تمام ہوجاتی۔ تب اُس نے یہ کیا کہ ایک کبوتر کے پیر پر چڑھ کر اُس سے چمٹ گئی۔ کیونکہ اس کبوتر کی گنبدِ خضریٰ تک رسائی تھی، وہ روضۂ رسول ﷺ پر حاضری دیا کرتا تھا، وہ جب وہاں پہنچا تو چیونٹی بھی وہاں پہنچ گئی۔ بلاتشبیہ ہمیں بھی چاہیے کہ ہم اس عاشقِ رسول ﷺ امامِ اہلِ سُنّت کا دامن تھام لیں، اُن کی رسائی آقائے دوجہاں ﷺ تک ہے، اُن کے وسیلے سے ہماری بھی رسائی ہوجائے گی۔ خدا کرے اس ولیِ کامل کی بدولت ہماری بھی آخرت سنور جائے۔

☆......☆......☆......☆

سن ۲۰۰۷ء کی ابتدا سے ہم افکارِ رضا کے بند کرنے کا اعلان کررہے ہیں۔ اس کی وجوہات سے بھی ہم نے قارئین کو آگاہ کردیا۔ معدودے چند کے علاوہ جماعت میں بے حسی اور مُردنی ہی چھائی رہی۔ البتہ بعض احباب کے تاثر بہت اثر انگیز تھے۔

کچھ احباب نے رقّت انگیز لہجے میں افکارِ رضا بند نہ کرنے کی درخواست کی۔ لیکن جب اُن سے مسائل بتائے گئے تو وہ کچھ حل نہ پیش کرسکے۔ ایسے میں افکارِ رضا کا سلسلہ جو ۱۳ برسوں سے جاری تھا اور بلاقیمت ہند و بیرون ممالک بھیجا جارہا تھا، اب موقوف کیا جارہا ہے۔ کیونکہ یہ ناگزیر ہوچکا ہے۔

ارادہ تھا کہ خاص نمبر کی مناسبت سے محنت کر کے اچھا سا اداریہ لکھوں لیکن ان دنوں مسائل کی کثرت نے ذہن کو غیر حاضر کر رکھا ہے۔ نمبر کی تیاری میں ابتدا میں جن علما و اہلِ قلم نے تعاون کے دعوے اور وعدے کیے تھے، وہی لوگ آخری لمحوں میں دھوکہ دے گئے۔ یعنی جن پر تکیہ تھا وہ پتے ہوا دے گئے۔ ہم نے بعض احباب کو مضمون لکھنے کے پیسے بھی دیے لیکن انہوں نے اُن پیسوں کا حق ادا نہیں کیا۔ تین مہینے (۹۰ دن) ایک مضمون لکھنے کے لیے کم نہیں ہوتے، مگر مسلسل رابطوں کے بعد آخری لمحوں میں انھوں نے مضمون بھیجا، وہ بھی کوئی خاص نہیں۔ اس کے برعکس پاکستان کے ایک مقالہ نگار جو کہ وہاں ایک چھوٹے سے گاؤں اٹک (پنجاب) میں رہتے ہیں اور ایک اسکول میں معمولی سے مشاہرے پر ملازمت کرتے ہیں۔ ان دنوں وہ خود ایک رسالے کے ختمِ نبوت نمبر کی تیاری میں بے حد مصروف ہیں۔ لیکن آخری لمحوں میں اُنھوں نے افکارِ رضا کے تمام رسائل کا اشاریہ مرتب کرنے کی ٹھانی اور ملازمت سے مسلسل پانچ دن کی چھٹیاں کر کے، رات دن لگا کر اشاریہ مکمل کیا۔ پھر کئی گھنٹوں کا سفر کر کے راول پنڈی گئے، وہاں ایک دوست کو مسوّدہ دیا، جس نے مسلسل دو دن لگا کر کمپوز کیا اور ہمیں ای میل سے بھیج دیا۔ اُن کی اس محنت و محبت کا ہم کوئی صلہ پیش نہیں کر سکتے **جزاك المولیٰ تعالیٰ**۔ ایسی ایک بھی مثال مَیں کسی ہندستانی قلم کار کی پیش نہیں کر سکتا۔

اس نمبر کی تیاری میں ہمیں ناکوں چنے چبانا پڑے۔ ویسے ہی کون ہمیں اچھے اور بہترین مضامین سے نوازتا ہے جو نمبر کے لیے کوئی قلمی تعاون کرتا۔ پھر بھی اللہ و رسول ﷺ کا فیضان ہم پر جاری ہے اس لیے اتنا بڑا اعلان کر بیٹھے۔ بڑے پاپڑ بیلنے پڑے تب جا کر یہ نمبر تیار ہو کر آپ کے ہاتھوں میں آیا۔ جن اہلِ قلم حضرات نے اپنی تحقیقی نگارشات و مقالات سے ہمیں نوازا، اس کا اجر تو انھیں اللہ ہی دے گا، مگر ہم اُن کے بہت مشکور و ممنون ہیں ورنہ اُن کے تعاون کے بغیر یہ نمبر شائع ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ جزاک المولیٰ تعالیٰ

ہم نے کبھی کوئی دعویٰ نہیں کیا اور نہ ہی اس خصوصی شمارے کو شائع کر کے کوئی تیر مارا ہے۔ یہ احقر کے دلی جذبات اور اعلیٰ حضرت سے عقیدت و محبت سے گوندھا ہوا ایک تحفہ ہے۔

آج کے حالات میں دنیا میں کسی سے کچھ اُمید رکھی جا سکتی ہے نہ توقع کی جا سکتی ہے۔ یہ خصوصی شمارہ آپ کو جیسا بھی لگا ہو، اگر اللہ توفیق دے، زندگی مہلت دے تو اس عاصی سیہ کار کے لیے ایک بار حُسنِ خاتمے کی ضرور دعا کیجیے گا۔

محمد زبیر قادری

پیش نامہ

افکارِ رضا کا یہ خصوصی پچاسواں شمارہ آپ کے طاقِ مطالعہ میں لَو دینے کے لیے بے قرار ہے۔ اس کے گذشتہ انچاس شمارے قارئین کے معلومات نگر میں علم وفکر کی قندیلیں آویزاں کرتے رہے ہیں۔ افکارِ رضا نے اپنے تیرہ سالہ صحافتی واشاعتی سفر، وقت کی کتنی خارزار وادیوں میں طے کیا اور کتنے مسائل کے جلتے صحرا میں آبلہ پائی کی اس کا احساس تو زبیر قادری صاحب ہی کو ہوسکتا ہے۔ اس سفر میں اُن کے عزائم کے پاؤں لہولہان ہوگئے۔ ان کے منصوبوں کا پیرہن چاک ہوتا نظر آیا لیکن انہوں نے پھر بھی اس اشاعتی وصحافتی انگیٹھی کو سلگائے رکھا، اس کے لیے وہ پوری جماعت کی جانب سے مبارک بادیوں کے مستحق ہیں۔ یہ تحریر کرنا میں بالکل ضروری سمجھتا ہوں کہ افکارِ رضا کی اس اشاعتی مہم میں قدم قدم پر پاکستانی علما کی حوصلہ افزائیاں اور ہمدردیاں مشکلات کی سخت دھوپ میں سائبان نہ کرتیں تو افکارِ رضا کب کا تاریخ کی مرقد میں اُتر چکا ہوتا۔

زبیر قادری صاحب کے بعض احباب کہتے ہیں کہ افکارِ رضا معیاری نہیں ہے۔ اس لیے وہ اپنی نگارشات ارسال کرنے میں کتراتے ہیں۔ اس خصوصی شمارے کی ترتیب وتدوین کے دوران لحہ لحہ مجھے بھی اس کا ذاتی تجربہ ہوا۔ یہاں ایک سوال میرے ذہن سے باہر نکلنے کے لیے بے تاب ہے کہ آخر معیاری رسالہ کسے کہتے ہیں؟ مَیں اب تک کے اپنے دو سالہ محدود تحریری تجربے کی بنیاد پر کہہ سکتا ہوں کہ معیاری رسائل آسمان سے نہیں اُترتے بلکہ اس سے تحریری انسلاک رکھنے والوں کے قلم باوزن اور معیاری ہوتے ہیں۔ اسی بنیاد پر قدر واہمیت اور معیار کے بازار میں رسالے کے نرخ کا تعین ہوتا ہے۔ اور ہاں مدیرِ اعلیٰ کو بھی نہایت باصلاحیت اور اچھے برے کا پارکھ ہونا ضروری ہے۔ افکارِ رضا زبیر قادری صاحب کی عقیدتوں کے گہوارے میں پلا بڑھا ہے۔ یہ بالکل مسلّم ہے کہ اس میں بعض تحریریں سطحی اور غیر معیاری شائع ہوچکی ہیں لیکن اس کی بنیاد پر پورے رسالے کو غیر معیاریت کی چھری سے زخمی کرڈالنا مناسب نہ ہوگا۔ جب قلم کار حضرات اپنی معیاری تحریریں افکارِ رضا کو ارسال نہیں فرمائیں گے تو وہ معیاری رسالہ کیسے بنے گا۔ تیرہ سال کے اس عرصے میں افکارِ رضا میں نہایت اچھی اچھی تحریریں بھی شائع ہوچکی ہیں۔ اس کے پچھلے انچاس شماروں کا اشاریہ اس شمارے میں موجود ہے۔ اشاریہ نگار سید صابر حسین شاہ بخاری پنجاب پاکستان ہیں۔ اسے دیکھ کر اندازہ لگایئے کہ افکارِ رضا کا یہ

اشاریہ رضویات کی تحقیق کے لیے کتنا کارآمد ہے۔

ہمیں مکمل احساس ہے یہ خصوصی شمارہ رضویات کے باب میں کوئی اہم اضافہ نہیں کہا جاسکتا، اس کی وجہ وہی ہے جو اوپر مذکور ہوئی ہے یعنی اہم مقالہ نگاروں کی عدم اعتنائی۔ لہٰذا جس ذہنی پس منظر کے ساتھ خصوصی شمارے کا اعلان کیا گیا تھا اس کے عملی اظہار کے اس خاکے میں ویسی رنگ آمیزی نہیں کی جاسکی۔ اس کے لیے اپنے قارئین سے ہم معذرت خواہ ہیں۔ بعض تحریریں ایسی بھی شامل کی گئی ہیں جو ہمارے ذوق کے سراپا پر بالکل موزوں نہیں ہیں، (ویسے ہم کیا اور ہمارا ذوق کیا) لیکن ان کا نیا حلیہ دیکھ کر انہیں بھی اشاعت کے رتھ پر سوار کرلیا گیا ہے۔

اعلان کے مطابق یہ شمارہ آخری شمارہ ہے۔ اس کے بعد افکارِ رضا کا کتابی سلسلہ جاری رکھنے کا ارادہ ہے۔ ہمارے اور زبیر قادری صاحب کے باہمی مشورے سے یہ طے پایا کہ کتابی سلسلے کے لیے امام احمد رضا بریلوی قدس سرہٗ کے حوالے سے نئے نئے عناوین پر ادبا اور عصری دانش وروں سے مقالات لکھوائے جائیں۔ ہمارے اس نظریے کا قبلہ کتنا درست ہے اس کو ناپنے کا فریضہ ہمارے قارئین انجام دیں گے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ادبا اور دانش وران امام احمد رضا بریلوی جیسی ہمالیائی شخصیت کے بارے میں یہ ادبا اور عصری دانش وران بہت محدود معلومات رکھتے ہیں اور وہ بھی منفی الا ماشاء اللہ، اس لیے ایسے حضرات تک امام احمد رضا کی تعلیمات پہنچانا اور اُن کے فکری دروازے پر دستک دینا ہم سب کا اجتماعی فریضہ ہے۔ امام احمد رضا بریلوی پر جو لکھا جارہا ہے، اس میں زیادہ تر تکرار پائی جاتی ہے۔ اس میں استثنائی مثالیں دی جاسکتی ہیں، لیکن اکثر تحریریں ہمارے اس نظریے کی تصدیق کرتی نظر آتی ہیں۔ اس سلسلے میں علما و دانش وران سے ہماری گذارش ہے کہ امام احمد رضا بریلوی پر اب کس جہت سے کام کیا جائے، جسے رضویات کے باب میں قرار واقعی اہمیت دی جاسکے۔ اس بابت اپنے قیمتی مشوروں سے ہمیں نوازیں۔ تاکہ افکارِ رضا اپنی اشاعت سے اور رضویات کے کینوس میں دھنک رنگ بکھیر سکے۔

از: **محمد صادق رضا مصباحی**

تاثرات

اس شمع کو جلائے رکھیں

از: پیر زادہ اقبال احمد فاروقی ایڈیٹر جہان رضا

میں ''افکار رضا'' کا قاری ہوں۔ اس کا صفحہ صفحہ میرے سامنے کھلتا ہے تو دل و جان وجد کرنے لگتے ہیں۔ اس کے اداریے ''افکارِ رضا'' کی روشن تحریریں ہیں۔ بلند پایہ مضامین اور علمی مقالات مجھے دعوتِ مطالعہ دیتے ہیں۔ مجھے افکار رضا کے ''رضا نامے'' اور ''اداریے'' گلہاے رنگا رنگ دکھائی دیتے ہیں۔ ''رضا ناموں'' میں تنقید و تحسین کے نقش و نگار ''افکارِ رضا'' کا حُسن دوبالا کرتے ہیں۔ یہ واحد جریدہ ہے جو سارے ہندستان میں فکرِ رضا کی ترجمانی کرتا ہے اور دنیاے رضویات کے اہلِ علم و فضل اسے نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

سابقہ چند ماہ سے ''افکارِ رضا'' کے مدیر محمد زبیر قادری اس شمع کو گل کردینے کے اعلانات کررہے ہیں۔ جس سے دل بیٹھا جاتا ہے۔ وہ اپنے حالات، احباب کی بے اعتنائی، اہلِ قلم کی بے نیازی اور سب سے بڑھ کر اہلِ سُنّت کی ''مفت خوانی'' کا شکوہ کررہے ہیں۔ اور افکار رضا کو بند کررہے ہیں۔ انہیں شاید معلوم نہیں کہ ''افکارِ رضا'' افکارِ رضا کا ترجمان ہے، کاروانِ رضا کا ہدی خواں ہے۔ یہ خیابانِ رضا کا مہکتا ہوا پھول ہے۔ یہ شمع شبستانِ رضا ہے۔ یہ آسمانِ رضویت کا ماہتاب ہے۔ یہ جہانِ رضا کا آفتاب ہے۔ اس کے مدیر کو شاید ''افکارِ رضا'' کے مقام کا اندازہ نہیں ہے، نہ اپنے مقام کا علم ہے۔

اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے ۔۔۔ کچھ اس میں تکلف نہیں، واللہ نہیں ہے

ایک زمانہ تھا۔ ممبئی میں ہمارے ایک دوست معین الدین احمد، مالک اجمیری کتب خانہ مطبوعات منگوایا کرتے تھے۔ ہم ان کتابوں میں ''جہانِ رضا'' کے چند شمارے رکھ دیا کرتے تھے۔ محمد زبیر قادری چلتے پھرتے ''جہانِ رضا'' اُٹھاتے اور اوّل سے آخر تک پڑھتے اور اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کے افکار کو دل کی گہرائیوں میں سمیٹتے۔ یہ مطالعہ، یہ محبت، یہ عشق انہیں کشاں کشاں بریلی کی گلیوں میں لے گیا۔ اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کے مزار پر لے گیا۔ اعلیٰ حضرت کی کتابوں کے ذخیروں میں لے گیا۔ افکارِ رضا کی وادیوں میں لے گیا۔ پھر گلستانِ رضا کے باغوں میں لے گیا۔ اور انہوں نے اعلان کیا کہ تحریک فکر رضا ممبئی ''افکارِ رضا'' جاری کرے گی اور لوگوں کو آواز دے کر کہا کہ:

''رضا کی زباں تمہارے لیے رضا کی فغاں تمہارے لیے

ممبئی سے ''افکارِ رضا'' دراصل ''جہانِ رضا، لاہور'' کے باغوں کا ایک پھول بن کر نکلنے لگا۔ یہ ے خانۂ رضا کا مغ بچہ بن کر آیا اور سارے جہانِ رضا میں روشنیاں پھیلاتا آیا۔ اور عاشقانِ رضا کو دعوتِ فکر دیتا ہوا آیا اور یوں محسوس ہوا کہ

رضویت کا چاند اُبھرا نور برساتا ہوا

ہمیں فخر تھا کہ محمد زبیر قادری نے ''جہانِ رضا'' کا نقشِ جمیل ہندستان میں جاری کیا ہے۔ جو افکارِ رضا کو دنیا کے گوشے گوشے تک پھیلانے لگا ہے۔ اور اپنے خصوصی انداز میں اعلیٰ حضرت کی تعلیمات کو گھر گھر پہنچانے لگا ہے۔

زبیر قادری اپنے ''افکارِ رضا'' کے سلسلے میں کئی بار پاکستان آئے۔ کراچی آئے۔ لاہور آئے۔ جہانِ رضا کے دفتر میں آئے۔ فکر رضا کی اشاعت کے لیے پاکستان کے دور دراز علاقوں میں گئے۔ ہر باغ، ہر پھول، ہر کلی کو سونگھا اور شہد کی مکھی کی طرح برِ صغیر میں پھیلے ہوئے ہزاروں پھولوں کا رس چوس کر ''افکارِ رضا'' کے چھتے میں وہ شہد تیار کیا۔ جس میں بریلی کے پھولوں کی مٹھاس تھی۔ اور فکر رضا کی شیرینی۔...... آج دنیاے رضویت کے اہلِ علم و فضل جانتے ہیں کہ ''افکارِ رضا'' نے انہیں کیا کیا دیا۔ آج دنیاے اسلام کے گوشے گوشے میں بسنے والے اہلِ ذوق جانتے ہیں کہ ''افکارِ رضا'' نے کتنا عظیم کام کیا۔ آج مغرب و مشرق کے اہلِ محبت تسلیم کرتے ہیں کہ افکارِ رضا کی شہد جانے کہاں کہاں پہنچی ہے۔ سارے ہندستان میں جب اعلانات کی بات چلتی ہے۔ تو افکارِ رضا کے صفحات کھلتے نظر آتے ہیں اور لوگ فکر رضا کی بات کرتے ہیں تو ان کی زبان پر بے اختیار یہ شعر آتا ہے۔

گلوں میں رنگ بھرے بادِ نو بہار چلے چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے

گلشنِ رضا کا کاروبار تو ''افکارِ رضا'' کی اشاعت ہے۔ اگر یہ بند ہوگیا تو گلہاے رضا میں رنگ کون بھرے گا؟ اور شہر بریلی کی بادِ نو بہار کس طرح چلے گی۔ اور گلشنِ رضویت کا کاروبار کس طرح جاری رہے گا۔

مدیر ''افکارِ رضا'' کو شاید احساس نہیں کہ ان کا قلم کتنے پھول برساتا ہوا جہانِ رضویت کی وادیوں کو شاداب کرتا ہے۔ ہاں کبھی کبھی افکارِ رضا کے صفحات محققین، مدققین، مصنفین، مطولین اور ناقدین کے مضامین سے بوجھل ہوجاتے ہیں۔ اگر انتخاباتِ مضامین کا خیال رکھا جائے تو ان شاء اللہ یہ شمع جلتی رہے گی۔ لوگ آگے آئیں گے اور فکرِ رضا کی روشنیاں پھیلتی رہیں گی۔

''افکارِ رضا'' کی کارکردگی کا اندازہ لگانے کے لیے اس کی فائل کی ورق گردانی کرنی چاہیے۔

جہاں صفحہ صفحہ پر موتی بکھرے ہوئے ہیں۔ اہلِ علم وفضل نے اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کے علوم پر مختلف انداز سے روشنی ڈالی ہے۔ اور افکارِ رضا اُن علوم کو دنیا کے گوشے گوشے تک پھیلاتا جارہا ہے۔ ہندستان کی سرحدوں سے نکل کر ''افکارِ رضا'' پاکستان کے تقریباً ہر شہر میں پہنچتا ہے۔ مختلف گوشوں میں بسنے والے علمائے کرام کے دروازوں پر دستک دیتا ہے۔ جنہیں ''افکارِ رضا'' نہیں ملتا وہ اس کی تلاش میں نکلتے ہیں اور دامنِ طلب بچھاتے ہیں۔ ہندستان میں چھپنے والے بے شمار جریدے ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر شائع ہوتے ہیں۔ مگر جب 'فکرِ رضا' کی تلاش ہوتی ہے، تو ہر شخص ''افکارِ رضا'' کا رُخ کرتا ہے اور اُسے کہنا پڑتا ہے کہ اعلیٰ حضرت کی مجالسِ علمیہ کی خوشبو آرہی ہے تو وہ ''افکارِ رضا'' کے صفحات کا مطالعہ کرتے ہیں۔ یہ رسالہ ''حدائقِ بخشش'' پر تحقیقی مضامین شائع کرتا ہے۔ ہر واعظِ شیریں بیان، اعلیٰ حضرت کے چند اشعار پڑھ کر محفل کو گرما لیتا ہے۔ ہر نعت خواں انعام واکرام حاصل کرنے کے لیے ''مصطفیٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام'' سُنا کر وقت گزار لیتا ہے۔ ہر شاعر اپنا رنگ جمانے کے لیے اعلیٰ حضرت کے کلام پر تضامین لکھ لیتا ہے۔ مگر جب فکرِ رضا کی بات چلتی ہے تو ''افکارِ رضا'' کے صفحات اپنے دامن بچھادیتے ہیں۔ پاکستان میں جہانِ رضا (لاہور) اور ''معارفِ رضا'' (کراچی) بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ اور فاضلِ بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے علوم وفنون کو مختلف انداز میں پیش کرتے ہیں۔ مرکزی مجلس رضا، لاہور نے اعلیٰ حضرت کی تصانیف کو دنیا کے گوشے گوشے تک پہنچایا ہے۔ مگر ہندستان میں صرف ''افکارِ رضا'' ہی ایک ایسا جریدہ ہے جو اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی شمع اُٹھائے چار دانگ عالم میں روشنیاں پھیلا رہا ہے۔ بریلی شریف جو مرکزِ رضویت ہے۔ وہاں کے علما ومشائخ جس انداز میں اعلیٰ حضرت پر کام کررہے ہیں وہ سب پر عیاں ہے۔ مگر ممبئی کا ایک ''افکارِ رضا'' شمع شبستانِ رضا بن کر اپنے پروانوں کو دعوتِ شوق دے رہا ہے۔ آج ''افکارِ رضا'' تمام رضویوں کو پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ اے اعلیٰ حضرت کا نام لینے والو! آؤ ''افکارِ رضا'' کی خدمات پر ایک نظر ڈالو۔ اور سارے ہندستان میں ایک ایسا جریدہ لاؤ جو ''افکارِ رضا'' کا ہم پلّہ ہو لاؤ۔

ہم ''افکارِ رضا'' کے مدیر شہیر سے درخواست کریں گے کہ وہ اس شمع کو بجھنے نہ دیں۔ اس شمع کو جاری وساری رکھیں۔ آج اپنوں کی بے اعتنائی ورضوی اہلِ قلم کے بے نیازی اور رضویوں کی 'مفت خوانی' کی پروا نہ کریں۔ ''قدم بڑھائیں ہم تمہارے ساتھ ہیں'' الا تحزن افی البلتیا فالرحمن الطاف خفیا'' اے بلاؤں میں گھرے ہوئے زبیر بھائی ڈرو نہیں۔ غم نہ کرو اللہ کے خزانوں سے غائبانہ الطاف نازل ہوں گی۔

☆☆☆☆☆☆☆

○ سیّد صبیح الدین صبیح رحمانی،
مدیر نعت رنگ و پروڈیوسر کیو ٹی وی، کراچی

جب کبھی محمد زبیر قادری کا ذکر آتا ہے تو میرے لوحِ ذہن پر مجاہدِ اعلیٰ حضرت کے الفاظ روشنی دینے لگتے ہیں۔ انھوں نے نہ صرف امام احمد رضا کی شخصیت اور تعلیمات سے عشق کیا بلکہ فکرِ رضا کی ترویج و اشاعت کو اپنی زندگی کا مقصدِ وحید بنا کر اپنے کام سے اُس کا اظہار بھی کیا ہے۔

افکارِ رضا کے شمارے جہانِ رضویات میں اُن کے اس سچے اور بے لوث عشق اور عملیت پسندی کی زندہ گواہی کے طور پر ہمارے سامنے ہیں۔ کسی بھی جریدے یا رسالے کے پیچھے اُس کے مدیر کا مقصد اور نظریہ کارفرما ہوتا ہے۔

افکارِ رضا اپنی ضخامت میں مختصر ہونے کے باوجود زبیر قادری کی بہترین ادارتی، تحریکی اور اشاعتی صلاحیتوں اور سلیقے کا آئینہ بن کر ہمارے سامنے ہے۔ مَیں زبیر قادری کے عشق، صلاحیت اور جذبے کو سلام پیش کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ ہمارے اکابرین جب ملّت کی فلاح اور مسلک کی بہتری کے لیے بڑے بڑے منصوبوں پر غور کریں تو اُنھیں یہ نکتہ بھی بجھائی دے کہ کسی بھی تحریک کی رگوں میں دوڑنے والا خون اصل میں زبیر قادری جیسے کارکن ہی ہوتے ہیں، ان کی جانب التفات اور حوصلہ افزائی بہت ضروری ہے۔ کاش اعلیٰ حضرت پر کام کے دعوے دار افراد اور ادارے ان جیسے نوجوانوں کی صلاحیتوں کو وسائل کی کمی اور عدم توجہی کے باعث برباد ہونے سے بچانے کے لیے بروقت کوئی اقدام کریں۔

○ افتخار امام صدیقی،

مدیر ماہ نامہ شاعر، ممبئی

آپ افکارِ رضا کے ذریعے سے جو دین کا تبلیغی اور فلاحی کام کر رہے ہیں وہ بہت اہم ہے اور اس سلسلے میں اللہ آپ کی مدد کرتا ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ وہ یقیناً آپ کی مدد کر رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اُس کے محبوب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام لیوا اس دنیا میں جتنے بھی تھے، ہیں، گزر گئے اور اب بھی ہوں گے، ہم کو معلوم نہیں۔ لیکن اُن میں ایک بہت نمایاں نام امام احمد رضا بریلوی کا ہے۔ اُن سے ہی یہ رسالہ منسوب ہے۔ جن کو ہم ''فاضل بریلوی'' کہتے ہیں۔ وہ شاعر بھی تھے۔ انھوں نے اپنی پوری زندگی سُنّتِ رسول کی تبلیغ و اشاعت میں صرف کردی۔ یہاں تک کہ اُن کی نعتوں میں ایسی عقیدت موجود ہے کہ بہت کم لوگوں میں ہم نے دیکھی۔ آپ ﷺ سے ایسا عشق تھا اور عشقِ رسول میں اتنے دیوانے تھے کہ کبھی کبھی غلو بھی کرجاتے تھے۔ معاف کیجیے۔ لیکن شاعری میں غلو جو ہے مَیں نے خود کیا ہے۔ مَیں بتاؤں ایک شعر ہے میرا ۔

وہ تو خدا نہیں ہیں، خدا کا وہ نور ہیں　　پیکر میں نور بھر لیا دنیا میں آ گئے

امام احمد رضا صاحب کی حمد و نعت اتنی مشہور ہے، اتنی مقبول ہے کہ اہلِ سُنّت و جماعت کی جتنی مساجد ہیں وہاں پر ہر جمعہ اور فجر کے بعد سلام ضرور پڑھا جاتا ہے۔ اور اتنا بابرکت اور اتنا مقبول ترین سلام ہے کہ اُس کے آگے ماہرالقادری کا ''وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا'' یا اور بھی بہت سارے لوگوں نے سلام کہے ہیں۔ وہ سب کے سب امام احمد رضا کے سلام کے سامنے پھیکے نظر آتے ہیں۔ عشقِ رسول میں کون شاعر ایسا ہے جو ڈوبا ہوا نہیں ہے۔ بدقسمت ہوگا وہ شخص جس نے کبھی نعت نہیں کہی۔ تو احمد رضا صاحب کے کلام میں جو عقیدت ہے، اُس نے اُن کے کلام کو مقبولیت کے اوجِ ثریا پر پہنچا دیا ہے۔ مَیں ایک بات جانتا ہوں، میرا تجربہ ہے۔ گذشتہ چار سال سے مجھے روزانہ اشراق کے بعد ایک حمد، ایک نعت اللہ تعالیٰ املا کراتا ہے۔ میرا یہ یقین ہے اور اُن کے معتقدین، اُن کے جانشین بتائیں گے کہ امام احمد رضا صاحب پر نعتیں الہام ہوتی تھیں اور وہ خود نہیں لکھتے تھے، اللہ لکھواتا تھا۔ کیونکہ اُسے معلوم تھا کہ یہ میرے محبوب کا عاشق ہے۔ تو وہ اپنے عاشق کے عاشق پر مہربان تھا۔ میرا ایک شعر ہے۔

دُرود پڑھتا ہوں رستے سنورتے جاتے ہیں　　میری اُمید کا اک اک شجر مہکتا ہے

اُسی طرح میرا یقین ہے کہ وہ ہمہ وقت باوضو رہتے ہوں گے۔ تبھی وہ اتنی عمدہ نعتیں اور اتنا بہترین کلام کہہ پاتے ہیں کہ آج پوری دنیا میں ...... کیا پاکستان، کیا ہندستان، کیا بنگلہ دیش جہاں جہاں اردو ہے، اُن کے عقیدت مند موجود ہیں۔ اور اہلِ سُنّت و جماعت تو پوری دنیا پر حاوی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہم اپنی بدکاریوں کی وجہ سے اپنے بزرگوں سے دور چلے گئے ہیں۔

امام احمد رضا کا مسلک وہی ہے جو اللہ اور اللہ کے رسول کا ہے۔ یعنی اللہ تک پہنچنے کے لیے اللہ نے بھی ذریعہ بنایا کہ اُس نے ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر بھیجے۔ کیوں؟ وہ براہ راست بتا سکتا تھا کہ مَیں واحد ہوں۔ لیکن نہیں، اُس نے کتنے پیغمبر بھیجے، کتنے اولیا کرام بھیجے۔ ہم تک پہنچایا یہ دین۔ لیکن اُس کے ساتھ ساتھ ذریعہ بنایا۔ تو امام احمد رضا بھی بہت بڑا ذریعہ ہیں۔ اتنا بڑا ذریعہ ہیں کہ ان کا کام دینی خدمات کی مختلف سمتوں میں پھیلا ہوا ہے۔ حالانکہ مَیں مولانا اشرف علی تھانوی کو مانتا ہوں کہ انھوں نے بھی بہت کام کیا، ایسا نہیں کہ نہیں کام کیا یعنی ان دیوبندیوں نے۔ لیکن جتنی شہرت اِن کو ملی اُتنی اُن کو نہیں ملی۔ اُس کی وجہ یہ ہے کہ شاید وہ شاعری کرتے ہوں گے، نعتیں کہتے ہوں گے، لیکن جیسی عقیدت امام احمد رضا صاحب میں تھی وہ ان میں نہیں تھی۔ اس کو مَیں اندھی عقیدت کہتا ہوں۔ اندھی سے مراد ایسا نہیں کہ خدانخواستہ وہ کچھ غلط راستے چلے گئے۔ بلکہ ایک ایسی عقیدت جو مثال بن گئی۔ ہم کو بھی ایسی ہی عقیدت ہونی چاہیے اور ہمارا ایمان و ایقان اللہ پر، اُس کے رسولوں پر، اُس کی کتاب پر، احادیث پر کامل ہونا چاہیے۔ جب تک ہم کامل یقین کے ساتھ نہیں　جئیں گے تو ہماری روح میں حرارت کہاں سے آئے گی؟ یہ تو حرارت بھرلوگ تھے امام احمد رضا جن کا نام ہے۔ اور واقعی آپ اپنے رسالے سے جو کام کررہے ہیں، اس میں سب سے اہم بات یہ لگی کہ آپ تحقیق پر زیادہ زور دے رہے ہیں۔ خود اللہ کہتا ہے کہ تفکّر اور تدبّر کرو۔ سوچو، غور کرو۔ تو غور کرنا تو ہمارا وصف ہے یعنی مسلمانوں کا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے یہاں بڑے بڑے سائنس داں، بڑے بڑے جراح اور شعرا، خطبا عربی میں ایک سے ایک پیدا ہوئے ہیں۔ انھیں میں سے ایک جید عالم و فاضل مولانا احمد رضا ہیں۔ مَیں تو سمجھتا ہوں کہ اُن کے فتاویٰ جو ہیں وہ بھی بے پناہ ہیں۔ ۱۲ جلدیں ہیں۔ وقت کہاں سے لاتے ہوں گے اتنا ہمہ وقت۔ یعنی عبادتیں بھی، شاعری بھی وہ بھی حمد و نعت اور بھی بہت ساری دینی مشاغل۔ اس سے لگتا ہے خدائے واحد خصوصی طور پر آپ کے اوپر مہربان تھا اور یہ خصوصی شمارہ انہیں کے نام سے منسوب ہے۔

O محمد سعید نوری
بانی وسیکریٹری جنرل رضا اکیڈمی، ۵۲، ڈونٹاڈ اسٹریٹ، کھڑک، ممبئ۔۹

الحمدللہ سہ ماہی افکارِ رضا آج اپنی پچاسویں بہار مکمل کررہا ہے۔ دعا ہے کہ یہ اپنی پچاس ہزار بہاریں بھی مکمل کرے۔ یوں تو ملک بھر سے دسیوں رسائل نکلتے ہیں مگر میری معلومات کے مطابق ہندستان میں صرف رضویات پر نکلنے والا یہ پہلا جریدہ ہے اور ایک دو سال نہیں، ایک دو شمارے نہیں بلکہ یہ پچاسواں شمارہ ہے جو آج ہمارے ہاتھوں میں ہے۔

جناب زبیر قادری صاحب نہ تو بہت بڑے سرمایہ دار ہیں، نہ پیر ہیں اور نہ مقرر اور عمر بھی کم ہے۔ مگر پچاس سے زاید کتابوں اور سہ ماہی افکارِ رضا کے پچاس شماروں کی اشاعت کوئی چھوٹا کام نہیں بلکہ بہت اہم کام ہے۔ اور یہ فضل ہے ربّ تبارک وتعالیٰ کا اور کرم ہے رسولِ اعظم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا اور فیضان ہے امامِ اہلِ سُنّت فاضل بریلوی علیہ رحمۃ الباری کا۔

بے شک افکارِ رضا کے ذریعے مسلکِ حق مسلکِ اعلیٰ حضرت کی انٹرنیشنل لیول پر خدمت ہوئی ہے۔ مَیں نے ہمیشہ زبیر قادری صاحب کو قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے اور اُن کی خدمات کو داد وتحسین پیش کیا ہے مگر جب مَیں نے افکارِ رضا کے پچاس شمارے پورے کرنے کے بعد مزید جاری نہ رکھنے کا اعلان پڑھا تو مجھے بہت افسوس ہوا۔ کیوں کہ کام کے افراد بہت کم ملتے ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اُن کے دل میں مسلکِ اعلیٰ حضرت کا درد دیا ہے۔ فروغِ رضویات کے لیے یہ ہمیشہ سرگرم رہتے ہیں۔ صرف مَیں ہی نہیں بلکہ ملک بھر سے اُن کے پاس خطوط اور ای میل کا تانتا بندھ گیا کہ آپ افکارِ رضا کے اس شمارے کو آخری شمارہ کیوں بنا رہے ہیں۔ مَیں جماعتی کمزوریوں کو جانتا ہوں کہ مسلسل کام کرنے کے بعد بھی کسی جانب سے کوئی حوصلہ افزائی اور بڑھاوا نہیں ملتا ہے اور نہ ہی دیگر کسی طرح کا تعاون ملتا ہے کہ کام کرنے والا بےفکری سے کام کرسکے۔ یہی وجہ ہے کہ کام کرنے والے ہمیشہ کام کے تعلق سے متفکر رہتے ہیں۔ چاہے وہ مدارسِ اہلِ سُنّت کے اراکین ہوں یا تنظیمیں چلانے والے یا پھر رسائل وجرائد نکالنے والے، ہر کوئی دشواریوں کا سامنے کرتے ہیں۔ مگر کثیر دشواریوں کے باوجود آج کے کام کرنے والوں کو دشواریوں کا وہ سامنا نہیں کرنا پڑتا ہے جو آج سے پندرہ بیس سال قبل خدمت کرنے والوں کو کرنا پڑتا تھا۔

جناب زبیر قادری صاحب! آپ نے ہمیشہ بلند حوصلگی اور بلند نظری کا مظاہرہ کرتے

ہوئے بڑے بڑے اور کثیر مقاصد کو بروے کار لایا ہے۔ لہٰذا آپ اسلام وسُنّیت اور مسلکِ اعلیٰ حضرت کی خدمت و اشاعت میں لگے رہیں۔ ان شاء اللہ تعالیٰ ہم لوگ دونوں جہان میں سُرخ رو رہیں گے۔ ربّ تبارک وتعالیٰ کا فضل و مدد، رسولِ گرامی وقار صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا کرم وعنایت اور بزرگوں کا فیضان ہمارے ساتھ ہے اور رہے گا۔ رضا اکیڈمی آپ کی ہر آواز پر لبیک کہے گی اور ان شاء اللہ ہمیشہ آپ کے دوش بدوش رہے گی۔

فقط والسلام

اسیر مفتیِ اعظم محمد سعید نوری

بانی وسیکریٹری جنرل، رضا اکیڈمی

○ سیّد منور علی شاہ بخاری،
نارتھ کیرولینا، امریکہ

یہ تحریر کرتے ہوئے بڑی مسرّت ہورہی ہے کہ آپ تیرہ سال متواتر دشوار سفر طے کرکے افکارِ رضا کا خصوصی پچاسواں شمارہ پیش کررہے ہیں۔ خدا کرے اسے رضویات کے خانے میں عمدگی سے سجایا جائے۔ افکارِ رضا ہندستان میں رضویات کا واحد نمائندہ ہے، جو مسلسل تیرہ برس سے افکارِ رضا کے مختلف پہلوؤں کو اُجاگر کرنے میں لگا ہوا ہے۔ مگر ہماری جماعت کی بے حسی کا کیا کیا جائے کہ کام کرنے والے کو قرار واقعی اہمیت نہیں دی جاتی بلکہ اس کی حوصلہ شکنی کرکے اس کے جذبات کو کند کیا جاتا ہے۔ قابلِ مبارک باد ہیں آپ کہ اتنے برسوں سے بلا قیمت افکارِ رضا کو قارئین تک پہنچاتے رہے ہیں۔ یقیناً آپ کے اوپر امام احمد رضا بریلوی کا خصوصی فیض ہے کہ بے سروسامانی کے عالم میں بھی افکارِ رضا کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔ خدارا اس کو بند مت کیجیے، ہماری نیک تمنائیں آپ کے ساتھ ہیں۔

افکارِ رضا کے خصوصی شمارے کی اشاعت پر دل کی گہرائیوں سے مبارک باد قبول فرمایئے۔

حیات

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا کی ۶۵ سالہ حیات طیبہ کا باب جب ہم کھولتے ہیں تو اس ۶۵ سال کے عرصے میں ان کے پورے سراپا پر شریعتِ مصطفیٰ کی چاندنی چھٹکی نظر آتی ہے۔ ان کے دامنِ حیات کا ذرا سا بھی کنارہ ایسا نہیں ملتا جو اتباعِ شریعت سے تَر نہ ہو۔ ان کے خاندانی بزرگوں نے اولیاے اسلام سے عشق و محبت تو انہیں گھول کر پلادی تھی، جس کا نشہ تادمِ حیات اُن کے فکر و عمل پر چھایا رہا۔ اُن کی حیاتِ مبارک کی مختلف سمتوں پر مضمون نگاروں نے قرطاس پر اپنی کاوشات کا لہو بہایا ہے۔ مولانا غلام یحییٰ انجم مصباحی صاحب نے اپنے مضمون کو اپنی زیر تالیف کتاب ”اختلافاتِ رضا“ سے منتخب فرماکر ارسال کیا ہے۔ خدا کرے یہ کتاب جلد از جلد طباعت کا زیور پہن سکے۔ حضور سیّد آلِ رسول حسنین میاں نظمی کا مضمون جو حضرت موصوف نے اعلیٰ حضرت کے اور اپنے خاندانی بزرگوں سے تعلقات کے پس نظر میں تحریر فرمایا ہے، گو اس باب سے متعلق نہیں ہے مگر ایک مضمون کے لیے تعلقات کے باب کا اضافہ کرنا مناسب نہ سمجھا گیا، اس لیے وہ بھی اس باب میں شامل ہے۔ ایک مضمون مولانا مجاھد حسین حبیبی مصباحی کا بھی ہے۔ اس میں انھوں نے ”امام احمد رضا کے عادات و خصائل“ پر روشنی ڈالی ہے۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ نجم القادری جنھوں نے امام احمد رضا بریلوی پر ڈاکٹریٹ بھی حاصل کی ہے۔ اُنھوں نے بھی حیاتِ رضا کے ایک پہلو تصوّف پر اپنے فکر و قلم کا چراغ روشن کیا ہے۔

.... ص۔ ر۔ مصباحی

باب دوم

امام احمد رضا اور مشائخ مارہرہ مطہرہ

از: سید شاہ آلِ رسول حسنین میاں نظمی مارہروی،
سجادہ نشین خانقاہ عالیہ برکاتیہ نوریہ امیریہ، مارہرہ مطہرہ

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم علیہ وعلی آلہ وصحبہ
افضل الصلاۃ والتسلیم

سادات مارہرہ نے اعلیٰ حضرت محدث بریلوی کو اتنا ٹوٹ کر چاہا کہ انھیں چشم و چراغ خاندان برکات کا لقب عطا فرمایا اور یہیں سے بریلی شریف کے عقیدت مندوں کے دلوں میں یہ تاثر گھر کر گیا کہ مارہرہ کو اپنی شہرت اور مقبولیت کے لیے بریلی کی ضرورت پڑتی ہے۔ کچھ حضرات تو یہ کہتے ہوئے بھی سُنے گئے کہ مارہرہ کو سارا فیض بریلی سے ملا ہے۔ جو لوگ مارہرہ اور بریلی کے رشتوں کی ماہیت سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ دو نام ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ نہ بریلی مارہرہ سے الگ ہے، نہ مارہرہ بریلی سے الگ ہے۔

بریلی کے معزز پٹھان گھرانے میں پیدا ہوئے، احمد رضا علم و فضل کے جملہ لوازمات سے لیس ہونے کے بعد نسبت کی تلاش میں نکلے۔ اس وقت ہند میں کتنے ہی ایسے گھرانے تھے جن کے پاس علم وفضل بھی تھا اور نام ونسب بھی۔ کچھوچھہ شریف، دلّی، مراد آباد، بدایوں، پھپھوند، حیدرآباد، اجمیر شریف کتنے ہی گھرانے تھے جو روحانیت کے آسمان پر سورج کی طرح چمک رہے تھے۔ احمد رضا کہیں سے بھی فیض حاصل کر سکتے تھے۔ مگر ان کی دور بیں نگاہوں نے ضلع ایٹہ کے ایک چھوٹے سے قصبے کا انتخاب کیا جہاں درویش صفت نبی زادے اپنے نانا جان ﷺ کی آبرو سنبھالے حجرہ نشین تھے۔ تھے بھی وہ آلِ رسول اور نام بھی تھا اُن کا آلِ رسول۔ یہ وہ قادری مسند تھی جہاں بغدادی و اجمیری دوآتشہ چھن رہی تھی۔ مارہرہ کے سادات کی سب سے بڑی خصوصیت تھی ان کا عالی نسب جو حسینی خاندان کی سونے کی کڑیوں سے جڑا ہوا تھا۔ جس میں سونے کے علاوہ کسی اور دھات کا ٹانکا نہیں تھا۔ اعلیٰ حضرت کو معلوم تھا کہ یہ وہ خاندان ہے جس نے اپنے شجرہ نسب کو ہر قسم کی ملاوٹ سے اب تک محفوظ رکھا ہے۔ جو اپنے بیٹوں یا بیٹیوں کی شادی صرف انھی خاندانوں میں کرتے ہیں جو انھی کی طرح مضبوط اور مسلسل نسب نامہ رکھتے ہیں۔ مارہرہ کا خاندان نجیب الطرفین سادات کا خاندان ہے۔ اعلیٰ حضرت نے سادات مارہرہ کے طریقتی شجرے کو بھی بڑے غور سے دیکھا تھا۔ سبحان اللہ! چشتیت ایسی کھری کہ ان کے جد

اعلیٰ کو قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے براہ راست ملی۔ قادریت ایسی انمول کہ ایک طرف پیر سے مرید کو بخشا ہوا سلسلہ دوسری طرف باپ سے بیٹے کو عطا کیا ہوا سلسلہ۔ گویا سونے پر سہاگہ!

اعلیٰ حضرت کو یہ بھی معلوم تھا کہ ساداتِ مارہرہ کا یہ وہ مقدس گھرانہ ہے جسے سرکار بغداد غوث اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف سے یہ بشارت دی گئی ہے: یہی پیام یہی رسالہ، کہیو برکات مارہرہ والا۔ ساتھ ہی حضور تاج دار جیلاں رضی اللہ عنہ نے اپنی تسبیح کے سات منکے (دانے) حضرت بوعلی شاہ قلندر کی معرفت تاج دارِ مارہرہ حضور شاہ برکت اللہ قدس سرہ کو بھجوائے اور سات منکوں کی صورت میں سات اقطاب کی بشارت دی۔ ان اقطاب میں کے پانچ اقطاب سے اعلیٰ حضرت اچھی طرح واقف تھے یعنی حضور سیدنا شاہ برکت اللہ قدس سرہ، حضور سیدنا شاہ آلِ محمد سرکار کلاں قدس سرہ، حضور سیدنا شاہ حمزہ عینی قدس سرہ، حضور سیدنا شاہ آل احمد اچھے میاں قدس سرہ، حضور سیدنا شاہ غلام محی الدین امیر عالم قدس سرہ۔ اور اعلیٰ حضرت کو یہ بھی یقین کامل تھا کہ سرکار بغداد کی بشارت پوری ہو کر رہے گی اور اسی خاندان میں دو قطب اور ہوں گے۔ ایسا ہی ہوا۔ خاتم الاکابر حضور سیدنا شاہ آلِ رسول احمدی قدس سرہ اور حضور سیدنا شاہ ابوالحسین احمد نوری قدس سرہ نے اس سلسلے کو پورا کیا۔ آج دنیائے طریقت میں مارہرہ شریف غالبًا وہ واحد آستانہ ہے جہاں ایک ہی چھت کے نیچے سات اقطاب آرام فرما ہیں۔ فللّٰہ الحمد!

اس طرح ہم نے دیکھا کہ اعلیٰ حضرت نے اپنا سودا کرنے کے لیے ایک ایسی نورانی دوکان کو منتخب فرمایا جہاں کا بھاؤ اس وقت دنیائے سُنّیت میں سب سے اونچا تھا۔ جس وقت اعلیٰ حضرت اپنے والد ماجد حضرت مولٰینا نقی علی خاں کے ہمراہ حضور اچھے میاں قدس سرہ کے مکان سجادگی کے حجرۂ سجادگی میں داخل ہوئے اور تخت احمدی پر براجمان تاج دارِ مارہرہ شاہ آلِ رسول احمدی کے سامنے دو زانو ہو کر بیٹھے، اس وقت کسے خبر تھی کہ جو نوجوان آج بیعت کی غرض سے حاضر ہوا ہے وہ بیعت کے علاوہ اور بہت کچھ لے کر اس حجرہ سے نکلے گا۔ بیعت کے بعد کے واقعات میں اکثر غلو کی آمیزش پائی جاتی ہے۔ لوگ طرح طرح کی باتیں کرتے ہیں۔ مثلاً شاہ آل رسول نے اعلیٰ حضرت کو بیعت کرنے کے بعد فرمایا: مجھے بہت دنوں سے اپنی نجات کی فکر دامن گیر تھی۔ الحمدللہ آج وہ فکر دور ہوگئی۔ گویا بریلی کے مولٰینا احمد رضا خاں قطب مارہرہ شاہ آلِ رسول احمدی کے لیے نجات دہندہ بن کر آئے تھے۔ اصل واقعہ صرف اتنا ہے کہ اعلیٰ حضرت کو بیعت کرنے کے ساتھ ساتھ حضور خاتم الاکابر نے انھیں خاندان کی تمام خلافتوں، اجازتوں اور وظائف و اوراد سے بھی نواز دیا۔ جب حضور خاتم الاکابر کے بھتیجے اور خلیفہ حضور سید شاہ حسین حیدر کو معلوم ہوا تو انھوں نے دبی زبان سے پوچھا: ہمارے خاندان کا تو یہ وطیرہ رہا ہے کہ خلافت دینے سے پہلے سالہا سال مجاہدہ کرایا جاتا ہے اور جب طالب ریاضت و مجاہدے کی بھٹی

میں تپ کر کندن بن کر نکلتا ہے تب اس کے سر پر خلافت کا تاج رکھا جاتا ہے۔ اس کے برعکس آپ نے بریلی کے ان صاحب زادے کو کسی بھی طرح کے مجاہدے کے بغیر ساری خلافتیں اور اجازتیں عطا کر دیں! خاتم الاکابر مسکرائے اور فرمایا: اور لوگ میلا کچیلا زنگ آلود دل لے کر آتے ہیں، اس کے تزکیہ کے لیے ریاضت و مجاہدے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ مصفّٰی و مزکّٰی قلب لے کر آئے؛ انھیں ریاضت و مجاہدے کی کیا ضرورت تھی؟ انھیں صرف نسبت کی ضرورت تھی، سو وہ ہم نے دے دی۔ اس کے بعد حضور خاتم الاکابر نے وہ مشہور و معروف جملہ ارشاد فرمایا: ''ایک عرصہ سے یہ فکر لاحق تھی کہ بروز حشر اگر احکم الحاکمین نے سوال فرمایا کہ آلِ رسول تو ہمارے لیے کیا لایا، تو میں کیا پیش کروں گا۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ آج وہ فکر دور ہوگئی۔ اب حشر میں رب پوچھے گا: اے آلِ رسول! ہمارے لیے کیا لایا، تو کہہ دوں گا: احمد رضا کو لایا۔'' ملاحظہ فرمایا آپ نے کہ روایتوں کے تضاد نے اصل واقعہ کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا تھا۔

حضور خاتم الاکابر شاہ آلِ رسول احمدی نے اپنے ولی عہد سید شاہ ابوالحسین احمد نوری علیہ الرحمۃ کو اس موقع پر ایک وصیت فرمائی جس سے ۲۲ سال کی عمر میں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا کی جملہ علوم و فنون میں مہارت کا پتہ چلتا ہے۔ آپ نے فرمایا: ''دیکھو اب ہمارے خاندان کے اکابر کی جو کتابیں شائع ہوں ان دونوں عالموں (مولٰنا احمد رضا اور مولٰنا عبد القادر بدایونی) کو دکھائی جائیں اور یہ جیسی اصلاح کریں قبول کی جائے پھر اشاعت ہو۔''

حجرۂ سجادگی میں بیعت ہونے کے بعد جب اعلیٰ حضرت باہر تشریف لائے تو خانقاہ کے خدام انھیں دیکھ کر بے اختیار اسم ذات اللّٰہ اللّٰہ کا نعرہ لگا بیٹھے۔ خانقاہ کی روایت کے مطابق خدام یہ نعرہ صرف صاحب سجادہ کو دیکھ کر لگاتے تھے۔ آج یہ کیا ہوا کہ بریلی کے نوجوان کو دیکھ خدامِ خانقاہ اپنی روایت فراموش کر بیٹھے۔ بات یہ تھی کہ جس وقت اعلیٰ حضرت حجرہ سے باہر آئے ان کی شکل و شباہت ہو بہو شاہ آلِ رسول کی جیسی تھی، اسی لیے خدامِ بارگاہ مرید پر شیخ کا دھوکہ کھا گئے اور بے ساختہ اسم جلالت بلند کر بیٹھے۔ سبحان اللہ! شاہ آلِ رسول نے علم و فضل سے مالا مال اپنے مرید کو اپنی ایسی نسبت عطا فرمائی کہ رات دن خدمت میں حاضر رہنے والے نمک خوار ایک لمحہ کے لیے پہچان نہ سکے کہ کون آقا ہے اور کون غلام!

یہاں ایک اور بات غور طلب ہے کہ حجرۂ سجادگی میں اعلیٰ حضرت اور ان کے والد ماجد ساتھ ساتھ داخل ہوئے تھے۔ شاہ آلِ رسول احمدی نے دونوں کو ایک ساتھ ہی بیعت کیا تھا مگر خلافت کا شرف صرف احمد رضا کو ملا جبکہ والد مولٰنا نقی علی خاں بھی علم و فضل کے آسمان پر سورج کی طرح چمک رہے تھے۔ دراصل شاہ آلِ رسول احمدی کی دور رس نگاہوں نے اپنی مومنانہ فراست سے یہ دیکھ لیا تھا

کہ بریلی کا یہ نوجوان کل دنیائے سُنّیت کا مجدد اور علوم ظاہری و باطنی کا امام بن کر چمکے گا اور اس کے سر پر امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی نیابت کا تاج رکھا جائے گا۔ نظمی اپنی ایک نظم میں کہتا ہے:

یہی تھے وہ خاتم الاکابر
کہ جن کے ہاتوں بکے بریلی کے خان زادے
مرید احمد رضا تھے ایسے
کہ جن پہ نازاں تھے ان کے مرشد
یہی وہ احمد رضا تھے جن کو
علوم ظاہر علوم باطن میں سب نے اپنا امام مانا
انھیں کی تقلید اس زمانے میں
سُنّیت کی کسوٹی ٹھہری
انھوں نے دنیا کو یہ بتایا
کہ پیر کا احترام کیا ہے
انھوں نے شعروسخن کے میداں میں
نعت گوئی کا ایک اچھوتا شعور بخشا
رضا کے موئے قلم نے
نجدی ملاعنہ کے حواس پر بجلیاں گرائیں
''حسام الحرمین'' ذوالفقار علی کی صورت
چلی سپاہِ وہابیہ پر
سکھایا احمد رضا نے دنیا کو
حق و باطل میں فرق کرنا
یہ فیض آلِ رسول کا تھا

امام احمد رضا نے دنیا میں اعلیٰ حضرت خطاب پایا۔

میں آج بھی یہی سوچتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے مولینا احمد رضا خاں محقق بریلوی کو کیسا غیر معمولی ذہن عطا کیا تھا کہ علومِ عقلیہ ونقلیہ کے علاوہ فلسفہ، ریاضی و ہیئت، فقہ، اصول فقہ، فن رجال، تفسیر، تصوف، کلام، منطق، تاریخ و سیر، قرآن و حدیث تقریباً ۵۴ علوم میں اتنا کچھ سرمایہ عطا کیا کہ دنیا انھیں علومِ ظاہر و باطن کا امام ماننے پر مجبور ہوگئی۔ اپنے تو اپنے، غیروں نے بھی اعلیٰ حضرت کے علم و فضل کا

اعتراف کیا ہے۔ اعلیٰ حضرت کے ایک تحقیقی فتوے کو دیکھ کر مکہ مکرمہ کے ایک جلیل القدر عالم مولانا سید اسماعیل بن سید خلیل آفندی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۳۳۸ھ/۱۹۱۹ء) نے فرمایا تھا:

(ترجمہ) خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں اور سچ کہتا ہوں کہ بے شک ان علمی جواہر پاروں کو اگر امام اعظم قدس سرہ دیکھتے تو ضرور ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوتیں اور ان کے مؤلف کو اپنے اصحاب کے زمرے میں شامل فرما لیتے۔

برِّ صغیر کے روحانی دانش وروں میں امام احمد رضا کا نام سرِفہرست آتا ہے۔ مسندِ افتا پر جلوہ افروز ہیں۔ سامنے فتویٰ نویس بیٹھے ہیں۔ بیک وقت کئی کاتبوں کو مختلف زمروں کے فتوے املا کرا رہے ہیں۔ دائیں بازو پر بیٹھے کاتب کو میراث کے فتوے کا ایک پیراگراف لکھاتے ہیں، پھر بائیں طرف بیٹھے ہوئے کاتب کی طرف مخاطب ہوتے ہیں اور اسے حلال وحرام کے فتوے کا ایک پیراگراف لکھواتے ہیں۔ سامنے بیٹھے ہوئے کاتب کو طلاق کے مسئلے پر ایک پیراگراف املا کرتے ہیں۔ ایک اور کاتب کو عقیدے کا کوئی مسئلہ لکھواتے ہیں۔ پھر پہلے کاتب کی طرف لوٹتے ہیں اور وہیں سے املا شروع کرا دیتے ہیں جہاں سے چھوڑا تھا۔ اسی طرح باری باری ہر کاتب کو املا کراتے ہیں۔ مضمون کا تسلسل وہی، کہیں ذرہ برابر کنفیوژن نہیں۔ مکان کے باہر بیٹھک میں متوسلین کا ہجوم ہے۔ لوگ دور دور سے آئے ہیں اور اپنے ساتھ طرح طرح کے مسائل لائے ہیں۔ مگر سوداگران محلّہ کا یہ درویش سب کی تسلی کر رہا ہے۔ مصلّٰی بچھا ہوا ہے، عبادت میں مصروف ہیں۔ مرشد کے آستانے سے جو اجازتیں عطا ہوئی ہیں، انھیں وظیفے کے روپ میں ڈھالا جا رہا ہے۔ کبھی مراقبے میں چلے جاتے ہیں تو مارہرہ شریف ہو کر مدینہ پہنچ جاتے ہیں۔ عبادت سے فارغ ہو کر زمینداری پر توجہ دیتے ہیں۔ کہیں زمین کا مقدمہ ہے، کہیں کھیت کا، کہیں لگان کا، کہیں چک بندی کا، سب کچھ انھی کو دیکھنا ہے۔ ان سارے کاموں کے ساتھ اللہ اور اللہ کے رسول کے دشمنوں سے بھی نپٹنا ہے، ان کی دشنام طرازیوں اور بہتان تراشیوں کا منہ توڑ جواب دینا ہے۔ یہ کیسا دماغ ہے کہ ایک ساتھ اتنے بہت سے کام کر رہا ہے اور وہ بھی نہایت نظم وضبط کے ساتھ۔

اعلیٰ حضرت نے دس ہزار صفحات پر مشتمل فتوے لکھے جنھیں دنیائے سُنّیت میں فتاویٰ رضویہ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ان فتاویٰ کے علاوہ ایک ہزار سے زیادہ کتابیں اور رسائل لکھے۔ ان فتاویٰ اور کتابوں میں اعلیٰ حضرت نے حوالہ کے لیے جن کتابوں کا حوالہ دیا ہے ان کی تعداد کم وبیش پانچ ہزار ہے۔ ظاہر ہے کہ جن کتابوں کو حوالہ کے روپ میں پیش کر رہے ہیں ان کا مطالعہ بھی ضرور کیا ہوگا اور ان کی عبارتیں ذہن میں محفوظ بھی رکھی ہوں گی۔ اتنی مصروفیات کے بعد وہ کون سا وقت رہا ہوگا جب

اعلیٰ حضرت نے عشقِ رسول میں ڈوبی اپنی شاعری کی ہوگی۔ شاعری بھی کیسی کہ اپنے وقت کے استاد حضرت داغ دہلوی کو کہنا پڑا:

ملک سخن کی شاہی تم کو رضا مسلم جس سمت آگئے ہو سکے بٹھا دیے ہیں

اعلیٰ حضرت نے ہندستان میں اردو شاعری کو ایک نیا سلیقہ، ایک نیا آہنگ، ایک نیا رنگ، ایک نیا روپ عطا کیا۔ انھوں نے شاعری کی سب سے مشکل صنف یعنی نعت کو اپنے شہوار قلم کی جولانیوں کے لیے بطور میدان منتخب کیا۔ انگریزی ادب میں لارڈ ٹینی سن، فارسی میں سعدی شیرازی اور اردو میں جوش کے ذخیرۂ الفاظ کی بڑی دھوم ہے۔ ذرا حدائق بخشش کے اوراق اُلٹیے، زبان و ادب کا ایک سمندر ہے جو ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ اعلیٰ حضرت نے اپنی نعتیہ شاعری میں جس رنگ و آہنگ کو پیش کیا وہ دوسروں کے نصیب میں اس لیے نہیں کہ دوسرے یا تو معشوق کی زلفوں کے پیچ وخم میں پھنسے رہ گئے یا غلو و مبالغہ کی دلدل میں دھنسے رہ گئے۔ اعلیٰ حضرت نے جو کچھ لکھا قرآن و حدیث اور بزرگانِ دین کے اقوال کی روشنی میں لکھا۔ خود فرماتے ہیں:

ہوں اپنے کلام سے نہایت محظوظ بے جا سے ہے المنة للّٰہ محفوظ
قرآن سے میں نے نعت گوئی سیکھی یعنی رہے احکام شریعت ملحوظ

اعلیٰ حضرت کا لکھا ہوا ایک چھوٹا سا رسالہ ہے جس کا نام ہے "الامن والعلی"۔ اس میں انھوں نے ساٹھ قرآنی آیتوں اور تین سو سے زیادہ احادیث کی مدد سے یہ ثابت کیا ہے کہ مصطفیٰ جانِ رحمت ﷺ بلاؤں کو دفع کرنے والے ہیں۔ آج تقریباً ایک صدی ہونے کو آئی، مخالفین میں سے کسی ایک کو بھی اس رسالے کے مشتملات کا رد کرنے کی جرات نہیں ہوئی۔ اعلیٰ حضرت نے مبتدعین زمانہ کے محاسبے اور ان کے سرغنوں کی سرکوبی کے لیے پانچ سو کتابیں لکھیں جن میں سے ایک کا بھی جواب مخالفین سے نہیں بن پایا۔ اعلیٰ حضرت کو جن علوم پر مہارت حاصل تھی، ان میں درجنوں وہ علوم ہیں جنھیں آپ نے اپنے اساتذہ سے حاصل کیا۔ کتنے ہی علوم وہ ہیں جنھیں اساتذہ کی مدد کے بنا محض اپنی ذہانت کے بل بوتے پر سیکھا تھا۔ کثیر تعداد ان علوم کی ہے جن پر آپ نے اپنی بصیرت و مہارت سے اضافے فرمائے۔ چند علوم وہ ہیں جو پہلے فنی طور پر مدوّن نہیں تھے، آپ نے انھیں مدوّن فرمایا۔ ان میں وہ علوم آتے ہیں جو مٹ چکے تھے، آپ نے ان کا احیا فرمایا۔ کچھ علوم ایسے ہیں جنھیں آپ نے خود ایجاد فرمایا۔ اگر یہاں ان تمام علوم کی مثالیں الگ الگ پیش کرنے بیٹھے تو اس کے لیے ایک الگ کتاب ہی لکھنی پڑے گی۔ حضرت مفتی شریف الحق رحمۃ اللہ علیہ کے بقول اعلیٰ حضرت کے لکھے ہوئے صفحات کی تعداد ایک لاکھ بیس ہزار سے زیادہ ہے اور بعض محققین کے مطابق یہ تعداد سولہ لاکھ تک پہنچتی ہے۔

آج بہت سے نام کے سید زادے اعلیٰ حضرت کا نام سن کر ناک بھوں چڑھانے لگتے ہیں۔ کچھ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ میلادِ مصطفیٰ کی محفلوں میں اعلیٰ حضرت زندہ باد کے نعرے کیوں لگائے جاتے ہیں۔ کچھ کا کہنا ہے کہ مسلکِ اعلیٰ حضرت کی دہائی کیوں دی جاتی ہے۔ یہ لوگ اعلیٰ حضرت کے نام سے بدکتے ہیں مگر جب کبھی وہابی اور دیوبندی کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو اعلیٰ حضرت کی کتابوں سے ہی مدد لینی پڑتی ہے۔ اعلیٰ حضرت نے سُنّیوں کو دین کے دشمنوں سے لڑنے کے لیے ہر قسم کا ہتھیار عطا کیا ہے۔

مسلک اعلیٰ حضرت کو بہت کم الفاظ میں بیان کیا جائے تو اس طرح ہوگا:

”جس سے اللہ و رسول کی شان میں ادنیٰ توہین پاؤ، پھر وہ تمھارا کیسا ہی پیارا کیوں نہ ہو، فوراً اس سے جدا ہو جاؤ۔ جس کو بارگاہ رسالت میں ذرا بھی گستاخ دیکھو، پھر وہ کیسا ہی بزرگ معظم کیوں نہ ہو، اسے اپنے اندر سے دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینک دو۔“ (وصایا شریف)

مارہرہ شریف کے مشائخین کرام کو اعلیٰ حضرت سے ایک عجیب سا لگاؤ تھا اور اعلیٰ حضرت کو اپنے پیر خانے کے ایک ایک فرد سے عشق تھا۔ ان کا یہ شعر صرف اور صرف مارہرہ شریف کے سادات کے متعلق ہے:

کیسے آقاؤں کا بندہ ہوں رضاؔ | بول بالے میرے سرکاروں کے

اعلیٰ حضرت اپنے پیر خانے کا اتنا ادب کرتے تھے کہ مارہرہ شریف کے ریلوے اسٹیشن پر اُترتے ہی اپنی جوتیاں اتار کر ہاتھ میں لے لیتے۔ نظمی کہتا ہے:

کبھی مرشد کے در پر پاؤں میں جوتا نہیں پہنا | مرید با صفا ہونا، یہ شان اعلیٰ حضرت ہے

اعلیٰ حضرت کو تاج دارِ مارہرہ حضور سید شاہ مہدی میاں صاحب سے بڑا لگاؤ تھا۔ اکثر مارہرہ شریف تشریف لاتے تو حضرت مہدی میاں صاحب کے دولت کدے پر ہی مہمان ہوتے۔ ایک بار کا واقعہ ہے کہ حضور مہدی میاں صاحب کو بادی اور بواسیر کی تکلیف لاحق ہوئی۔ آپ کے ایک مرید جو حج کر کے لوٹے تھے، مارہرہ آئے تو مرشد کی تکلیف معلوم ہوئی۔ انھوں نے تانبے کا ایک چھلّہ حضور مہدی میاں صاحب کی خدمت میں پیش کیا اور کہا: سرکار، یہ چھلّہ مَیں نے وادیٔ اُحد میں سید الشہدا امیر حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے آستانے پر حاضری کے وقت حاصل کیا ہے۔ اس کے بارے میں مشہور ہے کہ اس چھلّے کے پہننے سے بواسیر، سغرہ اور بادی جیسی ساری تکلیفوں میں راحت ملتی ہے۔ حضور مہدی میاں کو اس وقت اتنی شدید تکلیف تھی کہ فوراً وہ چھلّہ لے کر ہات کی انگلی میں پہن لیا۔ اتفاقاً انھی دنوں اعلیٰ حضرت مارہرہ شریف تشریف لائے اور حضور مہدی میاں کے دولت کدے پر قیام کیا۔ اعلیٰ

حضرت کی نظر حضور مہدی میاں کی انگلی پر پڑی تو دیکھا کہ تانبے کا چھلّہ پہنے ہوئے ہیں۔ مرشد زادے کا معاملہ تھا۔ اعلیٰ حضرت نے حسنِ تدبیر سے کام لیا۔ حضور مہدی میاں سے عرض کیا: حضور کچھ دنوں سے مجھے بادی کی شکایت ہے اگر آپ کوئی دوا تجویز کرسکیں تو عنایت فرمائیں۔ حضور مہدی میاں نے اپنی انگلی سے تانبے کا چھلّہ نکالا اور اعلیٰ حضرت کی طرف بڑھاتے ہوئے فرمایا: ایک صاحب نے مدینہ منورہ سے یہ چھلّہ ہمیں اسی مرض کی دوا کے لیے لاکر دیا ہے۔ آپ اسے پہن لیجیے۔ اعلیٰ حضرت نے بڑے ادب سے وہ چھلّہ لے لیا اور اس وقت محض دکھانے کے لیے انگلی میں ڈال لیا۔ یہ اعلیٰ حضرت ہی کا کمال تھا کہ اپنے مرشد زادے کو ایک شرعی قباحت سے آزادی بھی دلائی اور انھیں احساس بھی نہیں ہونے دیا۔ اعلیٰ حضرت کا کہنا تھا کہ اہلِ بیتِ رسول سے محبت کا تقاضا یہ ہے کہ اگر کسی سید زادے کی کوئی غلطی دیکھے تو اسے گناہ نہ سمجھے، بلکہ یوں سمجھے گویا سید زادے کے دامن پر تھوڑی سی غلاظت لگی ہوئی ہے، جسے دھوکر صاف کیا جاسکتا ہے۔

میرے دادا پیر مجدد برکاتیت حضور سید شاہ ابوالقاسم محمد اسماعیل حسن صاحب علیہ الرحمۃ کو اعلیٰ حضرت سے خصوصی محبت تھی۔ خاندانِ برکات کے مؤرخ حضور تاج العلما سید شاہ اولادِ رسول محمد میاں قدس سرہ اپنے والد ماجد کا ایک واقعہ یوں درج کرتے ہیں:

بریلی کے رہنے والے ایک صاحب جو خود کو حضرت نانا صاحب قبلہ و کعبہ سید شاہ احمد نوری میاں صاحب قدس سرہ کا مرید بتاتے اور جب ۱۳۴۳ھ میں حضرت قدس سرہ کے مبارک عرس کی شرکت کے لیے آئے ہوئے تھے اور اب حالت ان کی یہ تھی کہ وہ وہابی ہوگئے اور اسی بنا پر اعلیٰ حضرت مولٰنا احمد رضا خاں صاحب قدس سرہٗ کو بُرا کہتے اور ابنِ سعود نجدی کی بہت تعریفیں کرتے اور شریف حسین مرحوم کے سخت دشمن اور ان کو گالیاں دیتے تھے۔ ان کے اسی ادعاے بیعت و نیاز مندی کے دھوکے میں پڑکر ہمارے حضرت قدس سرہ کے ایک قریبی عزیز نے، جن سے متعدد قرابتوں کے علاوہ ساتھ رہنے سہنے اور میل جول کے قدیم تعلقات مودت و محبت بھی تھے، ان بریلوی صاحب کو ایامِ عرس میں اپنے مکان میں ٹھہرایا۔ جب حضرت قدس سرہ کو اس پر اطلاع ہوئی اور وہ عزیز حضرت سے ملے تو حضرت نے اس ٹھہرانے پر اپنی ناراضی و ناگواری بہت صفائی سے ظاہر کرتے ہوئے فرمایا کہ آپ سے اور مجھ سے کم و بیش پچاس برس اتفاق رہا۔ اب ایسی کارروائیوں سے افتراق کی صورت نظر آتی ہے۔ محمد میاں سلمہ بھی اگر دین میں مداہنت کرے تو میں اس سے بھی ایسے ہی علیحدہ ہو جاؤں۔

حضور تاج العلما سید شاہ اولادِ رسول محمد میاں علیہ الرحمۃ کو اعلیٰ حضرت سے محبت اپنے والد گرامی مجدد برکاتیت سید شاہ محمد اسمٰعیل حسن قدس سرہ سے ورثے میں ملی تھی۔ حضور احسن العلما علیہ

الرحمۃ نے اپنی ایک تقریر میں حضور تاج العلما کے تاثرات کچھ اس طرح پیش کیے ہیں:

میرے خال محترم نے لکھا اپنے تذکرۂ خاندانِ برکات میں:

''گو کہ مجھے رسمی طور پر مولینا احمد رضا خاں فاضل بریلوی سے تلمذ حاصل نہیں ہے لیکن مَیں ان کو اپنے بہت سے اساتذہ کے مقابلے میں اپنے حق میں بہتر و برتر مانتا ہوں۔'' اور اس کی وجہ لکھی: ''اس لیے کہ میں ان کا طریقہ تحریر وتقریر میں اپنے بزرگوں کے طریقے کے مطابق پاتا ہوں۔''

مارہرہ شریف میں اعلیٰ حضرت کا قیام مسجد برکاتی کے سامنے مدرسہ نام کی عمارت کے دالان میں رہتا۔ ایک بار اعلیٰ حضرت مارہرہ شریف تشریف لائے۔ ان دنوں میرے والد ماجد حضور سید العلما علیہ الرحمۃ کا بچپنا تھا۔ اعلیٰ حضرت درگاہ شریف کی حاضری کو گئے ہوئے تھے۔ اس دوران حضور سید العلما باہر آئے اور اس بستر پر لیٹ گئے جو اعلیٰ حضرت کے لیے سجایا گیا تھا۔ درگاہ شریف کی حاضری کے بعد جب اعلیٰ حضرت خانقاہ میں لوٹے تو دیکھا کہ سید میاں ان کے بستر پر براجمان ہیں۔ اعلیٰ حضرت نے کچھ کہا نہیں، بس پائینتی ہاتھ باندھے کھڑے ہوگئے۔ اس بیچ سید میاں کے نانا اور پیر و مرشد حضور سید شاہ ابوالقاسم محمد اسماعیل حسن عرف شاہجی میاں رحمۃ اللہ علیہ وہاں آ پہنچے، دیکھا کہ ان کا نواسہ بستر پر براجمان ہے اور سنّیوں کا پیشوا احمد رضا دست بستہ کھڑا ہے۔ نانا جان نے سید میاں کے پاس جا کر انھیں بستر سے ہٹانا چاہا۔ مگر اعلیٰ حضرت نے عرض کیا: صاحب زادے کو یوں ہی رہنے دیں حضور، اس غلام کے مرتبے بڑھ رہے ہیں۔

حضور سید میاں علیہ الرحمۃ نے اپنی زندگی مسلکِ اعلیٰ حضرت کی نشر و اشاعت، ترویج و ترقی کے لیے وقف کر رکھی تھی۔ مسلکِ برکاتیت کی نشر و اشاعت اور فکر اعلیٰ حضرت کی ترویج و ترقی کے لیے سید میاں نے اپنے وطن مالوف کو خیر باد کہا اور ممبئی کو اپنا ٹھکانہ بنایا۔ ملک بھر میں گاؤں گاؤں، قریہ قریہ دورہ کر کے عوام اہلِ سنّت تک دین حنیف کا پیغام پہنچایا۔ ان کا یہ شعر کافی مشہور ہوا:

یا الٰہی مسلک احمد رضا خاں زندہ باد ۔۔۔ حفظ ناموس رسالت کا جو ذمہ دار ہے

حضور احسن العلما سید شاہ حسن میاں قدس سرہ فرماتے تھے: ''میرا کوئی مرید مسلکِ اعلیٰ حضرت سے اِدھر سے اُدھر ہو جائے تو وہ خود بخود میری بیعت سے نکل جائے گا۔'' حضور احسن العلما اعلیٰ حضرت پر اتھارٹی تھے۔ حدائق بخشش پڑھنے اور سمجھانے کا انھی کا حصہ تھا۔ مسجد برکاتی، مارہرہ مطہرہ میں ہر جمعہ کو خطبے سے پہلے آدھا گھنٹہ تقریر کرتے اور اس میں ضروری مسائل سمجھاتے اور مسلکِ اعلیٰ حضرت کی باریکیاں مارہرہ کے عوام کے سامنے پیش کرتے۔ اعراس کی تقاریب میں بھی ان کی زبان سے زیادہ تر اعلیٰ حضرت کا ہی تذکرہ سننے کو ملتا۔ الحمدللہ! مارہرہ کے اس سیّد گھرانے کو یہ فخر حاصل ہے

کہ یہاں جتنا ذکر امام احمد رضا کا ہوتا ہے، اتنا شاید اعلیٰ حضرت کے اپنے خاندان میں نہیں ہوتا ہوگا۔

میرے برادرِ نسبتی پروفیسر ڈاکٹر سید جمال الدین اسلم القادری الجیلانی لکھتے ہیں:

''ہمارے اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ کی کسوٹی تھی اتباعِ شریعت اور حبِّ رسول صلی اللہ علیہ وسلم۔ انھیں خانقاہِ برکاتیہ اس کسوٹی پر خوب جچی اس لیے کسبِ فیض کے لیے پا پیادہ حاضر ہوگئے اور ایک ہی ملاقات میں اپنے مرشدِ برحق خاتم الاکابر حضرت سید شاہ آلِ رسول قدس سرہ سے وہ کچھ پالیا جس کے بعد وہ مجددِ دین وملت اور امام عصر کے منصب پر فائز ہوگئے۔ ہمارے اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے پیر خانہ میں علم کی دولت نظر آئی جس کے بغیر اتباعِ شریعت کا اہتمام کسی طرح ممکن نہیں۔'' (اہلِ سُنّت کی آواز، مارہرہ مطہرہ، شمارہ اکتوبر ۱۹۹۷ء، صفحہ۲)

کچھ لوگ ساداتِ مارہرہ کی اعلیٰ حضرت کے ساتھ والہانہ محبت کو یہ کہہ کر سمجھانے لگے ہیں کہ مارہرہ کی برکاتیت اپنی بقا کے لیے اعلیٰ حضرت کی بیساکھی کا سہارا لے رہی ہے۔ بیساکھی کا سہارا تو معذور شخص لیتا ہے۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ساداتِ مارہرہ اپنی جسمانی اور روحانی حیثیت سے پورے طور سے صحت مند اور چاق وچوبند ہیں۔ بریلی سُنّیت کا مرکز سہی، وہ آج بھی اس نسبت کا محتاج ہے جو شاہ آلِ رسول احمدی نے برسوں پہلے امام احمد رضا کی جھولی میں ڈالی تھی اور بعد میں انھی کے جانشین شاہ نوری میاں صاحب نے اعلیٰ حضرت کو چشم وچراغِ خاندانِ برکات کا لقب عطا کیا تھا۔

ایک دو سال کا عرصہ ہوا پورے سوراشٹر میں یہ افواہ پھیلائی گئی کہ نظمی اعلیٰ حضرت کے دشمنوں سے مل گیا ہے اور نظمی اور اس کا بیٹا اعلیٰ حضرت کے بارے میں یہ کہہ رہے ہیں کہ اگر اعلیٰ حضرت آج موجود ہوں تو ہم انھیں خاموش کرادیں۔ **لعنۃ اللہ علی الکاذبین**۔ نظمی تو نظمی اس کے آبا واجداد کی کیا مجال کہ اعلیٰ حضرت کے بارے میں ایسی بات کہہ سکیں۔ اگر اعلیٰ حضرت کا پیر خانہ ہی ان کا دشمن ہوگیا تو پھر ان کا دوست کون رہے گا؟ نظمی نے اپنے ایک مقطع میں اس فتنے کا ذکر اس طرح کیا ہے:

نظمی کو جو رضا کا مخالف کہے، مرتے دم اس کے لب پر نہ کلمہ رہے
ہمہ دانی کا دعویٰ ہے جس شخص کو وہ منافق ہے، جھوٹا ،دغا باز ہے

نظمی نے اعلیٰ حضرت کو اپنی روزی روٹی کا ذریعہ کبھی نہیں بنایا۔ ٹاڈائی مولوی نے اعلیٰ حضرت کے جن دشمنوں سے نظمی کے مل جانے کا ذکر کیا ان کے ہاتھ پاؤں خود وہی مولوی چومتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ نظمی کل بھی اعلیٰ حضرت کے گن گاتا تھا آج بھی گاتا ہے:

یہ فیض کلکِ رضا ہے کہ شعر کہتا ہوں　　وگرنہ نعت کہاں اور کہاں قلم میرا

ڈاکٹر غلام یحییٰ انجم
صدر شعبہ علوم اسلامیہ، جامعہ ہمدرد
ہمدرد نگر نئی دہلی

زیر ترتیب کتاب "اختلافات رضا" کا ایک ورق

امام اہلِ سُنّت مولانا احمد رضا قادری علیہ الرحمۃ والرضوان

(۱۸۵۶ء۔۱۹۲۱ء)

امام اہلِ سُنّت حضرت مولانا شاہ امام احمد رضا خاں قادری علیہ الرحمۃ والرضوان کے آبا و اجداد قندھار کے موقر قبیلے بڑھیچ کے پٹھان تھے۔ محمد سعید اللہ خاں جو عالی جاہ شجاعت جنگ بہادر کے لقب سے مشہور تھے۔ مغل بادشاہوں کے عہد میں سلطان محمد نادر شاہ کے ہمراہ لاہور تشریف لائے۔ گوناگوں خوبیوں کے باعث ''شش ہزاری'' منصب تفویض ہوا اور لاہور کا شیش محل انہیں جاگیر میں دیا گیا اور جب دہلی آئے تو حکومتِ وقت کی جانب سے انہیں ''شجاعت جنگ'' کا خطاب ملا۔ انہی کے اخلاف میں حضرت مولانا شاہ نقی علی خاں رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ (م ۱۲۹۷ھ) کے گھر بریلی شریف میں ۱۰ ر شوال المکرم ۱۲۷۲ھ مطابق ۱۴ ر جون ۱۸۵۶ء روز شنبہ بوقت ظہر جس فرزند ارجمند کی ولادت ہوئی، اسی کا نام احمد رضا تھا۔ سلسلۂ نسب اس طرح ہے:

''احمد رضا خاں بن مولانا نقی علی خاں بن مولانا رضا علی خاں بن مولانا حافظ کاظم علی خاں بن مولانا شاہ محمد اعظم خاں بن محمد سعادت علی خاں (علیهم الرحمة والرضوان)" (۱)

ابتدائے عمر میں بسم اللہ خوانی ہوئی۔ عام طور سے چار سال، چار ماہ اور چار دن کی مدت میں بچہ کی بسم اللہ خوانی کی رسم ادا کی جاتی ہے، مگر خدا کے فضل سے آپ نے چار سال کی عمر میں ناظرہ قرآن مجید ختم کرلیا تھا۔ ذہانت و فطانت کا وافر حصہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو دیا تھا۔ اس کا اندازہ ذیل کی اس عبارت سے لگایا جا سکتا ہے جو الف، با پڑھتے وقت پیش آیا تھا۔ پروفیسر مختار الدین احمد سابق ڈین فیکلٹی آف آرٹس مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ اپنے ایک مقالہ ''امام احمد رضا کا شخصیتی جائزہ'' میں لکھتے ہیں:

> ''استاذ نے بسم اللہ کے بعد الف، با، تا، ثا، جس طرح پڑھایا جاتا ہے پڑھایا۔
> آپ پڑھتے رہے جب لام الف کی نوبت آئی تو آپ خاموش رہے۔ استاد نے
> دوبارہ کہا میاں لام الف، آپ نے فرمایا دونوں حروف تو پڑھ چکے ہیں ل بھی اور

الف بھی۔ اب یہ دوبارہ کیوں؟ جد امجد مولانا رضا علی خاں موجود تھے، بولے بیٹا استاد کا کہنا مانو جو کہتے ہیں پڑھو۔ حضرت نے تعمیل کی اور جد امجد کی طرف دیکھا۔ وہ فراست سے سمجھ گئے کہ اس بچہ کو شبہ ہو رہا ہے کہ حروف مفردہ میں ایک مرکب لفظ کیسے آگیا فرمایا بیٹا تمھارا شبہ درست ہے۔ مگر شروع میں جو تم نے الف پڑھا ہے وہ الف دراصل ہمزہ ہے اور یہ درحقیقت الف ہے اور الف ہمیشہ ساکن ہوتا ہے اور ساکن کے ساتھ ابتدا ممکن نہیں۔ اس لیے ایک حرف لام اوّل میں ملا کر اس کا تلفظ بنانا مقصود ہے۔ آپ نے فرمایا تو کوئی بات نہیں ایک حرف ملا دینا کافی تھا لام کی کیا خصوصیت ہے با، دال، سین اوّل میں لا سکتے ہیں۔ جد امجد نے غایت محبت و جوش میں گلے سے لگایا دل سے دعائیں دیں پھر اس کی توجیہ ارشاد فرمائی۔'' (۲)

بچپن میں تعلیم حاصل کرنے کے دوران عجب عجب انداز سے آپ نے اعتراضات کر کے اپنے اساتذہ کو حیرت میں ڈال دیا۔ اہلِ علم میں جن حضرات تک آپ کے تعلق سے اس طرح کی باتیں پہنچیں وہ متعجب ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ آپ کی ابتدائی زندگی میں پیش آنے والے اس طرح کے کئی ایک چشم دید علمی واقعات کا ذکر "حیات اعلیٰ حضرت" کے مصنف ملک العلما مولانا ظفر الدین قادری نے اپنی شاہ کار تصنیف میں پیش کیا ہے۔

مولانا احمد رضا قادری نے علوم و فنون کی بیش تر تعلیم اپنے والد ماجد سے حاصل کی۔ البتہ ابتدائی تعلیم کے لیے آپ نے مرزا غلام قادر بیگ اور مکتب کے دوسرے اساتذہ کے سامنے زانوے تلمذ تہ کیا۔ چودہ سال کی عمر میں ۱۴؍شعبان المعظم ۱۲۸۶ھ/ ۱۸۶۹ء کو علومِ مروجہ کی تحصیل سے فراغت ہوئی اور ۱۲۹۶ھ/ ۱۸۷۸ء میں جب زیارتِ حرمین شریفین کے لیے مکّہ مکرمہ تشریف لے گئے تو وہاں حضرت سید احمد زینی دحلان مفتیٔ شافعیہ، حضرت مولانا عبدالرحمٰن سراج مفتیٔ حنفیہ سے حدیث، فقہ، اصول اور تفسیر وغیرہ کی سند و اجازت حاصل کی۔ مولانا رحمان علی نے تذکرہ علمائے ہند میں یہاں تک لکھا ہے:

''۱۲۹۶ھ/۱۸۷۸ء میں پہلی بار بیت اللہ کے لیے والد ماجد کے ہمراہ تشریف لے گئے۔ قیامِ مکہ معظمہ کے دوران شافعی عالم حسین بن صالح جمال اللیل ان سے بے حد متاثر ہوئے اور تحسین و تکریم کی۔ موصوف نے اپنی تالیف "الجوهرة المضية" کی عربی شرح لکھنے کی فرمائش کی۔ چنانچہ مولوی احمد رضا خاں نے صرف دو روز میں اس کی شرح تحریر فرمادی اور اس کا تاریخی نام "النيرة الوضيئة فی شرح الجوهرة المضيئة" (۱۲۹۶ھ/۱۸۷۸ء) رکھا۔ بعد میں تعلیقات و حواشی کا

اضافہ کر کے اس کا تاریخی نام الطرۃ الرضیۃ علی النیرۃ الوضیۃ (۱۳۰۸ھ/۱۸۹۰ء) تجویز کیا۔" (۳)

اس عظیم کارنامے کے باعث آپ کی علمی عبقریت کا شہرہ پورے بلادِ اسلامیہ میں پھیل گیا۔ جو بھی آپ کی تحریریں پڑھتا، وہ آپ کی علمی جلالتِ قدر کا نہ صرف اعتراف کرتا بلکہ معاً اس کے دل میں آپ کی زیارت کا شوق بھی انگڑائیاں لینے لگتا۔ پہلی بار سفر حج کے دوران علمائے عرب نے آپ کو اجازت اور اسناد سے نوازا لیکن ۱۳۲۳ھ/۱۹۰۶ء میں جب دوسری بار بارادۂ حج مکہ مکرمہ تشریف لے گئے تو آپ کی علمی عبقریت کی شہرت کے باعث وہاں کے علما نے خود آپ سے علمی استفادہ کیا اور علمی اسناد و اجازات حاصل کیں۔ مولانا محمود احمد نے تذکرہ علمائے اہلِ سُنّت میں لکھا ہے۔

"۱۳۲۳ھ میں دوسری بار حاضری دی، یہ حاضری بہت شان سے ہوئی۔ دیارِ عرب کے علماء و مشائخ نے آپ سے استفادہ کیا۔ اجازت و خلافت حاصل کیں اور آپ کے علمی تبحر کا اعلان کیا۔" (۴)

سفر حرمین کے دوران علمائے حرم نے بعض فقہی اور کلامی مسائل میں آپ سے مذاکرہ بھی کیا اور کچھ علمی استفسار بھی کیے جس کا جواب آپ نے جس محققانہ انداز میں دیا، اس سے علمائے حرم ششدر رہ گئے۔ مولوی عبدالحیٔ رائے بریلوی نے اپنی تالیف "الاعلام (نزھۃ الخواطر)" میں علمائے حرم کی حیرانی کا ذکر ان لفظوں میں کیا ہے۔

"اعجبوا بغزارۃ علمہ وسعۃ اطلاعہ علی المتون الفقھیۃ والمسائل الخلافیۃ وسرعۃ تحریرہ وذکائہ" (۵)

علمائے حرمین نے آپ کی توجہ جس علمی مسئلہ کی طرف مبذول کرائی تھی یا جو استفتا آپ کے سامنے پیش کیا تھا، اس کا تعلق کرنسی نوٹ سے تھا۔ کرنسی نوٹ کا مسئلہ علمائے حرم کے درمیان عقدۂ لاینحل بنا ہوا تھا۔ مگر جب آپ کے سامنے یہ سوال آیا تو اس کا قلم برداشتہ جواب آپ نے جس بصیرت و بصارت کے ساتھ دیا، اس کا اندازہ اہلِ علم ہی لگا سکتے ہیں۔ عربی زبان میں لکھی گئی اس کتاب کا نام آپ نے "کفل الفقیہ الفاھم فی احکام قرطاس الدراھم" (۱۳۲۴ھ/۱۹۰۶ء) رکھا ہے۔ مگر صاحب الاعلام نے اس کتاب کی تصنیف کا سنہ ۱۳۲۳ھ بتاتے ہوئے لکھا ہے:

"کفل الفقیہ الفاھم فی احکام قرطاس الدراھم" الذی الفہ فی مکۃ سنۃ ثلاث وعشرین وثلاث مائۃ الف۔" (٦)

اسی سفر میں علمائے حرم کے سوال پر علمِ غیب کے موضوع پر بھی ایک محققانہ رسالہ لکھا تھا اور یہ

رسالہ ۲۶ / اور ۲۷ / ذی الحجہ ۱۳۲۳ھ / ۱۹۰۵ء کو دو نشستوں میں ساڑھے آٹھ گھنٹے میں تحریر کیا تھا، جیسا کہ اس کتاب میں مرقوم ہے۔

جو علما علمِ غیب کے منکر ہیں جن میں اکثر ہندستانی ہیں انہوں نے دورانِ سفرِ حج یہ سوال کیوں اُٹھایا، اس کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا شاہ احمد رضا قادری فرماتے ہیں:

"انہوں نے جانا کہ مَیں مکہ معظمہ میں اپنی کتابوں سے جدا ہوں اور بیت اللہ کی زیارت میں مشغول ہوں اور اپنے مولیٰ ومحبوب ﷺ کے شہر کی جانب جانے کی جلدی ہے، تو انہوں نے یہ سوال اُٹھایا اس طمع پر کہ یہ جلدی اور اس دھیان میں دل کا لگا ہونا اور کتابیں پاس نہ ہونا مجھے اظہارِ جواب سے روک دے گا تو اس میں ان کی عید وخوشی ہو جائے گی۔" (۷)

ظاہری طور پر اس بے سروسامانی کے عالم میں بھی امامِ اہلِ سُنت مولانا شاہ احمد رضا خاں قادری نے ان کے اُٹھائے ہوئے سوالوں کا منہ توڑ عالمانہ جواب دیا اور علمِ غیب مصطفےٰ ﷺ کے ثبوت میں قرآنی آیات واحادیثِ نبوی اور قوانین شریعت کے انبار لگا دیے۔ جب یہ کتاب علمائے حرمین شریفین کے سامنے پہنچی تو اس قدر عجلت میں لکھی گئی عالمانہ کتاب کا متحیر ہوکر صرف خیر مقدم ہی نہیں کیا بلکہ اس کے مصنف کی علمی عبقریت کا کھلے دل سے اعتراف بھی کیا۔ اس کا اندازہ ان علما کی تقاریظ سے لگایا جاسکتا ہے جو انہوں نے "الدولة المكية بالمادة الغيبية" کے تعلق سے تحریر فرمائی ہے۔ جس کی تفصیل "فاضل بریلوی علمائے حجاز کی نظر میں" نامی کتاب میں دیکھی جاسکتی ہے۔

بعض ہندستانی علما کی طرف سے مولانا شاہ احمد رضا قادری پر یہ الزام تھا کہ وہ نبی اکرم ﷺ کے علم کو علمِ الٰہی کے مماثل قرار دیتے ہیں۔ درج بالا کتاب میں مولانا احمد رضا خاں قادری نے اپنے اوپر لگائے گئے اس الزام اور تہمت کی تردید فرمائی ہے۔ اس کتاب پر جن علما نے اپنے خیالات قلم بند فرمائے ہیں ان میں درج ذیل شخصیتیں قابلِ ذکر ہیں۔

۱۔ شیخ یوسف اسمٰعیل النبهانی صاحب جواهر البحار، فلسطین

۲۔ شیخ العلام محمد سعید بن محمد مفتی شافعیه، مکه معظمه

۳۔ شیخ عبد الله بن عبد الرحمان سراج مفتی حنفیه، مکه معظمه

٤۔ شیخ عبد الله بن حمید مفتی حنبلیه، مکه معظمه

٥۔ شیخ محمد صالح بن علامه شیخ صدیق کمال سابق مفتی حنفیه، خطیب وامام مسجد حرام، مکه معظمه

٦۔ رئیس الخطباء والائمۃ والمدرس مسجد الحرام شیخ احمدابوالخیر بن عبد اللہ میر داد علیہ الرحمہ،مکہ معظمہ

۷۔ شیخ عبد اللّٰہ بن صدقہ بن زینی دحلان جیلانی مدرس مسجد حرام،مکہ معظمہ

۸۔ شیخ محمد صالح بن شیخ محمدبا فضل امام شافعیہ مسجد حرام، مکہ معظمہ

۹۔ شیخ احمد الجزائری بن السید احمد مدنی مفتی مالکیہ، مدینہ منورہ

انہیں اجلہ علمائے کرام کی طرح مکہ معظمہ، مدینہ منورہ اور دیگر بلادِ اسلامیہ کے تقریباً ٦١ علمائے کرام نے تقاریظ لکھیں اوراپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔جن کی تفصیل "فاضل بریلوی علمائے حجاز کی نظر میں" نامی کتاب میں دیکھی جاسکتی ہے۔

العطایا النبویۃ فی الفتاویٰ الرضویۃ

مولانا شاہ احمد رضا قادری کو متعدد اور بعض تذکرہ نویسوں کے مطابق اٹھاون علوم وفنون میں ملکہ حاصل تھا۔ ان علوم میں آپ نے اپنی تصانیف بھی چھوڑی ہیں اور ہر تصنیف تحقیق و تدقیق کے اعتبار سے بلندتر ہے۔جس موضوع پر آپ نے قلم اُٹھایا ہے اس پر سیر حاصل بحث کی ہے۔اس طرح آپ کی چھوٹی بڑی ایک ہزار تصانیف کا پتا چلتا ہے۔جن میں بیش تر ابھی زیورِ طبع سے آراستہ نہیں ہو سکی ہیں۔ان تمام کتابوں میں ترجمۂ قرآن پاک "کنزالایمان فی ترجمۃ القرآن" "العطایا النبویۃ فی الفتاویٰ الرضویۃ" اور "حدائق بخشش" نے کافی شہرت ومقبولیت حاصل کی۔آپ کی تصانیف کا مطالعہ کرنے کے بعد اختلافِ عقیدہ کے باوجود مولوی عبدالحیٔ رائے بریلوی بھی آپ کی علمی جلالتِ قدر کا اعتراف کیے بغیر نہ رہ سکے فرماتے ہیں۔

"کان عالماً متبحراً کثیر المطالعۃ واسع الاطلاع لہ قلم سیال و فکر حامل فی التالیف۔" (۸)

امام احمد رضا فاضل بریلوی کو حدیث، تفسیر، فقہ و اصول فقہ الغرض تمام شرعی علوم میں بڑی مہارت تھی۔ ان مضامین کے جزئیات پر آپ کی گہری نظرتھی۔لیکن بحیثیت فقیہ آپ کو جو شہرت ملی وہ آپ کے معاصر علما کے حصے میں نہ آسکی۔ ہزارہا فتاویٰ کے آپ نے قرآن و احادیث کی روشنی میں مدلّل جوابات دیئے۔اس زمانے میں فقہی بصیرت کے معاملہ میں آپ کا کوئی ہمسر نہ تھا۔ بلادِ اسلامیہ کے تمام مفتیانِ کرام آپ کے نوک قلم سے لکھے گئے فتاویٰ کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ الاعلام کے مصنف نے فقہی بصیرت کے تعلق سے درج ذیل رائے قائم کی ہے۔

"یندر نظیرہ فی عصرہٖ فی الاطلاع علی الفقہ الحنفی و

جزئیاته يشهد بذالك مجموع فتاواه" (۹)

مولانا شاہ احمد رضا کی فقہی بصیرت پر مولانا حسن رضا نے پٹنہ یونیورسٹی سے پی۔ایچ۔ڈی کر کے ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی ہے۔ انہوں نے آپ کی فقاہت کے تعلق سے بڑی تفصیلی گفتگو فرمائی ہے۔موصوف کا تحقیقی مقالہ "فقیہ اسلام" کے نام سے طبع ہو چکا ہے۔اپنے تحقیقی مقالہ کے ''پیش گفتار'' میں وہ لکھتے ہیں:

''فتاویٰ رضویہ کے مطالعہ کے دوران مجھے اعلیٰ حضرت کی شخصیت میں متعدد اصحابِ کمال کے چہرے نظر آتے ہیں۔ مَیں نے کھلی آنکھوں سے دیکھا کہ اعلیٰ حضرت جب کسی مسئلہ پر بحث کرتے ہیں تو ایک ایسے فقیہ کی تصویر ابھرتی ہے جو قوتِ اجتہاد، بصیرت فکر، ذہانت و تعقل اور علمی استحضار میں دور دور تک اپنا جواب نہیں رکھتا۔'' (۱۰)

مولانا احمد رضا قادری نے جس گہرائی کے ساتھ فقہ کا مطالعہ کیا اور جس توجہ اور انہماک کے ساتھ بلادِ اسلامیہ سے آئے ہوئے فتاویٰ کا جواب دیا، اس کی نظیر دوسرے مفتیانِ کرام کے یہاں نہیں ملتی ہے۔ آپ کے فتاویٰ کے مجموعے بلا شبہ فقہی انسائیکلو پیڈیا کا درجہ رکھتے ہیں۔ جہازی سائز کے ہزاروں صفحات پر مشتمل ۱۲ جلدوں کو تعلیق و حواشی اور ترتیب جدید کے ساتھ شائع کیا جائے تو اس کی بارہ جلدیں کئی ایک بارہ جلدوں میں شائع ہوں گی۔ یہ بتاتے ہوئے مجھے خوشی ہو رہی ہے کہ اس نہج پر کام حضرت مولانا مفتی عبدالقیوم ہزاروی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سابق ناظمِ اعلیٰ جامعہ نظامیہ لاہور نے کیا ہے، جس کی تمام جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ ہندستان میں ان تمام جلدوں کو خوبصورت انداز میں برکاتِ رضا، پور بندر گجرات نے ۲۲ جلدوں میں شائع کر دیا ہے جس کا ایک سیٹ مجھے بھی ہدیۃً بھیجا گیا ہے۔

فجزاهم الله تعالىٰ خير الجزاء۔

سطورِ بالا میں فتاویٰ رضویہ کو فقہ اسلامی کا انسائیکلو پیڈیا لکھا گیا ہے۔ یہ میری ذاتی رائے نہیں بلکہ اس دور کے محققین کا بھی یہی خیال ہے۔ ڈاکٹر محمد طفیل ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی، بین الاقوامی یونی ورسٹی اسلام آباد اپنے ایک مقالہ ''فتاویٰ رضویہ کے فقہی مصادر" میں لکھتے ہیں:

''یہ کتاب درحقیقت فقہ اسلامی کا ایک دائرۃ المعارف ہے۔ اگر فتاویٰ رضویہ میں بیان کردہ مسائل کو انضباطی ترتیب سے مرتب کیا جائے تو یقین ہے کہ یہ فقہ اسلامی کا ایک عظیم انسائیکلو پیڈیا ہوگا۔'' (۱۱)

آپ کی فقہی بصارت کا اعتراف متعدد اربابِ دین و دانش اور صاحبانِ فکر و نظر نے کیا ہے۔

جس کی تفصیل امام احمد رضا قادری سے متعلق سوانحی کتابوں میں دیکھی جاسکتی ہے۔ یہاں صرف ڈاکٹر سر محمد اقبال کا وہ بیان بھی کھلی آنکھوں سے پڑھنے کے قابل ہے جسے انہوں نے مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ میں اساتذہ کے درمیان مولانا احمد رضا خاں بریلوی کا ذکر چھڑنے پر فرمایا:

> ''وہ بے حد ذہین اور باریک بین عالم دین تھے۔ فقہی بصیرت میں اُن کا مقام بہت بلند تھا۔ اُن کے فتاویٰ کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کس قدر اعلیٰ اجتہاد کی صلاحیتوں سے بہرہ ور اور ہندوستان کے لیے نابغۂ روزگار فقیہ تھے۔ ہندوستان کے اس دورِ متاخرین میں ان جیسا طباع اور ذہین فقیہ مشکل سے ملے گا۔'' (۱۲)

کنزالایمان فی ترجمة القرآن

مولانا شاہ احمد رضا قادری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو فتاویٰ رضویہ کے علاوہ اور جن تصانیف نے شہرتِ دوام بخشی ان میں کنزالایمان کا خصوصی مقام ہے۔ قرآن حکیم کے اس ترجمے نے حقانیت و صداقت کی اس دنیا میں اپنا وقار اور معیار صرف برقرار ہی نہیں رکھا بلکہ اس نے ایوانِ باطل میں تہلکہ مچا دیا۔ اس ترجمے میں عظمتِ توحید اور ناموسِ رسالت کا بھرپور پاس رکھا گیا ہے۔ بقول مولانا یٰسٓ اختر مصباحی:

> ''اس جامع بلیغ ترجمہ کے اندر عظمتِ توحید کا پاس و لحاظ رکھا گیا ہے کہ دوسرے اردو تراجمِ قرآن میں اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ یہ ترجمۂ قرآن کتاب و سنت کا وہی شارح و ترجمان ہے جس نے سبحان السبوح جیسی معرکۃ الآرا کتاب لکھ کر امکانِ کذبِ باری تعالیٰ کے سارے دلائل و براہین کی دھجیاں بکھیر دیں اور اس کے جواز کے قائل بڑے بڑے اساطین و صنادید کی زبانیں گنگ ہو کر رہ گئیں۔'' (۱۳)

امام احمد رضا قادری نے قرآن حکیم کا ترجمہ کر کے ملتِ اسلامیہ پر احسانِ عظیم کیا ہے۔ اور وہ اس لیے کہ اس زمانے میں جتنے قرآن حکیم کے تراجم موجود تھے اس میں کسی نہ کسی طرح شانِ رسالت میں تنقیص کے پہلو نمایاں تھے اور کماحقہٗ عظمتِ توحید ربانی کا اظہار نہیں ہوتا تھا۔ مگر آپ کا ترجمۂ قرآن ان تمام خامیوں سے قطعاً مبرا ہے۔ اس ترجمے کے سلسلے میں خاص بات یہ ہے کہ قرآن حکیم کے جتنے تراجم اردو زبان میں موجود ہیں ان میں چند ہی تراجم ایسے ہیں جو قرآن حکیم کی عربی عبارت سے دوسری زبانوں میں منتقل ہوئے ہیں۔ ورنہ بیش تر تراجم قرآن ایک دوسرے تراجم کی نقل یا اس کا چربہ ہیں۔ جو حضرات قرآن کریم کے ترجموں کا مطالعہ کرتے ہیں ان پر یہ بات مخفی نہیں۔

ترجمۂ قرآن کنز الایمان کس طرح وجود میں آیا اس کی تفصیل سوانح اعلیٰ حضرت کے

مصنف مولانا بدر الدین احمد رضوی نے اس طرح لکھی ہے:

"واقعہ یوں ہے کہ صدر الشریعہ حضرت مولانا حکیم امجد علی اعظمی علیہ الرحمہ نے قرآن مجید کے صحیح ترجمہ کی ضرورت پیش کرتے ہوئے اعلیٰ حضرت سے ترجمہ کر دینے کی گذارش کی۔ آپ نے وعدہ تو فرمالیا لیکن دوسرے مشاغلِ دینیہ کثیرہ کے ہجوم کے باعث تاخیر ہوتی رہی۔ جب حضرت صدر الشریعہ کی جانب سے اصرار بڑھا تو اعلیٰ حضرت نے فرمایا، چونکہ ترجمہ کے لیے میرے پاس مستقل وقت نہیں ہے اس لیے آپ رات میں سوتے وقت یا دن میں قیلولہ کے وقت آجایا کریں۔ چنانچہ حضرت صدر الشریعہ ایک دن کاغذ، قلم اور دوات لے کر اعلیٰ حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دینی کام بھی شروع ہو گیا۔ ترجمہ کا طریقہ یہ تھا کہ اعلیٰ حضرت زبانی طور پر آیاتِ کریمہ بولتے جاتے اور صدر الشریعہ اس کو لکھتے رہتے۔" (۱۴)

بعض ترجمہ نگاروں کے حالات زندگی کا مطالعہ کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ انہیں قرآن حکیم کے ترجمہ کے وقت کس قدر دشوار گذار مراحل سے گزرنا پڑا ہے۔ انہوں نے کئی ایک کتب تفاسیر کا مطالعہ کیا ہے لیکن پھر بھی وہ آیاتِ قرآنی کی روح کو سمجھنے سے قاصر رہے۔ اس کے برخلاف مولانا احمد رضا خاں قادری نے کتب احادیث و تفاسیر کا سہارا لیے بغیر اپنے وسعتِ مطالعہ کی بنیاد پر جس برجستگی کے ساتھ صدر الشریعہ مولانا حکیم امجد علی اعظمی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو جو ترجمۂ قرآن رقم کرایا وہ آپ کی عبقریت اور قرآنی علوم میں مہارت کی بین دلیل ہے۔ اور دوسرے وہ مترجمین جن کی عقل و دماغ کی رسائی روحِ قرآن تک نہ پہنچ سکی۔ انہوں نے ضلال کا ترجمہ "گمراہی" ہی کیا ہے۔ ان تشریحات کی روشنی میں مولانا احمد رضا خاں قادری نے ملتِ اسلامیہ کو عظمتِ توحید و رسالت کا درس دے کر جس طرح ایمان کو جلا بخشی ہے وہ قابلِ قدر ہے۔ ان کی اس برجستگی اور بے ساختگی سے روحِ قرآن پوری طرح اپنی آب و تاب کے ساتھ ترجمے میں موجود ہے۔ بقول ملک شیر محمد اعوان:

"اس ترجمہ سے قرآنی حقائق و معارف کے اسرار منکشف ہوتے ہیں جو عام طور سے دیگر تراجم سے واضح نہیں ہوتے۔ یہ ترجمہ سلیس، شگفتہ، رواں ہونے کے ساتھ ساتھ روحِ قرآن اور عربیت کے بہت قریب ہے۔ ان کے ترجمہ کی ایک نمایاں ترین خصوصیت یہ بھی ہے کہ آپ نے ہر مقام پر انبیاء علیہم السلام کے ادب و احترام اور عزت و عظمت کو بطور خاص ملحوظ رکھا ہے۔" (۱۵)

اس موقع سے میں ایک اور مثال کی طرف اشارہ کرنا ضروری سمجھوں گا جس کی وضاحت ڈاکٹر

رشید احمد جالندھری، ڈائرکٹر ادارۂ ثقافت اسلامیہ لاہور پاکستان نے ان لفظوں میں کیا ہے:

'سورۂ والضحیٰ میں آنحضرت علیہ السلام کے بارے میں ارشادِ خداوندی ہے ووجدك ضالا فهدیٰ مولانا (احمد رضا) اس کا ترجمہ یوں کرتے ہیں اور "میں نے تمہیں اپنی محبت میں خود رفتہ پایا تو اپنی طرف راہ دی" آنحضرت ﷺ کے بارے میں ہمیں معلوم ہے کہ زمانۂ نبوت سے پہلے بھی ان کے دامن وقار وتمکنت پر قبائلی رسم و رواج یا اہلِ مکہ کی بت پرستی و گمراہی کا کوئی داغ نہیں ہے۔ اس لیے اس آیتِ کریمہ میں لفظ ضلال کا وہی ترجمہ زیادہ مناسب ہے جو مولانا نے کیا ہے۔" (١٦)

حدائق بخشش

حضرت مولانا شاہ احمد رضا قادری کے نام کا سکہ بساطِ علم وفن پر تو چل ہی رہا تھا۔ ادبی دنیا میں بھی آپ کی شخصیت محتاجِ تعارف نہ رہی۔ جنہیں اردو ادب کا اعلیٰ ذوق حاصل ہے انہوں نے آپ کی ادبی صلاحیت کا لوہا مانا ہے۔ اردو ادب میں نعت کے مقدس فن سے جنہیں شغف ہے ان کے دلوں میں آپ کی عظمت بھرپور ہے۔ آپ کی شاعرانہ عظمت اور مہارتِ فن کا اعتراف اردو ادب کے محققین نے کیا ہے۔ شاعری کے جن اسرار و رموز کو اپنا کر آپ نے اپنی شاعری کو جلا بخشی ہے بیشتر شعرا کے یہاں اس کا فقدان نظر آتا ہے۔ حضرت مولانا احمد رضا خاں قادری خود اپنی شاعری کے بارے میں فرماتے ہیں:

ہوں اپنے کلام سے نہایت محظوظ　　بیجا سے ہے المنۃ للہ محفوظ
قرآن سے میں نعت گوئی سیکھی　　یعنی رہے احکام شریعت ملحوظ　　(١٧)

توشہ غم واشک کا سامان بس ہے　　افغان دلِ زار حدی خوان بس ہے
رہبر کی رہِ نعت میں گر حاجت ہو　　نقش قدم حضرت حسان بس ہے　(١٨)

اردو شاعری کے حوالے سے آپ کی شخصیت پر کئی ایک اربابِ علم و دانش نے اپنی تحقیقات جمع کر کے عصری جامعات سے ڈاکٹریٹ کی اسناد حاصل کیں۔ مگر مقامِ تعجب ہے کہ یونی ورسٹی اور کالج کے طلبہ اردو کے اس باکمال شاعر کے نام سے بھی واقف نہیں۔ اس کی اصل وجہ کیا ہو سکتی ہے؟ یہ مسئلہ بہر حال اب بھی محلِ نظر ہے۔ اس پہلو پر بھی ہمیں سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔

"مولانا احمد رضا خاں اصلاً نعت گو شاعر ہیں۔ اس سلسلہ میں یہ امر قابلِ غور ہے کہ اردو ادب کی تاریخ میں نعت گوئی کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ ایسا کیوں نہیں، اسے اساطینِ ادب اچھی طرح جانتے ہیں۔ یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ حاصلِ کائنات فخر موجودات ﷺ کے نواسوں سے متعلق تو مرثیہ

کے لیے اردو ادب کے صفحات میں جگہ ہے مگر اس ذات کی نعت مقدس کے لیے اردو ادب میں کوئی جگہ نہیں، جن کی بے پناہ شفقتوں کے سبب امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو شہرتِ دوام ملی۔"

اردو ادب کی تاریخ میں مولانا احمد رضا بریلوی کو کیوں نہیں محفوظ کیا گیا۔ اس کی کئی ایک وجہیں ہیں جس کی وضاحت کا یہاں کوئی موقع نہیں۔ اس سلسلہ میں محققانہ گفتگو آپ کی شاعری پر ریسرچ کر نے والے محققین نے ضرور کی ہوگی۔ بہرحال اس وقت جو اردو ادب کے ذمہ دار ہیں انہیں اپنے تعصب کی عینک اتار کر کھلے دل سے آپ کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کر لینا چاہیے کیوں کہ مولانا احمد رضا خاں قادری وہ واحد شاعر ہیں جن کا مشہور زمانہ سلام ؎

مصطفٰے جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام　　شمع بزم ہدایت پہ لاکھوں سلام (۱۹)

اور چہار لسانی نعت مبارک

لم یات نظیرک فی نظر مثل تو شد نہ پیدا جانا

جگ راج کو تاج تورے سر سو ہے تجھ کو شہ دوسرا جانا (۲۰)

عالم اسلام میں کثرت سے پڑھی جاتی ہے۔ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ اس مقبولِ عام نعت وسلام کے شاعر مولانا احمد رضا خاں قادری ہیں۔

حضرت مولانا شاہ احمد رضا خاں قادری نے اپنی شاعری میں بانیٔ سلسلۂ قادریہ سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی علیہ الرحمۃ والرضوان سے جس والہانہ عقیدت ومحبت کا اظہار کیا ہے، وہ آپ ہی کا حصہ ہے۔ آپ کے مشہور زمانہ دیوان "حدائق بخشش" میں سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے متعلق کئی ایک منقبتیں شامل ہیں۔

واہ کیا مرتبہ اے غوث ہے بالا تیرا　　اونچے اونچوں کے سروں سے قدم اعلیٰ تیرا

سر بھلا کیا کوئی جانے کہ ہے کیسا تیرا　　اولیاء ملتے ہیں آنکھیں وہ ہے تلوا تیرا

مزرع چشت وبخارا وعراق واجمیر　　کون سی کشت پہ برسا نہیں جھالا تیرا

یارب بجمال نام عبد القادر　　یارب بنوال عام عبد القادر

منگر بقصور ونقص ما قادریاں　　بنگر بکمال نام عبد القادر

یارب بجمال نام عبد القادر　　یارب بنوال عام عبد القادر (۲۱)

اس کے علاوہ تقریباً انہتر (۶۹) رباعیاں الف سے یا تک کی ردیف میں ہیں، جن کا تعلق سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی علیہ الرحمۃ والرضوان کی ذاتِ گرامی سے ہے۔

آپ کا سلسلۂ بیعت چونکہ قادری مشرب سے تھا اور اسی سلسلے کی آپ کو اجازت وخلافت بھی

حاصل تھی اس لیے بانیٔ سلسلہ قادریہ سیدنا شیخ عبد القادر جیلانی علیہ الرحمۃ والرضوان اور اس سلسلے سے وابستہ بزرگانِ دین جن کا تعلق بدایوں اور مارہرہ سے تھا، ان کی شان میں بھی مناقب لکھ کر آپ نے اپنی عقیدت اور وابستگی کا اظہار کیا ہے۔ چونکہ آپ کی شاعرانہ عظمت پر یہاں کوئی بحث مقصود نہیں، اس لیے یہاں اس موضوع پر گفتگو سے صرفِ نظر کیا جارہا ہے۔ تاہم اتنا مسلم ہے کہ جن شعرائے کرام نے اردو ادب کو اپنا کر اسے شہرتِ دوام سے ہم کنار کیا' مولانا احمد رضا خاں قادری کی شخصیت بحیثیت شاعر ان میں بہت نمایاں ہے۔ شریعت کے دائرے میں رہ کر قرآن حکیم کی روشنی میں شاعری کرنا اور نہ صرف شاعری کرنا بلکہ اسے شعر و ادب کے اعلیٰ معیار تک پہنچانا بلاشبہ اسے ان کی فنِ شاعری کا اعجاز ہی کہا جاسکتا ہے۔ اور یہ اعجاز سرکارِ دو عالم ﷺ سے والہانہ عشق کا نتیجہ ہے۔ ڈاکٹر ریاض مجید اس نکتے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "انہوں نے نعتیہ مضامین کے بیان میں قرآن واحادیث سے لے کر منطق و ریاضی، ہیئت و نجوم، ہندسہ و مابعد الطبعیات وغیرہ علوم وفنون کی مختلف اصطلاحوں کو نہایت سلیقے سے برتا۔ یہ ان کا کمالِ فن ہے کہ ان کی نعتوں میں مختلف علمی وفنی اصطلاحات وحوالہ جات سطح پر تیرتے پھرتے نظر آتے ہیں۔" (۲۲)

ذیل میں کچھ ایسے اشعار کی نشان دہی کی جارہی ہے جن کا تعلق خالص علومِ متداولہ سے ہے مگر جس خوبصورتی سے امام احمد رضا بریلوی نے اسے شعر کے قالب میں ڈھالا ہے، اس کی نظیر اور کہیں نہیں ملتی۔

محیط ومرکز میں فرق مشکل رہے نہ فاصل خطوط واصل
کمانیں حیرت میں سر جھکائے عجیب چکر میں دائرے تھے (۲۳)

ذرے مہر قدس تک تیرے توسط سے گئے
حد اوسط نے کیا صغریٰ کو کبریٰ نور کا (۲۴)

ترا منسوب ہے مرفوع اس جا — اضافت رفع کی عامل ہے یا غوث
ترے کامی مشقت سے بری ہیں — کہ بر تر نصب سے فاعل ہے یا غوث
نتیجہ حد اوسط گر کے دے اور — یہاں جب تک کہ تو شامل ہے یا غوث
(۲۵)

غایت وعلت سبب بہر جہاں تم ہو سبب — تم سے بنا تم بنا تم پہ کروروں درود
گیسو وقد لام الف کردو بلا منصرف لا — کے تہ تیغ لاتم پہ کروروں درود (۲۶)

مختلف علوم و فنون پر مشتمل نمونے کے طور پر جو اشعار پیش کیے گئے اس سے ان کی قادر الکلامی کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے اور حیرت کی بات یہ ہے کہ جس طرح دوسرے علوم و فنون میں انہیں درک حاصل تھا اسی طرح شعر و ادب میں بھی وہ اعلیٰ درجے کا کمال رکھتے تھے۔ جس کا اعتراف متعدد زبانوں کے ماہر مشہور محقق پروفیسر محی الدین الوائی قاہرہ نے ان لفظوں میں کیا ہے:

''پرانا مشہور مقولہ ہے کہ شخص واحد میں دو چیزیں تحقیقاتِ علمیہ اور نازک خیالی نہیں پائی جاتی لیکن مولانا احمد رضا خاں کی ذات اس تقلیدی فطرت کے عکس پر بہترین دلیل ہے۔ آپ عالم محقق ہونے کے ساتھ ساتھ نازک خیال شاعر بھی تھے جس پر آپ کے عربی، فارسی اور اردو کلام پر مشتمل دواوین شاہد عدل ہیں۔'' (۲۷)

آپ کی اس شاعرانہ عظمت کی طرف ڈاکٹر حازم محفوظ، استاذ ازہر یونیورسٹی قاہرہ نے ان لفظوں میں اشارہ کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

"شعر احمد رضا خاں هو اتصافه بنوع ما من العالمية بكسر اللام والميم۔ فهو عالم دين يعرف الاصول والقواعد الفقهية، ومحيط بتفاصيل السيرة النبوية ولذا فهو يمدح الرسول مدحا علميا فتمثل اشعاره بالمعلومات جنباً الى جنب مع العاطفة۔" (۲۸)

حضرت مولانا شاہ احمد رضا قادری میں ایک خوبی یہ بھی تھی کہ وہ اعلانِ حق کے سلسلے میں اپنے لیے کسی مصلحت کو جرم سمجھتے تھے۔ عوام ہوں یا خواص جہلا ہوں یا علما، شریعتِ مطہرہ کے خلاف کسی سے بھی ایک لفظ سننا یا لکھنا گوارہ نہ تھا۔ اس سلسلے میں آپ نے حالات سے کوئی سمجھوتہ نہیں کیا۔ ابطالِ باطل اور احقاقِ حق میں پوری زندگی بسر کردی۔ آپ کی یہی وہ ادا تھی جو اکثر لوگوں کو پسند نہ آئی اور وہ آپ کے تمام محاسن اور کمالات کو پسِ پشت ڈال کر عیب جوئی اور بہتان تراشی میں لگ گئے۔ لیکن آپ نے اپنے ان مخالفین و معاندین کی معاندانہ سرگرمیوں کا ذرّہ برابر بھی نوٹس نہ لیا۔ اپنے طور و طریق پر اٹل رہے۔ اپنے اور پرائے کی پروا کیے بغیر آپ کا قلم تیغ بڑاں کی طرح ہر اس شخص کے خلاف چلتا رہا جس نے شانِ رسالت میں توہین کی، عظمتِ توحید کی غلط تعبیرات سے عوام الناس کو گمراہ کیا اور شریعتِ مطہرہ کے ساتھ کھلواڑ کیا۔ آپ کے اس مومنانہ کردار کی مخالفت میں چودہویں صدی ہجری کے اوائل میں ایک ہمہ گیر تحریک چلائی گئی، جس کے کئی اسباب تھے۔ مگر یہ چار زیادہ نمایاں تھے:

ا۔ امام احمد رضا قادری نے مسلکِ اہلِ سُنّت و جماعت (سلف صالحین) کی پُرزور حمایت کی اور مجاہدانہ و سرفروشانہ جذ... [illegible]

۲۔امام احمد رضا قادری نے انگریزوں کے زیرِ اثر چلنے والی ہر اصلاحی تحریک کی مخالفت کی۔

۳۔امام احمد رضا قادری نے محمد بن عبدالوہاب نجدی کے زیرِ اثر چلنے والی ہر سیاسی تحریک کی مخالفت کی۔ (۲۹)

لیکن بقول پروفیسر مسعود احمد پاکستان:

''امام احمد رضا سے مخالفت کی سب سے بڑی وجہ مسلکِ سلف صالحین پر ان کی بے پناہ استقامت اور اس کی اشاعت کے لیے ان کی سرگرمی اور اس مسلک کے مخالفین پر ان کی سخت تنقیدات معلوم ہوتی ہے۔'' (۳۰)

جن دانش وروں نے آپ سے علمی، فکری اور سیاسی اختلافات کیے ہیں یا جن اربابِ علم و دانش کا آپ نے علمی تعاقب کیا ہے انہیں تین حصوں میں تقسیم کر کے مدلل گفتگو زیرِ غور ہے۔ حالات نے موقع دیا اور وقت نے اجازت دی تو ان افکار کو ضرور قلمی جامہ پہنانے کی کوشش کی جائے گی۔ اس سلسلے میں سردست ہم نے جو خاکہ تیار کیا ہے، اس کا پس منظر کچھ اس طرح ہے۔

جس زمانے میں راقم مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کا طالب علم تھا، تو راقم کے ساتھیوں میں دوسرے مکاتبِ فکر کے طلبہ بھی تھے اور وہ اپنی موروثی عادت کے مطابق مجھے دیکھ کر جا و بے جا امام اہلِ سُنّت مولانا شاہ احمد رضا قادری علیہ الرحمۃ والرضوان پر تنقیدیں کیا کرتے تھے اور جو کام زندگی میں آپ نے کبھی نہیں کیا اس کا انتساب وہ طلبہ آپ کی طرف کر کے مذاق اُڑایا کرتے تھے۔ ایسا صرف ان کی نادانی کے سبب تھا۔ کیوں کہ مولانا احمد رضا قادری کے بارے میں جو کچھ انہیں معلوم تھا وہ ان کے اکابر ہی کی تحریروں سے معلوم تھا، جو زیادہ تر سُنی سنائی باتوں پر مبنی تھیں۔ اس لیے وہ طلبہ امام اہلِ سُنّت کے تعلق سے اس طرح کی آرا قائم کرنے پر مجبور تھے۔ نہ انہوں نے براہ راست امام احمد رضا قادری کی تحریریں پڑھی تھیں اور نہ ہی آپ کے تعلق سے کسی منصف مزاج مصنف کی کوئی تحریر ان طلبہ کی نگاہوں کے سامنے سے گزری تھی۔ یہ تو طلبہ کی بات تھی اس طرح کی غیر سنجیدہ باتیں جب اساتذہ کی زبانی مَیں سنتا تو مجھے انتہائی ندامت بھی ہوتی اور حیرت بھی۔ ۱۹۸۶ء میں شعبۂ علوم اسلامیہ کے زیرِ اہتمام منعقدہ ایک سیمینار جس کا مرکزی موضوع ''علومِ اسلامیہ میں ہندوستان کی خدمات'' تھا۔ اس مضمون سے تعلق رکھنے والے 'اربابِ دین و دانش جمع تھے۔ میرے مقالے کا موضوع تھا ''علوم اسلامیہ میں ضلع بستی کا حصہ''۔ علومِ اسلامیہ کے کسی موضوع پر مقالہ کیوں نہ ہو کوشش یہی ہوتی کہ کسی نہ کسی طرح اس مقالے میں امام احمد رضا قادری کا نام آجائے تاکہ اس کے ذریعے یونی ورسٹی کے اربابِ حل وعقد کے درمیان آپ کے تعلق سے پھیلی ہوئی غلط فہمیوں کا ازالہ کیا جاسکے۔ چنانچہ ہوا

بھی۔ جب اس مقالے میں کہیں امامِ اہلِ سُنّت کا ذکر آیا اور آپ کی دینی و علمی خدمات کے تعلق سے سیر حاصل بحث کی تو یونی ورسٹی کے اساتذہ میں سے کسی نے یہ سوال کیا کہ ان کی تصانیف کی تعداد اٹھائیس یا تیس ہے۔ مولانا اشرف علی تھانوی سے ان کا کوئی مقابلہ نہیں وہ تین سو کتابوں کے مصنف تھے۔ یہ بات مجھے بہت ناگوار لگی اور وہ اس لیے کیوں کہ یہ باتیں سراسر حقائق کے خلاف تھیں۔ اسی سیمینار میں مَیں نے امام احمد رضا قادری کی تصانیف کی ایک فہرست جو اتفاق سے میرے پاس موجود تھی اور ۶۰۰ کتابوں پر مشتمل تھی، وقفۂ سوالات کے درمیان ان دانش وروں کی عدالت میں پیش کردی۔ مَیں نے یہ بھی کہا، ان کی تصانیف کی کُل تعداد ایک ہزار بتائی جاتی ہے۔ یہ فہرست جو ہمارے پاس ہے ان میں بعض کتابیں ہزاروں صفحات پر مشتمل ہیں۔ میری اس گفتگو سے سامعین پر تھوڑی دیر کے لیے سکتہ طاری ہوگیا۔ اس مجلس میں راقم نے یہ بھی کہا کہ اگر دانش ورانِ ملت، امام احمد رضا قادری کی کتابوں کا براہ راست مطالعہ کریں تو اس طرح کی بدگمانیاں ان کے ذہن و دماغ میں جنم نہ لے سکیں گی۔ اسی وقت سے مَیں نے سوچا کہ اب مجھے رضویات کے تعلق سے کچھ کام کرنا چاہیے تاکہ یونی ورسٹی کے پڑھے لکھے ماحول میں آپ کے حاسدین اور معاندین آپ کے تعلق سے جو غلط فہمیاں پھیلا رہے ہیں، ان کا ازالہ ہوسکے اور مثبت تحریروں کی روشنی میں انہیں سمجھایا جاسکے کہ جو کچھ امامِ اہلِ سُنّت کے بارے میں آپ جانتے ہیں دراصل ان کی شخصیت ایسی نہیں۔ اس تعلق سے مَیں نے اسی زمانے میں اس موضوع پر ایک پروجیکٹ بھی تیار کیا کہ یہ بات جو عام طور سے امامِ اہلِ سُنّت کے تعلق سے مشہور ہے کہ وہ بہت جھگڑالو تھے۔ بات بات پر کفر کے فتاوے لگاتے تھے۔ اس کی صحیح حقیقت عوام اور علما کے سامنے آنی چاہیے تاکہ اس غلط فہمی کا سدِّ باب ہوسکے۔ مگر اس پروجیکٹ کی تکمیل کے لیے مالی تعاون کا بندوبست کہیں سے نہ ہوسکا اس لیے کام نہ ہوسکا۔ اس پروجیکٹ کا خاکہ تین حصوں پر مشتمل تھا:

۱. دینی اختلافات

۲. علمی اختلافات

۳. سیاسی اختلافات

اس پروجیکٹ کی تکمیل میں کتابوں کی خریداری، زیراکس، خط وکتابت اور اسفار بھی ضروری تھے، جس کے لیے اچھی خاصی رقم کی ضرورت تھی۔ اس رقم کا بندوبست نہ ہونے کے باعث پروجیکٹ تو پایۂ تکمیل تک نہ پہنچ سکا۔ البتہ اس تعلق سے جو کام مَیں نے اپنی ذاتی دلچسپی کے طور پر کیا ہے اس کی بڑی پذیرائی ہوئی۔ سنجیدہ طبقے سے ان مقالات پر ستائشی خطوط بھی آئے اور بابِ رضویات میں بعض پی ایچ۔ ڈی اسکالروں نے انہیں ماخذ کے طور پر استعمال بھی کیا، وہ مقالات یہ ہیں:

۱۔ امام احمد رضا اور خواجہ حسن نظامی۔ نظریۂ سجدۂ تعظیمی کا تقابلی مطالعہ
۲۔ امام احمد رضا اور ڈاکٹر اقبال۔ نظریۂ زمان کا تقابلی مطالعہ
۳۔ امام احمد رضا اور مولانا ابوالکلام آزاد۔ ترک موالات کا تقابلی مطالعہ
۴۔ امام احمد رضا اور مولانا طیب عرب مکی۔ نظریۂ تقلید کا تقابلی مطالعہ
۵۔ امام احمد رضا اور مرزا غلام احمد قادیانی۔ نظریۂ ختم نبوت کا تقابلی مطالعہ

اس کے علاوہ اور دوسرے مقالات جو راقم نے فاضل بریلوی مولانا احمد رضا خاں قادری کی علمی و دینی خدمات کے تعلق سے قلم بند کیے ہیں، ان کی فہرست کچھ اس طرح ہے:

۱۔ امام احمد رضا کی شاعری کا انفرادی رخ
۲۔ فاضل بریلوی کے گمنام خلیفہ مولانا محمود جان جام جودھپوری (گجرات)
۳۔ امام احمد رضا کی نعتیہ شاعری
۴۔ امام احمد رضا خاں اور فن تاریخ گوئی
۵۔ امام احمد رضا اور مولانا ابولکلام آزاد کا نظریۂ موالات
۶۔ امام احمد رضا کی نعتیہ شاعری میں آہ سحر گاہی
۷۔ مولانا شاہ احمد رضا قادری علیہ الرحمۃ والرضوان۔ ایک مختصر تعارف
۸۔ بیسویں صدی میں امام احمد رضا قادری کی معنویت
۹۔ مولانا احمد رضا کی عربی نعتیہ شاعری (علمائے ازہر کے حوالے سے)
۱۰۔ امام احمد رضا بنام معتقدین

اس پروجیکٹ میں راقم نے ''اختلافاتِ رضا'' کے تحت جن علما اور دانش وروں کے افکار کے درمیان موازنہ پیش کرنے کا خاکہ تیار کیا تھا اس کی تفصیل کچھ اس طرح ہے۔ یہ تفصیل یہاں اس لیے دی جارہی ہے تا کہ رضویات پر کام کرنے والے ان موضوعات پر بھی سنجیدگی سے مثبت انداز میں کام کرسکیں۔ اور اگر کسی نے نہیں کیا اور راقم کو کہیں سے مالی وسائل کی فراہمی ہوئی تو ان شاء اللہ فرصت ملنے پر اس اہم کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی ضرور کوشش کروں گا۔

الف) مذہبی اختلاف

۱۔ امام احمد رضا قادری اور مولانا اشرف علی تھانوی	مسئلہ علم غیب
۲۔ امام احمد رضا قادری اور مولانا رشید احمد گنگوہی	مسئلہ امکانِ کذبِ باری
۳۔ امام احمد رضا قادری اور مولانا محمد قاسم نانوتوی	مسئلہ خاتم النبیین

۴۔ امام احمد رضا قادری اور مولانا خلیل احمد انبیٹھوی	مسئلہ علم مصطفےٰ
۵۔ امام احمد رضا قادری اور مرزا غلام احمد قادیانی	مسئلہ دعویٰ نبوت
۶۔ امام احمد رضا قادری اور خواجہ حسن نظامی	مسئلہ سجدۂ تعظیمی
۷۔ امام احمد رضا قادری اور میاں نذیر حسین دہلوی	مسئلہ تقلید و نماز جنازہ
۸۔ امام احمد رضا قادری اور مفتی وجیہ الدین بنگالی	مسئلہ طلاق

ب) علمی اختلاف

۹۔ امام احمد رضا قادری اور ڈاکٹر سر ضیاء الدین	مسئلہ علم ریاضی
۱۰۔ امام احمد رضا قادری اور مولوی پروفیسر حاکم علی	مسئلہ حرکت زمین
۱۱۔ امام احمد رضا قادری اور مولانا عبدالحیٔ لکھنوی	مسئلہ وراثت
۱۲۔ امام احمد رضا قادری اور جسٹس محمود	مسئلہ وراثت
۱۳۔ امام احمد رضا قادری اور مولانا احمد حسن سنبھلی	مسئلہ فلسفہ جدیدہ
۱۴۔ امام احمد رضا قادری اور مولانا اشرف علی تھانوی	مسئلہ تقبیل ابہامین
۱۵۔ امام احمد رضا قادری اور مولانا خلیل احمد انبیٹھوی	مسئلہ نوٹ
۱۶۔ امام احمد رضا قادری اور مولانا رشید احمد گنگوہی	مسئلہ نوٹ
۱۷۔ امام احمد رضا قادری اور مولانا محمد طیب عرب مکی	مسئلہ تقلید
۱۸۔ امام احمد رضا قادری اور پروفیسر البرٹ پورٹا	مسئلہ علم نجوم
۱۹۔ امام احمد رضا قادری اور مولانا عبدالحیٔ لکھنوی	مسئلہ دعا
۲۰۔ امام احمد رضا قادری اور مولانا معین الدین اجمیری	مسئلہ اذان ثانی
۲۱۔ امام احمد رضا قادری اور مولانا محمد علی مونگیری	مسئلہ ندوہ

ج) سیاسی اختلاف

۲۲۔ امام احمد رضا قادری اور مولانا ابوالکلام آزاد	مسئلہ ترک موالات
۲۳۔ امام احمد رضا قادری اور علی برادران	مسئلہ خلافت
۲۴۔ امام احمد رضا قادری اور مولانا عبدالباری فرنگی محلی	مسئلہ تحریک عدم تعاون
۲۵۔ امام احمد رضا قادری اور مسٹر گاندھی	مسئلہ عدم تعاون
۲۶۔ امام احمد رضا قادری اور ڈاکٹر سر محمد اقبال	مسئلہ قومیت

اس وقت تفصیل سے گریز کرتے ہوئے اتنی وضاحت ضرور کرنا چاہوں گا کہ مولانا احمد رضا

قادری کا طریقہ کار ہر اختلافی امور میں افہام وتفہیم کا ہوتا تھا۔ جدل و جدال و مناظرہ بازی سے آپ نے ہمیشہ گریز کیا۔ عدل ومیانہ روی پر گامزن رہتے ہوئے آپ نے افہام وتفہیم کی راہ اختیار کی ہے۔ خواہ وہ مذہبی اختلافات ہوں یا علمی وسیاسی، یہی طریقہ کار آپ نے سب میں اختیار کیا ہے۔ ان تمام اختلافات میں شریعت کا پہلو ہمیشہ آپ کے پیش نظر رہا۔ اگر کسی نے شرعی جرم کا ارتکاب کیا تو آپ نے پہلے اسے متنبہ کیا، وضاحت کا موقع دیا، خط وکتابت، گفت وشنید کے بعد بھی اگر آپ کے حریف اپنے موقف پر اٹل رہے تو پھر آپ نے ان کے خلاف شرعی حکم صادر فرمایا۔ یہ اختلافات علمی ہوتے۔ اس میں ذاتی رنجش اور عناد کا کوئی دخل نہ ہوتا۔ آپ کسی سے محبت بھی کرتے تو اللہ کے واسطے اور مخالفت بھی کرتے تو اللہ کے واسطے۔ اس تعلق سے ایک مراسلہ جسے آپ نے ۱۹؍رمضان المبارک ۱۳۳۹ھ کو مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے نام ارسال کیا، اس میں فرماتے ہیں:

> ''نامی نامہ تشریف لایا۔ ان شاء اللہ العزیز آپ اس فقیر کو ان بندگانِ خدا میں پائیں گے لایحبون الا اللہ ولا یبغضون الا اللہ اب میرے قلب میں وقعت سامی بحمدہٖ تعالیٰ پہلے بھی زائد ہے۔ میرا قلب صاف ہے۔ امید کہ قلب گرامی بھی ایسا ہی صاف ہوگا وما ذالک علی اللہ بعزیز۔'' (۳۱)

حضرت مولانا شاہ امام احمد رضا قادری بلاشبہ عبقری تھے۔ خالق کائنات نے علوم وفنون کا وافر حصہ آپ کو عطا کیا تھا۔ جس کی آپ نے بھرپور اشاعت فرمائی۔ آپ نے اپنی زندگی کا لمحہ لمحہ ہی نہیں اطاعتِ رسول میں گذارا بلکہ تمام مسلمانانِ عالم کو اپنے کردار وعمل سے سنتِ مصطفیٰ کی پیروی کا صحیح شعور بھی بخشا۔ یقیناً آپ کی ذات ستودہ صفات، عشقِ رسول میں جلتی ہوئی ایسی شمع فروزاں تھی جس سے نگر نگر میں عشقِ رسول کا اُجالا پھیلا۔ جس کے سبب عاشقانِ مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثنا اپنے دین و ایمان کی صیانت میں کامیاب ہوسکے۔

فاضل بریلوی کا سلسلۂ عالیہ قادریہ سے والہانہ لگاؤ تھا۔ اس سلسلے کی آپ کو اجازت وخلافت بھی حاصل تھی۔ ۱۲۹۴ھ/۱۸۷۷ء میں آپ اپنے والد ماجد شاہ مفتی محمد نقی علی خاں علیہ الرحمۃ والرضوان اور تاج الفحول حضرت مولانا سیدنا شاہ آل رسول علیہ الرحمہ کی خدمتِ بابرکت میں مارہرہ مطہرہ حاضر ہوئے اور سلسلۂ عالیہ قادریہ میں انہی سے بیعت کا شرف حاصل کیا اور خلافت واجازت کی دولت سے سرفراز ہوئے۔

خانقاہِ مطہرہ کا یہ دستور ہے کہ بیعت کے بعد مریدین کو ریاضت ومجاہدہ کے مصفّٰی ومجلّٰی بنایا جاتا ہے پھر اگر وہ شیخ کے معیار پر کامل اُترتا ہے تو اسے خلافت کی عظیم دولت سے سرفراز کیا جاتا ہے

لیکن جب مولانا احمد رضا خاں قادری بیعت سے مشرف ہوئے تو ساتھ ہی ساتھ آپ کو خلافت بھی دے دی گئی۔ اس پر حضرت مولانا شاہ ابوالحسین نوری میاں نے حضرت شاہ آلِ رسول مارہروی سے دریافت کیا۔

حضور! آپ کے یہاں تو طویل عرصہ بامشقت مجاہدات و ریاضات کے بعد خلافت و اجازت دی جاتی ہے تو اس کی کیا وجہ ہے کہ ان دونوں امام احمد رضا قادری اور ان کے والد ماجد مولانا نقی علی خاں قدس سرہ کو بیعت کرتے ہی خلافت دے دی گئی؟

تو حضرت نے ارشاد فرمایا: میاں صاحب اور لوگ زنگ آلود میلا کچیلا دل لے کر آتے ہیں۔ اس کی صفائی اور پاکیزگی کے لیے مجاہداتِ طویلہ، ریاضاتِ شاقہ کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ دونوں حضرات صاف ستھرا دل لے کر ہمارے پاس آئے۔ ان کو صرف اتصالِ نسبت کی ضرورت تھی اور وہ مرید ہوتے ہی انہیں حاصل ہوگئی۔ مزید انہوں نے یہ بھی فرمایا:

> ''مجھے بڑی فکر تھی کہ روزِ حشر اگر احکم الحاکمین نے سوال فرمایا کہ آلِ رسول تو میرے لیے کیا لایا۔ ہے تو میں کیا پیش کروں گا مگر اللہ کا شکر ہے کہ وہ فکر دور ہو گئی اس وقت میں احمد رضا کو پیش کردوں گا۔'' (۳۲)

سلسلۂ عالیہ قادریہ کی دولت ملنے کے بعد آپ کو جن دیگر سلاسل کی اجازت و خلافت حاصل ہوئی ان کی تعداد تیرہ بتائی جاتی ہے۔ ان کے علاوہ درج ذیل مصافحات کی سندات بھی آپ کو تفویض ہوئی تھیں۔

۱۔ مصافحة الجنيه

۲۔ مصافحة الخضرية

۳۔ مصافحة المعمرية

سلسلۂ قادریہ سے وابستہ ہوتے ہی آپ نے اس کی اشاعت میں چار چاند لگا دیئے۔ برصغیر میں یہ سلسلہ اپنی آب و تاب اور تمام تر رعنائیوں کے ساتھ پھیل گیا۔ لاکھوں بندگانِ خدا سلسلۂ قادریہ میں آپ کے دامن کرم سے وابستہ ہوئے۔ جس کے باعث، آپ کی ذات کے ذریعے یہ سلسلہ ''سلسلۂ قادریہ'' کے نام سے پورے عالم اسلام میں مشہور ہوگیا۔ عوام کم علما و فضلا زیادہ اس سلسلے سے وابستہ ہوئے۔ جن حضرات کو آپ نے سندِ خلافت و اجازت سے سرفراز فرمایا وہ سب اپنے زمانے کے چیدہ و چنیدہ علمائے کرام میں سے تھے۔ آپ کے چند خلفا کا ذکر ذیل میں کیا جارہا ہے:

ا۔ حجۃ الاسلام حضرت مولانا شاہ محمد حامد رضا خاں قادری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ (م۱۹۴۳ء) خلف

اکبر امام اہلِ سُنّت احمد رضا خاں قادری

۲۔ مفتیِ اعظم ہند حضرت مولانا شاہ محمد مصطفےٰ رضا خاں قادری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ (م ۱۹۸۱ء)
خلف اصغر امام احمد رضا خاں قادری

۳۔ صدر الشریعہ حضرت مولانا حکیم مفتی محمد امجد علی اعظمی قادری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ (م ۱۹۴۸ء)

۴۔ ملک العلماء حضرت مولانا شاہ ظفر الدین قادری بہاری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ (م ۱۹۶۲ء)

۵۔ صدر الافاضل حضرت مولانا شاہ محمد نعیم الدین قادری مراد آبادی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ (م ۱۹۴۸ء)

۶۔ حضرت مولانا شاہ محمد برہان الحق جبل پوری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ (م ۱۹۸۴ء)

۷۔ حضرت مولانا شاہ ضیاء الدین احمد مدنی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ (م ۱۹۸۱ء)

تصوف اور اس کے اغراض و مقاصد کا صحیح مفہوم امام احمد رضا قادری کی تحریروں سے سمجھ میں آتا ہے۔ کیوں کہ علم و عمل میں احکامِ شریعت کی پابندی اور اتباعِ سُنّت سے آپ کی پوری زندگی معمور اور اکابر علما و صلحا کے فیضانِ نظر سے زندگی کا ہر گوشہ پُرنور ہے۔ جنہوں نے اپنے کردار و عمل سے تصوف کو بدنام کیا ان نام نہاد صوفیا کے آپ سخت مخالف تھے۔ آپ نے ان کی نہ صرف زبان و قلم سے مذمّت کی بلکہ تصوف کے دامن سے ایسے بدنما دھبوں کو مٹانے کے لیے ہر ممکن جدوجہد بھی فرمائی۔ بزرگانِ دین کے نام مزارات پر جو لوٹ کھسوٹ مچی ہوئی ہے، اسے آپ نے صرف منع ہی نہیں کیا بلکہ سختی سے اس کی مخالفت بھی کی۔ قبر پر سجدہ کرنے کو حرام لکھا اور اس کے تعلق سے الزبدة الزكية لتحريم سجود التحية کے نام سے ایک ضخیم کتاب لکھی۔ آج کل جاہل صوفیا نے حصولِ زر کے لیے جو تباہی خانقاہوں میں مچا رکھی ہے اس کا مسلکِ اربابِ حق سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ آپ نے تصوف کے اسرار و رموز کو ہر طرح بیان فرمایا۔ مزارات پر ہونے والے بدعات و منکرات سے بچنے کی تلقین فرمائی۔ ایک مقام پر بیعت اور طلب کے درمیان ہونے والے فرق کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"طالب ہونے میں صرف طلب فیض ہے اور بیعت کے معنیٰ پورے طور سے بکنا ہے۔
بیعت اس شخص سے کرنا چاہیے جس میں یہ چار شرطیں ہوں ورنہ بیعت جائز نہ ہوگی۔
۱۔ شیخ کا سلسلہ بہ اتصال صحیح حضور اقدس ﷺ تک پہونچتا ہو۔ بیچ میں منقطع نہ ہو کہ منقطع کے ذریعہ اتصال ممکن نہیں۔
۲۔ شیخ سُنّی صحیح العقیدہ ہو بدمذہب نہ ہو۔
۳۔ عالم ہو علمِ فقہ اس کی اپنی ضرورت کے قابل کافی اور لازم کہ عقائد اہل سُنّت سے پورا واقف، کفر و اسلام اور ضلالت و ہدایت کے فرق کا خوب عارف ہو۔

۴۔ فاسق معلن نہ ہو۔" (۳۳)

مولانا احمد رضا قادری چونکہ علم شریعت اور واقفِ اسرارِ طریقت کے ساتھ اعلیٰ درجے کے فقیہ اور محقق تھے۔ طریقت کو شریعت اور شریعت کو طریقت کے آئینے میں دیکھنے اور پرکھنے کا اعلیٰ شعور رکھتے تھے۔ اسی لیے شیخ کے لیے وہی باتیں لازم اور ضروری قرار دیں جس کی طرف اشارہ سیدنا غوث اعظم شیخ عبدالقادر جیلانی علیہ الرحمۃ والرضوان نے الفتح الربانی کی بارہویں مجلس میں کیا تھا۔ سیدنا غوث اعظم فرماتے ہیں:

"اے غلام (صاحبزادہ) کیا تو نے سنا نہیں کہ فقہ حاصل کر اس کے بعد عزلت نشیں بن۔ یعنی اوّل ظاہری فقہ حاصل کر اس کے بعد باطنی فقہ کی تحصیل میں عزلت اختیار کر۔ ظاہری شرع پر عمل کرتا رہ یہاں تک کہ یہ عمل تجھ کو اس علم تک پہنچا دے جو تو نے نہیں سیکھا ہے۔" (۳۴)

اب تک سوانح نگاروں نے جو کچھ لکھا ہے، اس میں امامِ اہلِ سنت فاضل بریلوی کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ ضرور کیا ہے مگر آپ کی زندگی کا وہ پہلو جس کا تعلق براہ راست روحانیت سے ہے اس پر بہت کچھ لکھنا باقی ہے۔ اس تعلق سے ایک مختصر کتاب اور چند مقالات کے علاوہ کچھ دستیاب نہیں۔ سوانح نگاروں اور محققین کو امامِ اہلِ سنت کی زندگی کا اس پہلو سے مطالعہ کرنے اور اسے حیطۂ تحریر میں لانے کی ضرورت ہے۔ خدا کرے صاحبانِ قلم اس طرف متوجہ ہوں۔ کیونکہ اگر آپ کی زندگی کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ روز و شب کا ہر لحہ سنتِ مصطفےٰ علیہ التحیۃ والثناء کے مطابق تھا اور اصل تصوف یہی ہے کہ صوفی کی زندگی سنتِ نبوی کی مکمل آئینہ دار ہو۔ آپ بلاشبہ زہد و اتقاء، راست گوئی، حق بازی، دیانت داری، اور تواضع وانکساری کے عملی پیکر تھے۔ سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی علیہ الرحمہ کی عقیدت و محبت جسم کے رگ و ریشے میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ آپ کے سوانح نگاروں نے لکھا ہے کہ:

"آپ تا دمِ زیست بغداد کی سمت یا مدینہ کی طرف یا کعبہ کی جانب پیر پھیلا کر نہیں بیٹھے۔" (۳۵)

آپ کو یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ تصوف کے راستے پر شریعت کے اصول کی خلاف ورزی کر کے چلنا ممکن نہیں ہے۔ کیوں کہ بقول سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ :

"اقرب الطرق الی اللّٰہ تعالیٰ لزوم قانون العبودیۃ والاستمساک بعروۃ الشریعۃ" (۳۶)

(اللہ عزوجل کی طرف سے سب سے زیادہ قریب راستہ قانونِ بندگی کو لازم پکڑنا

اور شریعت کی گرہ کو تھامے رکھنا ہے۔)

امام احمد رضا قادری، نظری تصوف سے کہیں زیادہ عملی تصوف کے پیکر تھے۔ اس لیے آپ کی تحریروں میں متصوفانہ افکار و خیالات کی جھلک جا بجا نظر آتی ہے۔ ایمان و یقین، تقویٰ و تدین، محاسبۂ نفس، اخلاص و حسنِ نیت اور تجدید و اصلاح میں بلاشبہ آپ نے اپنی زندگی وقف کردی اور عملی تصوف کا ایسا کامل نمونہ پیش کیا جس کی نظیر اس صدی میں مشکل ہی سے پیش کی جاسکتی ہے۔

امام احمد رضا قادری نے اپنی پوری زندگی اشاعتِ دینِ حق میں بسر کی۔ رشد و ہدایت کا محبوب ترین فریضہ انجام دیا۔ ابطالِ باطل اور احقاقِ حق میں کتابیں تصنیف فرمائیں۔ آپ کی تحریریں ایسی محقق، مدلل اور عالمانہ ہوتی ہیں کہ ہر پڑھنے والا آپ کی عظمت اور علمی جلالتِ قدر کا اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکتا ہے۔ بلاتفریق مسلک وعقیدہ جس نے بھی تعصب کی عینک اتار کر آپ کی تحریروں کا براہ راست مطالعہ کیا اس نے کھلے دل سے آپ کی علمی صلاحیتوں کا اعتراف کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اب آپ کی شخصیت پر مختلف پہلوؤں سے برصغیر کی کئی یونی ورسٹیوں میں ہی صرف نہیں بلکہ یورپ کی عصری دانش گاہوں میں اربابِ دین و دانش اور صاحبانِ فکر ونظر، ریسرچ وتحقیق میں سرگرمِ عمل ہیں۔ آپ نے علمی دنیا میں جتنا کام اکیلے کردیا ہے، اتنا کام کرنے کے لیے اس زمانے میں ایک ادارے کی ضرورت ہے۔ ان دینی وعلمی کارناموں کی روشنی میں اگر کہا جائے کہ امام احمد رضا قادری کسی ایک فرد کا نام نہیں بلکہ ایک ادارہ کا نام ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ سچ تو یہ ہے کہ جس طرح مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے باطل قوتوں کا سرفروشانہ مقابلہ کرکے حقانیت وصداقت کا پرچم بلند کیا، ٹھیک اسی طرح پوری چودھویں صدی ہجری میں جب کہ ناموسِ رسالت ﷺ کو ملیامیٹ اور اسے پامال کرنے کی سازشیں رچی گئیں اور عظمتِ توحید کو داغ دار کرنے کے منصوبے بنائے گئے۔ اس موقع پر آپ نے تن تنہا سینہ سپر ہوکر ان باطل قوتوں اور منافقانہ سازشوں کا مقابلہ کیا اور بانگِ دہل یہ اعلان کردیا۔

کلکِ رضا ہے خنجر خونخوار برق بار اعدا سے کہدو خیر منائیں نہ شر کریں (۴۷)

اس اعلانِ عام سے دشمنانِ نبی ﷺ اور گستاخانِ مصطفےٰ ﷺ کی بھاری جمعیت آپ کے پیچھے پڑگئی مگر آپ تن تنہا ان نام نہاد مسلمانوں کے مقابل میدانِ حقانیت وصداقت میں ڈٹے رہے۔ آج مذہب حق وصداقت کی جو صحیح تصویر ہمارے سامنے ہے یہ مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور امام احمد رضا قادری علیہ الرحمۃ والرضوان جیسی نفوسِ قدسیہ کی ان تھک کوششوں اور مجتہدانہ کاوشوں کا ثمرہ ہے۔ ایک نہیں بہت سارے شرعی امور میں ان تمام

۴۔ فاسق معلن نہ ہو۔" (۳۳)

مولانا احمد رضا قادری چونکہ علم شریعت اور واقفِ اسرارِ طریقت کے ساتھ اعلیٰ درجے کے فقیہ اور محقق تھے۔ طریقت کو شریعت اور شریعت کو طریقت کے آئینے میں دیکھنے اور پرکھنے کا اعلیٰ شعور رکھتے تھے۔ اسی لیے شیخ کے لیے وہی باتیں لازم اور ضروری قرار دیں جس کی طرف اشارہ سیدنا غوث اعظم شیخ عبدالقادر جیلانی علیہ الرحمۃ والرضوان نے الفتح الربانی کی بارہویں مجلس میں کیا تھا۔ سیدنا غوث اعظم فرماتے ہیں:

"اے غلام (صاحبزادہ) کیا تو نے سنا نہیں کہ فقہ حاصل کر اس کے بعد عزلت نشیں بن۔ یعنی اوّل ظاہری فقہ حاصل کر اس کے بعد باطنی فقہ کی تحصیل میں عزلت اختیار کر۔ ظاہری شرع پر عمل کرتا رہ یہاں تک کہ یہ عمل تجھ کو اس علم تک پہنچا دے جو تو نے نہیں سیکھا ہے۔" (۳۴)

اب تک سوانح نگاروں نے جو کچھ لکھا ہے، اس میں امامِ اہلِ سنت فاضل بریلوی کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ ضرور کیا ہے مگر آپ کی زندگی کا وہ پہلو جس کا تعلق براہ راست روحانیت سے ہے اس پر بہت کچھ لکھنا باقی ہے۔ اس تعلق سے ایک مختصر کتاب اور چند مقالات کے علاوہ کچھ دستیاب نہیں۔ سوانح نگاروں اور محققین کو امامِ اہلِ سنت کی زندگی کا اس پہلو سے مطالعہ کرنے اور اسے حیطۂ تحریر میں لانے کی ضرورت ہے۔ خدا کرے صاحبانِ قلم اس طرف متوجہ ہوں۔ کیونکہ اگر آپ کی زندگی کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ روز و شب کا ہر لمحہ سنتِ مصطفےٰ علیہ التحیۃ والثناء کے مطابق تھا اور اصل تصوف یہی ہے کہ صوفی کی زندگی سنتِ نبوی کی مکمل آئینہ دار ہو۔ آپ بلا شبہ زہد و اتقاء، راست گوئی، حق بازی، دیانت داری، اور تواضع و انکساری کے عملی پیکر تھے۔ سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی علیہ الرحمہ کی عقیدت و محبت جسم کے رگ و ریشے میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ آپ کے سوانح نگاروں نے لکھا ہے کہ:

"آپ تادمِ زیست بغداد کی سمت یا مدینہ کی طرف یا کعبہ کی جانب پیر پھیلا کر نہیں بیٹھے۔" (۳۵)

آپ کو یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ تصوف کے راستے پر شریعت کے اصول کی خلاف ورزی کر کے چلنا ممکن نہیں ہے۔ کیوں کہ بقول سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ:

"اقرب الطرق الی اللّٰہ تعالیٰ لزوم قانون العبودیۃ والاستمساك بعروۃ الشریعۃ" (۳٦)

(اللہ عز وجل کی طرف سے سب سے زیادہ قریب راستہ قانونِ بندگی کو لازم پکڑنا

اور شریعت کی گرہ کو تھامے رکھنا ہے۔)

امام احمد رضا قادری، نظری تصوف سے کہیں زیادہ عملی تصوف کے پیکر تھے۔ اس لیے آپ کی تحریروں میں متصوفانہ افکار و خیالات کی جھلک جا بجا نظر آتی ہے۔ ایمان و یقین، تقویٰ و تدین، محاسبۂ نفس، اخلاص وحسنِ نیت اور تجدید و اصلاح میں بلاشبہ آپ نے اپنی زندگی وقف کردی اور عملی تصوف کا ایسا کامل نمونہ پیش کیا جس کی نظیر اس صدی میں مشکل ہی سے پیش کی جاسکتی ہے۔

امام احمد رضا قادری نے اپنی پوری زندگی اشاعتِ دینِ حق میں بسر کی۔ رشد و ہدایت کا محبوب ترین فریضہ انجام دیا۔ ابطالِ باطل اور احقاقِ حق میں کتابیں تصنیف فرمائیں۔ آپ کی تحریریں ایسی محقق، مدلل اور عالمانہ ہوتی ہیں کہ ہر پڑھنے والا آپ کی عظمت اور علمی جلالتِ قدر کا اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکتا ہے۔ بلاتفریق مسلک وعقیدہ جس نے بھی تعصب کی عینک اتار کر آپ کی تحریروں کا براہ راست مطالعہ کیا اس نے کھلے دل سے آپ کی علمی صلاحیتوں کا اعتراف کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اب آپ کی شخصیت پر مختلف پہلوؤں سے برصغیر کی کئی یونی ورسٹیوں میں ہی صرف نہیں بلکہ یورپ کی عصری دانش گاہوں میں اربابِ دین و دانش اور صاحبانِ فکر ونظر، ریسرچ وتحقیق میں سرگرمِ عمل ہیں۔ آپ نے علمی دنیا میں جتنا کام اکیلے کردیا ہے، اتنا کام کرنے کے لیے اس زمانے میں ایک ادارے کی ضرورت ہے۔ ان دینی وعلمی کارناموں کی روشنی میں اگر کہا جائے کہ امام احمد رضا قادری کسی ایک فرد کا نام نہیں بلکہ ایک ادارہ کا نام ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ سچ تو یہ ہے کہ جس طرح مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے باطل قوتوں کا سرفروشانہ مقابلہ کرکے حقانیت وصداقت کا پرچم بلند کیا، ٹھیک اسی طرح پوری چودہویں صدی ہجری میں جب کہ ناموسِ رسالت ﷺ کو ملیامیٹ اور اسے پامال کرنے کی سازشیں رچی گئیں اور عظمتِ توحید کو داغ دار کرنے کے منصوبے بنائے گئے۔ اس موقع پر آپ نے تن تنہا سینہ سپر ہوکر ان باطل قوتوں اور منافقانہ سازشوں کا مقابلہ کیا اور بیانگِ دہل یہ اعلان کردیا۔

کلکِ رضا ہے خنجرِ خونخوار برق بار اعدا سے کہہ دو خیر منائیں نہ شر کریں (۳۷)

اس اعلانِ عام سے دشمنانِ نبی ﷺ اور گستاخانِ مصطفےٰ ﷺ کی بھاری جمعیت آپ کے پیچھے پڑگئی مگر آپ تن تنہا ان نام نہاد مسلمانوں کے مقابل میدانِ حقانیت وصداقت میں ڈٹے رہے۔ آج مذہب حق وصداقت کی جو صحیح تصویر ہمارے سامنے ہے یہ مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور امام احمد رضا قادری علیہ الرحمۃ والرضوان جیسی نفوسِ قدسیہ کی ان تھک کوششوں اور مجتہدانہ کاوشوں کا ثمرہ ہے۔ ایک نہیں بہت سارے شرعی امور میں ان تمام

موخر الذکر عبقری شخصیتوں کے خیالات و نظریات ایک دوسرے سے ہم آہنگ تھے۔ تفصیلی معلومات کے لیے ''مجدد الف ثانی اور امام احمد رضا'' نامی کتاب کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ (۳۸)

حضرت مولانا شاہ امام احمد رضا قادری نے اگر ایک طرف شریعت کے مشکل ترین مسائل کی عقدہ کشائی میں دل چسپی لی تو دوسری طرف دانش ورانِ قوم کی بے راہ روی اور معاشرے میں پھیلی ہوئی غیر شرعی رسم و رواج کو مٹانے کے لیے جدوجہد فرمائی اور مصلح قوم و مجددِ دین و ملت کی حیثیت سے تقریری اور تحریری طور پر بدعات و منکرات کی تردید فرمائی اور عوام الناس کو اس سے باز رہنے کا حکم دیا۔ سجدۂ تعظیمی، فخر بالنسب، مراسمِ محرم، تعزیہ داری، عورتوں کے لیے زیارتِ قبور، بدمذہبوں سے رشتے، ہنود کے مذہبی میلوں میں شرکت، قبر پر نماز، فرضی قبریں...... ایسی نہ جانیں کتنی خرافات کی چیزیں ہیں جو مسلم معاشرے میں رائج تھیں اور ہیں۔ آپ نے ان سب کی تردید میں کتابیں لکھیں اور اس کے خلاف فتوائے شرع صادر فرمائے۔ چونکہ آپ کی آنکھوں میں شریعت کا نور اور فقۂ اسلامی کا کیف و سرور تھا اس لیے بدعات و منکرات کے خلاف کئی ایسے اہم فیصلے صادر فرمائے جو اس وقت بھی حق اور اٹل تھے اور آج بھی حق اور اٹل ہیں۔ احکامِ شرع کے صادر کرنے میں مولانا محمد احمد مصباحی صدر المدرسین الجامعۃ الاشرفیہ مبارکپور کے بقول آپ درج ذیل طریقہ اختیار فرماتے ہیں:

> ''نہ تو اس میں افراط ہے کہ بدعت کو شرک، گناہ کو کفر، مکروہ تنزیہی کو حرام یا کم از کم صغیرہ بلا اصرار کو کبیرہ، خفی کو جلی کہدے نہ اس میں تفریط ہے کہ اس میں مکروہ یا خلاف اولیٰ کو غیر مکروہ و مستحب، بدعت کو سُنت، منکر کو معروف یا ناجائز کو جائز کہدے، اعتدال ہے اور اعتدال یہی وہ اصلاح ہے جو فساد افساد سے پاک ہوتی ہے۔'' (۳۹)

امام احمد رضا فاضل بریلوی دینی و مذہبی علوم و معارف کے ساتھ عصری علوم جس کی اُس زمانے میں ضرورت تھی، ان میں انہیں نہ صرف جانکاری تھی بلکہ بعض علوم میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ دنیا بھر سے مختلف قسم کے آئے ہوئے استفتا کا بڑے مدلل انداز میں جواب دیا کرتے تھے۔ جن عصری علوم پر آپ کی گہری نظر تھی ان میں زیجات، ریاضی، ہیئت، توقیت، جبر و مقابلہ، جفر و تکسیر، نجوم، مثلث و لوگارثم وغیرہ کے علوم خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان علوم میں آپ کی بعض تصانیف ایسی ہیں کہ اس دور کے علما و دانش ور جن کی تفہیم سے قاصر ہیں۔ آپ کی اس عبقری صلاحیت کا اعتراف اربابِ دین و دانش اور انصاف پسند مصنفین نے یکساں طور پر کیا ہے۔ ''انوار رضا لاہور'' میں ''امام احمد رضا جدید سائنس کی روشنی میں'' کے مقالہ نگار لکھتے ہیں:

''فتاویٰ رضویہ جس کی ضخیم بارہ جلدیں ہیں اس کی پہلی جلد کا پہلا حصہ ''کتاب الطہارۃ'' کے مطالعہ سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ امام احمد رضا علمِ دین ہی کے بحر بیکراں نہیں بلکہ علمِ ارضیات، مادیات، فلکیات اور علمِ ریاضی و ہندسہ کے بھی اتھاہ سمندر ہیں۔'' (۴۰)

سطور بالا میں جن علوم کا ذکر ہوا ان علوم میں امام احمد رضا قادری نے گراں قدر تصانیف بھی چھوڑی ہیں۔ حاشیہ زیج بہادر خانی، اطائب الاکسیر فی علم التکسیر، حل المعادلات لقوی المعکبات، الموہبات فی المر بعات، کشف العلۃ عن سمت القبلۃ، الاشکال الاقلیدس لنکس اشکال اقلیدس جیسی کئی اہم کتابیں ثبوت میں پیش کی جاسکتی ہیں۔

امام احمد رضا قادری تو جامع العلوم والفنون تھے ہی، ان کے تلامذہ بھی بعض اہم علوم وفنون میں اپنے معاصرین میں یگانہ اور ممتاز تھے۔ انہوں نے ریاضی و ہیئت جیسے مشکل علوم میں بعض جدید افکار ونظریات کے حامل اور عصری درس گاہوں کے ممتاز مفکرین و دانش وران کی جس طرح بخیہ دری کی ہے وہ قابلِ مطالعہ ہے۔ اس موقع سے اگر امام احمد رضا قادری کے تمام ماہرین فکر وفن تلامذہ کا ذکر کیا جائے تو اس کے لیے سیکڑوں صفحات درکار ہوں گے۔ ''مشتے نمونہ از خروارے'' کے طور پر یہاں صرف آپ کے ایک تلمیذ حضرت مولانا محمد ظفر الدین قادری جنہیں علمائے اہلِ سنّت و جماعت کے حلقے میں ''ملک العلما'' سے شہرت حاصل ہے، ذکر کافی ہوگا۔

ایک تاریخی واقعہ ہے کہ علامہ عنایت اللہ مشرقی جنہیں ریاضی و ہیئت میں خصوصی درک حاصل تھا اور جس کی بنیاد پر یورپ کی بعض یونی ورسٹیوں نے انہیں اعزازی ڈگریاں دی تھیں۔ انہوں نے نہ جانے کس زعم میں اعلان کر دیا کہ ''ہندستان کے بعض شہروں کی مساجد کے قبلے غلط ہیں'' اور اس کی وجہ انہوں نے علما کی جہالت بتائی۔ انہوں نے اپنے اس قول کی تائید میں متعدد رسالے بھی شائع کیے۔ ان کے اس بیان سے بہت بڑا فتنہ کھڑا ہوگیا۔ ہندستان کے بیشتر علما، مشرقی کے اس بیان پر چراغ پا ہوگئے اور ہاتھ دھوکر ان کے پیچھے پڑ گئے۔ ان کے رسائل کی تردید میں کئی رسالے شائع کیے مگر ان کی صحت پر ان علما کی تحقیقی کاوشوں کا کوئی اثر نہ ہوا۔ تب امام احمد رضا قادری کے ایک شاگرد مولانا محمد ظفر الدین قادری جنہوں نے ریاضی و ہیئت کی تعلیم اپنے استاد امام احمد رضا قادری سے حاصل کی تھی، میدان میں کود پڑے اور علامہ مشرقی کے نظریات کو کھوکھلا ثابت کیا اور اپنی تحقیقی نگارشات سے یہ بتادیا کہ علما نہیں خود علامہ مشرقی جہالت کے پیکر ہیں اور انہوں نے اپنے جن دلائل کی روشنی میں ہندستان کی بعض مساجد کا قبلہ غلط ثابت کیا تھا، ان دلائل کی ایسی دھجیاں بکھیریں کہ وہ ہوا ہوگئیں۔ ان کے

دلائل سے ہندستان کے تمام علما کا سر فخر سے بلند ہوگیا۔ سمت قبلہ کے تعلق سے علامہ مشرقی کی تردید میں اگرچہ ہندستان کے علما نے کئی رسالے لکھے مگر علامہ مشرقی کے جارح قلم کا منھ توڑ جواب جس نے دیا، وہ امام احمد رضا کے شاگرد مولانا محمد ظفر الدین قادری ہی تھے۔ یہ تو کہیے کہ امام احمد رضا قادری اس وقت دنیائے فانی کو الوداع کہہ چکے تھے، اگر وہ کہیں اس عالم فانی میں ہوتے تو علامہ مشرقی کے ریاضی و ہیئت میں بالغ نظری کی اس طرح درگت بنتی کہ دنیا تماشہ دیکھتی اور وہ لوگ جو حقائق اسلام کے خلاف گل افشانیاں کرتے رہتے ہیں وہ اس قسم کی حرکتیں کرنے کے لیے کئی بار سوچتے۔

مولانا محمد ظفر الدین قادری نے سمتِ قبلہ کے تعلق سے علامہ عنایت اللہ مشرقی کی ہفوات و اباطیل کی تردید میں جو جواب لکھا وہ ماہنامہ معارف دار المصنفین اعظم گڑھ کے جنوری، فروری ۱۹۴۰ء کے شمارے میں شائع ہو چکا ہے۔ اصل بحث تو اسی شمارہ میں دیکھی جا سکتی ہے لیکن اپنی تمہیدی گفتگو میں جس طرح مولانا محمد ظفر الدین قادری نے بحث کا آغاز فرمایا ہے وہ قابل مطالعہ ہے، فرماتے ہیں:

> ''علمی حلقہ میں جناب عنایت اللہ مشرقی کا تعارف سب سے پہلے ان کی تصنیف تذکرہ کے ذریعہ ہوا تھا اب ان کی تحریک خاکساریت نے ان کی شہرت عام کردی ہے۔ وہ یوروپ کی درجنوں ڈگریوں کے مالک اور مختلف فنون میں علم و کمال کے مدعی ہیں۔ اسے دیکھ کر یہ خیال تھا کہ مذہب کے متعلق ان کے معلومات و خیالات کیسے ہی ناقص و غلط ہوں لیکن جدید علوم سے ضرور ان کو واقفیت ہوگی لیکن ان کے بعض علمی مضامین کو دیکھ کر یہ حسنِ ظن بھی غلط ثابت ہوا۔ عرصہ ہوا انہوں نے علم ہیئت کی رو سے ہندستان کی مسجدوں کی سمت قبلہ غلط ہونے پر ایک مضمون لکھا تھا۔ اس کے علاوہ وہ مولویوں کی جہالت کے سلسلے میں وقتاً فوقتاً جن عالمانہ خیال کا اظہار کرتے رہتے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جدید علوم میں بھی ان کا پایہ مذہبی علوم سے کم نہیں ہے۔ اس مضمون میں ریاضی و ہیئت اور تاریخ علوم میں ان کے علمی کمالات پر تبصرہ مقصود ہے۔ مولویوں کی جہالت کے سلسلے میں وہ فرماتے ہیں:
>
> ''آپ کی بلا جانتی ہے کہ مکہ کا رخ دریافت کرنا کسے کہتے ہیں، آپ کو معلوم ہے کہ جغرافیہ کس بیل کا نام ہے، علمِ نجوم کسے کہتے ہیں، دوربین کیا ہوتا ہے، خطِ سرطان کس مرض کو کہتے ہیں، آپ صرف اپنی رات کی باسی روٹیاں گن کر بیچنا نہیں جانتے اور اگر روٹیاں زیادہ ہوں اور آنے پورے نہ بیٹھیں تو حساب میں گھنٹوں غلطی نہیں کرتے بلکہ آنوں کو ان روٹیوں پر بٹھا لیتے ہیں۔ آپ کو اس کا پتا

ہے کہ مغرب اور شمال کے دونوں طرفوں کے درمیان خود مسلمانوں ہی نے ۹۰ درجے قائم کیے۔ ہر درجے کو ۶۰ دقیقہ (منٹ) اور دقیقہ کو ساٹھ ثانیوں (سیکنڈ) میں تقسیم کیا۔'' (۴۱)

عنایت اللہ مشرقی کا یہ وہ جارحانہ بیان تھا جس کو مولانا محمد ظفر الدین قادری نہ برداشت کر سکے اور اس کی تردید میں ایسا جواب لکھا جس سے علامہ مشرقی کے سارے دلائل تارِ عنکبوت ثابت ہوئے۔ آپ کی اس علمی بحث نے کچھ دیر کے لیے علمائے ہند کو حیرت و استعجاب میں ڈال دیا۔ اور آپ کی اس علمی جلالت کا اعتراف انہیں بھی کرنا پڑا جو یہ کہتے اور لکھتے ہوئے نہیں تھکتے تھے کہ بریلوی علما جاہل ہوتے ہیں۔ آج تک انہوں نے کوئی علمی کارنامہ انجام نہیں دیا ہے۔ اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ مسلکِ دیوبند کے مشہور عالم دین مفتی محمد شفیع جب اپنی کتاب جواھر الفقہ (جسے علمائے دیوبند نے عظیم اسلامی انسائیکلو پیڈیا لکھا ہے) لکھ رہے تھے تو اس کتاب میں جہاں انہوں نے سمت قبلہ کا ذکر کیا ہے اپنے موقف کی تائید میں فاضل بہار مولانا محمد ظفر الدین قادری کے اس مقالے کو بھی جسے انہوں نے عنایت اللہ مشرقی کی تردید میں لکھا تھا من وعن شامل کیا ہے۔ یہ مقالہ آج بھی جواھر الفقہ جلد اوّل ناشر مکتبہ تفسیر القرآن عارف کمپنی سید منزل جامع مسجد، دیوبند کے ص ۲۷۷ پر موجود ہے۔

اس اجمالی گفتگو کے بعد اب ابو زہرہ کا وہ تاثر بھی پڑھ لیں جو علمائے اہلِ سنت و جماعت کے کردار و عمل کا مکمل آئینہ دار ہے، لکھتے ہیں:

''یہ اعلیٰ حضرت کی علمی فضیلت کہی جائے گی جن کے شاگرد کی تحقیقات کو دارالعلوم دیوبند کے مفتی اور استاذ اپنی کتاب میں بڑے فخر اور ناز کے ساتھ نقل کر رہے ہیں اور دوسری طرف ہم اہلِ سُنّت کی کم ہمتی دیکھیے کہ اب تک ہم اپنے اکابر کے کارناموں کو کما حقہ دنیا کے سامنے لا بھی نہ سکے۔'' (۴۲)

تاریخ گوئی بہت مشکل فن ہے مگر امام احمد رضا قادری کو اس فن میں بھی اسی طرح کمال حاصل تھا جس طرح دوسرے علوم و فنون میں تھا، عربی شعرا کے یہاں اس قسم کا اہتمام کم ملتا ہے۔ امام احمد رضا قادری نے تینوں زبانوں میں کثرت سے تاریخیں نکالی ہیں اور مختلف صنعتوں میں نکالی ہیں۔ مولانا احمد رضا قادری میں ایک خوبی یہ بھی تھی کہ موقع و محل کی مناسبت سے بغیر دوات و قلم کا سہارا لیے برجستہ تاریخی مادّے نکال دیا کرتے تھے۔ کبھی آپ کا نکالا ہوا تاریخی مادہ غلط نہیں ثابت ہوا۔ آپ کی بیشتر کتابوں اور رسائل کے اکثر نام تاریخی ہیں، جو بغیر کسی صراحت کے کتابوں کے مباحث پر چسپاں ہوتے ہیں۔ تعارف امام احمد رضا کے مصنف لکھتے ہیں:

''فن تاریخ گوئی میں آپ کو نہایت کمال حاصل تھا جو کتاب بھی لکھتے اس کے نام سے کتاب لکھنے کا مقصد بھی سامنے آجاتا اور تاریخ تصنیف بھی نکل آتی''(۴۳)

کئی دفعہ تو ایسا بھی ہوا ہے کہ امام احمد رضا قادری نے ایک ہی موقع کے دو چار نہیں بلکہ دس دس تاریخی مادّے نکالے ہیں۔ کئی شعرا کے دواوین کی تاریخیں انہوں نے ہی نکالی ہیں لوگ اکثر فرمایش کرتے کہ نومولود بچوں کے تاریخی نام ارسال فرمائیں۔ بعض اوقات ایسے وظائف بھی پڑھنے کو بتا دیتے کہ وظیفے کے اعداد اور وظیفہ پڑھنے والے کے نام کے اعداد برابر ہوتے۔ جناب ایوب علی رضوی صاحب نے ایک مرتبہ ان سے وظیفہ پڑھنے کے لیے دریافت کیا۔ انہوں نے ''یا لطیف'' کا ورد بتایا۔ لطیف اور ایوب علی دونوں کے اعداد ۱۲۹ ہی آتے ہیں یہ کوئی اتفاقیہ بات نہ تھی بلکہ اکثر ایسا ہی ہوا کرتا تھا۔

اپنے والد گرامی حضرت عظیم المرتبت مولانا شاہ محمد نقی علی خاں قادری کی کتاب مستطاب "سرور القلوب فی ذکر المحبوب" کا قطعۂ تاریخ لکھا، جس میں انتہائی حسن و خوب صورتی کے ساتھ الفاظ تحریر اور نقطوں کی تعریف کی ہے اور آخر میں جس حسین انداز سے تاریخ نکالی ہے، وہ انہی کا حصہ ہے۔ فرماتے ہیں:

میرے والد نے جب کیا تصنیف — یہ رسالہ بوصف شاہ ہدیٰ
جس کا ہر صفحہ تختۂ فردوس — ہر ورق برگ سدرہ وطوبیٰ
گیسوئے حور سواد حروف — مردم چشم حور ہر نقطہ
یا قلم اس کا ابر نیساں ہے — ہر ورق اس کا علم کا دریا
ہر سطر رشک موج صافی ہے — دائروں کو صدف لکھوں تو بجا
نقطے جن کے ہیں گوہر شہوار — قیمت ان کی ہے جنت الماویٰ
سال تالیف میں رضا نے کہا — وصف خلق رسول امی کیا
(۱۲۸۸ھ) (۴۴)

امام احمد رضا قادری نے کافی مشکل صنعت میں تاریخی مادے نکالے ہیں۔ ذیل کے قطعہ میں ایک لفظ کو تین گنا کرنے سے مادہ برآمد ہو جاتا ہے۔ اس پورے قطعہ میں الفاظ کے زیر و بم کے ساتھ معنوی ربط بھی خوب ہے۔

چو لامع شد کبدر او تجلی — مہ طیبہ علیہ صلی
دہانش مشرق وحی مبیں شد — بر آمد ازو ماہ مجلی

ہجوم آوردہ اند جلوہ گاہش نجوم آں واصحاب معلّی
چوں ایں مہر وماہ انجم ہم شد رضا گوید سہ بالا شد تجلّی

(۴۴۴ +۳ = ۱۳۰۲ھ)(۴۵)

اس قطعہ میں لفظ تجلّی کے اعداد تین بار جوڑنے سے سنہ مطلوب ۱۳۰۲ھ برآمد ہوتا ہے۔

امام احمد رضا قادری نے دواوین کے لیے تاریخی قطعات لکھے ہیں اور اپنے بزرگوں، احباب، متعلقین اور متعارفین کے وصال کی تاریخیں بھی نکالی ہیں اور اس تاریخ کے استخراج میں کئی صنعتوں سے کام لیا ہے۔آپ نے اپنے مرشد کی تاریخ وصال تواریخ الاولیا (۱۲۹۶ھ) اور رضی اللّٰہ والمحبوب (۱۳۹۶ھ) سے نکالی ہے۔

امام احمد رضا قادری نے بعض اہم شخصیتوں کے تاریخی ماڈے نکالنے میں ولادت و وفات دونوں کا اہتمام کیا ہے۔ایسی اہم شخصیتوں میں آپ کے والد ماجد کا نام لیا جاسکتا ہے جیسے:

تاریخ ولادت

افضل سباق العلما (۱۲۴۶ھ)

اقدم حذاق الکرما (۱۲۴۶ھ)

تاریخ وفات

کان نهایة جمع العظما (۱۲۹۷ھ)

خاتم اجلة الفقها (۱۲۹۷ھ)

زبر و بینہ تاریخ گوئی کی ایک مشکل صنعت ہے۔اس میں حروف کے بجائے اسمائے حروف سے اعداد نکالے جاتے ہیں الملفوظ کی تاریخ زبر و بینہ میں نکالی گئی ہے۔امام احمد رضا قادری فرماتے ہیں:

میرے ملفوظ کیے کچھ محفوظ مصطفیٰ مصطفیٰ کا ہو ملحوظ
نام تاریخی اس کا رکھتا ہوں زبر و بینہ میں ''الملفوظ'' (۴۷)

آپ کے یہ اشعار الملفوظ کے قدیم نسخوں میں جلد اوّل کے آخر میں پائے جاتے ہیں۔ مولانا احمد رضا قادری کے صرف دو سال یعنی ۱۳۳۸ھ تا ۱۳۴۰ھ تک کے ملفوظات حضور مفتی اعظم ہند مولانا مصطفیٰ رضا قادری علیہ الرحمۃ والرضوان نے ترتیب دیئے ہیں جو عالی جناب توسل حسین کے اہتمام میں رضوی کتب خانہ بریلی سے ۱۹۳۳ء میں شائع ہوئے۔اس کے صفحہ ۱۲۴ پر یہ اشعار درج ہیں۔ "الملفوظ" کے اعداد اسما کے حروف سے اس طرح نکالے جائیں گے۔

ا۔ الف (۱۱۱)

۲۔ لام (۷۱)

۳۔ میم (۹۰)

۴۔ لام (۷۱)

۵۔ فا (۸۱)

۶۔ واو (۱۳)

۷۔ ظا (۹۰۱)

الملفوظ (۱۳۳۸ھ)

امام احمد رضا قادری نے دوسرے علما، مشائخ اور احباب و متعلقین کی تواریخ وفات نکالی ہی تھیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ آپ نے خود اپنی تاریخ ولادت و وفات دونوں کا استخراج بھی قرآنی آیات سے کیا ہے۔

اولئك كتب فی قلوبهم الايمان وايدهم روح منه (۴۸)

(یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان نقش فرمایا ہے اور اپنی طرف سے روح القدس کے ذریعہ مدد فرمائی ہے)

اس آیت کے کل اعداد ۱۲۷۲ ہیں، جو امام احمد رضا قادری کا سنِ ولادت ہے۔

۲۵ رصفر المظفر ۱۳۴۰ھ / ۲۹ را کتوبر ۱۹۲۱ء کو آپ کا انتقال ہوا۔ "شیخ الاسلام والمسلمین" مادۂ تاریخ وفات ہے۔ خود امام احمد رضا قادری اپنی تاریخ وصال کی تقریباً پانچ ماہ قبل خبر دیتے ہوئے اپنے قلم حق رقم سے یہ آیت کریمہ تحریر فرمائی۔

ويطاف عليهم بآنية من فضة واكواب (۱۳۴۰ھ) (۴۹)

(ان پر دورہ ہوگا چاندی کے پیالوں اور جاموں کا)

بڑے فرزند حجۃ الاسلام حضرت مولانا حامد رضا خاں قادری علیہ الرحمۃ والرضوان نے جنازہ کی نماز پڑھائی، محلہ سوداگران بریلی شریف میں مدفون ہوئے۔ ہر سال ۲۵ رصفر المظفر کو آپ کا عرس بریلی کی سرزمین پر بڑے تزک واحتشام کے ساتھ منایا جاتا ہے، جس میں ہند و بیرون ہند کے لاکھوں فرزندان توحید شریک ہو کر علمائے کرام کے مواعظ حسنہ اور آپ کے روحانی فیوض و برکات سے استفادہ کرتے ہیں۔

0000000

مصادر وماخذ

۱۔ حیات اعلیٰ حضرت، ظفر الدین قادری، جلد اول ص ۲ مرکزی مجلس رضا لاہور ۱۹۹۲ء

۲۔ انوار رضا (امام احمد رضا نمبر) ص ۳۳۵ لاہور ۱۳۹۷ھ

۳۔ تذکرہ علمائے ہند، رحمان علی ص ۱۶ لکھنو ۱۹۱۴ء

۴۔ تذکرہ علمائے اہلِ سُنّت، محمود احمد ص ۴۳، کانپور ۱۳۹۱ھ

۵۔ الاعلام بمن فی تاریخ الهند من الأعلام (نزهة الخواطر) عبدالحیٔ رائے بریلوی جلد ۸ ص ۵۲ لکھنؤ ۱۹۹۱ء

۶۔ الاعلام جلد ۸ ص ۵۲

۷۔ الدولة المکیة، احمد رضا خاں ص ۱۷ مطبوعہ بریلی

۸۔ الاعلام جلد ۸ ص ۵۲

۹۔ الاعلام جلد ۸ ص ۵۲

۱۰۔ فقیہ اسلام، حسن رضا خاں ص ۱۲ پٹنہ ۱۹۸۱ء

۱۱۔ معارف رضا ص ۲۶ کراچی پاکستان ۱۴۱۶ھ شمارہ نمبر ۱۵

۱۲۔ پیغاماتِ رضا حصہ سوم ص ۱۰ دائرۃ المصنفین اردو بازار لاہور

۱۳۔ ماہنامہ حجاز جدید دہلی ص ۷ ستمبر ۱۹۹۲ء

۱۴۔ سوانح اعلیٰ حضرت، بدر الدین احمد ص ۳۷۳ بار پنجم دھنباد بہار ۱۹۸۴ء

۱۵۔ محاسن کنز الایمان، شیر محمد خاں اعوان ص ۲۷ لاہور

۱۶۔ پیغامِ رضا (امام احمد رضا نمبر) ص ۱۹۱ دہلی ۱۹۹۶ء

۱۷۔ حدائق بخشش، احمد رضا خاں ص ۱۳۴ رضا اکیڈمی ممبئی ۱۹۹۷ء

۱۸۔ حدائق بخشش ص ۱۳۵

۱۹۔ حدائق بخشش ص ۳۶

۲۰۔ حدائق بخشش ص ۲۱

۲۱۔ حدائق بخشش ص ۴

۲۲۔ معارف رضا ص ۱۱۴ کراچی پاکستان ۱۹۹۴ء شمارہ نمبر ۱۶

۲۳۔ حدائق بخشش ص ۱۵۳

۲۴۔ حدائق بخشش ص ۷

۲۵۔ حدائق بخشش ص ۱۲،۱۱
۲۶۔ حدائق بخشش ص ۲۰
۲۷۔ جریدہ صوت الشرق قاہرہ شمارہ فروری ۱۹۷۰ء
۲۸۔ کتاب التذکاری ، حازم محفوظ ص ۷۷ دار الاتحاد ، قاہرہ ۱۹۹۹ء
۲۹۔ امام احمد رضا اور رد بدعات و منکرات ، لیس اختر مصباحی ص ۸۸ المجمع الاسلامی مبارکپور ۱۹۸۵
۳۰۔ مکتوبات امام احمد رضا مع تنقیدات و تعاقبات ، محمد مسعود احمد ص ۵۶ لاہور ۱۹۸۸
۳۱۔ حاشیہ تذکرہ نوری ص ۴۰ بحوالہ تذکرہ مشائخ قادریہ رضویہ ص ۳۹۹ دہلی
۳۲۔ حاشیہ تذکرہ نوری ص ۴۰ بحوالہ تذکرہ مشائخ قادریہ رضویہ ص ۳۹۹ دہلی
۳۳۔ امام احمد رضا اور تصوف ، محمد احمد مصباحی ص ۱۱۰ المجمع الاسلامی مبارکپور ۱۹۸۸ء
۳۴۔ الفتح الربانی (تحفہ سبحانی) شیخ عبد القادر جیلانی ص ۶۳ مسلم پریس دہلی ۱۹۰۱ء
۳۵۔ افکار رضا ، قمر الحسن بستوی ص ۸۶ دہلی ۱۹۹۳ء
۳۶۔ مقال عرفا باعزاز شرع وعلما ، احمد رضا خاں ص ۱۶۲ مطبوعہ ۱۳۲۷ھ
۳۷۔ حدائق بخشش ص ۵۹
۳۸۔ مجدد الف ثانی اور امام احمد رضا ، غلام مصطفےٰ مجددی مرکزی مجلس رضا لاہور ۱۹۹۶
۳۹۔ امام احمد رضا اور رد بدعات و منکرات (تقریب) ص ۴۳
۴۰۔ انوار رضا (امام احمد رضا نمبر) ص ۳۰۹ لاہور
۴۱۔ معارف ، اعظم گڑھ ص ۲۵ جنوری ۱۹۴۰ء
۴۲۔ یادگارِ رضا ص ۸۸ رضا اکیڈمی ۲۰۰۷ء
۴۳۔ تعارفِ امام احمد رضا ص ۱۹ الہٰ آباد ۱۹۸۳ء
۴۴۔ افکارِ رضا ممبئی جلد ۳ ص ۱۶ اکتوبر تا دسمبر ۱۹۹۷ء
۴۵۔ افکارِ رضا ممبئی جلد ۳ ص ۱۷ اکتوبر تا دسمبر ۱۹۹۷ء
۴۶۔ افکارِ رضا ممبئی جلد ۳ ص ۲۵ اکتوبر تا دسمبر ۱۹۹۷
۴۷۔ افکارِ رضا ممبئی جلد ۳ ص ۲۵ اکتوبر تا دسمبر ۱۹۹۷ء
۴۸۔ معارف ، اعظم گڑھ جلد ۴۵ ص ۲۵ جنوری تا جون ۱۹۴۰ء
۴۹۔ سوانح اعلیٰ حضرت ، بدر الدین احمد ص ۳۷۷ رضا اکیڈمی ۲۰۰۲ء

⊗⊗⊗⊗⊗⊗

فیضانِ تصوّف اور امام احمد رضا

از ڈاکٹر غلام مصطفیٰ نجم القادری

صوفی باصفا امام احمد رضا اتنی خوبیوں کے جامع اور اتنے اوصاف کے حامل تھے کہ کوشش بسیار کے باوجود ان سب کا تعین بہت مشکل ہے اور کمال یہ کہ ہر خوبی ایسی درخشاں و تاباں کہ ان میں جس پر بھی نظر پڑ جائے تو دوسری طرف رخ کرنے کی نوبت نہیں آتی، بلکہ وہ خوبی دوسری خوبیوں کی طرف متوجہ ہونے کی مہلت ہی نہیں دیتی۔ ان کے اوصاف میں ایک اہم وصف یہ بھی ہے کہ وہ اپنے دَور کے صوفی ہی نہیں صوفی گر ہیں۔ بہت سے حضرات صرف ان کی صحبت و رفاقت پاکر، ان کی مجلس کی نشست و برخاست کی برکت سے تصوف کے اعلیٰ درجے پر پہنچ گئے۔ جس طرح وہ اپنی مجلس کے حاضر باشوں کو احکامِ شریعت سے آشنا کرتے رہتے تھے، اسی طرح وہ اپنی مجلس میں طریقت کی پیچیدہ گتھیاں بھی سلجھاتے۔ تصوف کی زلفِ پریشاں سنوارتے اور روحانی اقدار کے چہرے پر غازہ بھی ملتے رہتے۔ لیکن ان کے کارِ تجدید و احیاے دین کا رنگ ایسا چوکھا، نمایاں اور قوس قزحی تھا کہ دوسرے اوصاف کے رنگ اس میں چھپ کر رہ گئے۔ یا یہ کہہ لیجیے کہ نام و نمود اور زیبائش و نمائش کی آلائش کے پیش نظر اپنے قالب پر مجدّدی دبیز چادر تان کر خود ہی سارے اوصاف کو اس میں چھپا لیا تھا۔ تاہم ان کے اوصاف کی روشنی، ان کی خوبیوں کی خوشبو اور ان کے کمالات کی جلوہ ریزی کبھی بذریعہ قلم، کبھی بواسطہ گفتگو، کبھی بوسیلہ خطاب اور کبھی بغرض اصلاح و ہدایت آشکارا ہو ہو کر انجمن آرائی کرتی رہتی تھیں۔ امام ربانی، حضور مجدّد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ مجدّد کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:

"مجدّد وہ ہے کہ اس کے زمانے میں اُمتوں کو جتنے فیض پہنچتے ہیں وہ اس کے واسطے سے پہنچتے ہیں۔ اگرچہ اس وقت اقطاب اور اوتاد ہوں، ابدال و نجبا ہوں۔"

(مکتوباتِ امام ربانی، فارسی، صفحہ ۱۵، جلد ثانی)

معلوم ہوا اپنے دور کے مجدّد کی طرف رجوع کیے بغیر کسی بڑائی و بزرگی، منصب و مرتبہ کا کوئی تصور ہی نہیں ہے۔ مجدّد ہی فیض بخش عالم ہوتا ہے، سوچنے کی بات ہے بحیثیت مجدّد کیا عوام، کیا علما، کیا صوفیا کیا فضلا، جو سب کا مقتدا ہو وہ طریقت و تصوف میں کتنے اونچے مقام پر ہوگا؟ مگر اس کا جلوۂ تصوف آج بھی اتنا عام نہیں جتنا ہونا چاہیے۔ ضرورت ہے کہ ان کا وصف تصوف عالم آشکار ہو تا کہ اس رخ روشن سے بھی لوگ اپنی حیات کا رخ متعین اور خیالات کا قبلہ درست کر سکیں۔

تصوف کیا ہے؟ تصوف کی حقیقت کیا ہے، صوفی کون ہے اور صوفیت کے ضوابط کیا ہیں؟ جو نظر آتا ہے وہی حقیقت ہے یا حقیقت بناوٹ میں گم ہے؟ صوفیا ہی کے آثار و آرا کی روشنی میں پہلے ان اُمور کی وضاحت ضروری ہے۔ سلطان المحققین حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیری رضی اللہ عنہ تحریر فرماتے ہیں

''زمانے میں جو خرابیاں پیدا ہوگئی ہیں ان کی وجہ سے زمانے والوں کی آنکھوں میں صوفیوں کا بُرا حال دکھائی دیتا ہے، اُن کی پاک دامنی پر دھبّے لگانے کا خاص سبب یہی ہے کہ خود صوفیوں نے اپنی روش بدل دی ہے اور خلافِ اصول عادتوں میں مبتلا ہوکر تصوف کو بدنام کر دیا ہے، ورنہ تصوف تو دین و ایمان کی جان ہے۔''

(مکتوباتِ صدی، ص ۱۷۱)

حضرت داتا گنج بخش علی ہجویری فرماتے ہیں:

''صفائے باطن کے لیے کچھ اصول و فروع ہیں، ایک اصل تو یہ ہے کہ دل کو غیر سے خالی کرے۔ اور فروع یہ ہے کہ مکر و فریب سے بھرپور دنیا کو دل سے خالی کردے۔
''

(کشف المحجوب، ص ۶۴)

اب تک یہ فیصلہ نہ ہوسکا کہ صوفی مشتق کس سے ہے۔ ایک جماعت کہتی ہے کہ صوفی کو صوفی اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ صوف (پشمینہ) کے کپڑے پہنتے ہیں۔ بعض یہ کہتے ہیں وہ اوّل صف میں ہوتے ہیں، اس لیے انہیں صوفی کہتے ہیں۔ ایک گروہ کا خیال یہ ہے کہ یہ اصحابِ صُفّہ کی نیابت کرتے ہیں۔ بعض کا کہنا یہ ہے کہ یہ نام 'صفا' سے ماخوذ ہے۔ آپ غور کریں تو ہر وجہ تسمیہ میں بکثرت لطائف موجود ہیں۔ خلاصے کے طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ چوں کہ صوفیائے کرام اپنے اخلاق و معاملات کو مہذب و پاکیزہ بنا کر، طبعی آفتوں سے نفرت کرتے ہیں، اس بنا پر انہیں صوفی کہا جاتا ہے۔ حضرت شیخ علی ہجویری اس امر کی نقاب کشائی یوں کرتے ہیں:

''جملہ مشائخ طریقت کا اس پر اجماع ہے کہ بندہ جب مقامات کی بندشوں سے آزاد ہو جاتا ہے اور احوال کی کدورتوں سے خالی ہوکر، تغیر و تلون کے حدود سے نکل جاتا ہے، تو وہ تمام احوالِ محمودہ سے متصف ہو جاتا ہے۔ اور تمام بشری کدورتوں سے نجات پا جاتا ہے، اس لیے اولیائے کاملین اور عرفائے محققین کا نام صوفی ہے۔

ایک بزرگ فرماتے ہیں من صفا الحب فهو صاف ومن صفا الحبيب فهو

صوفی ''جس کی محبت پاک وصاف ہے، وہ صافی ہے اور جو دوست میں مستغرق ہو کر اس کے غیر سے بری ہو وہ صوفی ہے۔'' (ایضاً،ص ۶۸)

تصوف کے ماننے والوں، اس کے آداب پر عمل کرنے والوں یعنی خود حضراتِ صوفیا نے صوفی کی تین قسمیں بیان فرمائی ہیں۔ ایک کو صوفی، دوسرے کو متصوف اور تیسرے کو مستصوف کہتے ہیں۔ (۱) صوفی وہ ہے جو خود کو فنا کر کے حق کے ساتھ مل جاتا ہے۔ (۲) متصوف، وہ ہے جو ریاضت و مجاہدہ کے ذریعے اس مقام کو طلب کرے۔ (۳) مستصوف، وہ ہے جو دنیاوی عزت و منزلت کی خاطر خود کو ایسا بنالے۔ گویا صوفی صاحبِ وصول ہے، متصوف صاحبِ اُصول اور مستصوف صاحبِ نقول وفضول۔

تصوف کا بانی کون ہے؟ اور صوفیِ اوّل کے لقب سے کون ملقب ہے؟ اس سلسلے میں سلطان المحققین، مخدوم جہاں، حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیری رحمۃ اللہ علیہ، قرآن و حدیث کے اشارات و رموز کی روشنی میں اس راز کو یوں واشگاف فرماتے ہیں:

''اگر تصوف کی ابتدا پر غور کرو گے تو اس کو حضرت آدم علیہ السلام کے وقت ہی سے پاؤ گے۔ اس عالم میں پہلے صوفی حضرت آدم علیہ السلام ہیں۔ ان کو حق تعالیٰ نے خاک سے پیدا کیا، پھر اجتبا اور اصطفا کے مقام پر پہنچایا، خلافت عطا فرمائی، پھر صوفی بنایا...... وہ مرقع جو دریوزہ گری کے بعد پہنایا گیا تھا آپ اس کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ آخر عمر میں وہ مرقع شیث علیہ السلام کو آپ نے پہنادیا اور خلافت بھی سپرد کردی۔ چنانچہ نسلاً بعد نسلٍ اسی طریقے پر عمل ہوتا رہا اور تصوف کی دولت ایک نبی سے دوسرے نبی کو یکے بعد دیگرے منتقل ہوتی رہی۔ صوفیِ صافی اوّل حضرت آدم علیہ السلام کی خلوت در انجمن کے لیے خانۂ کعبہ کی بنیاد پڑی، یعنی دنیا میں پہلی خانقاہ کعبۂ مکرم ہے۔...... حضرت موسیٰ وعیسیٰ علیہما السلام نے بیت المقدس کو خانقاہ بنایا۔ چنانچہ اور ملکوں میں بھی خانقاہیں بنائی گئیں، جن میں عبادتیں کی جاتیں اور اسرارِ الٰہی کا بیان ہوا کرتا۔ پھر جب دورِ مبارک حضرت سیدنا ونبینا، سلطان الاولیا والانبیا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم آ پہنچا، ...... حضور نے اسی خانقاہِ کعبہ کا قصد فرمایا، علاوہ اس کے خود مسجدِ نبوی میں ایک گوشہ متعین کردیا۔ اصحاب میں وہ گروہ جو سالکانِ راہِ طریقت بعنوان خاص تھا اس سے وہیں راز کی باتیں ہوا کرتیں۔ اس جماعتِ خاص صوفیہ کے لوگ قریب قریب ستر ۷۰ اشخاص تھے۔ تصوف وطریقت جس کی ابتدا حضرت آدم علیہ السلام سے ہوئی، اس کا تتمہ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ

وسلم نے فرمایا۔"

(مکتوباتِ صدی، ص ۱۷۳ تا ۱۷۵ ملخصاً)

آج تو ایک طرح سے ہر بوالہوس نے تصوف پرستی شروع کردی ہے۔ جس کو دیکھیے وہی اپنے آپ کو صوفی کہتے اور کہلواتے نظر آتے ہیں۔ رازدارِ شریعت و طریقت حضرت مخدوم جہاں فرماتے ہیں:

"تم اس بات کا یقین کرلو کہ جو شخص طریقت کی راہ کا طلب گار ہو، اس کے پاس شریعت کی پونجی ہونا ضرور چاہیے، تاکہ قصبۂ شریعت سے شہرِ طریقت میں پہنچے، طریقت میں جہاں قدم درست ہوا، ملک حقیقت میں پہنچ جانا آسان ہے۔ جس بے علم نے شریعت ہی کو نہیں سمجھا ہے، وہ طریقت کو کیا پہچانے گا اور جب طریقت ہی سے شناسائی نہیں ہے تو حقیقت تک کیوں کر رسائی ہوسکتی ہے۔ اسی لیے بے علم و معرفت اور ناواقفِ شریعت کو اس راہ میں چلنے کی اجازت نہیں۔ اگر اپنی خود رائی سے کوئی ایسا کرے گا تو بھٹک کر رہ جائے گا اور اسی چکّر میں اس کی جان بھی چلی جائے گی۔ بالکل ناممکن ہے کہ وہ منزلِ مقصود تک پہنچ سکے۔ اگر بفرضِ محال کورانہ و جاہلانہ مجاہدہ و ریاضت سے کچھ نظر آ گیا، تو اتنا غرور پیدا ہوگا، جہالت بڑھے گی اور حماقت تیز ہوگی کہ ایمان تک رخصت ہوجائے گا اور شیطان کے پھندے میں پھنسا رہے گا۔ تم اس بات کا یقینِ کامل کرلو کہ اللہ تعالیٰ کسی جاہل کو ولی نہیں بناتا، ما اتخذ اللہ ولیاً جاھلاً، مشائخ کا قول ہے۔ اور قرآن شریف میں بھی اس طرف اشارہ ہے، ولم یکن لہ ولی من الذل، خداوند جل و علا جاہل کو دوست کبھی نہیں بناتا۔ حقیقت یہ ہے کہ جہالت سے بڑھ کر کوئی چیز ذلیل نہیں، یہ ساری ذلتوں کی جڑ ہے۔ اللہ تعالیٰ کی راہ میں قدم رکھنا دل لگی نہیں ہے۔ بزرگوں کا قول ہے کہ سالک کو جب بارہ چیزوں کا علم ہوتا ہے تو وہ اس راہ کے لائق سمجھا جاتا ہے۔ (۱) علمِ توحید (۲) علمِ رسالت (۳) علمِ معاملت (۴) علمِ معرفت (۵) علمِ حالت (۶) علمِ مکاشفت (۷) علمِ مشاہدت (۸) علمِ خطاب (۹) علمِ سماع (۱۰) علمِ وجد (۱۱) علمِ معرفتِ روح (۱۲) علمِ معرفتِ نفس۔ پھر ان علوم کے اصول و فروع کی واقفیت بھی ضروری ہے۔"

(مکتوبات صدی ص ۱۷۶، ۱۷۷)

ظاہر جب علم ہی نہیں ہے تو وہ حلال و حرام کو کیسے جان پائے گا، اور جب تک جانے گا نہیں حلال کا التزام اور حرام سے اجتناب کیسے کر پائے گا۔ اور جب خود نہیں کر پائے گا تو اپنے مریدوں سے

کیسے کرا پائے گا۔ اور جب تک یہ نہیں ہوگا تقویٰ کا تصور بھی نہیں ہو پائے گا۔ اس لیے کے تقویٰ حلال پر چلنے اور حرام سے بچنے ہی کا نام ہے۔ اور جب تقویٰ نہیں تو ولایت نہیں۔ اسی لیے تمام صوفیاے کرام اور علماے اسلام نے علم پر زور دیا، اور فرمایا اللہ تعالیٰ کسی جاہل کو ولی نہیں بناتا، مگر ہاں جسے ولی بنانا چاہتا ہے اسے جاہل نہیں چھوڑتا۔ علم چاہے کسبی ہو یا وہبی مگر ہو۔ علم نور ہے، جب یہ رہے گا تو حیات اور معاملاتِ حیات کا ہر گوشہ منور و تاباں رہے گا۔ اسی لیے شرائطِ مرشد کی تیسری شق ذکر کرتے ہوئے اعلیٰ حضرت تحریر فرماتے ہیں:

> ''علمِ فقہ اس کی اپنی ضرورت کے قابل کافی اور لازم کہ عقایدِ اہلِ سُنّت سے پورا واقف، کفر و اسلام، ضلالت و ہدایت کے فرق کا خوب عارف ہو، ورنہ آج بدمذہب نہیں، کل ہو جائے گا۔''

(فتاوی افریقہ، امام احمد رضا)

جس خوش نصیب میں علم بھی ہو اور آدابِ شریعت کا لحاظ و خیال بھی اس کا قلب معرفتِ الٰہی کے انوار سے جگمگا اُٹھے گا۔ حضرت ابو القاسم قشیری رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسالۂ مبارکہ ''قشیریہ'' میں ص ۳۰ پر سیدی ابو العباس احمد، محمد القردی معاصر سیدنا جنید بغدادی رضی اللہ عنہ کا فرمان نقل کرتے ہیں:

> ''من الزم نفسه آداب الشريعة نور الله قلبه بنور المعرفة ولا مقام اشرف من مقام متابعة الحبيب في اوامره وافعاله واخلاقه'' جو اپنے اوپر آدابِ شریعت لازم کرے اللہ تعالیٰ اس کے دل کو نورِ معرفت سے روشن کر دے گا، اور کوئی مقام اس مقام سے بڑھ کر معظم نہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام، افعال، عادات سب میں حضور کی پیروی کی جائے۔''

(مقام عرفاء، ص ۲۰)

یہ تصور باطل ہے کہ علما اور صوفیا دو الگ اور بے تعلق جماعتیں ہیں۔ علماے ربانیین ہی صوفیاے کاملین ہیں۔ صوفیا اور علما میں کبھی بُعد نہیں رہا، خانقاہوں کی زینت سجّادہ حضرات ہی اپنے وقتوں میں مدارس کے فخر المدرسین بھی تھے، دار الاشاعت کے عمدۃ المؤلفین بھی اور خانقاہ کے زبدۃ العارفین بھی۔ آج کلّیات و جامعات کی کثرت کے باوجود انسان کو انسان بننا میسر نہیں۔ یہ سب کچھ خانقاہی نظام سے نفرت کے باعث ہے۔ یہ درست سہی کہ خانقاہی نظام میں وہ پہلی سی بات نہ رہی، تاہم اس کے آثار تو موجود ہیں، اس کی اصلاح تو ممکن ہے۔ درس گاہ اور خانقاہ یک جسم و یک جان ہوتے ہیں تو علم کے فوّارے اور عمل کے چشمے سے آبادی کی آبادی جل تھل ہو اُٹھتی ہے۔ اور علم

وعمل کی سنگم شخصیت کی زبان سے نکلی ہوئی بولی بولی نہیں ہوتی، قند کی ڈلی ہوتی ہے۔

معین الملۃ الدین حضرت خواجہ غریب نواز رضی اللہ تعالی عنہ، برصغیر کے خوش عقیدہ مسلمان جن کی بارگاہ کو اپنی روحانی چھاؤنی اور آخری پناہ گاہ تصور کرتے ہیں، آپ نے صرف تین جملوں میں تصوف کے جلال و جمال کو سمیٹ کر رکھ دیا ہے۔ ان کی نظر میں سب سے بڑا صوفی، اللہ کا دوست یعنی ولی اللہ کون ہے؟ تو فرماتے ہیں:

> ''حضرت پیر و مرشد کا قول ہے کہ جس شخص میں یہ تین خصلتیں ہوتی ہیں، وہ اللہ کا دوست ہوتا ہے، اوّل دریا جیسی سخاوت، دوم آفتاب جیسی شفقت سوم، زمین جیسی تواضع۔''

(ہند و پاک کے اولیاء، ص ۴۹)

صاحب تذکرہ صوفیِ باصفا، عاشقِ مصطفےٰ امام احمد رضا چوں کہ قادری سلسلے کے صوفی و بزرگ ہیں اور قادری سلسلے کے بانی حضور غوثِ اعظم رضی اللہ تعالی عنہ کے جامِ محبت کے ایسے مست ہیں کہ ان کے افکار و خیالات کی جنت میں ہر سو غوثِ اعظم کے قدمِ مبارک کی ہلچل سنائی دیتی ہے، اُن کے تصورات ونظریات کے آفاق پر ہر دم غوثِ اعظم کی یادوں کا سورج ضوفشاں رہتا ہے۔ اس لیے آیئے دیکھیں کہ صوفی وتصوف کے حقایق پر غوثِ اعظم کے خیالات کیا ہیں، اور ان خیالات کی روشنی میں اعلیٰ حضرت کی حیات و خدمات، جذبات و ملکات کا مطالعہ کریں کہ انہوں نے کس کس طرح ان فرمودات کے لعل وگوہر سے اپنے خزینۂ روحانیت کو سجایا ہے، اور دوسروں کے بھی بے نور دل و دماغ کو درخشاں کرنے کی سعی فرمائی ہے۔ ولی جن کی حیات کا مقصودِ اصلی ہی خدا تک رسائی اور خدا کو پالینا ہوتا ہے، حضور غوث پاک نے اس راستے کے پیچ وخم، منزلِ مقصود اور عرفانِ الٰہی تک کے سنگ میل کی نشان دہی فرمادی ہے، ارشاد گرامی ہے:

> ''اقرب طرق الی اللّٰہ تعالی لزوم قانون العبودیۃ الاستمساک بعروۃ الشــریعۃ، اللہ عزوجل کی طرف سب سے زیادہ قریب راستہ قانونِ بندگی کو لازم پکڑنا اور شریعت کی گرہ کو تھامے رہنا ہے۔''

(مقال عرفاء، ص ۱۶، بحوالہ بہجۃ الاسرار ص ۵۰)

ولی کی پہچان کچھ لوگوں نے کرامت ٹھہرالی ہے۔ اُن کی نظرِ تلاش اس تگ و دو میں ہوتی ہے کہ خارق عادت، افعال کا صدور، محیر العقل کارنامے کا ظہور ہو، اگر اتفاق سے ایسا ہوگیا تو ان کی جبینِ عقیدت جھک جاتی ہے ورنہ ولی ماننے میں ہی انہیں تامّل ہوتا ہے۔ ولی کی سب سے بڑی پہچان

شریعت پر استقامت ہے۔ دیکھیے کتنے واضح لفظوں میں حضور غوث پاک فرماتے ہیں:

''کرامة الولی استقامته فعله علیٰ قانون قول النبی صلی اللّٰه علیه وسلم،
ولی کی کرامت یہ ہے کہ اس کا فعل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کے قانون پر پورا اُترے۔''

(مقال عرفاء، ص ۳۹، بحوالہ بہجۃ الاسرار ص ۱۵)

تصوف، حقیقتِ تصوف اور لوازمِ تصوف کے حوالے سے جتنے جواہر پارے اب تک آپ کی بزمِ نظر سے گذرے ہیں ان تمام کو صرف دو جملوں میں اگر دیکھنا چاہیں تو حضور غوثِ پاک کا فرمان ایک بار پھر دیکھ لیجیے۔ جس نے بھی، جو کچھ بھی کہا ہے اس کی روح آپ کے ارشاد گرامی میں موجود ہے۔ امام احمد رضا نے ارشادِ غوثِ اعظم کو تا حین حیات حرزِ جاں بنائے رکھا۔ زندگی و بندگی کے ہر مرحلے میں اس کو پیش نظر رکھا۔ نسبتِ قادریت کی برکت نے امام احمد رضا بریلوی کو زمین سے اٹھایا اور قطبیت کے آسمان پر پہنچا دیا۔ امام احمد رضا کی اس روحانی بلندی کو دیکھ کر بڑے بڑے محوِ حریت و استعجاب ہیں مگر اس میں حیرت کی چنداں کوئی بات نہیں ہے۔ فطرت جس غنچے کی شگفتگی چاہتی ہے، اس پر شبنم کے چھینٹے دے دیتی ہے، اس کی حنا بندی خود کرتی ہے۔ اعلیٰ حضرت کو خاندان ملا، اس خاندان کی گود میں تصوف کا سورج اُگتا اور ڈوبتا تھا۔ جو اساتذہ و اکابر ملے وہ طریقت کے آسمان کے نجم و قمر تھے اور حسنِ اتفاق سے جو پیر ملے روحانی دنیا کی شہنشاہی انہیں نصیب تھی۔ ان سب نے مل کر اُن کے بچپن کو شریعت کا رنگ، اُن کے شباب کو طریقت کا آہنگ اور ان کی ضعیفی کو حقیقت کے کیف سے ایسا سرشار کر دیا کہ معرفت ان پر ناز کرنے لگی۔

(۱) مثلاً آپ کے دادا قطبِ دوراں حضرت مولانا شاہ رضا علی خان صاحب نے شہر ٹونک میں مولانا خلیل الرحمٰن سے علومِ دینیہ حاصل کر کے بائیس سال کی عمر میں سند حاصل فرمائی، آپ کے علم کا شہرہ ہندستان میں دور تک پھیلا۔ آپ سلوک و تصوف میں کامل درک رکھتے تھے۔ پُر اثر تقریر فرماتے تھے۔ زہد و قناعت، فقر و استغنا، حلم و تواضع آپ کا خاص وصف تھا۔ آپ اپنے وقت کے قطب تھے، بے شمار کرامتیں آپ سے ظہور میں آئیں۔

(۲) آپ کے والد عارف باللہ حضرت مولانا شاہ حکیم نقی علی خان صاحب نے اپنے والد ماجد قدس سرہ سے علومِ ظاہرہ و باطنہ حاصل فرمایا۔ علومِ ظاہری میں تو آپ کی نظیر نہیں تھی اور علومِ باطنہ کا یہ عالم کہ دولتِ کشف سے آپ مالا مال تھے۔ جو فرما دیا ویسا ہی ظہور میں آیا۔ ایک مرتبہ بریلی میں قحط پڑا، مسلمانوں نے حاضرِ خدمت ہو کر عرض کی، آپ نے فرمایا ہمارے ساتھ چلو۔ ایک جم غفیر آپ کے

پیچھے پیچھے تھا۔ ابھی راستے ہی میں تھے کہ پانی برسنا شروع ہوگیا اور اتنا برسا کہ گھٹنوں گھٹنوں پانی میں لوگ اپنے گھر آئے۔ (تجلیاتِ امام احمد رضا، ص ۳۰)

(۳) آپ کے اساتذہ میں نور العارفین حضرت سید ابوالحسین احمد نوری بھی ہیں، جو آپ کے روحانی مربّی ہیں۔ آپ کو گیارہ سال کی عمر میں آپ کے جدّ اکرم و شیخ طریقت خاتم الاکابر حضور سیّد آلِ رسول مارہروی نے مجاہدات و سلوک اور خاص ادعیہ خاندانی، مثلاً حزب البحر، چہل اسم، حرز یمانی وغیرہم کی دعوت باقاعدہ آپ سے ادا کرائیں۔ آپ کی ریاضت کو دیکھ کر آپ کی جدہ ماجدہ گھبرا جاتیں اور روکنا چاہتیں، تو آپ کے جدّ امجد ارشاد فرماتے کہ رہنے دو، ان کو عیش و آرام سے کیا کام، یہ کچھ اور ہی ہیں، اور ان کو کچھ اور ہی ہونا ہے۔ یہ اقطاب سبعہ میں سے ایک قطب ہیں جن کی بشارت شاہ بوعلی قلندر پانی پتی نے دی ہے۔ (تذکرہ مشائخ قادریہ رضویہ، ص ۳۸۱)

(۴) آپ کے اکابر میں ایک اہم نام شیخ العرب والعجم حضرت مولانا شاہ فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی کا ہے۔ ۲۷ر رمضان المبارک ۱۲۹۲ھ میں اعلیٰ حضرت، حافظ بخاری محدّث سورتی کی رفاقت میں آپ سے ملنے گئے۔ ادھر گنج مراد آباد میں بغیر کسی ظاہری اطلاع کے شاہ صاحب نے مریدوں سے فرمایا کہ آج ایک شیر حق آرہا ہے، چلو اس کا استقبال کیا جائے۔ چنانچہ قصبے سے باہر تشریف لاکر استقبال فرمایا، اپنے مخصوص حجرے میں مہمان ٹھہرایا۔ عصر کے بعد اعلیٰ حضرت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا "مجھے آپ میں نور ہی نور نظر آتا ہے" نیز فرمایا میرا جی چاہتا ہے کہ میں اپنی ٹوپی آپ کو اڑھادوں، اور آپ کی ٹوپی خود اوڑھ لوں۔ یہ فرما کر اپنی ٹوپی اعلیٰ حضرت کو اڑھا دی اور اعلیٰ حضرت کی ٹوپی خود اوڑھ لی۔ اس وقت اعلیٰ حضرت کی عمر صرف بائیس سال کی تھی اور حضرت شاہ کی ۸۴ سال کی۔

(۵) آپ کے پیر و مرشد خاتم الاکابر حضرت مخدوم الشاہ سیّد آلِ رسول مارہروی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تعلیم و تربیت والد ماجد کی آغوشِ شفقت میں ہوئی۔ ۱۲۲۶ھ میں حضرت شیخ العالم عبدالحق ردولوی المتوفی ۸۰۷ھ کے عرس مبارک کے موقع پر علما و مشائخ کی موجودگی میں دستارِ فضیلت سے سرفراز فرمایا گیا۔ اسی سال حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز محدّث دہلوی کے درسِ حدیث میں شریک ہوئے۔ صحاح ستہ کا دورہ کرنے کے بعد سلاسلِ حدیث و طریقت کی سندیں مرحمت فرمائیں۔ آپ علومِ ظاہری و باطنی کے بحر ناپیدا کنار تھے۔ آپ کے مکاشفہ میں عجیب شان تھی، اپنے اسلاف کی زندہ و تابندہ یاد گار تھے۔ آپ کے مرید و خلیفۂ خاص امامِ اہلِ سنّت اعلیٰ حضرت نے فارسی میں آپ کے فضائل پر ۴۲ اشعار قلم بند فرمائے، جس کا مطلع ہے:

خوشا دلے کہ دہندش ولائے آلِ رسول　　　خوشا سرے کہ کنندش فدائے آلِ رسول

(ایضاً، ص ۳۷۰)

سلوک و تصوف کا جوہر بھرا ماحول آپ کو ملا تھا اور طریقت و معرفت کی جن نورانی کڑیوں سے آپ وابستہ تھے، اس کا اثر و فیض آپ کو پہنچنا ہی تھا، اسی لیے کیا بچپن اور کیا جوانی، حیات کے جس باب کو دیکھیے تابناک نظر آتا ہے۔ صرف بچپن کے حالات اگر یکجا کیے جائیں تو کمالات دیکھ کر آپ بھی کہیں گے کہ یا تو یہ مکتب کی کرامت ہے یا صاحبِ نظر کا فیضانِ نظر۔ ہم صرف اشارہ کر کے آگے بڑھتے ہیں، مثلاً (۱) بسم اللہ خوانی کے وقت ساڑھے تین سال کی عمر میں ''لا'' پر اعتراض کرنا کہ الف بھی پڑھ لیا اور لام بھی، پھر دوبار کا بشکل مرکب ''لا'' کیوں؟ (۲) ناظرہ قرآن پڑھتے وقت کسی آیت میں استاذ کا زبر بتانا، آپ کا غیر اختیاری طور پر زیر پڑھنا، اور دوسرے نسخۂ قرآن سے مطابقت پر آپ کی تائید کا ملنا۔ (۳) استاذ کے جواب ''جیتے رہو'' پر اعلیٰ حضرت کا یہ کہنا کہ یہ تو سلام کا جواب نہ ہوا، وعلیکم السلام کہنا چاہیے۔ (۴) چھ سال کی عمر میں جلسۂ عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے موضوع پر مجمع عام میں دو گھنٹہ تقریر کرنا۔ (۵) ۸ برس کی عمر میں عربی گرامر کی کتاب کا عربی زبان میں حاشیہ لکھ دینا۔ (۶) استاذ سے سبق پڑھنے کے بعد ایک دو مرتبہ دیکھ لینے پر پورا سبق ازبر ہو جانا اور استاذ کو سنا دینا۔ (۷) کسی بھی کتاب کی ابتدائی چند بحث پڑھ لینے کے بعد بقیہ پوری کتاب کا خود ہی حل کر لینا۔ (۸) تیرہ سال، دس ماہ، پانچ دن کی عمر میں تمام علومِ مروجہ عقلیہ و نقلیہ، عالیہ و آلیہ، جدیدہ و قدیمہ سے فارغ ہو جانا۔ (۹) جس دن فارغ ہوئے اسی دن رضاعت کے مسئلہ کا جواب لکھنا اور والد صاحب کا خوش ہو کر فتویٰ نویسی کا پورا کام آپ کو سونپ دینا، وغیرہ وغیرہ۔

آپ کی ایامِ طفلی سے عنفوانِ شباب تک کے یہ چند واقعات ہیں، جو ہمیشہ ذکر کیے جائیں گے۔ اور جب بھی ذکر کیے جائیں گے۔ شیخ سعدی کا یہ شعر یاد آئے گا کہ

بالائے سرش ز ہوش مندی　　　می تافت ستارۂ بلندی

چودہ سال کی چھوٹی سی عمر میں فراغت کے بعد کارِ افتا کی ذمہ داری سنبھالتے ہی جب آپ نے گرد و پیش کو شریعت کی میزان اور طریقت کی ترازو پر تولا تو حالاتِ حاضرہ کے ہر شعبے کو کہیں کمی اور کہیں زیادتی کا شکار پایا۔ اگر شریعت میں بدعت کی آمیزش کی وجہ سے چہرۂ شریعت دھندلا نظر آ رہا تھا، تو طریقت میں جہالت کی آلائش کے سبب روحِ طریقت مجروح نظر آ رہی تھی۔ ستم بالائے ستم لوگوں نے اپنے مفاد کی خاطر شریعت و طریقت دونوں کو دو خانوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ ایسے میں اسلام بچانے کی فکر ہی بہت بدیہی بات ہے۔ چہ جائیکہ کارزارِ عمل میں سرگرمِ عمل ہونا۔ حق کو باطل سے، نور کو

ظلمت سے، چھانٹ چھانٹ کر الگ کرنا، خالص شریعت اور شفاف طریقت سے دنیا کو آشنا کرنا، یہ معاملہ جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا مگر اصلاحِ فکر وعمل اور فلاحِ جسد و روح کے لیے ایک ماہر سرجن کی طرح آپ کو جو کرنا تھا، کسی کی چیخ و پکار کی پرواہ کیے بغیر وہ سب کچھ کر دیا جس کے بغیر نہ شریعت کا کوئی وقار تھا اور نہ طریقت کا کوئی اعتبار، زمانہ دیکھتا رہ گیا اور فتح ونصرت نے بڑھ کر جھنڈا گاڑ دیا۔ یہ وہ عظیم مجاہدہ ہے جس کو ہر مجاہدہ رشک کی نظروں سے دیکھتا ہے۔ آپ خود فرماتے ہیں:

''مجاہدہ کے لیے اسی برس درکار ہیں اور رحمت توجہ فرمائے تو ایک آن میں نصرانی سے ابدال کر دیا جاتا ہے، اور صدقِ نیت کے ساتھ مشغولِ مجاہدہ ہو تو امدادِ الٰہی خود کارفرما ہوتی ہے۔ عرض کیا گیا، یہ تو اگر اسی کا ہو رہے تو ہو سکتا ہے۔ دنیوی ذرائع معاش اور دینی خدمات سب چھوڑنا پڑیں گی۔ فرمایا، اس کے لیے یہی علامات مجاہدات ہیں، بلکہ اگر نیت صالح ہے تو ان مجاہدوں سے اعلیٰ، امام ابن حجر مکی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے، ایک عالم صاحب کی وفات ہوئی، ان کو کسی نے خواب میں دیکھا، پوچھا، آپ کے ساتھ کیا معاملہ ہوا۔ فرمایا، جنت عطا کی گئی، نہ علم کے سبب بلکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس نسبت کے سبب جو کتے کو راعی کے ساتھ ہوتی ہے، کہ ہر وقت بھونک بھونک کر بھیڑوں کو بھیڑیئے سے ہوشیار کرتا رہتا ہے۔ مانیں نہ مانیں ان کا کام۔ فرمایا کہ بھونکے جاؤ، بس اس قدر نسبت کافی ہے، لاکھ ریاضتیں، لاکھ مجاہدے اس نسبت پر قربان، جس کو یہ نسبت حاصل ہے اس کو کسی مجاہدے کی ضرورت نہیں، اور اس میں کیا ریاضت تھوڑی ہے؟ جو شخص عزلت نشین ہو گیا، نہ اس کے قلب کو کوئی تکلیف پہنچ سکتی ہے، نہ اس کی آنکھوں کو نہ اس کے کانوں کو، اس سے کہیے جس نے اوکھلی میں سر دیا ہے، اور چاروں طرف سے موسل کی مار پڑی ہے۔''

(الملفوظ، ج ۳، ص ۳۸)

اعلیٰ حضرت کے اس بیان پر علامہ محمد احمد مصباحی تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اب آپ امام احمد رضا کے شب و روز کا جائزہ لیں اور دیکھیں، انہوں نے کتنا عظیم مجاہدہ کیا ہے، پوری زندگی خدمتِ دین اور پیارے مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی بھولی بھالی بھیڑوں کو ہوشیار کرنے اور رہزنانِ دین کی گالیاں سننے میں بسر کی ہے، اور یہ سلسلہ بعد وصال بھی جاری ہے، ایک طرف ان کی تصانیف سے حفاظت دین و مسلمین ہوئی جارہی ہے، تو دوسری طرف، مخالفین کی جانب سے گالیوں کا بھی تانتا بندھا ہوا ہے۔ یہی وہ عظیم

مجاہدہ تھا کہ ان کے مرشد طریقت نے کسی اور ریاضت کی ضرورت نہ سمجھی، بلکہ بیعت کے ساتھ، خلافت و اجازت کا تمغۂ امتیاز بھی بخش دیا، اور اس اعزاز سے بھی سرفراز کر دیا کہ
''روزِ قیامت، اگر احکم الحاکمین نے فرمایا، کہ آلِ رسول، تم میرے لیے کیا لائے ہو؟ تو مَیں احمد رضا کو پیش کروں گا۔''

(امام احمد رضا اور تصوف، ص ۴۸)

حضرت خاتم الاکابر نے ۲۲ سالہ نوجوان میں وہ کون سی خوبی دیکھ لی کہ اپنا زادِ آخرت اپنے اس مرید کو بنالیا۔ پوچھنے پر آپ نے جواب دیا تھا کہ اور لوگ میلا کچیلا دل لے کر آتے ہیں، انہیں بذریعہ ریاضت صاف کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ صاف ستھرا دل لے کر آئے، صرف نسبت کی ضرورت تھی وہ مَیں نے پوری کر دی، دل کا صاف و شفاف ہونا یہ کوئی آسان بات نہیں ہے۔ گناہ چھوٹا ہو چاہے بڑا، ہر گناہ سے دل پر داغ پڑتا ہے، مگر جس ۲۲/سالہ پاک دامن نوجوان کا دل اتنا مصفٰی ہو کہ خاتم الاکابر جیسی عبقری شخصیت اس کی گواہی دے، بلکہ اس پر ناز کرے، وہ احکامِ شریعت کے عامل اور آدابِ طریقت کے حامل کے سوا دوسرا ہو ہی نہیں سکتا ہے۔ وہ تو وہ خوش نصیب انسان ہے قرآن نے جس کے لیے دارین کی فلاح کی ضمانت دی ہے، قد افلح من تزکٰی، 'تحقیق کہ وہ کامیاب ہوگیا جس نے اپنے دل کو پاک کرلیا'۔ اور یہ چیز تقویٰ کے بغیر پیدا نہیں ہوسکتی۔ اور تقویٰ ولایت کی شرائط میں ایک اہم شرط ہے، اور جب شرط ولایت پائی گئی تو ولایت حاصل ہوگئی۔ اس کا صاف مطلب یہ نکلا کہ دل کی صفائی کی بات کہہ کر حضرت خاتم الاکابر نے ۲۲/سال کی عمر میں آپ کے ولی ہونے کی بشارت دی ہے۔ ولایت کیا ہے؟ اللہ کی پسندیدگی کی سند ہے۔ اور اللہ کو وہ بندہ بہت پسند ہے جو اللہ کے بندوں کو اللہ کی بات بتائے۔ قرآن نے تو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو خیر امّت کی دلیل بنایا ہے۔ جو بھی اس عمل خیر سے گذرے گا۔ خیر کی سعادت کا تاج اس کے سر رہے گا۔ علامہ ابن جوزی، ''صفت الصفوۃ'' میں حضرت سفیان بن عینیہ کا ارشاد نقل کرتے ہیں:

''ارفع الناس منزلة من كان بين الله و بين عباده وهم الانبياء و العلماء،
لوگوں میں سب سے بلند رتبہ وہ حضرات ہیں جو اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان واسطہ ہوتے ہیں۔ یہ انبیاء اور علماء ہیں۔''

(صفۃ الصفوۃ، ج ۲، ص ۱۳۱)

ایک صحرانشین، خلوت گزیں صرف اپنے کو نارِ جہنم سے بچانے کی تدبیر کرتا ہے۔ اور ایک مخلص و بے ریا صاحب ہمت و مجاہدہ عالمِ ربانی ایک جہان کو عذابِ آخرت سے بچانے کی سعی کرتا ہے، یقیناً

یہ اس سے افضل و اعلیٰ ہے۔ یہ مجاہدہ و ریاضت، یہ اصلاح و ہدایت، یہ جہدِ مسلسل و مشقت، یہ خدمتِ دین و ملت، یہ جذبۂ فروغ شریعت و طریقت ہی رضائے مصطفےٰ اور وصلِ مولیٰ کے لیے کافی و وافی ہے۔ اس پر مستزاد، حضرت پیر و مرشد کی تعلیم و تربیت نے سونے پہ سہاگہ کا کام کیا۔ اعلیٰ حضرت خود فرماتے ہیں:

''جمادی الاولیٰ ۱۲۹۴ھ میں شرف بیعت سے مشرف ہوا۔ تعلیم و تربیت حضور پُر نور مرشدِ برحق سے حاصل کی۔ ۱۲۹۶ھ میں حضرت کا وصال ہوا۔ تو قبلِ وصال مجھے حضرت سیدنا شاہ ابوالحسین احمد نوری، اپنے ابن الابن، ولی عہد و سجادہ نشیں کے سپرد فرمایا۔'' (حیاتِ اعلیٰ حضرت، ص۴۴۔۴۵)

اور اعلیٰ حضرت نے بھی باآں علم و فضل ہمیشہ اپنے آپ کو حضرت نوری میاں کے جاروب کشوں میں شمار کیا۔ اور ادب و تواضع کا وہ مظاہرہ کیا کہ ابرِ کرم برستا رہا اور اعلیٰ حضرت نہال ہوتے رہے۔ حضرت نوری میاں کی شان میں اعلیٰ حضرت قصیدہ لکھتے اور بزبانِ خود پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتے۔ ذرا ان کی کیفیت و مستی کا یہ عالم دیکھیے۔

برتر قیاس سے ہے مقامِ ابوالحسین ۔۔۔ سدرہ سے پوچھو رفعتِ بامِ ابوالحسین

حاضرین پر وجد طاری ہے۔ طویل منقبت کے بعد مقطع پیش کرتے ہیں۔

یاں طالع رضا تیری اللہ رے یاوری ۔۔۔ اے بندۂ جدود و کرام ابوالحسین

وہ دیکھیے محفلِ نور آراستہ ہے۔ حضرت رضا، نوری میاں کے روبرو دوزانو بیٹھے ہیں۔ اعلیٰ حضرت تازہ مدحیہ قصیدہ لائے ہیں، وہ نذر کررہے ہیں۔ قصیدے کا نام ہے ''مشرقستانِ قدس'' مقطع پر پہنچ کر عرض کرتے ہیں۔

اتنا کہہ دے رضا ہمارا ہے ۔۔۔ پار بیڑا ہے احمد نوری

اسی مقطع کی تکرار کررہے ہیں اور بڑے نیاز سے عرض کررہے ہیں۔ ''اتنا کہہ دے رضا ہمارا ہے، اتنا کہہ دے رضا ہمارا ہے''، ''اتنا کہہ دے رضا ہمارا ہے'' اعلیٰ حضرت نے حضور نوری میاں کی آنکھوں میں کچھ دیکھ لیا، چہرے کو پڑھ لیا اور ''نیاز'' نے اچانک ''ناز'' کا رنگ لے لیا۔ اعلیٰ حضرت نے دوسرا مقطع نذر کیا۔

اے رضا کیوں ملول ہوتے ہو ۔۔۔ ہاں تمہارا ہے احمد نوری

اب اسی مصرع کی تکرار ہے ''ہاں تمہارا ہے احمد نوری، ہاں تمہارا ہے احمد نوری، ہاں تمہارا ہے احمد نوری''۔ حضرت نوری میاں کو اعلیٰ حضرت کی یہ ادا کچھ ایسی بھائی کہ آپ نے اپنا عمامہ مبارک سر سے اُتارا اور اعلیٰ حضرت کے سر پر باندھ دیا۔ گویا سند مل گئی کہ ''ہاں تمہارا ہے احمد نوری''۔ اعلیٰ حضرت

نے عرض کیا، حضور یہ عمامہ نہیں بلکہ میرے سر کا تاج ہے۔ یہ سُن کر مولانا عبدالمقتدر صاحب نے فرمایا کہ مولانا یہ ''تاج الفخر'' ہے۔ دیکھا گیا تو اس لفظ سے اس واقعہ کی سند برآمد ہوتی ہے ''تاج الفخر'' (۱۳۱۵)۔

پھر حضرت نوری میاں نے اس تحریر پر تنویر سے مشتحر فرمایا، ''چشم و چراغ خاندانِ برکاتیہ مارہرہ، مولانا احمد رضا خاں، دام عمرھم و علمھم' یہ خطاب مَیں نے آپ کو بایماء غیبی پہنچا دیا۔ بطوع و رغبت آپ کو قبول کرنا ہوگا۔ اور مَیں نے بطیبِ خاطر، بلا جبر و اکراہ، بہ رغبت قلب یہ خطاب آپ کو ہبہ کیا اور بخش دیا۔ یہی خط اس کی سند میں باضابطہ رہے۔ فقط ابوالحسین نوری، مارہرہ۔ (جامِ نور، جنوری ۲۰۰۸ء، ص ۵)

بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ امام احمد رضا نے وہ منازلِ سلوک اور مراحلِ طریقت بھی طے فرمائے جو بے توجہ مرشدِ کامل طے نہیں ہوتے۔ خود اپنی طبعی کوشش، فطری خواہش، اکابر و اساتذہ کی نوازش اور اس پر مرشدِ برحق کی روحانی آرایش نے امام احمد رضا کے طبقاتِ حیات کو ایسا روشن و منور اور معنبر و معطر کردیا کہ دوسروں کو بھی انھیں نقوش و خطوط پر چلانا ان کا مرکزی نکتہ اور نصب العین بن گیا۔ مشائخ و عرفا کا اس پر اجماع ہے کہ ''شریعت کا چھوآنے والا طریقت کی ہوا بھی نہیں پاسکتا۔''
امام احمد رضا اپنی تصنیف ''مقالِ عرفا'' میں تحریر فرماتے ہیں کہ

''شریعت کی حاجت ہر مسلمان کو ایک ایک سانس، ایک ایک پل، ایک ایک لحہ مرتے دم تک ہے۔ اور طریقت میں قدم رکھنے والوں کو اور زیادہ کہ راہ جس قدر باریک اسی قدر ہادی کی زیادہ حاجت، اے عزیز! شریعت عمارت ہے، اس کا اعتقاد بنیاد، اور عمل چنائی، پھر اعمالِ ظاہر وہ دیوار ہیں کہ اس بنیاد پر ہوا میں چنے گئے ہیں۔ اور تعمیر اوپر بڑھ کر آسمانوں تک پہنچی وہ طریقت ہے۔ دیوار جتنی اونچی ہوگی نیو کی زیادہ محتاج ہوگی۔ احمق وہ جس پر شیطان نے نظر بندی کرکے اس کی چنائی آسمانوں تک دکھائی اور دل میں یہ ڈالا کہ اب ہم تو زمین ک دائرے سے اونچے گذر گئے۔ ہمیں اس سے تعلق کی کیا حاجت۔ نیو دیوار سے جدا کرلی، اور نتیجہ وہ ہوا جو قرآن عظیم نے فرمایا، فانھا ربہ فی نار جھنم اس کی عمارت اسے لے کر جہنم میں ڈھے پڑی۔ والعیاذ باللہ رب العالمین ۔ اسی لیے اولیاے کرام فرماتے ہیں، صوفی جاہل شیطان کا مسخرہ ہے۔ اسی لیے حدیث میں آیا حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، فقیۃ واحد اشد علی الشیطان من الف عابد' ایک فقیہ، شیطان پر ہزار عابدوں سے زیادہ بھاری ہے۔ بے علم مجاہدے والوں کو شیطان انگلیوں پر نچاتا ہے۔ منہ میں لگام، ناک میں نکیل ڈال کر جدھر چاہے کھینچے پھرتا ہے۔ حضور غوث پاک 'فتوح الغیب' میں ارشاد فرماتے ہیں ''جس حقیقت

کی گواہی شریعت نہ دے وہ زندقہ ہے۔" اور امام غزالی 'احیاء العلوم' میں فرماتے ہیں "جس حقیقت کو شریعت باطل بتائے وہ حقیقت نہیں بلکہ کفر ہے۔" امام الطریقت سیدنا جنید بغدادی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: "صوفی اسے کہتے ہیں، جو ایک ہاتھ میں قرآن اور دوسرے ہاتھ میں سُنّتِ نبویہ لیے ہو۔" اب بھی جو شخص یہ کہے کہ شریعت اور ہے طریقت اور ہے، اولیاے کرام، صوفیاے عظام کے ارشاد کے بموجب وہ مردود ہے۔"

جسمِ پاک مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات کا نام شریعت ہے، قلب پاک کے احوال کا نام طریقت ہے، سرِ پاک کے احوال کا نام حقیقت ہے۔ اور روح پاک کے حالات کا نام معرفت ہے۔ غرض کہ ذاتِ پاکِ مصطفےٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ان چاروں کا مرکز ہے۔"

یہ تھا امام احمد رضا کے قلم سے نکلا ہوا شریعت و طریقت کا وہ مغز کہ یہ جہاں کہیں بھی ہوں گے شریعت کی توانائی بھی وہیں رہے گی اور طریقت کی تازگی بھی۔ امام احمد رضا نے اپنے زورِ قلم اور طبع رسا سے اس طرح انہیں اوراق پر سجادیا ہے کہ جو ان سے قریب ہوتا ہے یا ان کو اپنے سے قریب کرلیتا ہے وہ بھی چمک اُٹھتا ہے۔ روحانیت کا تمام حسن، طریقت کی تمام جمالیاتی قدریں اس میں سمٹ آتی ہیں۔ ایسی علم ریز اور عمل خیز بحث وہی کرسکتا ہے جو خود شریعت کا جامع اور طریقت کا ماہر ہو۔ جس کے قلب پر شریعت کا نقش و نگار اور قلب پر طریقت کا باغ و بہار جلوہ بار ہو، جو نکتہ رس عالمِ دین ہونے کے ساتھ ساتھ باریک بین صوفیِ کامل بھی ہو۔ علم اور عمل جب گلے ملے ہیں، شریعت و طریقت جب ہم آہنگ ہوئے ہیں تب امام احمد رضا صوفیِ باصفا ہوئے ہیں۔ اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ ان کی یہ خوبیاں اضافی ہیں۔ نہیں بلکہ بچپن ہی سے وہ ان اوصاف سے متصف تھے۔ ان کے بچپنے کے کوائف بولتے ہیں کہ وہ شروع ہی سے صوفی تھے۔ اسی لیے اُن کی سیرت میں صرف علم کا دعویٰ نہیں، عمل کی دلیل بھی ہے۔ نماز اور روزہ، احکامِ شرع میں دو ایسے احکام ہیں کہ جو ان کا مکمل پابند ہوتا ہے وہ دوسرے احکام میں بھی ذرہ برابر کوتاہی نہیں کرتا۔ اختصار کے پیشِ نظر ہم روزہ و نماز کا صرف ایک ایک واقعہ ذکر کرتے ہیں، جس سے اندازہ ہوگا کہ وہ تقویٰ ہی نہیں ورع کی منزلِ بلند پر فائز تھے۔ اور ان اولیاء الا المتقون کے مطابق متقی کامل اور ولی عارف تھے۔ امام احمد رضا کی زندگی کا آخری رمضان ۱۳۳۹ھ میں تھا، اس وقت ایک تو بریلی میں سخت گرمی تھی، دوسرے عمر مبارک کا آخری حصہ اور ضعف و مرض کی شدت، شریعت اجازت دیتی ہے کہ شیخ فانی روزہ نہ رکھ سکے تو فدیہ دے۔ اور ناتواں مریض کو اجازت دیتی ہے کہ قضا کرے۔ لیکن امام احمد رضا کا فتویٰ اپنے لیے کچھ اور ہی تھا۔ جو در حقیقت فتویٰ نہیں تقویٰ تھا۔ انہوں نے فرمایا، بریلی میں شدتِ گرما کے سبب میرے لیے روزہ رکھنا ممکن نہیں۔ لیکن پہاڑ پر ٹھنڈک

ہوتی ہے۔ یہاں سے نینی تال قریب ہے۔ بھوالی پہاڑ پر روزہ رکھا جاسکتا ہے۔ میں وہاں جانے پر قادر ہوں۔ لہٰذا میرے اوپر وہاں جاکر روزہ رکھنا فرض ہے۔ چنانچہ رمضان وہیں گذارے اور پورے روزے رکھے۔ ۲۵ر صفر المظفر ۱۳۴۰ھ کو وصال ہوتا ہے۔ مرض مہینوں سے تھا اور ایسا کہ چلنے پھرنے کی طاقت نہیں۔ شریعت اجازت دیتی ہے کہ ایسا مریض گھر میں تنہا نماز پڑھ لے۔ مگر امام احمد رضا جماعت کی پابندی کرتے۔ چار آدمی کرسی پر بٹھا کر مسجد تک پہنچاتے، جب تک اس طرح حاضری کی قدرت تھی، جماعت میں شریک ہوتے رہے۔ علامہ محمد احمد مصباحی نے اپنے استاذ محترم حضور حافظِ ملت علیہ الرحمہ کے حوالے سے جمل النور فی نھی النساء عن زیارۃ القبور کے حاشیہ میں لکھا ہے کہ

> ''ایک بار مسجد لے جانے والا کوئی نہ تھا، جماعت کا وقت ہوگیا۔ طبیعت پریشان، ناچار خود ہی کسی طرح گھسٹتے ہوئے حاضر ہوئے اور باجماعت نماز ادا کی۔ آج صحت و طاقت اور تمام تر سہولت کے باوجود ترکِ نماز اور ترکِ جماعت کے ماحول میں یہ واقعہ ایک عظیم درسِ عبرت ہے۔''

(امام احمد رضا اور تصوّف، ص۵٦)

یہ انداز و ادا، یہ روشِ حیات، یہ جذبۂ عبودیت' وہ استقامت علی الشریعۃ ہے جسے غوث اعظم نے کرامت کہا ہے۔ اور یہی وہ کرامت ہے جس کے بارے میں سید المکاشفین حضرت محی الدین ابن عربی نے فرمایا کہ ''اس میں استدراج اور مکر کا دخل نہیں، یہ اصل کرامت معنوی ہے۔'' لیکن ان کی حیات میں بہت سی کرامات حسّی بھی موجود ہیں جو (۱) ''امام احمد رضا اور تصوّف'' کے 'کرامات' والے حصے میں (۲) ''تجلیاتِ امام احمد رضا'' میں (۳) ''سیرتِ اعلیٰ حضرت مع کرامات'' میں (۴) ''صوفی با صفا امام احمد رضا'' میں (۵) خصوصیت کے ساتھ ''حیاتِ اعلیٰ حضرت'' میں ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔ امام احمد رضا کی کرامتوں میں یہ بھی عظیم اور نمایاں کرامت ہے کہ ان کے خلفا، تلامذہ اور مریدین اصحابِ کرامت ہوئے ہیں۔ مثلاً:

(۱) ملک العلما حضرت مولانا سید محمد ظفر الدین بہاری علیہ الرحمۃ الباری، عرصے سے فشار الدم کے مرض میں مبتلا تھے اور بہت کمزور ہوگئے تھے۔ لیکن ان کی عبادت و ریاضت میں کبھی کوئی کمی نہیں آئی۔ نہ اُن کے روزانہ کے معمولات میں کوئی فرق آیا۔ زندگی کے آخری دن تک وہ علمی و دینی فرائض حسب معمول انجام دیتے رہے۔ شب دوشنبہ ۱۹ر جمادی الاخریٰ ۱۳۸۲ھ / ۱۸ر نومبر ۱۹٦۲ء کو ذکر جہر اللہ، اللہ کرتے، انہوں نے اپنی جان، جانِ آفریں کو اس طرح سپرد کی کہ کچھ دیر تک اہلِ خانہ کو اس بات کا احساس بھی نہیں ہوا کہ وہ واصل بحق ہوچکے ہیں۔ (مقدمہ الجامع الرضوی، ص۱۰)

(۲) صدر الشریعہ حضرت علامہ محمد امجد علی اعظمی، مصنف بہارِ شریعت، علیہ الرحمہ کے وصال کے بعد برسات کی وجہ سے مزار شریف کا ایک حصّہ کھل گیا، پورا باغ خوشبو سے معطر ہوگیا۔ عینی شاہدوں کا بیان ہے کہ یہ خوشبو نہ پہلے ہم نے کسی چیز میں پائی، نہ بعد میں اس کی نظیر نظر آئی۔ اعلیٰ حضرت کے خلف اصغر حضور مفتیِ اعظم ہند مولانا مصطفٰے رضا خاں علیہ الرحمہ ملفوظات کے دیباچے میں فرماتے ہیں ''صحبت بغیر رنگ لائے نہیں رہتی۔ اور پھر اچھوں کی صحبت اور وہ بھی کون جنہیں سید العلما کہیں تو حق یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا۔ جنہیں تاج العرفا کہیں تو بجا، جنہیں مجددِ وقت اور امامِ اولیا کے تعبیر کریں تو صحیح، جنہیں حرمین طیبین کے علمائے کرام نے مدائح جلیلہ سے سراہا۔ انہ السدی الفرد الامام کہا۔ ان کے ہاتھ پر بیعت ہوئے۔ انہیں اپنا شیخ طریقت بنایا، ان سے سندیں لیں، اجازتیں لیں۔ انہیں اپنا استاذ بنایا، پھر ایسے کی صحبت، کیسی بابرکت صحبت ہوگی۔ سچ تو یہ ہے کہ صحبت کی برکت نے انسان کردیا۔ میری جان، ان پاک قدموں پر قربان، جب سے یہ قدم پکڑے، آنکھیں کھلیں، اچھے بُرے کی تمیز ہوئی، اپنا نفع و زیاں سوجھا، منہیات سے تا بمقدور احتراز کیا۔ اور اوامر کی بجا آوری میں مشغول ہوا۔ (الملفوظ، ج ۱، ص ۴) یہ اعتراف استفاضہ کافی و وافی ہے۔

(۳) اب آپ کو خود حضور مفتیِ اعظم ہند کی زندگی پر نظر ڈالیں۔ شریعت کے سانچے میں ڈھلی ہوئی زندگی، طریقت کی میزان پر تلی ہوئی زندگی اور کشف و کرامات سے بھری ہوئی زندگی، اس زندگی کے جلوے اب بھی بہت سی نگاہوں میں محفوظ ہیں۔ مَیں سمجھتا ہوں حضرت خواجہ غریب نواز کے بعد پورے برصغیر میں سب سے زیادہ جس بزرگ کی کرامتیں زبان زد خواص و عوام ہیں اور عمومی مجالس سے مخصوص محافل تک سُنی اور سُنائی جاتی ہیں وہ حضور مفتیِ اعظم ہند کی کرامتیں ہیں۔ مفتیِ اعظم ہند کون ہیں؟ اعلیٰ حضرت کے دسترخوانِ تصوّف کے ریزہ چیں، اعلیٰ حضرت کے مے کدے کی معرفت کے بادہ خوار۔ ظاہر ہے کہ جب زندگی کا یہ عالم ہے تو، زندگی ساز کا عالم کیا ہوگا۔ امام احمد رضا کے دورِ حیات میں طریقت ظلم و جہالت کے پنجے میں سسک رہی تھی، ایک تو انگریزوں کا ساختہ و پرداختہ گروہ تھا جو تصوّف کے وجود پر ہی سوالیہ نشان لگا رہا تھا، دوسری ٹولی نام نہاد صوفیوں کی تھی، جو اپنی ناروا حرکتوں سے تصوف کی مٹی پلید کررہی تھی، اور اپنی اس حرکتِ مکروہی پر وہ اتنے جری تھے کہ کچھ سننے کو تیار نہیں تھے۔ امام احمد رضا نے تصوف کی یہ حالت زار دیکھی تو بحیثیت صوفی آپ تڑپ اُٹھے، اور تصوّف کے دفاع میں اپنی علمی و عملی فوج میدان میں اُتار دی۔ پھر کیا تھا کتابوں کا عسکری دستہ، رسائل کی وہ کمک بھیجی کہ خانقاہ سے لے کر درگاہ تک رضا کے نام کی دھوم مچ گئی۔ درگاہ حضرت محبوب الٰہی نظام الدین اولیا کے سجّادہ نشین حضرت خواجہ حسن نظامی کو بھی اعتراف کرنا پڑا کہ

''بریلی کے مولانا احمد رضا خان صاحب جن کو اُن کے معتقد مجدّد مائۃ حاضرہ کہتے ہیں، درحقیقت طبقۂ صوفیا کرام میں باعتبار علمی حیثیت کے منصب مجدّد کے مستحق ہیں۔ انہوں نے ان مسائل اختلافی پر معرکہ کی کتابیں لکھی ہیں جو سالہا سال سے فرقۂ وہابیہ کے زیرِ تحریر و تقریر تھیں، اور جن کے جوابات گروہ صوفیہ کی طرف سے کافی و شافی نہیں دیئے گئے تھے۔ ...... جماعتِ صوفیا علمی حیثیت سے مولانا موصوف کو اپنا بہادر صف شکن سیف اللہ سمجھتی ہے، اور انصاف یہ ہے کہ بالکل جائز سمجھتی ہے۔''

(ہفت روزہ خطیب، دہلی۔۲۲؍مارچ ۱۹۱۵ء)

آپ نے خانقاہوں اور صاحب خانقاہ کے تقدس کی خاطر پوری زندگی جہاد بالقلم فرما کر خانقاہی نظام کو درست کرنے کا انمول ضابطۂ حیات عطا فرمایا، اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ آج پھر بیش تر خانقاہیں، ہوا، ہوس، ہا و ہو میں مبتلا اپنے محسن کے لائحہ عمل سے جداگانہ ہے، ورنہ آج اگر پوری خانقاہیں امامِ اہلِ سُنّت کو اپنا قاید اور محسن مان کر آپ کے بتائے اصول پر گامزن ہو جائیں تو آج بھی خانقاہیں رشد و ہدایت کا سرچشمہ بن سکتی ہیں۔ تصوف کا اصلی رمز آپ کی ذات سے فروغ پایا۔ اور آج اگر خانقاہیں محفوظ ہیں، مقابر ڈھائے نہیں گئے، آثارِ مقدسہ کی عظمت برقرار ہے تو یہ صدقہ ہے مجدد اعظم قدس سرہٗ کا۔ اس لیے کسی خانقاہ یا صاحب خانقاہ کو چھیڑے بغیر آپ ہی کی ذات پر ہر باطل اور بدمذہب حملہ کررہے ہیں۔ طریقت و تصوّف کے باب میں امام احمد رضا کی یہ بھی ایک امتیازی خصوصیت ہے کہ مروّجہ سلاسل کی اجازت و خلافت آپ کو حاصل تھی۔ آپ کی بارگاہ کے عقیدت کیش نے جن سلاسل سے اجازت و خلافت طلب کی ہے، آپ نے انہیں اسی سلسلے کی اجازت و خلافت سے نوازا ہے۔ چار مشہور سلسلے قادریہ، چشتیہ، نقشبندیہ، سہروردیہ ہوں یا دیگر سلاسل، آپ سبھی سلاسل کے امین و فیض بخش تھے۔ کچھ برسوں پہلے ادارہ قاری، دہلی نے اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ کے ہاتھ کا قلمی خلافت نامہ شائع کیا تھا۔ حضرت محدّث بریلوی نے یہ چشتیہ سلسلہ کا خلافت نامہ، حضرت علامہ سید غلام علی بن حضرت مولانا سید نور محمد معینی قدس سرہٗ کو عطا فرمایا تھا۔ یہ ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس دستاویز کی سند سے خانقاہِ رضویہ اور اجمیر مقدس کے روحانی و عرفانی تعلقات کی بھرپور نشان دہی ہوئی ہے۔ امام احمد رضا نے فنِ تصوّف کو بھی اپنی شاہ کار تصانیف سے گلزار بنادیا ہے اور خانقاہی و درگاہی نظام و ادب پر بھی اپنے افکار کے جوہر دکھائے ہیں۔ درج ذیل کتابوں سے ان امور پر خوب روشنی ڈالی ہے۔ مثلاً

(۱) کشف حقائق و اسرارِ دقائق (۲) الیاقوتۃ الواسطہ فی قلب عقد الرابطہ (۳) انہار الانوار من یم صلوۃ الاسرار (۴) ازہار الانوار من صباء صلوۃ الاسرار (۵) مقال عرفاء۔
ان کے علاوہ دیگر تصانیف میں بھی مضامینِ تصوف جا بجا موجود ہیں۔ مثلاً

(۱) **الملفوظ**، جس کے جامع و مرتب حضور مفتی اعظم ہند ہیں مگر یہ آپ ہی کی مجلسی ملفوظات کا مجموعہ ہے۔ اس میں مسائلِ تصوف کے نہاں سے نہاں اور عیاں سے عیاں گوشے پر اپنے خصوصی انداز میں لفظوں کے گوہر لٹائے ہیں۔ (۲) الدولۃ المکیہ، جو علمِ غیب مصطفےٰ پر آپ کی تاریخی تصنیف ہے۔ اس میں وحدتِ وجود و شہود و معبود سے متعلق رقم طراز ہیں:

''حقیقی وجود صرف اللہ کے لیے ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ سلم نے فرمایا، سب سے سچی بات جو عرب نے کہی وہ لبید شاعر کا قول ہے، الا کل شئ ما خلا اللّٰہ باطل، ہمارے نزدیک ثابت ہو چکا ہے کہ کلمہ لا الٰہ الا اللّٰہ کا معنی، عوام کے نزدیک یہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اور خواص کے نزدیک یہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی مقصود نہیں، اور اخص الخواص کے نزدیک یہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی مشہود نہیں، اور جو مقامِ نہایت تک پہنچ گئے، ان کے نزدیک یہ ہے کہ خدا کے سوا کوئی موجود نہیں، اور سب حق ہے، مدارِ ایمان اوّل پر ہے، مدارِ اصلاح دوم پر ہے، کمالِ سلوک سوم پر، وصول الی اللہ کا مدار چہارم پر، اللہ تعالیٰ ہمیں ان چاروں معانی سے حظ کامل عطا فرمائے، اپنے احسان و کرم سے۔ آمین۔
(الدولۃ المکیہ، ص۳۲۴)

(۳) **فتاویٰ افریقہ**، اس میں آپ نے فلاح ظاہر، فلاح باطن، وقوع، امید، احسان، شیخ اتصال، شیخ ایصال، بیعتِ برکت، بیعتِ ارادت، شرائطِ مرشد وغیرہ پر جو نفیس و لذیذ بحث فرمائی ہے، اس کے بارے میں صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ یہ آپ ہی کا حق و حصہ ہے۔ مرشد کی بحث میں فرماتے ہیں: کلام اللہ و کلام الرسول، و کلامِ ائمہ شریعت و طریقت و کلامِ علمائے دین، اہل رشد و ہدایت ہے۔ اسی سلسلۂ صحیحہ پر کہ عوام کا ہادی کلام علما، علما کا رہنما کلامِ ائمہ، ائمہ کا مرشد کلامِ رسول، رسول کا پیشوا کلام اللہ جل و علا و صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیہم وسلم۔ فلاح ظاہر ہو خواہ فلاح باطن، اسے اس مرشد سے چارہ نہیں، جو اس سے جدا ہے، بلا شبہہ کافر ہے یا گمراہ، اور اس کی عبادت برباد و تباہ۔ امام احمد رضا کی یہ وہ چند تصانیف، اور تصانیف میں جلوہ ریز علمی شہ پارے ہیں، جس نے تصوف کو نئی شان و شوکت عطا کی، اس کو اس کی رفعتِ گمشدہ، وعظمتِ برگشتہ سے آشنا کیا۔ نہ صرف مقام متعین کیا بلکہ مقام پر متمکن کیا، ورنہ کچھ ایسی چیزیں داخلِ تصوف ہو گئی تھیں، یا کر دی گئی تھیں جن کی وجہ سے پورا سرمایۂ تصوف تنقید و تضحیک کا ہدف بن کر رہ گیا تھا۔ امام احمد رضا کی ہمتِ مومنانہ، جراتِ رندانہ، شفقتِ عارفانہ اور

جسارتِ عاشقانہ نے ہر ملاوٹ سے تصوف کو پاک کر دیا۔ امام احمد رضا کے اس غیر معمولی جذبۂ تحفظِ تصوف کو سراہتے ہوئے اس کے ثمرات و نتائج پر ڈاکٹر وحید کوثر یوں اظہار خیال کرتے ہیں:

''امام احمد رضا رحمۃ اللہ علیہ نے تصوف اور اس کے مسائل پر جو کتابیں تصنیف فرمائی ہیں، وہ نہ صرف تصوف کے دقیق مسائل کو قرآن اور حدیث کی روشنی میں واضح کرتی ہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ، یہ کتابیں ان لوگوں کے لیے بھی قابلِ مطالعہ ہیں جو تصوف کے متعلق صحیح معلومات نہیں رکھتے، اور ان کے لیے بھی، جو تصوف کو قرآن و حدیث سے بالکل جدا سمجھتے ہیں۔ آپ کی ان تصانیف سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ تصوف سے متعلق پھیلے ہوئے غلط خیالات کو روکا جا سکا، تو دوسری طرف بھگتی تحریک کے راستے سے، ہندو فلسفے کے اثرات جو اسلامی تصوف پر نمایاں ہو رہے تھے، ان پر بند باندھا جاسکا۔ اس وقت خانقاہی نظام کے بعض جہلا نے یہ سمجھ لیا تھا کہ وہ بھی اسلامی تصوف کا جزو ہیں، حالانکہ بعض مسلمان صوفیوں نے معرفت کی باتیں عوام کو سمجھانے کے لیے روز مرّہ کی تشبیہوں اور عام زندگی سے متعلق واقعات کا سہارا لیا تھا، اس لیے کہ عرفانِ الٰہی کو سمجھنا ہندستان کے نومسلم طبقے کے لیے مشکل تھا۔ ان مسلمان صوفیوں کی روایت ذرا آگے بڑھی تو گمرہی پھیلنے لگی۔ امام احمد رضا رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تصانیف کے ذریعہ اس گمرہی کا سدّ باب فرمایا۔ آپ کی تصانیف سے صوفی کے صحیح مفہوم اور اس کے پہچان کی کسوٹی ہاتھ آ سکی۔''

(قلمی نسخہ، صوفی باصفا، امام احمد رضا، ص ۲۸، ۲۹)

ہر مرید اپنے پیر پر اعتمادِ کلی رکھے یہ کمالِ عقیدت ہے، اور پیر اپنے مرید پر اعتماد رکھے یہ معراجِ کمال ہے۔ حضور خاتم الاکابر کو اپنے مریدِ باوفا امام احمد رضا کے علمی تبحر اور فکری رسوخ پر اتنا اعتماد تھا کہ اپنے ولی عہد حضرت نوری میاں سے فرمایا، دیکھو! ہماری اور ہمارے خاندان کے اکابر کی جو کتابیں شائع ہوں، مولانا عبدالقادر بدایونی اور مولانا احمد رضا کو دکھائی جائیں۔ یہ جیسے اصلاح کریں، قبول کی جائیں، پھر اشاعت ہو، ایک طرف یہ تواضع کی انتہا ہے تو دوسری طرف چاہتوں کا نقطۂ عروج کہ پیر اپنے مرید سے اپنی اور خاندان کی کتابوں پر اصلاح چاہے، اور ایسا کیوں نہ ہو کہ یہاں تو ؎

تو من شدی، من تو شدم، تو تن شدی، من جاں شدم
تا کس نہ گوید بعد ازیں، من دیگرم تو دیگری

کا حسین منظر نظر آ رہا ہے، روزِ اوّل ہی مرشد گرامی نے توجہ شیخی ڈال کر، اپنے رنگ میں

ایسا رنگ دیا کہ جب حجرۂ بیعت سے باہر آئے تو پہچان مشکل تھی کہ ان میں پیر کون ہے؟ اور مرید کون؟ صرف داڑھی کی سفیدی اور سیاہی سے دونوں میں امتیاز کیا جا سکا۔ وہ کیسا صاحب تصرف پیر ہوگا جو ایک ہی نظر میں قلب ماہیت کر دے، اور ایک جست میں وہاں پہنچا دے جہاں پہنچنے کے لیے برسوں کی ریاضت درکار ہوتی ہے۔ مگر یہ ماہرہ مقدسہ کی شان ہے۔ ہر دور میں اس خانقاہ کے افق سے ولایت کا نیّرِ درخشاں طلوع ہوا ہے۔ آج بھی جہاں کا ذرہ مہتاب بن کر اُبھرتا اور آفتاب بن کر چمکتا ہے۔ جو اَبر وہاں سے اُٹھتا ہے وہ کشت زارِ انسانیت پر ٹوٹ ٹوٹ کر برستا ہے۔ آخر وہ کون سا جوہر اس صدف میں پنہاں ہے کہ وہاں کا فیض یافتہ اقران و افاضل پر فائق و ممتاز ہو جاتا ہے۔ طریقت کے جس ہیرے نے امام احمد رضا کی قدر و قیمت روحانی دنیا میں اتنی بڑھا دی کہ موجودہ تمام خانقاہوں کی بھی وہ آبرو بن گئے، سلوک کا نشانِ عظمت اور تصوّف کا طرۂ امتیاز بن گئے۔ ہم نے جو تجسس و تفحص سے پایا ہے وہ صرف دو چیزیں ہیں، ایک ''ادب'' اور دوسری ''تواضع''۔ (تذکرہ مشائخ قادریہ رضویہ، ص ۳۷۴) یہ دونوں وہاں ریاضت و مجاہدہ کے ذریعہ روح میں اتار دی جاتی اور اگر ضرورتِ مجاہدہ نہیں تو نظر کے پیمانے سے پلا دی جاتی۔ یہ وہ نشہ تھا کہ تُرشی کی کیا مجال جو اُتار دے۔ ان دو جوہروں سے لیس اور فیضِ قادری سے فیض یاب ہو کر جب مراحلِ دنیا میں قدم رکھتا تھا تو جہاں وہ بیٹھ جاتا چراغِ ہدایت جل اُٹھتا تھا، جدھر نکل جاتا سربلندی و سرفرازی کا کارواں اُتر پڑتا تھا۔ امام احمد رضا کی عالمی شہرت اور آفاقی مقبولیت اسی گوہرِ مقصود کی محسوس برکتیں ہیں، ادب و تواضع نے انہیں اتنا بلند کر دیا کہ بلندیاں ان کا منھ تکتے رہ گئیں، عظمتیں فرشِ راہ بنتی اور رفعتیں تحت قدم بچھتی چلی گئیں اور وہ ہر این و آن سے بلا خوف و خطر گذر گئے۔ یہ تو بلا وجہ لوگوں نے مشہور کر دیا ہے کہ وہ بڑے سخت مزاج اور متشدّد تھے، تھے، مگر کب؟ رزمِ حق و باطل کے وقت، ورنہ حلقۂ یاراں میں وہ ریشم سے زیادہ نرم تھے۔ ادب جس کی فطرت میں اور تواضع جس کی طبیعت میں داخل و شامل ہو وہ تُند خو کیسے ہو سکتا ہے۔ چند واقعات، ناگہانی حالات، عینی مشاہدات حاضر ہیں، آپ خود فیصلہ کیجیے کہ وہ کیا ہیں؟ انسان! یا فرشتہ؟

کسی زندگی معلوم کرنے کے لیے اس کے پڑوسیوں کا بیان خاص طور سے قابلِ غور ہوتا ہے، پڑوسیوں سے کچھ نہ کچھ نزاع ہو ہی جاتی ہے، اس لیے بعض ایسے بھی ملتے ہیں کہ اپنے دنیوی نقصان کے باعث اپنے نیک پڑوسیوں کی بھی بے جا شکایت کرتے ہیں۔ مگر امام احمد رضا کے پڑوسی بھی اُن کے معترف نظر آتے ہیں:

(۱) محمد شاہ خان ایک معزز زمیندار اور اعلیٰ حضرت کے پڑوسی تھے۔ عمر اعلیٰ حضرت سے زیادہ تھی۔ سید ایوب علی صاحب اور سید قناعت علی صاحب نے ایک دن دیکھا کہ یہ اپنی زمینداری و سن

رسیدگی کے باوجود بڑے ادب سے آستانۂ رضویہ کی جاروب کشی کر رہے ہیں۔ سید قناعت علی صاحب کو گوارا نہ ہوا، آگے بڑھ کر ان کے ہاتھ سے جھاڑو لینا چاہی مگر حاجی صاحب نہ مانے اور فرمانے لگے، صاحبزادے یہ میرا فخر ہے کہ اپنے شیخ کے آستانۂ عالیہ کی جاروب کشی کروں۔ عمر میں، مَیں حضور سے بڑا ہوں، ان کا بچپن دیکھا اور جوانی دیکھا، اور اب بڑھاپا دیکھ رہا ہوں، ہر حالت میں یکتائے زمانہ پایا، تب ہاتھ میں ہاتھ دیا، بڑھاپے میں تو ہر کوئی بزرگ ہوجاتا ہے، انہیں بچپن سے یکتائے روزگار دیکھ رہا ہوں۔

(۲) ایک صاحب داخلِ سلسلہ ہوکر کسی وظیفہ کے خواہش مند ہوئے۔ ان کی داڑھی حدِ شرع سے کم تھی۔ فرمایا، جب داڑھی شرع کے مطابق ہوجائے گی، وظیفہ بتادیا جائے گا۔ کچھ دنوں کے بعد پھر درخواست کی۔ فرمایا، کسی التماس کی ضرورت نہیں۔ جب داڑھی شرع کے مطابق ہوجائے گی خود وظیفہ بتادیا جائے گا۔ نفل پر واجب مقدم ہے۔

(۳) کسی عالم نے بہ نیت اعتکاف مسجد میں قیام کیا۔ اور پان وغیرہ بھی کھایا، اُگال دان بھی رکھا۔ بعض لوگ جو ان کی نیتِ اعتکاف سے باخبر نہ تھے، معترض ہوئے۔ اعلیٰ حضرت کے پاس سوال آیا۔ اعتراض کرنے والوں کو حکم مسئلہ اور مرتبۂ عالم بتاتے ہوئے تنبیہ کی۔ آخر میں یہ بھی لکھا، ''علما کو چاہیے کہ اگرچہ خود نیت صحیح رکھتے ہوں، عوام کے سامنے ایسے افعال جن سے ان کا خیال پریشان ہو نہ کریں۔ کہ اس میں دو فتنے ہیں۔ جو معتقد نہیں، ان کا معترض ہونا، غیبت کی بلا میں پڑنا، عالم کے فیض سے محروم رہنا اور جو معتقد ہیں ان کا اس کے افعال کو دستاویز بناکر بے علم نیت خود مرتکب ہونا۔ عالم فرقۂ ملامتیہ سے نہیں کہ عوام کو نفرت دلانے میں اس کا فائدہ ہو۔ مسندِ ہدایت پر ہے۔ عوام کو اپنی طرف رغبت دلانے میں ان کا نفع ہے۔ احیاناً ایسے افعال کی حاجت ہو تو اعلان کے ساتھ اپنی نیت اور مسئلہ شریعت عوام کو بتادے۔

(۴) غربا کی دل جوئی کا بڑا خیال تھا۔ مخلص غربا کی دعوت نہ ردّ کرتے، نہ بعد میں کوئی حرفِ شکایت زبان پر لاتے۔ بلکہ خدام کو حیرت ہوتی کہ کھانا کیسے تناول فرمایا؟ تو ارشاد ہوتا، ایسی خلوص کی دعوت ہو تو مَیں روزانہ قبول کرنے کو تیار ہوں۔

(۵) خدمتِ دینی پر اپنوں کی مدح اور غیروں کی قدح، انسان کو عُجب و کبر، یا نفسانی غصہ انتقام میں مبتلا کردیا کرتے ہیں۔ مگر امام احمد رضا قدس سرہٗ فرماتے ہیں ''بخدا مَیں نہ اُن اکابر علما و اولیا کی مدح پر اِتراتا ہوں، نہ ان دشمنانِ خدا و رسول کی گالیوں سے غصہ میں آتا ہوں۔ خدا کا شکر ہے کہ اس نے اس ناچیز کو اس قابل بنایا کہ اس کے حبیب پاک علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے ناموس کی حفاظت

میں گالیاں سنے۔ جتنی دیر مجھے گالیاں دیتے ہیں، اتنی دیر تو میرے آقا کی بدگوئی سے باز رہتے ہیں۔

(۶) مولانا سید شاہ ابو سلمان محمد عبدالمنان قادری جو ابتداءً اعلیٰ حضرت کے مخالف تھے، انہوں نے یہ تحریری بیان دیا کہ ''اعلیٰ حضرت اخلاقِ نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک زندہ مثال ہیں۔ آپ کی زیارت نے تمام و کمال، فقیر پر یہ ثابت کردیا کہ جو کچھ بھی آپ کی تعریفیں ہوتی ہیں، وہ کم ہیں۔''

(۷) علماے اسلام کی توقیر و تعظیم میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ ہونے دیتے۔ علامہ شامی اور محقق علی الاطلاق جیسے اکابر کی باتوں پر کلام کرتے ہیں مگر ادب اور تواضع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ جبکہ آج اکابر پر اس طرح حرف گیری کی جاتی ہے کہ وہ طفلِ مکتب معلوم ہوں۔ یہ ان لوگوں کا حال ہے جنھیں امام احمد رضا کے علوم کا پچاسواں حصہ بھی نصیب نہیں۔ ایک جگہ ردالمحتار میں علامہ شامی نے فرمایا، اس اعتراض کا حل ہماری سمجھ میں نہ آیا۔ اعلیٰ حضرت نے جدّ الممتار میں اس پر لکھا۔ ''وظهر لنا ببركة خدمة كلماتكم'' آپ کے کلمات پر کام کرنے کی برکت سے ہمیں سمجھ میں آ گیا۔

(۸) ایک بار پیلی بھیت آتے وقت ٹرین میں تاخیر تھی، تو اسٹیشن پر آرام کرسی بیٹھنے کو دی گئی۔ فرمایا، یہ تو بڑی متکبرانہ کرسی ہے۔ تشریف رکھا مگر پشت نہ لگائی اور وظائف میں مشغول رہے۔

(۹) رمضان میں بعد افطار صرف پان کھالیتے اور سحری کے وقت ایک چھوٹے سے پیالے میں فیرنی تناول فرماتے۔ زمانہ اعتکاف میں ایک دن ملازم بچہ، دو گھنٹے کی تاخیر سے پان لے کر آیا۔ حضرت نے اس کو ایک چپت مار کر فرمایا، اتنی دیر میں لایا۔ اس ایک چپت مارنے پر انہیں رات بھر فکر رہی۔ آخر سحر کے وقت اسے بلوایا۔ اور فرمایا کہ ''رات جو تاخیر ہوئی اس میں تمہارا قصور نہ تھا، بھیجنے والے کی کوتاہی تھی۔ مجھ سے غلطی ہوئی کہ تمہیں چپت ماری۔ اب تم میرے سر پر چپت مارو۔ ٹوپی اُتار کر اصرار فرماتے رہے۔ بچہ دم بخود کانپنے لگا۔ ہاتھ جوڑ کر عرض کیا۔ حضور میں نے معاف کیا۔ فرمایا، تم نابالغ ہو۔ تمہیں معاف کرنے کا حق نہیں، چپت مارو۔ پھر اپنا بکس منگوا کر مٹھی بھر پیسے نکالے اور فرمایا، یہ پیسے تم کو دوں گا، چپت مارو۔ آخر خود اس کا ہاتھ پکڑ کر بہت سی چپتیں اپنے سر پر لگائیں۔ اور پھر اسے پیسے دے کر رخصت کیا۔

(۱۰) وقتِ وصال سے کچھ ایام پہلے کا چشم دید واقعہ مولانا جعفر شاہ پھلواروی لکھتے ہیں کہ نماز جمعہ کے بعد اپنے ضعف و مرض کی حالت میں، درد و اثر بھری آواز میں چند وداعی کلمات کچھ اس طرح کہے، ''میری طرف سے تمام اہلِ سنّت مسلمانوں کو سلام پہنچا دو۔ اور مَیں نے کسی کا قصور کیا ہے تو مَیں اس سے بڑی عاجزی سے، اِس کی معافی مانگتا ہوں۔ مجھے خدا کے لیے معاف کردو یا مجھ سے کوئی بدلہ لے لو۔'' (امام احمد رضا اور تصوف، ص ۵۹ تا ۶۶، ملخصاً)

ادب و تواضع جو اسلام کا خاص عنوان اور تصوف کی جان ہے، کاش ہمارے علما و صوفیا، درس گاہیں اور خانقاہیں پھر ان جوہروں سے آباد ہو جائیں۔ صرف ان دو چیزوں کے اُٹھ جانے سے۔ رہ گئی رسمِ اذاں روحِ بلالی نہ رہی، کا سماں نظر آنے لگا ہے۔ خانقاہوں میں مجاور رہ گئے یا گورکن کی کیفیت پیدا ہو چلی ہے۔ درسگاہ سے تجلیات اور خانقاہ سے تاثیرات رخصت ہو گئی ہیں۔ محبت، مروّت، وفا، شفقت ماضی کی روایات کے کھنڈرات میں جیسے گم ہیں۔ جہاں پیار کا ساگر چھلکتا تھا، وہاں ایک بوند کو لوگ ترس رہے ہیں۔ یہ ادب و تواضع ہی تھا جس نے تازندگی امام احمد رضا کو اخلاص پرست، اخلاق دوست اور انسانیت نواز رکھا، اور اولیاے کرام کی بارگاہ کا ایسا والہ و شیدا بنادیا کہ خاصانِ خدا پر کہیں سے بھی، کسی نے بھی، کوئی بھی جسارت کی تو فوراً دفاع فرمایا۔

ایک طرف شانِ اولیاے کرام کو مصنوعی تصوّف کی دہلیز پر بھینٹ چڑھنے سے بچایا تو دوسری طرف جرح و قدح کی صلیب پر صوفیاے اسلام کو مصلوب ہونے سے محفوظ رکھا۔

؎ بندہ مجبور ہے خاطر پہ ہے قبضہ تیرا یہ سرکار غوث اعظم کے ایک ارشاد کا ترجمہ ہے۔ بعض حضرات کو اس پر اعتراض ہوا۔ اسی طرح ؎ حاجیو! آؤ شہنشاہ کا روضہ دیکھو، میں لفظ شہنشاہ پر ایک صاحب کو ممانعت کا خدشہ ہوا۔ دونوں کا مفصل جواب ایک رسالے میں جمع فرما دیا۔ 'فقہ شہنشاہ وان القلوب بید المحبوب بعطاء اللہ' رسالہ کا نام ہے۔ اعتراض کے جواب میں دلائل کی موسلا دھار بارش اور بارگاہِ محبوبانِ خدا سے پیہم نوازش کا منظر دیکھنا ہو تو ایک بار وہ رسالہ ضرور پڑھیے۔ حضرت مخدوم جہاں، تاجدارِ بہار شیخ شرف الدین احمد یحیٰ منیری، فردوسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر کسی نے اعتراض کیا۔ اس کے جواب میں مکمل ایک رسالہ 'جحب العوار عن مخدوم بہار' تصنیف فرمایا۔ سارے اعتراض کی اس طرح قلعی کھول دی کہ معترض کو نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن کا وظیفہ یاد دلا دیا۔ اور حضور مخدوم بہار کی عظمت اپنی اصل شان و وقار کے ساتھ ضیا بار ہو گئی۔ کتاب کا ایک نسخہ لے کر بہار شریف تشریف لائے، اور بصد عقیدت آستانہ عرش نشان پر پیش فرمایا۔ بزرگانِ دین کی بارگاہ سے بے لوث عقیدت کا یہ صلہ آپ کو ملا کہ ان خاصانِ خدا نے بھی اپنی توجہ باطنی اور مرحمت خصوصی سے آپ کو خوب خوب نوازا۔ یہ الطاف خسروانہ نہیں تو اور کیا ہے کہ مزار کسی بھی بزرگ کا ہو، معمولاتِ اہلِ سنّت بجا لائیے تو لوگ کہتے ہیں، بریلوی ہے۔ اولیاے کرام کے کرم کی فصل ایسی لہلہائی خصوصاً تاج دارِ بغداد، قطب ربانی، حضور غوث اعظم جیلانی نے وہ توجہ فرمائی کہ اپنا نائب بنالیا۔ قطب الارشاد کے منصب پر فائز کردیا۔ مخدوم الملت حضور محدث اعظم ہند رضی اللہ عنہ رقم طراز ہیں:

''حضور شیخ المشائخ شاہ سید علی حسین اشرفی میاں، قدس سرہٗ العزیز وضو فرما رہے

تھے، کہ یکبارگی رونے لگے۔ یہ بات کسی کی سمجھ میں نہ آئی کہ کیا کسی کیڑے نے کاٹ لیا ہے؟ میں آگے بڑھا، تو فرمایا، بیٹا! میں فرشتوں کے کاندھے پر قطب الارشاد کا جنازہ دیکھ کر رو پڑا ہوں۔ چند گھنٹے کے بعد بریلی کا تار ملا، تو ہمارے گھر میں کہرام پڑ گیا، حضرات والد صاحب کی زبان پر بے ساختہ تاریخ وصال جاری ہوگئی، 'رحمۃ اللہ علیہ'۔"

(قاری کا امام احمد رضا نمبر، ص ۲۵۹)

اس واقعہ سے متحقق ہوگیا کہ منزلِ ولایت میں اعلیٰ حضرت مرتبۂ قطب الارشاد پر فائز ہیں۔ بہت سے واقعات اس سلسلے میں موجود ہیں کہ اربابِ باطن کو سرکارِ غوثیت سے یہی بتایا گیا کہ ہمارا نائب بریلی میں احمد رضا ہے۔ مبلغ اسلام حضرت علامہ عبدالعلیم صدیقی نے بھی اس طرف اشارہ کیا ہے ۔

تمہیں پھیلا رہے ہو علمِ حق اکناف عالم میں　　امامِ اہلِ سُنّت نائبِ غوث الوریٰ تم ہو

قطب کون ہوتا ہے، اس کے فرائض کیا ہوتے ہیں، اس کا دائرۂ کار و اختیار کیا ہوتا ہے، نائب غوث اعظم ہونا کتنا عظیم منصب ہے؟ ان سب پر سلطان التارکین حضرت سید مخدوم اشرف جہانگیر سمنانی رحمۃ اللہ علیہ "لطائف اشرفیہ" میں یوں روشنی ڈالتے ہیں:

"حق تعالیٰ نے بعض اولیا کو اپنی بارگاہِ عالی کا نائب بنایا ہے۔ اور انہیں اہلِ عالم کے اُمور کی اصلاح، و بنی آدم کے حاجات کی تدبیر و تکمیل کا کام سونپا ہے۔ یہ حضرات امور کی انجام دہی میں باہم ایک دوسرے کے محتاج اور ایک دوسرے کے تعاون سے کام کرنے والے ہوتے ہیں۔ البتہ قطب تمام اہلِ عالم میں سے وہ ذاتِ واحد ہے، ہر وقت زمانے میں جس پر اللہ کی نظر رہتی ہے۔ اور وہ اسرافیل علیہ السلام کے قلب پر ہوتا ہے۔ وہ قطبیت کبریٰ جو قطب الاقطاب کا مرتبہ ہے، پر فائز ہوتا ہے۔ اور یہ باطنی نبوت ہے۔ پس وہ یعنی قطب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اکملیت کے ساتھ مختص ہونے کی وجہ سے آپ کے باطن پر، اور آپ کا وارث ہوتا ہے۔

جب تک یہ ولایت میں قطب نہ ہوں، برکات و حسنات کا ظہور اور دنیاوی معاملات کی درستگی ممکن نہ ہوگی۔ واصلین بارگاہِ الٰہیہ جو اہل اللہ ہیں، دو قسم پر ہیں۔ ان میں سے ایک قسم وہ ہے، جنہیں دنیا کی محبت سے کوئی تعلق نہیں۔ احوالِ شریعت پر سلامتی کے ساتھ چلتے ہیں۔ دوسری قسم وہ ہیں جنہوں نے دنیا کو طالبانِ دنیا کے لیے چھوڑ دیا ہے، اور آخرت کو مؤمنوں پر ایثار کردیا ہے۔ اور حق تعالیٰ کے مشاہدے میں مستغرق رہتے ہیں۔ انہیں کے

لیے قطبیت کے مراتب ہیں۔ دنیا کا حل وعقد، انہیں کے ہاتھوں میں ہوتا ہے۔ وہی دعوت الی اللہ کے اہل ہوتے ہیں۔ جب دین کے معاملے میں کوئی خرابی دیکھتے ہیں، اسے دور کرنا چاہتے ہیں۔ البتہ قطب الاقطاب تمام عالم میں ایک شخص ہوتا ہے، چند ہم معنی الفاظ اس متبرک نام کے لیے بولے جاتے ہیں، غوث اعظم، قطب الدائرہ، انسانِ کامل، قطب الاقطاب، قطب الاعلیٰ، مظہر کلی، جہانگیر۔کوئی اُمّت چار سو ابدالوں سے خالی نہیں رہتی۔ ان چار سو میں سے چالیس اوتاد ہیں۔ ان چالیس میں سے چار نقبا ہیں۔ ان چار میں سے ایک قطب ہے۔ اور کافروں کی سلامتی مؤمنوں کی برکت سے۔ اوتاد کی سلامتی نقبا کی برکت سے اور نقبا کی سلامتی قطب کی برکت سے۔"

(لطائف اشرفی، ملخصاً، ص ۵٦ تا ۸۴)

حضور مخدوم سمنانی کے اس گلریز، فکر خیز اور معلومات انگیز بیان سے اتنا ہر کوئی سمجھ سکتا ہے کہ قطب، نائب غوث اعظم ہوتا ہے۔ اس کے فرائض واختیارات اتنے وسیع اور وقیع ہوتے ہیں کہ زمانے کی طناب اس کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ ملکی وملی انتظام کی باگ ڈور ان کے قبضے میں رہتی ہے۔ حالات میں انقلاب ان کے اشارے اور ایما سے آتا ہے۔ بحیثیت قطب اعلیٰ حضرت جب نائب غوث اعظم ہیں تو ان تصرّفات واختیارات کی روشنی میں اُن کی حیات اور کارناموں کو دیکھنا اور سمجھنا چاہیے۔ ان کی زندگی کا مطالعہ صرف مولانا یا امام کی حیثیت سے نہیں بلکہ صوفیِ باصفا، نائبِ غوث الوریٰ کی حیثیت سے ہونا چاہیے۔ تبھی جا کر ان کی قرار واقعی عظمت کا اعتراف ہوگا۔ ان کے اختیارات وتصرّفات سے کماحقہٗ آگہی مل سکے گی۔

اسی طریقے سے ان کی ذات کا عرفان اور صفات سے انصاف ہو پائے گا۔ یہاں پر یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ جو جس کا نائب ونمائندہ ہوتا ہے، وہ ہر لحہ اس کی فکر ونظر میں ہوتا ہے۔ نائب کی تعریف سے اصل کو خوشی ہوتی ہے اور اس کی دل آزاری سے اصل کو بے زاری۔ تو ظاہر ہے بحیثیت نائب غوث اعظم اعلیٰ حضرت کی تعریف وتحسین سے غوث اعظم یقیناً خوش ہوں گے اور اُن کی توہین یا تضحیک سے بلاشبہ غوث اعظم ناراض۔ اب اگر کسی کو یہ دیکھنا ہو کہ غوث اعظم اس سے خوش ہیں یا ناراض، تو وہ اپنا محاسبہ کرے کہ اعلیٰ حضرت اس سے راضی ہیں یا ناراض۔ راضی کرنے کے جو اسباب ہیں ان کو نظر میں رکھے، عمل میں لائے۔ اور ناراض کرنے کے جو وجوہات ہیں ان سے حتی المقدور دور رہے، گریز کرے۔ ورنہ۔

خدا پناہ میں رکھے جلالِ مومن سے نگاہ بدلی کہ عالم میں انقلاب ہوا

اسی لیے اعلیٰ حضرت کے ہم عصر تمام علما و مشائخ اپنی آسمان چھوتی عزت و شہرت کے باوصف اعلیٰ حضرت کے مدّاح ہی نظر آتے ہیں۔ شمع رضا کے گرد ہالہ و پروانہ بننے ہی میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ مبلغ اسلام حضرت علامہ عبدالعلیم صدیقی فرماتے ہیں۔

ہیں سیارہ صفت گردش کناں اہلِ طریقت یاں وہ قطب وقت اے سرخیل جمع اولیا تم ہو

امام احمد رضا نے فنا فی الغوث ہو کر خود کو فنا فی الرسول کرلیا تھا۔ اکثر مشائخ کی رائے ہے کہ جب کوئی خوش نصیب عاشق فنا فی الرسول کا عظیم منصب پالیتا ہے۔ تو سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا جلوہ ہر وقت اس کے سامنے رہتا ہے۔ اسی لیے اعلیٰ حضرت ہر وقت سرشارِ ذکر مصطفےٰ رہتے۔ اپنی ہر ادا کو ادائے رسول کے مطابق ڈھالنے میں لگے رہتے۔ اطاعتِ رسول کی انہوں نے ایسی مثال قائم کی ہے جو رہتی دنیا تک باعثِ صد رشک و تقلید رہے گی۔ شریعت کی پابندی نے طریقت کے دَر وا کردیے۔ طریقت نے حقیقت کی منزل آئینہ کردی۔ حقیقت نے جلوۂ محبوب میں گم کرکے معرفت کی لذت سے آشنا کردیا۔

کہتے ہیں کہ وہ جس راہ سے گزر جاتا ہے اس راہ کے در و دیوار ذاکر ہوجاتے ہیں۔ وہ صوفی باصفا امام احمد رضا، جس نے اپنا انوکھا بچپن، نرالی جوانی اور انمول بڑھاپا، جس شہر میں گزارا ہو، اور تقریباً ۶۵ سال جس سرزمین کو اپنی فکرِ نو بہار اور علم شاہ کار سے سینچا ہو، جہاں ملک العلما جیسے نابغہ فاضل، صدر الشریعہ جیسے عظیم فقیہ اور صدر الافاضل جیسے عہد ساز مدبّر ڈھلتے ہوں۔ جہاں علما، عرفا اور صوفیا کی بارات پر بارات اُترتی ہو، اہلِ دل کے جمگھٹے لگے رہتے ہوں۔ اس شہرِ محبت کی عظمت کو سمجھنے کے لیے اتنا کافی ہے کہ وہ عالمِ اسلام کے سُنّی مسلمانوں کا مرکزِ عقیدت ہے۔ کسی بھی عوامی جلسے میں آپ پکاریئے ''ہمارا مرکز'' ہر چہار جانب سے یہی جواب آئے گا ''بریلی شریف''۔ بریلی کے جن ذرّوں کو امام احمد رضا نے اپنے تلوا کا جلوہ بخش دیا تھا وہ آج بھی شمس و قمر سے آنکھ مچولی کررہے ہیں۔

جن ذرّوں نے بوسے تیرے قدموں کے لیے تھے
ان ذرّوں کو سورج کی کرن چوم رہی ہے

چند تاثرات

○ فضیلۃ الشیخ کریم اللہ، مہاجر مدنی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

''میں سالہا سال سے مدینہ منورہ میں قیام پذیر ہوں۔ ہندستان سے ہزارہا انسان آتے ہیں۔ جن میں علما، صلحا، اتقیا سبھی ہوتے ہیں۔ لیکن میری آنکھوں نے یہی دیکھا کہ وہ شہر مبارک کی

گلیوں میں پھرتے رہتے ہیں۔ اور کوئی توجہ دینے والا نہیں ہوتا، لیکن آپ (امام احمد رضا) کے اعزاز کا یہ حال ہے کہ عوام تو عوام، بڑے بڑے علما اور اربابِ علم وفن، اصحابِ عزت وعظمت، آپ کی طرف چلے آرہے ہیں اور آپ کے اکرام وتعظیم میں سبقت کرتے ہیں۔ یہ اللہ کا فضل ہے، جسے چاہے عطا فرمائے۔" (الاجازۃ المتینہ، ص ۷)

○ علامہ سید شاہ محمد قاسم رضوی، قتیل داناپوری، پٹنہ، بہار:

"حضرت امام احمد رضا خاں صاحب قدس سرہ، انوارِ طریقت سے بھی بھرپور ہیں۔ اور آج تک اُن کا فیض جاری ہے۔ بلکہ حق تو یہ ہے کہ آپ مجمع البحرین ہیں۔ یعنی شریعت وطریقت کے سنگم ہیں ...... آپ کے مریدین ومتوسلین کی تعداد، اللہ ہی جانے، آپ کی تصانیف نظم ونثر سے صاف ہے کہ آپ مقام، 'فنا فی الرسول' میں ہیں۔" (انوارِ رضا، ص ۳۸۹)

○ حضرت علامہ محمد جلال الدین علیہ الرحمہ، کھاریاں، گجرات:

"امام احمد رضا سلسلۂ قادریہ کی ایک اہم کڑی ہیں۔ آپ کے خلفا ومتوسلین نے نہ صرف برصغیر میں، بلکہ اقصائے عالم میں علم وعرفان کی دنیا آباد کی۔ مسلم دنیا کی اکثر آبادی میں آپ کے انوار پھیلے ہوئے ہیں۔...... تصوف کی زبان اور اصطلاح میں آپ کے منصب کو اُجاگر کیا جائے، تاکہ عامۃ الناس پر بھی واضح ہو کہ اس دور میں، غوث اعظم کے نائب اعظم، امام احمد رضا قادری ہیں۔"

(تذکرہ مشائخ قادریہ رضویہ، ص ۳۵)

○ ڈاکٹر محی الدین الوائی، جامعہ ازہر، مصر (جو مسلکا اہلِ حدیث ہیں):

"مولانا احمد رضا بچپن ہی سے دنیاوی آرائشوں کی طرف ملتفت نہ تھے۔ لوگوں سے ملاقات ومعاملات میں حلم، تواضع، بلند اخلاق سے پیش آتے، .... آپ کی علمی سرگرمیوں میں تصوف، اتقا، پرہیزگاری کے بہترین نمونے ہیں، جس کی بنا پر آپ بہت جلد سارے برصغیر میں مشہور ہوگئے۔ اور آپ کے پاس نور ومعرفت کے پروانے ہر طرف آنے لگے۔" (انوارِ رضا، ص ۶۷۸)

○ ڈاکٹر اعجاز مدنی، لائبریرین برہانی کالج، ممبئی:

"اعلیٰ حضرت کی تعلیمات اور تصوف پر ان کے فکر انگیز ملفوظات، بہت گہرے مطالعہ ومشاہدہ کی دین ہیں۔ اس احتیاط وتوازن کے ساتھ آپ نے کلماتِ حکمت فرمائے ہیں کہ ذرہ برابر تنقید کی گنجایش نہیں۔ اگر سالک صدقِ دل سے آپ کی راہ پر سفر اختیار کرے اور بزرگوں سے سچی نسبت پیدا کرے تو اس کی منزل، اس دورِ ابتلا وآزمایش میں بھی کامیابی سے ہم کنار ہوسکتی ہے۔"

(تذکرہ مشائخ قادریہ رضویہ، ص ۴۴۶)

امام احمد رضا کے عادات و خصائل

از: مولانا محمد مجاہد حسین حبیبی قادری،
رکن آل انڈیا تبلیغ سیرت، بنگال

قبلۂ دین و کعبۂ ایماں، اعلیٰ حضرت مجدد ملت، راحتِ قلب و رحمتِ یزداں اعلیٰ حضرت زہد و تقویٰ، عشق و الفت کی آپ کی ذات اک مرقع تھی۔ جس کا کوئی مقابل نہیں۔ ہاں، اعلیٰ حضرت مجدد ملت شیخ الاسلام والمسلمین، عاشقِ محبوبِ رب العالمین حضرت علامہ الحاج الشاہ محمد احمد رضا خاں عبدالمصطفیٰ فاضل بریلوی علیہ الرحمہ کی ذات ستودہ صفات بلاشبہ اسلامیانِ عالم کے لیے عظیم ترین نعمتِ خداوندی ہے۔ خلاقِ عالم نے آپ کے سر مجددیت کا سہرا باندھ کر خلق کی رشد و ہدایت کا بار گراں سپرد فرمایا۔ دیکھنے میں تو آپ ایک فرد تھے لیکن اپنی ذات میں انجمن تھے۔ درجنوں علوم و فنون کے حامل اور منفرد تھے۔ جس زاویے یا جس جہت سے دیکھا جائے، آپ اپنی مثال آپ تھے۔ آپ کی زندگی کا مرکز و محور سرکار رسالت مآب ﷺ کی محبت تھا۔ جس پر آپ کی جملہ تصانیف و کتب شاہد عدل ہیں۔

ایک طرف جہاں آپ کا نعتیہ دیوان "حدائق بخشش" اس کا جیتا جاگتا نمونہ ہے، وہیں دوسری طرف آپ کا ترجمۂ قرآن کنزالایمان شانِ الوہیت اور سرکار رسالت مآب ﷺ کی حرمت و عظمت کا محافظ و نگہبان ہے۔ فتاویٰ رضویہ اور دیگر کتب بھی اپنی نظیر آپ ہیں۔ دانش ورانِ قوم اور اہلِ علم حضرات نے آپ کی تصانیف کے مطالعہ کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ پچھلی کئی صدیوں میں آپ جیسا نابغۂ روزگار پیدا نہیں ہوا۔ اس حقیقت کا اعتراف جہاں اپنوں کو ہے، وہیں اغیار نے بھی اس حقیقت کا برملا اعتراف کیا ہے۔ گویا آپ کی غیر معمولی ذہانت و فطانت اور استحضارِ علم مسلمات میں سے ہیں۔ فضل و کمال کے ایسے بلند مقام پہ فائز ہونے کے باوجود آپ حد درجہ خوش اخلاق اور منکسر المزاج تھے۔ عاجزی و فروتنی آپ کے رگ رگ میں سمائی ہوئی تھی۔ غربا پروری اور دیگر محتاجوں اور ضرورت مندوں کی امداد کا جذبۂ صادقہ آپ کے انگ انگ میں بسا تھا۔ کسر نفسی کا یہ عالم کہ حجام تک کو بھائی کہہ کر مخاطب فرماتے۔ غرضیکہ ان کی ہر ہر ادا آقائے کریم ﷺ کی سنتِ مبارکہ کی سچی تصویر تھی۔ آیئے اسی پاکیزہ ہستی کے عادات و خصائل کے چند درخشاں پہلوؤں کا جائزہ لیں اور ان پہلوؤں کی سیابار کرنوں سے اپنی تاریک زندگی کو منور کریں۔

ان کا سایہ اک تجلی ان کا نقشِ پا چراغ
وہ جدھر گزرے ادھر ہی روشنی ہوتی گئی

نماز اور جماعت کا اہتمام:

آپ تندرست و توانا ہوں یا بیمار، ہمیشہ نماز، پنج گانہ باجماعت ادا فرمانے کے عادی تھے۔ مریدین و متوسلین اور عقیدت مندوں کو بھی نماز باجماعت ادا کرنے کی خصوصی ہدایت فرماتے تھے۔ ملک العلما علامہ ظفر الدین بہاری تحریر فرماتے ہیں کہ

''ایک دفعہ اعلیٰ حضرت سخت بیمار تھے۔ نشست و برخاست کی بالکل طاقت نہ تھی۔ اس کے باوجود فرض نماز مسجد میں باجماعت ادا کرتے تھے۔ انتظام یہ تھا کہ کرسی میں لکڑی باندھ کر چار آدمی آپ کو مسجد میں لے جاتے اور بعد نماز دولت خانہ میں پہنچا دیتے۔ بارہا میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ اس نازک حالت میں بھی آپ کھڑے ہوکر نماز پڑھنے کا ارادہ کرتے، طاقت نہ دیکھتے ہوئے مجبوراً بیٹھ کر پڑھنی پڑتی۔ لیکن ایسی حالت میں بھی دونوں پیروں کی انگلیوں کے پیٹ زمین پر لگانے کی بے حد سعی فرماتے۔''

(حیاتِ اعلیٰ حضرت (قدیم نسخہ)، از ملک العلما ظفر الدین بہاری)

اللہ! اللہ! یہ تھا نماز اور جماعت سے آپ کا والہانہ رشتہ کہ کسی بھی صورت میں نماز تو نماز، جماعت تک نہ چھوٹے۔ لیکن یہ کوئی اکیلا واقعہ نہیں۔ اسی قسم کا ایک اور واقعہ مولانا حسنین رضا خاں نے اپنی کتاب میں تحریر کیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ

''اعلیٰ حضرت قبلہ کا ایک سال پاؤں کا انگوٹھا پک گیا۔ ان کے خاص جراح جو شہر میں سب سے ہوشیار جراح تھے، جن کو بعض سول سرجن بھی خطرناک آپریشن میں شریک کرتے تھے۔ انھوں نے اعلیٰ حضرت کا آپریشن کردیا۔ پٹی باندھنے کے بعد انھوں نے عرض کیا کہ حضور اگر حرکت نہ کریں گے تو یہ زخم دس بارہ روز میں خشک ہوسکے گا، ورنہ زیادہ وقت لگے گا۔ وہ یہ کہہ کر چلے گئے۔ یہاں یہ ممکن تھا کہ مسجد کی حاضری اور جماعت ترک کردی جائے۔ یہ صبح کا وقت تھا۔ جب ظہر کا وقت آیا، آپ نے وضو کیا اور کھڑے نہ ہوسکتے تھے تو بیٹھ کر پھاٹک تک آگئے۔ وہیں سے لوگوں نے کرسی پر بٹھا کر مسجد تک پہنچا دیا۔ اس وقت اہلِ محلہ اور خاندان وغیرہ نے یہ طے کیا کہ علاوہ مغرب کے ہر اذان کے بعد ہم سب میں سے چار مضبوط آدمی کرسی لے کر زنانہ میں

حاضر ہوجایا کریں گے اور پلنگ ہی پر سے کرسی پر بٹھا کر مسجد کی محراب کے قریب بٹھادیا کریں گے۔ اور مغرب کے وقت، وقت کے اندازے سے حاضر ہوجایا کریں گے۔ یہ سلسلہ بڑی پابندی سے چلتا رہا۔ جب زخم اچھا ہوگیا اور آپ خود سے چلنے کے عادی ہوگئے تو یہ سلسلہ ختم ہوا۔ نماز تو نماز ہے، ان کی جماعت کا ترک بھی بلا عذر شرعی کسی صاحب کو یاد نہ ہوگا۔''

(سیرتِ اعلیٰ حضرت مع کرامات، از: مولانا حسنین رضا خان، ص ۸۸)

مذکورہ بالا دونوں واقعات نہایت ہی ایمان افروز اور سبق آموز ہیں۔ عامۃ الناس اور خواص ہر دو طبقے کے افراد کو ان سے عبرت حاصل کرنی چاہیے۔

احترامِ مسجد:

مسجد خانۂ خدا، عبادت کی جگہ اور شعائر اللہ میں سے ہے۔ اور شعائر اللہ کا احترام تقویٰ کی علامت ہے۔ اسی لیے اعلیٰ حضرت امام احمد رضا مسجد کے جملہ آداب کا خاص خیال رکھتے تھے۔ جس پر آپ کے معمولات شاہد عدل ہیں۔ چنانچہ علامہ ظفر الدین بہاری تحریر فرماتے ہیں کہ

''ایک مرتبہ سیدی امام احمد رضا خاں مسجد میں معتکف تھے۔ سردی کا موسم تھا اور دیر سے مسلسل بارش ہورہی تھی۔ حضرت کو نمازِ عشا کے لیے وضو کی فکر ہوئی۔ پانی تو موجود تھا لیکن بارش سے بچاؤ کی کوئی جگہ ایسی نہ تھی جہاں وضو کرلیا جاتا کیونکہ مسجد میں مستعمل پانی کا ایک قطرہ تک گرانا بھی جائز نہیں ہے۔ آخر کار مجبور ہوکر مسجد کے اندر ہی لحاف اور گدّے کی چار تہہ کرکے ان پر وضو کرلیا اور ایک قطرہ تک فرشِ مسجد پر گرنے نہیں دیا۔ سردیوں کی رات، جس میں طوفانِ بادوباراں کے اضافات، مگر خود اتنی سردی میں ٹھٹھرتے ہوئے رات گزارنی منظور کی لیکن ایسی دشواری میں بھی مسجد کی اتنی سی بے حرمتی برداشت نہ کی۔''

(حیاتِ اعلیٰ حضرت، (قدیم نسخہ) از: ملک العلما علامہ ظفر الدین بہاری)

یہ امر واقعی ہے کہ جو فنا فی اللہ و فنا فی الرسول کے عہدۂ جلیلہ پر فائز ہوجاتا ہے، اسے اپنی راحت کا ذرّہ برابر خیال نہیں رہتا۔ اتباعِ شریعت و سنّت کے سامنے ہر چیز ہیچ ہوجاتی ہے۔ اسی بات کا ثبوت اعلیٰ حضرت نے اپنے عمل کے ذریعے دیا ہے۔

آپ کے احترامِ مسجد کا ایک اور واقعہ حسب ذیل ہے۔ علامہ ظفر الدین بہاری تحریر فرماتے ہیں:

''ایک دفعہ فریضۂ فجر ادا کرنے میں خلافِ معمول کسی قدر دیر ہوگئی۔ نمازیوں کی نظر

بار بار کاشانۂ اقدس کی طرف اُٹھ رہی تھیں کہ اسی اثنا میں آپ جلدی جلدی تشریف لاتے ہوئے دکھائی دیے۔ اس وقت برادرم سید قناعت علی نے اپنا یہ خیال مجھ پر ظاہر کیا کہ اس تنگ وقت میں دیکھنا یہ ہے کہ حضرت دایاں قدم مسجد میں پہلے رکھتے ہیں یا بایاں؟ لیکن قربان جائیں اس عاشقِ رسول اور متبع سُنّت کے، کہ دروازۂ مسجد کے زینے پر جس وقت قدم مبارک رکھا تو دایاں، توسیعی فرشِ مسجد پر قدم پہلے رکھا تو دایاں، قدیمی فرشِ مسجد پر بھی پہلے دایاں قدم رکھا، یونہی ہر صف پر تقدیم دائیں قدم ہی سے فرمائی۔ حتیٰ کہ محراب میں مصلّٰی پر دایاں قدم ہی پہلے پہنچا۔"

(حیاتِ اعلیٰ حضرت (قدیم نسخہ)، از: ملک العلما، ص ۱۷۷)

اللہ! اللہ! یہ ادب و احترام اور اس قدر سختی سے اتباعِ سُنّت کا اہتمام ایک مجدّد ہی کی شان ہوسکتی ہے۔ آپ جہاں خود مسجد کی تکریم فرماتے، وہیں دوسروں کو بھی اس کی تنبیہ فرمایا کرتے تھے۔ ملک العلما علامہ ظفر الدین بہاری رقم فرماتے ہیں کہ

"ایک صاحب جنھیں نواب صاحب کہا جاتا تھا، مسجد میں نماز پڑھنے آئے اور کھڑے کھڑے بے پروائی سے اپنی چھڑی مسجد کے فرش پر گرادی، جس کی آواز حاضرینِ مسجد نے سُنی۔ اعلیٰ حضرت نے فرمایا: نواب صاحب مسجد میں زور سے قدم رکھ کر چلنا بھی منع ہے۔ پھر کہاں چھڑی کو اتنے زور سے ڈالنا؟ نواب صاحب نے میرے سامنے عہد کیا کہ ان شاء اللہ تعالیٰ آیندہ ایسا نہیں ہوگا۔"

(حیاتِ اعلیٰ حضرت (قدیم)، از: ملک العلما ظفر الدین بہاری، ص ۱۷۹)

احترامِ سادات:

حضور نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی اولاد امجاد یعنی ساداتِ کرام کا اعلیٰ حضرت امام احمد رضا حد درجہ اکرام و احترام فرماتے تھے۔ ذیل کے واقعات سے ان کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ملک العلما علامہ ظفر الدین بہاری علیہ الرحمہ تحریر فرماتے ہیں کہ

"ایک نوعمر لڑکا اُمورِ خانہ داری میں امداد کے لیے اعلیٰ حضرت کے گھر ملازم ہوگیا۔ کچھ دنوں بعد اعلیٰ حضرت کو معلوم ہوا کہ نیا ملازم تو سیّد زادہ ہے۔ آپ نے تمام اہلِ خانہ کو تاکید کی کہ خبردار! اس سیّد لڑکے سے کوئی کام مطلقاً نہ لیا جائے۔ کیونکہ یہ مخدوم زادہ ہیں۔ بلکہ ان کی خاطر تواضع میں کسی طرح کی کمی نہ آئے۔ ان کی حسب منشا ہر چیز خدمت میں پیش کرتے رہنا۔ غرضیکہ صاحب زادے کو پورا پورا آرام

پہنچایا جائے۔ تنخواہ جو مقرر کی ہے وہ حسبِ وعدہ دیتے رہنا لیکن تنخواہ سمجھ کر نہیں بلکہ بطور نذرانہ پیش ہوتا رہے۔"

(حیاتِ اعلیٰ حضرت (قدیم)، از: ملک العلما ظفر الدین بہاری، ص ۲۰۱)

اسی نوعیت کا ایک اور واقعہ ہدیۂ قارئین ہے۔ پڑھیے اور سیدوں کے تعلق سے اعلیٰ حضرت کے والہانہ لگاؤ کا اندازہ لگائیے۔

"کسی روز ایک سیّد صاحب نے زنان خانے کے دروازے پر آکر آواز دی "دلواؤ سیّد کو" اعلیٰ حضرت نے اپنی آمدنی سے اخراجاتِ اُمورِ دینیہ کے لیے دو سو روپے ماہ وار مقرر فرمائے تھے۔ اس ماہ کی رقم اسی روز آپ کو ملی تھی۔ سیّد صاحب کی آواز سنتے ہی فوراً وہ روپوں والا آفس بکس لے کر دوڑے اور سیّد صاحب کے سامنے پیش کر کے فرمایا: حضور یہ نذرانہ حاضر ہے۔ سیّد صاحب کافی دیر تک اس رقم کو دیکھتے رہے، پھر ایک چوّنی اُٹھا کر فرمایا "بس لے جایئے" اعلیٰ حضرت نے خادم سے فرمایا۔ جب ان سیّد صاحب کو دیکھو تو فوراً ایک چوّنی ان کی نذر کر دینا تاکہ انھیں سوال کرنے کی زحمت نہ اُٹھانی پڑے۔"

(مجدّدِ اسلام، از: مولانا محمد صابر نسیم بستوی، ص ۱۶۲)

مندرجہ بالا دونوں واقعات سے بخوبی سمجھا جاسکتا ہے کہ سادات کی تعظیم وتکریم میں آپ کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتے تھے۔ نشست و برخاست بلکہ ہر معاملے میں سادات کا خاص خیال رکھا کرتے تھے۔ علامہ ظفر الدین بہاری تحریر فرماتے ہیں کہ

"اعلیٰ حضرت کے یہاں دستور تھا کہ میلاد شریف کے موقع پر سیّد حضرات کو آپ کے حکم سے دوگنا حصہ ملا کرتا تھا۔ ایک دفعہ سیّد محمود جان صاحب کو تقسیم کرنے والے کی غلطی سے اکہرا حصہ ملا۔ اعلیٰ حضرت کو معلوم ہوا تو فوراً تقسیم کرنے والے کو بلوایا اور اس سے ایک خوان شیرینی کا بھروا کر منگوایا۔ پھر معذرت چاہتے ہوئے سیّد صاحب موصوف کی نذر کیا اور تقسیم کرنے والے کو ہدایت کی کہ آیندہ ایسی غلطی کا اعادہ نہ ہو۔ کیونکہ ہمارا کیا ہے، سب کچھ ان حضرات کے ہی عالی گھرانے کی بھیک ہے۔"

(حیاتِ اعلیٰ حضرت (قدیم نسخہ)، از: ملک العلما ظفر الدین بہاری، ص ۲۰۳)

"ایک دفعہ نمازِ جمعہ کے بعد ایک طالب علم نے ایک سیّد صاحب کو نام لے کر پکارا "قناعت علی، قناعت علی"۔ اعلیٰ حضرت نے پکارنے والے طالب علم کو بلایا اور فرمایا

کہ: عزیزم سیّد صاحب کو اس طرح پکارتے ہو۔ سادات کی تعظیم کا آیندہ خیال رکھیے اور جس عالی گھرانے کے یہ افراد ہیں اس کی عظمت کو ہمیشہ پیش نظر رکھیے۔ اس کے بعد حاضرین کو مخاطب کر کے فرمایا کہ سادات کا اس درجہ احترام ملحوظ رکھنا چاہیے کہ قاضی اگر کسی سیّد پر حد لگائے تو یہ خیال تک نہ کرے کہ مَیں اسے سزا دے رہا ہوں بلکہ یوں تصوّر کرے کہ شہزادے کے پیروں میں کیچڑ بھر گئی ہے، اسے دھو رہا ہوں۔"

(حیاتِ اعلیٰ حضرت (قدیم)، از: ملک العلما ظفر الدین بہاری، ص۲۰۴)

تیری نسلِ پاک میں ہے بچّہ بچّہ نور کا تو ہی عین نور تیرا سب گھرانہ نور کا

والدہ کا احترام:

مذہب اسلام نے والدین کو جن اعزازات سے نوازا ہے اس سے بھلا کس کو انکار ہوسکتا ہے۔ سرکارِ دوعالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس نے اپنے والدین کو راضی کرلیا، اس نے اللہ کو راضی کرلیا۔ بایں وجہ سرکارِ اعلیٰ ہمیشہ والدین کی تکریم فرماتے رہے۔ والد صاحب علیہ الرحمہ کے انتقال کے بعد ہر کام سے پہلے والدہ سے اجازت لیتے۔

"حضرت شاہ اسماعیل حسن میاں صاحب کا بیان ہے کہ جب مولانا (اعلیٰ حضرت) کے والد ماجد نقی علی خان صاحب (التوفی ۱۲۹۷ھ/ ۱۸۸۰ء) کا انتقال ہوا۔ اعلیٰ حضرت اپنے حصۂ جائداد کے خود مالک تھے مگر سب اختیار والدہ ماجدہ کے سپرد تھا۔ وہ پوری مالکہ اور متصرفہ تھیں۔ جس طرح چاہتیں صرف کرتیں۔ جب مولانا کو کتابوں کی خریداری کے لیے کسی غیر معمولی رقم کی ضرورت پڑتی تو والدہ ماجدہ کی خدمت میں درخواست کرتے اور اپنی ضرورت بتاتے۔ وہ اجازت دیتیں اور درخواست منظور کرتیں تو کتابیں منگواتے۔"

(حیاتِ اعلیٰ حضرت (قدیم)، از: ملک العلما ظفر الدین بہاری، ص۴۲)

احترامِ والدہ کا ایک اور بے مثال واقعہ پیش خدمت ہے۔ حضرت مولانا حسنین رضا خاں تحریر فرماتے ہیں کہ

"اعلیٰ حضرت قبلہ حضرت حجۃ الاسلام کو گھر کے والان میں پڑھانے بیٹھے، وہ پچھلا سبق سُن کر آگے سبق دیتے تھے۔ پچھلا سبق جو سُنا، تو وہ یاد نہ تھا۔ اس پر اُن کو سزا دی۔ اعلیٰ حضرت کی والدہ محترمہ جو دوسرے والان کے کسی گوشے میں تشریف فرما

تھیں، انھیں کسی طرح اس کی خبر ہوگئی۔ وہ جدہ الاسلام کو بہت چاہتی تھیں، غصہ میں بھری ہوئی آئیں اور اعلیٰ حضرت قبلہ کی پشت پر ایک دو ہنٹر مارا اور فرمایا، تم میرے حامد کو مارتے ہو۔ اعلیٰ حضرت فوراً جھک کر کھڑے ہوگئے اور اپنی والدہ محترمہ سے عرض کیا کہ امّاں اور ماریئے۔ جب تک آپ کا غصہ فرو نہ ہو۔ یہ کہنے کے بعد انھوں نے ایک دو ہنٹر مارا۔ اعلیٰ حضرت سر جھکائے کھڑے رہے۔ یہاں تک کہ وہ خود واپس تشریف لے گئیں۔ اس وقت تو جو غصہ ہونا تھا ہوگیا، مگر اس واقعہ کا ذکر جب کرتیں تو آب دیدہ ہوکر فرماتیں کہ دو ہنٹر مارنے سے پہلے میرے ہاتھ کیوں نہ ٹوٹ گئے کہ ایسے مطیع و فرماں بردار بیٹے کو جس نے خود کو پٹنے کے لیے پیش کر دیا، دوسرا ہنٹر کیسے مارا۔"

(سیرتِ اعلیٰ حضرت مع کرامات، از: مولانا حسنین رضا خان، ص ۹۱)

غریبوں کی امداد و اعانت:

اعلیٰ حضرت کی زندگی غربا پروری اور اُن کی امداد و اعانت سے عبارت تھی۔ آپ بلاتردّد اہلِ ضرورت کی امداد فرمایا کرتے تھے۔ اس سلسلے میں آپ اپنی نجی ضرورت کی چیزیں بھی ضرورت مندوں کو دینے سے گریز نہیں فرمایا کرتے تھے۔ اس سلسلے میں چند واقعات ہدیۂ قارئین ہیں۔ پڑھیے اور سبق حاصل کیجیے۔

"جناب ذکاء اللہ خاں صاحب کا بیان ہے کہ سردی کا موسم تھا۔ بعد نمازِ مغرب اعلیٰ حضرت حسبِ معمول پھاٹک میں تشریف لاکر سب لوگوں کو رخصت کر رہے تھے۔ خادم کو دیکھ کر فرمایا: آپ کے پاس رزائی نہیں ہے؟ مَیں خاموش ہو رہا۔ اس وقت اعلیٰ حضرت جو رزائی اوڑھے ہوئے تھے، وہ خادم کو دے کر فرمایا کہ اسے اوڑھ لیجیے۔ خادم نے بصد ادب و احترام قدم بوسی کی سعادت حاصل کی اور فرمانِ مبارک کی تعمیل کرتے ہوئے وہ رزائی اوڑھ لی۔"

(حیاتِ اعلیٰ حضرت (قدیم)، از: ملک العلما ظفرالدین بہاری، ص ۵۰)

اسی طرح کا ایک اور واقعہ پیشِ خدمت ہے، جو مذکورہ بالا واقعہ کے بعد در پیش ہوا۔

"اس واقعہ کے دو تین دن بعد اعلیٰ حضرت کے لیے ایک نئی رزائی تیار ہوکر آگئی۔ اسے اوڑھتے ہوئے ابھی چند ہی روز گزرے تھے کہ ایک رات مسجد میں کوئی مسافر آیا، جس نے اعلیٰ حضرت سے گزارش کی کہ میرے پاس اوڑھنے کے لیے کچھ نہیں

ہے۔ آپ نے وہ نئی رزائی اس مسافر کو عطا فرما دی۔"

(حیاتِ اعلیٰ حضرت (قدیم)، از: ملک العلما ظفر الدین بہاری، ص ۵۰)

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا کی سخاوت اور غربا پروری کی گرد و نواح میں بڑی دھوم تھی۔ اس سلسلے میں علامہ بدرالدین احمد قادری رقم فرماتے ہیں کہ

"کاشانۂ اقدس سے کوئی سائل خالی واپس نہ ہوتا۔ بیوگان کی امداد اور ضرورت مندوں کی حاجت روائی کے لیے آپ کی جانب سے ماہ وار رقمیں مقرر تھیں اور یہ امداد صرف مقامی لوگوں کے لیے ہی نہ تھی، بلکہ بیرون جات میں بذریعہ منی آرڈر امدادی رقم روانہ فرمایا کرتے تھے۔"

(سوانح اعلیٰ حضرت، از: علامہ بدرالدین احمد قادری، ص ۹۰)

بیرون ملک کے لوگوں کی امداد کے سلسلے میں ایک ایمان افروز واقعہ پیش خدمت ہے:

"ایک دفعہ مدینہ طیبہ سے ایک شخص نے پچاس روپے طلب کیے۔ لیکن اتفاق ایسا ہوا کہ اس وقت اعلیٰ حضرت کے پاس ایک روپیہ بھی نہیں تھا۔ اعلیٰ حضرت نے بارگاہِ رسالت میں التجا کی کہ حضور، مَیں نے کچھ بندگانِ خدا کے مہینے (ماہوار وظیفے) آپ کی عنایت کے بھروسے پر اپنے ذمّے مقرر کر لیے ہیں۔ اگر کل پچاس روپے کا منی آرڈر کر دیا گیا تو بروقت ہوائی ڈاک سے پہنچے گا۔ یہ رات آپ نے بڑی بے چینی سے گزاری۔ علی الصبح ایک سیٹھ صاحب حاضر بارگاہ ہوئے۔ اور مولوی حسنین رضا خاں صاحب کے ذریعہ مبلغ اکاون روپے بطور نذرانۂ عقیدت حاضر خدمت کیے۔ جب مولوی صاحب موصوف نے اکاون روپے اعلیٰ حضرت کی خدمت میں جا کر پیش کیے تو آپ پر رقت طاری ہوگئی اور مذکورہ بالا ضرورت کا انکشاف فرمایا۔ ارشاد ہوا، یہ یقیناً سرکاری عطیہ ہے۔ اس لیے کہ اکاون روپے کے کوئی معنی نہیں سوائے اس کے کہ پچاس روپے بھیجنے کے لیے فیس منی آرڈر بھی تو چاہیے۔ چنانچہ اسی وقت منی آرڈر کا فارم بھرا گیا اور ڈاک خانہ کھلتے ہی منی آرڈر روانہ کر دیا گیا۔"

(حیاتِ اعلیٰ حضرت (قدیم)، از: ملک العلما ظفر الدین بہاری، ص ۵۲)

اللہ اللہ! غربا و مساکین کی امداد و اعانت کے ایسے واقعات و معاملات کم ہی دیکھنے کو ملیں گے۔ مگر اعلیٰ حضرت نے زندگی بھر محتاجوں کی دادرسی فرمائی اور ایسے ایسے ذرائع اختیار کیے جو عام اذہان سے بالاتر ہیں۔

خیر یہ تو آپ کی حیاتِ طیبہ کے معمولات ہیں۔ وصال فرمانے سے پہلے آپ نے جو وصیت نامہ تحریر کروایا، اس میں بھی غریبوں کی امداد و اعانت اور داد رسی کا خاص حکم فرمایا ہے۔ افرادِ خانہ سے آپ نے التماس فرمایا ہے کہ میرے وصال کے بعد میرے ایصالِ ثواب کے لیے بطور خاص غریبوں کی امداد کرنا اور اُن کی خاطر مدارات کرنا۔

وصیت نامہ کے الفاظ حضرت مولانا حسنین رضا خاں صاحب کی زبانی کچھ اس طرح ہیں:

''فاتحہ کے کھانے سے اغنیا کو کچھ نہ دیا جائے، صرف فقرا کو دیں اور وہ بھی اعزاز اور خاطر داری کے ساتھ، نہ جھڑک کر۔ غرض کوئی بات خلافِ سُنّت نہ ہو۔ اعزّہ سے اگر بطیبِ خاطر ممکن ہو تو فاتحہ میں ہفتہ میں دو تین بار ان اشیا میں سے کچھ بھیج دیا کریں۔ دودھ کا برف خانہ ساز اگرچہ بھینس کے دودھ کا ہو۔ مرغ کی بریانی، مرغ پلاؤ خواہ بکری کا شامی کباب پراٹھے اور بالائی، فیرنی اُرد کی پھریری دال مع ادرک و لوازم، گوشت بھری کچوریاں، سیب کا پانی، انار کا پانی، سوڈے کی بوتل، دودھ کا برف، اگر روزانہ ایک چیز ہو سکے یوں کر دیا کرو جیسے مناسب جانو، مگر بطیبِ خاطر، میرے لکھنے پر مجبور نہ ہو۔''

(وصایا شریف، از: حسنین رضا خاں، ص ۱۱)

غریبوں کی دل جوئی:

حضور نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم غریبوں کا اعزاز فرمایا کرتے تھے اور اُن کی دل جوئی کا خاص خیال فرماتے تھے۔ سرکارِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی اسی سُنّتِ مبارکہ و عادتِ کریمہ کا عکس سیّدی اعلیٰ حضرت میں نظر آتا تھا۔ آپ غریبوں کی امداد و اعانت فرماتے اور انھیں خاص اہمیت دیتے تھے۔ اگر کوئی غریب عدم استطاعت کے باوجود آپ کی دعوت کرتا تو آپ محض اُن کی دل جوئی کے لیے دعوت قبول فرما لیا کرتے تھے۔ اس ضمن میں دو واقعات ہدیۂ قارئین ہیں۔

''ایک صاحب تشریف لائے اور اعلیٰ اور اُن کے بعض ساتھیوں کی دعوت کر کے چلے گئے۔ دوسرے دن گاڑی آ گئی۔ اعلیٰ حضرت کے ساتھ اس روز مولانا ظفرالدین صاحب بھی تھے۔ مکان پہ گاڑی پہنچی تو میزبان بھی منتظر ملے۔ گاڑی سے اُتارا اور اپنے مکان میں چارپائی پر لے جا کر بٹھا دیا۔ ہاتھ دُھلانے کے بعد ڈھلیاں میں روٹیاں اور رکابیوں میں گائے کے گوشت کا قیمہ رکھ دیا۔ کھانا شروع ہوا، مولانا ظفرالدین صاحب کو خیال آیا کہ اعلیٰ حضرت قبلہ تو گائے کا گوشت نہیں

کھاتے۔ ان کے لیے سخت مضر ہے۔ اگر گوشت شوربے کا پکاتے تو اعلیٰ حضرت شوربہ کھالیتے۔ اور قیمہ میں بلا گوشت کھائے چارہ ہی نہیں۔ (مولانا) اسی خیال میں اُلجھے ہوئے تھے کہ اعلیٰ حضرت قبلہ نے ازخود فرمایا کہ مولانا ایک دعا حدیث شریف میں وارد ہے کہ مسلمان اگر پڑھ کر جو کچھ کھائے وہ کھانا ہرگز ضرر نہ دے گا۔ وہ دعا یہ ہے: بِسْمِ اللّٰهِ الَّذِیْ لَا یَضُرُّ مَعَ اسْمِهٖ شَیْءٌ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِی السَّمَآءِ وَھُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ۔ مولانا سمجھ گئے کہ میرے دل کے خطرے کا جواب دے دیا ہے اور اس دعا کی بھی تعلیم فرمائی ہے۔"

(سیرتِ اعلیٰ حضرت مع کرامات، از: مولانا حسنین رضا خان، ص ۹۲)

اسی قسم کا ایک اور واقعہ پیش خدمت ہے جس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ آپ محض دل جوئی کے لیے غریبوں کی دعوت قبول فرمالیا کرتے تھے۔ اور ان کے یہاں خلافِ معمول وطبیعت غذا کھانے سے بھی گریز نہیں کیا کرتے تھے۔ چنانچہ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک کمسن بچے نے خدمتِ عالیہ میں حاضر ہوکر عرض کیا کہ کل آپ کی میرے گھر دعوت ہے، والدہ نے آپ کو کھانے پہ بلایا ہے۔

اعلیٰ حضرت نے بچے کی دعوت قبول فرمائی اور حاجی کفایت اللہ صاحب سے فرمایا کہ وہ اچھی طرح بچے کے گھر کا پتہ دریافت کرلیں تاکہ وقتِ مقررہ پر آسانی سے گھر پہنچا جاسکے۔ اس کے بعد معاملہ حضرت مولانا حسنین رضا خاں صاحب کی زبانی کچھ یوں ہے کہ

"(اعلیٰ حضرت) جس وقت ان کے مکان پہ پہنچے تو صاحب زادے اپنے دروازے پر کھڑے انتظار کررہے تھے۔ اعلیٰ حضرت کو دیکھتے ہی یہ کہتے ہوئے اندر کو بھاگے، ارے مولوی صاحب آگئے۔ ان کے دروازے پر ایک چھپر پڑا تھا، جس کے سایے میں اعلیٰ حضرت اور حاجی کفایت اللہ صاحب کچھ دیر منتظر کھڑے رہے۔ اس کے بعد ایک بوسیدہ چٹائی آئی اور ایک دلیا میں باجرہ کی گرم گرم روٹیاں آئیں، مٹی کی رکابی میں ماش کی دال آئی جس میں مرچوں کے ٹکڑے ٹوٹے ہوئے پڑے تھے۔ یہ رکھ کر صاحب زادے نے کھانے کو کہا۔ فرمایا، ہاتھ دھونے کے لیے پانی تو لائیے۔ وہ پانی لینے مکان میں گئے، حاجی صاحب نے یہ عرض کیا، یہ مکان تو نقارچی کا ہے۔ اعلیٰ حضرت قبلہ نے ان سے کبیدہ خاطر ہوکر فرمایا، ابھی سے کیوں کہہ دیا، کھانے کے بعد کہتے۔ اتنے میں صاحب زادے پانی لے کر آگئے۔ آپ نے ان سے پہلا سوال یہ کیا کہ آپ کے والد کہاں ہیں اور کیا کام کرتے ہیں؟

پردے کی آڑ سے ان کی ماں نے عرض کیا کہ میرے شوہر کا انتقال ہو گیا ہے۔ وہ پہلے نوبت بجاتے تھے، اس کے بعد انھوں نے توبہ کر لی تھی اور اب تو کمانے والا صرف یہ لڑکا ہے۔ جو راجوں کے ساتھ مزدوری کرتا ہے۔ اعلیٰ حضرت نے خدا کا شکر ادا کیا اور ان لوگوں کے لیے دعاء خیر و برکت فرمائی۔"

(سیرتِ اعلیٰ حضرت مع کرامات، از: مولانا حسنین رضا خان، ص ۹۱)

دورِ حاضر کے علما و مشائخ خاص طور پر ان واقعات سے عبرت حاصل کریں۔ جو دولت مندوں کے یہاں تو خوب دعوت کھاتے ہیں لیکن اگر کوئی غریب انھیں اپنے گھر دعوت دے تو نظر انداز کر دیتے ہیں۔

دنیا سے بے رغبتی:

اللہ رب العزت نے قرآن کریم میں مال کو فتنہ قرار دیا ہے اور سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کی محبت کو تمام بُرائیوں کی جڑ قرار دیا ہے۔ بایں سبب سرکارِ اعلیٰ حضرت مال و دولت اور دنیاوی جاہ و اقتدار سے کوسوں دور رہتے تھے۔ نہ تو از خود آپ نے ان چیزوں کی طلب فرمائی اور نہ ہی کسی دوسرے کے دینے سے آپ نے لینا گوارہ فرمایا۔

حضرت سیف الاسلام مولانا منور حسین جنھوں نے کئی سال بریلی شریف میں گزارا ہے اور حضور حجۃ الاسلام علیہ الرحمہ کی صحبت بھی پائی ہے۔ وہ تحریر فرماتے ہیں کہ

"میں نے سوداگری محلے کے کئی بزرگوں سے سنا کہ نظام حیدرآباد، دکن نے کئی بار لکھا کہ حضور کبھی میرے یہاں تشریف لا کر ممنون فرمائیں یا مجھے ہی نیاز کا موقع عنایت فرمائیں۔ تو آپ نے جواب دیا کہ میرے پاس اللہ تعالیٰ کا عنایت فرمایا ہوا وقت اُسی کی اطاعت کے لیے ہے۔ میں آپ کی آؤ بھگت کا وقت کہاں سے لاؤں۔"

(تصویت الایمان، از: مولانا منور حسین، ص ۶۹)

یہ امر واقعی ہے کہ جس ذات نے خداوند قدوس کی خوش نودی اور دین متین کی خدمت کو اپنا مطمح نظر بنا لیا ہو اُسے کسی والیِ ریاست کی بارگاہ میں حاضری کی کیا حاجت۔ خیر یہ تو اعلیٰ حضرت کا عمل ہے۔ آپ کے خلفِ اکبر کا عمل ملاحظہ ہو۔ سیف اللہ مولانا منور تحریر کرتے ہیں:

"حضرت مولانا حامد رضا خاں رحمۃ اللہ علیہ جن سے مجھے چند دن فیض حاصل کرنے کا موقع ملا۔ بڑے حسین وجمیل، بڑے عالم اور بے انتہا خوش اخلاق تھے۔ ان کی خدمت میں بھی نظام حیدرآباد نے دارالافتا کی نظامت کی درخواست کی اور اس سلسلے میں کافی

دولت کا لالچ دلایا۔ تو آپ نے فرمایا کہ مَیں جس دروازۂ کریم کا فقیر ہوں، میرے لیے وہی کافی ہے۔"

(تصویت الایمان، از: مولانا منور حسین، ص ۶۹)

مذکورہ بالا دونوں واقعات سے یہ بخوبی سمجھا جاسکتا ہے کہ آپ اور آپ کے اہلِ خانہ، دنیاوی جاہ وحشمت اور مال وزر کے حصول سے کوسوں دور تھے۔ اس سلسلے میں مزید دو واقعات ہدیۂ قارئین ہیں:

"ایک مرتبہ نواب رام پور نینی تال جارہے تھے۔ اسپیشل بریلی شریف پہنچے تو حضرت شاہ مہدی حسن میاں صاحب نے اپنے نام سے ڈیڑھ ہزار کے نوٹ ریاست مدار المہام کی معرفت بطور نذر اسٹیشن سے حضور کی خدمت میں بھیجے اور والیِ ریاست کی جانب سے مستدعی ہوتے ہیں کہ ملاقات کا موقع دیا جائے۔ حضور کو مدارالمہام صاحب کے آنے کی خبر ہوئی تو اندر سے دوروازہ کی چوکھٹ پر کھڑے کھڑے مدارالمہام صاحب سے فرمایا کہ میاں کو میرا سلام عرض کیجیے گا اور یہ کہیے گا، یہ اُلٹی نذر کیسی؟ مجھے میاں کی خدمت میں نذر پیش کرنا چاہیے نہ کہ میاں، مجھے نذر دیں۔ یہ ڈیڑھ ہزار ہوں یا جتنے ہوں، واپس لے جایئے۔ فقیر کا مکان نہ اس قابل کہ کسی والیِ ریاست کو بلاسکوں اور نہ مَیں والیانِ ریاست کے آداب سے واقف کہ خود جاسکوں۔"

(حیاتِ اعلیٰ حضرت (قدیم)، از: علامہ ظفر الدین بہاری، ص ۱۹۲)

اسی قسم کا ایک واقعہ نواب حامد علی خاں صاحب کا بھی جو افادہ کے لیے ہدیۂ قارئین ہے:

"نواب حامد علی خاں صاحب کے متعلق معلوم ہوا کہ کئی بار انھوں نے اعلیٰ حضرت کو لکھا کہ حضور رام پور تشریف لائیں تو مَیں بہت ہی خوش ہوں گا۔ اگر یہ ممکن نہ ہو تو مجھی کو زیارت کا موقع دیجیے۔ آپ نے جواب میں فرمایا کہ چونکہ آپ صحابہ کبار رضوان اللہ علیہم اجمعین کے مخالف شیعوں کے طرف دار اور ان کی تعزیہ داری اور ماتم وغیرہ کی بدعادات میں معاون ہیں۔ لہٰذا مَیں نہ آپ کو دیکھنا جائز سمجھتا ہوں، نہ اپنی صورت دکھانا ہی پسند کرتا ہوں۔"

(تصویت الایمان، از مولانا منور حسین، ص ۷۰)

مذکورہ بالا واقعے سے ہمارے علما اور مشائخ کو عبرت حاصل کرنی چاہیے۔ اور صاحبانِ ثروت و امارت کی دعوت قبول کرتے ہوئے اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ کہیں یہ اللہ اور اس کے رسول یا صحابہ

اور بزرگانِ دین کا گستاخ تو نہیں۔

اخوت اسلامی اور مساوات کی پاس داری:

اعلیٰ حضرت شریعت وسُنّت کے سچے ترجمان تھے۔ آپ فرمانِ قرآن اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ کے سبب تمام مسلمانوں کو بھائی کی حیثیت سے دیکھا کرتے تھے۔ ہر ایک کے ساتھ اخوت ومحبت کا معاملہ فرماتے۔ اس سلسلے میں ایک ایمان افروز واقعہ ہدیۂ قارئین ہے:

> ''ایک صاحب خدمتِ اقدس میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ اعلیٰ حضرت بھی کبھی کبھی ان کے یہاں تشریف لے جایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ حضور ان کے یہاں تشریف فرما تھے کہ ان کے محلّے کا ایک بے چارہ غریب مسلمان ٹوٹی ہوئی پرانی چارپائی پر، جو صحن کے کنارے پر پڑی ہوئی تھی، جھجکتے ہوئے بیٹھا ہی تھا کہ صاحب خانہ نے نہایت کڑے تیوروں سے اس کی طرف دیکھنا شروع کیا، یہاں تک کہ وہ ندامت سے سر جھکائے اُٹھ کر چلا گیا۔ حضور کو صاحب خانہ کی اس مغرورانہ روش سے سخت تکلیف پہنچی مگر کچھ فرمایا نہیں۔ کچھ دنوں کے بعد وہ حضور کے یہاں آئے۔ حضور نے اپنی چارپائی پہ جگہ دی، وہ بیٹھے ہی تھے کہ اتنے میں کریم بخش حجام، حضور کا خط بنانے کے لیے آئے۔ وہ اس فکر میں تھے کہ کہاں بیٹھوں؟ آپ نے فرمایا کہ بھائی کریم بخش! کھڑے کیوں ہو؟ مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ اور ان صاحب کے برابر بیٹھنے کا اشارہ فرمایا۔ وہ بیٹھ گئے۔ پھر تو ان صاحب کے غصّے کی یہ کیفیت تھی کہ جیسے سانپ پھنکاریں مارتا ہے اور فوراً اُٹھ کر چلے گئے۔ پھر کبھی نہ آئے۔ خلافِ معمول جب عرصہ گزر گیا تو اعلیٰ حضرت نے فرمایا کہ اب فلاں صاحب تشریف نہیں لاتے ہیں۔ پھر خود ہی فرمایا، مَیں بھی ایسے متکبر اور مغرور شخص سے ملنا نہیں چاہتا۔''

(حیاتِ اعلیٰ حضرت (قدیم)، از: ملک العلما مولانا ظفرالدین بہاری، ص ۴۰)

☆☆☆☆☆☆

خدمات

اعلیٰ حضرت علیہ الرحمۃ والرضوان کی تصنیفی و تبلیغی خدمات کا پہلو اس قدر تابناک ہے کہ نظر کو تاب نہیں کہ دامنِ چشم میں اس کا احاطہ کرسکے۔ ان کی خدمات پر بھی اتنا زیادہ لکھا جاچکا ہے جسے شمار کے پیمانوں میں بند نہیں کیا جاسکتا. امام احمد رضا نے دین و ملّت کے خلاف ذرا سی بھی بات دیکھی تو وہ نوکِ قلم پر آکر رہی. اُن کے خدمات کی مختلف جہات ان کی شخصیت کے البم کی حسین تصویریں ہیں. جوں جوں وقت کے ذرّے ماضی کے ریت میں دفن ہوتے جارہے ہیں ان تصاویر کی جاذبیت و دلکشی میں گوناگوں اضافہ ہورہا ہے۔ ان کی خدمات کی سواری جب چلی تو اس نے انہیں ایسی منزل پر پہنچا دیا جہاں سے وہ "مجددِ مائۃ حاضرہ" کے اعزاز سے سرفراز ہوکر واپس آئے۔ انہوں نے اتنا کچھ لکھ دیا کہ ابھی تک ان کی بہت ساری تصانیف کو طباعت کا زیور نہیں پہنایا جاسکا ہے۔ خیر یہ تو ہماری بے حسی و کوتاہی ہے۔ ان کی حیات و خدمات پر لکھ کر اپنا قد اونچا کرنے والوں کی لائن لگی ہوئی ہے، لیکن افسوس کہ اب تک بہت ساری تحریریں غیر مطبوعہ ہیں. ہماری گذارش ہے کہ سب سے پہلے اعلیٰ حضرت کی دستیاب غیر مطبوعہ تصانیف کو عطرِ طباعت کی خوشبو سے مَس کیا جائے۔ پھر ثانوی حیثیت سے اُن کی حیات و خدمات کا جائزہ لیا جائے۔ بہرحال زیر نظر باب اُن کی خدمات کی دھلیز پر دھندلی سی مشعل لیے کھڑا ہے۔ اس میں مولانا وارث جمال کا مضمون "تحریک ردِّ ندوہ" کے تعلق سے ہے۔ مولانا نے یہ بات بڑے زور سے اُٹھائی کہ اعلیٰ حضرت پر ضمنی و ثانوی کام تو کیا جارہا ہے لیکن جس بنیاد پر انہیں "مجددِ اعظم" کا خطاب عطا کیا گیا، اسے ابھی تک گوشۂ گم نامی میں رکھا گیا ہے۔ مولانا نے اس میں مزید بات یہ لکھی کہ اعلیٰ حضرت کے ساتھ ساتھ ان علما اور قایدین پر بھی ڈاکٹریٹ کی جائے جنھوں نے نمایاں خدمات انجام دی ہیں. ان کا یہ مشورہ بجا طور پر بڑا اہم اور قیمتی ہے۔ اس سلسلے میں مولانا کی اجازت کے بغیر اتنا اور اضافہ کرنا چاہوں گا کہ جس خاندان کے بزرگوں نے اور خاص طور سے خطاب عطا کرنے والے بزرگ نے ان کی شخصیت کو اس خطاب کا پیرہن پہنایا ہے اُن پر بھی لازمی طور پر پی، ایچ، ڈی کی جائے کیونکہ علمائے بدایوں کا امام احمد رضا سے ایک بڑا گہرا رشتہ رہا ہے۔ ڈاکٹر حسن رضا صاحب کی وقیع تحریر بھی شامل ہے۔ غالباً اُن کی ڈاکٹریٹ کے بعد یہ پہلا مضمون شائع ہورہا ہے۔ اس کے علاوہ مولانا منظر الاسلام ازہری اور مولانا شفیق اجمل صاحب کی قیمتی تحریریں بھی شامل ہیں اور مختصر کج مج آرائی اس راقم السطور کی بھی ہے

.... **ص۔ ر۔ مصباحی**

بابِ سوم

امام احمد رضا اور علمِ رجالِ حدیث

از: مولانا منظر الاسلام ازہری
اسلامک سینٹر آف ہائی پوائنٹ، نارتھ کرولینا
manz786@gmail.com

تیرہویں صدی ہجری کے ربع اخیر اور انیسویں صدی عیسوی کے نصف اخیر میں برصغیر کے افق علم پر ایک نام ظاہر ہوا جو دیکھتے ہی دیکھتے آسمانِ علم وفضل کا بادشاہ بن گیا، جس نے فقہ و اصول سے لے کر ہیئت و ہندسہ تک اور تفسیر و علوم القرآن سے لے کر حدیث وعلوم حدیث تک کے تمام علوم وفنون میں اپنی مہارت کا لوہا منوالیا، جنہیں دنیا امام احمد رضا محدث بریلوی کے نام سے جاننے لگی۔ امام احمد رضا نے ہر فن میں درجنوں تحقیقی رسالے تالیف کیے، علمِ حدیث، اصولِ حدیث اور رجال کی جب بات آئی تو اس میدان کو بھی تشنہ نہیں چھوڑا، ''سجدۂ تحیہ'' سے متعلق ایک نایاب رسالہ تحریر فرمایا جس میں صحاح وسنن، جوامع ومسانید سے چالیس حدیثیں سجدۂ تحیہ کی حرمت پر پیش کیا، جو آپ کی حدیثی مہارت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ تخریج حدیث سے متعلق ایک زبردست رسالہ ''الروض البهيج فی اصول التخريج'' تالیف کیا جس کے متعلق شیخ رحمٰن علی نے فرمایا: ''اگر اس سے قبل اس فن میں کتاب نہیں لکھی گئی تو اس فن کی یہ پہلی کتاب سمجھی جائے گی۔'' اصولِ حدیث میں ایک ایسا عمیق رسالہ تالیف کیا جس کو پڑھ کر ماہر حدیث علامہ ڈاکٹر مصطفیٰ محمد ابو عمارہ نے کہا: ''اس کتاب میں علمِ حدیث کے ایسے مباحث ہیں جن کا ذکر کسی دوسری کتاب میں موجود نہیں، اس کے علمی مباحث دیکھ کر یہ کہنا درست ہوگا کہ یہ کتاب علامہ صنعانی کی ''توضیح الافکار'' سے کچھ کم نہیں۔'' (۱)

علمِ رجال پر امام احمد رضا محدث بریلوی کی دسترس ملاحظہ کرنا ہو تو ''حاجز البحرین'' (۲) کا مطالعہ کیجیے جہاں آپ کو علم رجال سے متعلق محدث بریلوی کے ایسے ایسے لطائف ملیں گے کہ آپ کا ذوق امام کی روح پر انور کو خراجِ تحسین پیش کیے بغیر نہیں رہ سکے گا۔ کتاب کے مباحث سے پتہ چلتا ہے کہ محدث بریلوی نے اس کی تالیف ایک فقہی مسئلہ کے ثبوت اور اس وقت کے ایک غیر مقلد عالم شیخ محمد نذیر حسین دہلوی (۱۳۲۰ھ) کے مزعوم قصر علم وفضل کو ڈھانے کے لیے کیا ہے۔

شیخ محمد نذیر حسین صاحب دہلوی (۱۳۲۰ھ) جماعت غیر مقلدین کے معتمد عالم دین، شیخ الکل اور جامع العلوم سمجھے جاتے ہیں۔ اُن کے ماننے والوں کا یہ سمجھنا ہے کہ میاں صاحب کو تمام علوم میں

خاص طور پر علم حدیث میں بڑی مہارت تھی۔ انہوں نے مقلدین اور بالخصوص احناف کا رد بڑے مدلل انداز میں کیا ہے، اور یہ کہ ان کی کتاب "معیار الحق" مقلدین علما کی راہ میں ایسا پتھر ہے جسے وہ کسی طرح نہیں ہٹا سکتے۔

جس زمانے میں یہ کتاب منظر عام پر آئی تھی اسی زمانے میں اہل سنت کے سرکردہ علما مثلاً مولانا ارشاد الحق رامپوری، مولانا ارشاد حسین رامپوری نے زبردست علمی انداز میں رد کردیا تھا، اس کے باوجود غیر مقلدین کی شورش کم نہیں ہوئی تو بالآخر میدان علم وفضل کے شہسوار امام احمد رضا محدث بریلوی کو قلم اٹھانا پڑا۔ محدث بریلوی نے علم رجال اور حدیث پر ایسی بحث کی اور میاں صاحب اور ان کے ماننے والوں پر ایسے ایسے ایراد قائم کیے جو آج تک لاجواب ہیں۔ ہماری یہ تحریر محدث بریلوی کی اسی تحریر کی تلخیص اور اس کے ساتھ بعض ایسی علمی، اصولی توجیہات پر مشتمل ہوگی جن کا امام نے اشارہ کیا ہے۔

امام نسائی نے جمع بین الصلوتین سے متعلق حضرت عبد اللہ ابن عمر سے ایک حدیث تخریج کی ہے جس سے صرف اس قدر مسئلہ ثابت ہوتا ہے کہ ضرورت کے تحت صورتاً دو نمازوں کو ایک ساتھ ملا کر پڑھنا جائز ہے یعنی مثلاً مغرب کی نماز اس کے اخیر وقت میں ادا کی جائے اور عشا اوّل وقت میں، یونہی ظہر کی نماز اس کے اخیر وقت میں ادا کی جائے اور عصر کی نماز اوّل وقت میں۔ میاں صاحب کا موقف چونکہ دو نمازوں کو ایک ساتھ حقیقۃً جمع کرنے کا ہے یعنی ایک کو دوسرے کے وقت میں پڑھنا روا ہے، اس لیے انہوں نے اس حدیث اور اس معنی کی دیگر حدیثوں کو آنکھ موند کر رد کرنے کا عزم کرلیا اور پھر ان کے اصول وضابطے کی وجہ سے صحیح بخاری ومسلم میں مذکور ایسی ایسی حدیثیں زد میں آرہی ہیں کہ اگر ان کی بات کو مان لیا جائے تو سب سے پہلے میاں صاحب کو ہی ایمان وعقیدہ سے ہاتھ دھونا پڑے گا، اس کی مکمل تفصیل امام احمد رضا کے رسالہ "حاجز البحرین" (۳) میں دیکھی جاسکتی ہے۔

امام نسائی نے جس حدیث کو ذکر کیا اس کی سند میں ایک راوی کا نام "ولید" ہے، میاں صاحب اس حدیث کو رد کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

نسائی والی اسناد میں "ولید بن قاسم" ہے اور روایت میں اس سے خطا واقع ہوتی تھی کہا تقریب میں: الولید بن القاسم بن الولید الهمداني الكوفي صدوق و يخطي۔ (۴)

میاں صاحب کو تقلید سے اتنی چڑھ تھی کہ مقلدین بالخصوص احناف کے مسائل اور دلائل کو رد کرنا ان کی زندگی کا نصب العین تھا۔ اس دھن میں انہوں نے تحقیق وتدقیق کو ایک طرف رکھ کر جو کچھ سامنے آیا لکھ مارا۔ انہیں اس کا احساس تک نہیں ہوسکا کہ وہ اپنے اس طرز تحریر سے بڑی علمی خیانت کے مرتکب ہورہے ہیں، کیونکہ وہ جسے ولید بن قاسم سمجھ کر رد کررہے ہیں وہ دراصل "ولید بن مسلم"

ہیں جن کو ائمہ حدیث اور ماہرین رجال نے عالمِ وقت، عاقل زمانہ اور سرکردہ شامی علما میں شمار کیا ہے، بلکہ صحیح بخاری و مسلم کے رواۃ سے بھی ہیں، تقریب میں ہے:

ا۔ ابوالعباس ولید بن مسلم دمشقی ایک نامور شخص کا نام ہے اور شامیوں کے علما میں سے ایک ہیں، وہ کئی عمدہ کتابوں کے مصنف بھی ہیں، امام احمد نے ان کے بارے میں فرمایا: علمائے شام میں ان سے زیادہ عقل مند میں نے کسی اور کو نہیں دیکھا۔ امام ابن مدینی نے کہا: ان کے پاس علم بہت زیادہ تھا۔ ابومسہر نے کہا: ولید مدلس ہیں۔ (ابن حجر) فرماتے ہیں: ولید جب ابن جریج یا اوزاعی سے عنعنہ کرے تو معتمد نہیں سمجھے جائیں گے، کیونکہ وہ کذابین سے تدلیس کرتے ہیں، مگر جب حدثنا کی صراحت کردیں تو ان کی روایت حجت ہوگی (۵)۔ یہاں راویِ مذکور نے حدثنا کے ذریعہ تصریح کردی ہے لہٰذا ان کی حدیث مقبول ہوگی۔

۲۔ میاں صاحب کے مطابق اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ یہ "ولید بن قاسم" ہی ہیں تو بھی ان کا ردّ کرنا علمی دیانت سے خالی ہے، کیونکہ امام احمد نے ان کی توثیق فرمائی اور ان سے اخذ روایت کیا، دوسرے محدثین کو ان سے روایت کی تلقین بھی کی، ابن عدی نے کہا: جب وہ کسی ثقہ سے روایت کریں تو کچھ حرج نہیں۔

۳۔ صحیح بخاری اور مسلم کے رجال میں درجنوں ایسے رواۃ ہیں جن پر ائمہ کرام نے اسی لفظ "صدوق یخطی" کے ذریعے ہی حکم لگایا ہے۔ اگر راوی مذکور کو اس حکم کی وجہ سے لائق اعتبار نہیں سمجھا جاسکتا ہے تو کیا وجہ ہے، اسماعیل بن مجالد، اشھل بن حاتم، بشر بن عبیس، حارث بن عبید جیسے درجنوں صحیحین کے رواۃ کو قابلِ اعتبار سمجھا جارہا ہے، جبکہ ان پر بھی وہی حکم ہے جو "ولید" پر ہے!! ملخصا

توضیح: ولید سے مراد ولید بن مسلم ہی ہیں:

امام احمد رضا محدث بریلوی نے جس جزم کے ساتھ ولید سے مراد ولید بن مسلم کا قول کیا ہے کسی کو یہ خدشہ ہوسکتا ہے کہ اگر میاں صاحب کے پاس کوئی دلیل نہیں تھی تو امام نے بھی تو کسی قرینے کا ذکر نہیں کیا۔ اس خدشے کو دور کرنے کے لیے مشتبہ اسماء سے متعلق چند اہم نکات ذکر کیے جاتے ہیں جن کی روشنی میں یہ سمجھنا آسان ہوگا کہ ان قرائن کی روشنی میں ہی امام نے یہ طے کیا ہے کہ یہاں ولید سے مراد "ولید بن مسلم" ہی ہیں۔

مشتبہ اسما کے پہچاننے کے لیے چند اہم بنیادی طریقے یہ ہیں:

ا۔ راوی کا اپنے شیخ سے گہرا واسطہ ہونا اس طور پر کہ ہر وقت شیخ کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا ہے، ایسا راوی اگر ابہام سے کام لیتا ہے تو معلوم ہوجائے گا کہ مبہم اس کا شیخ ہے، مثلا ابونعیم جب سفیان ثوری

سے روایت کرتے ہیں تو اسم منسوب کا اکثر ذکر نہیں کرتے، جب سفیان بن عیینہ سے روایت کرتے ہیں تو اس کی تصریح کر دیتے ہیں۔

۲۔ راوی، اس کے شیخ اور اس کے تلامذہ کا تعلق کس طبقے سے ہے، اس بنیاد پر بھی آپ مبہمات کا پتہ لگا سکتے ہیں۔

۳۔ کوئی معتبر اور جلیل القدر امام راوی کی تعیین اس طرح کر دے کہ اس میں کچھ شبہہ باقی نہ رہ جائے، مثلاً امام ابوداؤد کی سند میں کوئی ایسا راوی وارد ہوا جس کا کسی دوسرے سے اشتباہ ہو رہا ہے، اگر کوئی معتمد امام سنن کا منہج بتاتے ہوئے ذکر کر دے کہ ابوداؤد فلاں سے روایت نہیں کرتے تو اشتباہ دور ہو جائے گا۔

۳۔ ''المتفق والمفترق''، ''المؤتلف والمختلف''، اور ''مشتبہ'' کے موضوع پر لکھی ہوئی کتابوں کی طرف رجوع کیا جائے۔

۴۔ راوی اگر کوئی صحابی ہے یا گمان ہے کہ صحابی ہوگا تو صحابہ کی زندگی پر تالیف کی گئی کتابوں سے استفادہ کیا جائے، یونہی مراسیل کی طرف بھی رجوع مفید ہوگا۔

۵۔ راوی کی اگر کنیت موجود ہے تو ''کنی'' کے موضوع پر اور اگر لقب مذکور ہے تو ''القاب'' کے موضوع پر لکھی ہوئی کتب سے استفادہ کیا جائے گا۔

۶۔ راوی کا شاگرد ایسے انداز میں استاذ کا ذکر کرے کہ اس کے بعد اس میں کوئی اشتباہ نہ رہ جائے مثلاً ابونعیم فضل بن دکین روایت کرتے وقت کہے: حدثنا سفیان بن عیینہ...

۷۔ راوی کے شاگرد اور اس کے شیخ کا علم بھی مشتبہات میں مفید ہوتا ہے۔

ان قواعد کی تطبیق کی جائے تو بڑی آسانی سے امام احمد رضا محدث بریلوی کی تحقیق سمجھ میں آ جاتی ہے۔ کتب رجال کی مشہور کتاب ''تہذیب الکمال'' کا مطالعہ تو اس بات کا بین ثبوت ہے۔ علامہ حافظ المزی (م۷۴۲) نے ولید کے شاگرد ''محمود بن خالد'' کی حیات کے ضمن میں ان کے مشائخ کا بھی ذکر کیا ہے، جس میں ''ولید بن قاسم'' کا دور تک کوئی پتہ نہیں البتہ ''ولید بن مسلم'' کا ضرور ذکر ہے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ ''محمود بن خالد'' نے علی الاطلاق جب یہاں حدثنا ''الولید'' کہا ہے تو اس سے مراد ''ولید بن مسلم'' ہی ہیں۔(۶)

مشتبہ اسما کے بیان کردہ طریقوں میں تیسرا طریقہ سامنے رکھیے اور امام بیہقی کی سنن پر نظر ڈالیے تو میاں صاحب کا بچا کھچا گراف بھی پردے کے پیچھے سے گرا ہوا نظر آئے گا۔ امام بیہقی نے ٹھیک اسی روایت کا ذکر اپنی سنن میں کیا ہے اور یعنی کے ذریعے یہ تصریح کر دی ہے کہ یہ ''ولید بن

مسلم" ہی ہیں۔ امام بیہقی کی تصریح آپ بھی ملاحظہ کیجیے، فرماتے ہیں:

اخبرنی محمود بن خالدقال: حدثنا الولید یعنی بن مسلم قال: حدثنا بن جابر قال: حدثنی نافع قال: خرجت مع عبد اللہ بن عمر فی سفر یرید ارضا لھفاتاہ آت فقال ان صفیۃ بنت ابی عبید..... الحدیث (۷)

اسی روایت کو امام طحاوی نے ایک دوسری سند سے تخریج کی، اس میں ایک راوی "بشر بن بکر" کا نام آیا ہے۔ اس کے بارے میں میاں صاحب رقم طراز ہیں:

طحاوی والی اسناد میں "بشر بن بکر" ہے اور وہ غریب الحدیث ہے، ایسی روایتیں لاتا ہے کہ سب کے خلاف **قالہ الحافظ فی التقریب۔ (۸)**

امام احمد رضا محدث بریلوی نے اس پر چھ طریقوں سے ایراد قائم کیا، فرماتے ہیں:

۱۔ "بشر بن بکر" بخاری کے رجال سے ہیں، میاں صاحب جب صحیح حدیثوں کو ردّ کرنے پر آئے تو بخاری شریف کو بھی بالائے طاق رکھ دیا۔

۲۔ میاں صاحب نے یہاں بھی زبردست علمی خیانت کا ارتکاب کیا ہے، کیونکہ "**تقریب التھذیب**" میں راوی مذکور پر ثقہ ہونے کا حکم لگایا گیا ہے جسے وہ سرے سے حذف کر گئے ہیں، جبکہ علمی امانت کا تقاضہ یہ تھا کہ اسے ذکر کیا جائے۔

۳۔ جناب والا! "تقریب" میں اس راوی کے بارے میں "**ثقۃ یغرب**" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ "**فلان یغرب**" اور "**فلان غریب الحدیث**" میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

۴۔ آپ کے مطابق "غریب" کی تفسیر یہی ہے کہ راوی ایسی روایت کرے جو دیگر تمام رواۃ کے خلاف ہو تو "غریب" اور "منکر" میں آپ کس طرح فرق کریں گے؟

۵۔ کوئی راوی ثقہ ہونے کے ساتھ ساتھ اگر غریب بھی ہو اور اس بنیاد پر آپ اس کی حدیث ردّ کر دینا چاہتے ہیں تو بخاری و مسلم کے درجنوں رواۃ سے آپ کو ہاتھ دھولینا چاہیے۔ کیونکہ ابراہیم بن طہمان، بشر بن خالد، ابراہیم بن سوید بن حبان، بشیر بن سلیمان وغیرہ جیسے بے شمار راویوں پر "**ثقۃ یغرب**" کا ہی حکم لگایا گیا ہے۔

۶۔ علامہ ذہبی نے تو مسئلہ صاف ہی کر دیا، فرماتے ہیں: بشر بن بکر تنیسی صدوق اور ثقہ ہیں، ان کے اندر کوئی بھی سبب طعن موجود نہیں۔ ملخصا

حضرت ابن عمر کی مذکورہ حدیث امام ابوداؤد نے بھی متعدد سند سے تخریج کی ہے۔ اس کی ایک

سند میں "محمد بن فضیل" ہیں۔ میاں صاحب اس روایت کو ردّ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

روایت اوّل ابو داؤد کی جس میں قبل غیوب الشفق واقع ہے اس لیے منکر ہے کہ مخالف ہے صحاح کے اور خود ضعیف ہے، کیونکہ ایک راوی اس کا "محمد بن فضیل بن غزوان" ہے اور یہ مجروح ہے کہ نسبت کیا گیا طرف رفض کے اور مقلب الاحادیث ہے اور حدیث موقوف کو مرفوع کر دیا کرتا تھا۔ کہا حافظ نے تقریب میں: محمد بن فضیل بن غزوان صدوق ہے، لوگوں نے شیعہ کہا ہے۔ (۹)

امام احمد رضا محدث بریلوی نے پانچ طریقوں سے اس کا ردّ فرمایا ہے، ملاحظہ کیجیے ان کی عبارت کا خلاصہ:

۱۔ جناب والا! "محمد بن فضیل" تو بخاری اور مسلم کے رجال میں سے ہیں، ان کی حدیث ردّ کرتے وقت اس بات کو تو مدنظر رکھا ہوتا!!

۲۔ امام ابن معین جیسا جلیل القدر ناقد رجال نے "محمد بن فضیل" کی توثیق کی ہے،، امام نسائی نے ان کے بارے میں "لا بـأس بـه" کہا، امام احمد بن حنبل نے انہیں "حسن الحدیث" کہا اور ان سے روایت بھی کی، روایتِ حدیث میں امام احمد کا طریقہ کار معروف ہے کہ وہ جن کو ثقہ نہیں سمجھتے ان سے روایت بھی نہیں کرتے اور علامہ ذہبی نے میزان الاعتدال میں ان پر کچھ جرح مفسر بھی نہیں کی۔

۳۔ میاں صاحب نے "ابن فضیل" کو متشیع ہونے کی بنیاد پر بھی ردّ کرنا چاہا ہے، جبکہ محدثین کے ہاں "رفض" اور "تشیع" میں زبردست فرق ہے۔ علامہ ذہبی نے میزان میں حاکم سے متعلق کسی عالم کی طرف یہ قول منسوب کیا کہ وہ رافضی تھے، اس کے بعد کہا: اللہ تعالیٰ انصاف کو پسند فرماتا ہے، سچ بات یہ ہے کہ حاکم رافضی نہیں شیعی تھے، لہٰذا "رفض" اور "تشیع" کو ایک ہی کھاتے میں شمار کرنا علمِ حدیث سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔ امام ذہبی کے ان الفاظ کو بھی ملاحظہ کر لیجیے: محمد بن فضیل بن غزوان بہت بڑے محدث، حافظ ہونے کے ساتھ ساتھ ماہر عالم دین بھی تھے، یحییٰ بن معین نے ان کی توثیق کی ہے جبکہ امام احمد نے انہیں "حسن الحدیث" اور شیعی کہا ہے، میں یہ کہتا ہوں کہ ان پر تشیع کی وجہ اہلِ بیت سے ان کی گہری عقیدت تھی۔

۴۔ صحیحین کی روایت میں تیس سے زیادہ ایسے رجال ہیں جن کے بارے میں متشیع کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، بلکہ علامہ سیوطی نے تو تدریب میں امام حاکم کے حوالے سے یہ نقل کیا کہ: صحیح مسلم کی حدیثیں شیعہ راویوں سے بھری ہوئی ہیں۔ میاں صاحب کی بات تسلیم کر لی جائے تو صحیحین بالخصوص مسلم کی ان تمام روایتوں کو ردّ کر دینا چاہیے!!

۵۔ اگر "ابن فضیل" کو ضعیف مان بھی لیا جائے تو ان کی روایت کے ساتھ ہی امام ابو داؤد

نے حدیث کی مباحثیں دو ثقہ اور عادل راوی یعنی ابن جابر اور عبد اللہ بن العلاء کے حوالے سے ذکر بھی کردیا ہے۔ نسائی وغیرہ میں بھی ان کی روایتیں موجود ہیں، تو پھر اس حدیث کا مدار ''ابن فضیل'' پر ہی کب رہا!! ملخصا

امام نسائی، امام طحاوی اور امام عیسیٰ بن ابان نے ایک روایت بطریق عطاف عن نافع اپنی اپنی کتاب میں ذکر کیا ''عطاف'' کو میاں صاحب نے ''وہمی'' قرار دے کر ان کی رویات کو رد کردیا۔ لکھتے ہیں: اسی طرح روایت تیسری طحاوی کی جس میں ''کاد الشق'' دال سے واقع ہے، وہ بھی منکر ہے کیونکہ اس میں ''عطاف'' ہے اور وہ وہمی ہے، کما تقریب میں: **عطاف بتشدید الطاء بن خالد بن عبد اللّٰہ بن العاص المخزومی ابو صفدان المدنی صدوق یھم۔** (۱۰)

امام احمد رضا نے میاں صاحب کے اس وہم پر چار طریقوں سے ایراد قائم کیا، فرماتے ہیں:

ا۔ ''عطاف'' کو امام احمد اور امام ابن معین نے ثقہ قرار دیا ہے، علم رجال کے یہ دونوں نام قابل تقلید ہیں۔ میزان میں بھی اس راوی سے متعلق کوئی جرح مفسر منقول نہیں۔

۲۔ ''وہمی'' اور ''**صدوق یھم**'' میں کتنا فرق ہے کسی ذی علم سے سمجھ لینا چاہیے پھر اس مسئلہ میں کلام کرتے۔

۳۔ اگر کسی راوی کو ''**صدوق یھم**'' کی وجہ سے رد کردیا جانا چاہیے تو تقریب اُٹھا کر دیکھ لیجیے کتنے ایسے راوی ہیں جن پر ''**صدوق یھم**'' کا حکم لگایا گیا، کیا خیال ہے آپ کا ابراہیم بن یوسف بن اسحاق، اسامہ بن زید اللیثی، اسماعیل بن عبد الرحمٰن السدی، ایمن بن نابل، جابر بن عمرو، جبر بن نوف، حاتم بن اسماعیل، حرب بن ابی العالیہ.. اور بخاری و مسلم میں موجود ان جیسے درجنوں رواۃ کا جن پر علمائے رجال نے ''**صدوق یھم**'' کا حکم لگایا ہے.؟ ان سب کی روایتوں کو بھی کیوں نہیں رد کر دیتے؟!!

۴۔ فرض کرلیجیے کہ عطاف کی روایت مطعون ہی ہے مگر اس روایت کے کسی راوی پر یقین کے ساتھ سقوط کا حکم تو نہیں لگایا گیا، لہٰذا تعدد طرق سے حدیث کا حجت ہونا برقرار رہے گا، **ولکن الوھابیۃ قوم یجھلون**۔.. ملخصا

توضیح: علامہ حافظ ابن حجر نے ''تقریب'' میں رواۃ کے مراتب بارہ بتائے ہیں، پانچویں مرتبہ کا ذکر ان الفاظ سے کرتے ہیں:

الخامسة من قصر عن الرابعة قليلا، واليه الاشارة بصدوق سئی الحفظ، أو صدوق يهم، أو له أوهام، أو يخطئی، او تغير باخره، ....(۱۱)

مراتب رواۃ کے پانچویں درجے کی طرف، **صدوق سئی الحفظ، یا صدوق یھم، یا لہ**

اوھام، یا یخطئی ، یا اخیر عمر میں حالت بدل گئی، کے ذریعے اشارہ کیا جاتا ہے۔ یہ مرتبہ چوتھے مرتبے سے تھوڑا کم درجے کا ہے...

ان الفاظ یا ان کے علاوہ ایسے الفاظ جس کا کہیں صراحت کے ساتھ علما نے ذکر نہیں کیا، کے ذریعہ جن رواۃ پر حکم لگایا جائے تو ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں کہ فوراً راوی پر ضعف یا اس سے استدلال ترک کردینے کا حکم صادر کردے ۔ ان کی باریکیوں پر وہی شخص مطلع ہوسکتا ہے جسے کتب رجال پر پوری دسترس اور کلامِ محدثین پر وسیع نگاہ ہو۔ راقم نے بڑے غور وفکر کے بعد اس درجے کے رواۃ کا حکم جاننا چاہا تو منکشف ہوا کہ ایسے رواۃ کی حدیثیں "حسن لذاتہ" ہیں، پھر بعد میں علامہ حافظ ابن حجر کے شاگرد رشید علامہ بقائی کا کلام نظر سے گذرا جہاں انہوں نے اس بات کی تشریح کردی تھی ۔ اس نعمت و فیضان پر اللہ کا شکر بجالایا، ذلک فضل اللّٰہ یوتیہ من یشاء، والفضل للسبق..

اسی طرح یہ بھی جاننا چاہیے کہ "صدوق لہ أوھام" اور "صدوق یھم" میں بھی بڑا دقیق فرق ہے، پہلے کا مطلب یہ ہے کہ راوی کو کسی وجہ سے وہم ہوا ہے مگر وہ بہت کم ہے جبکہ دوسرا جملہ اس بات کی طرف مشعر ہے کہ پہلے کے بالمقابل راوی کے اندر وہم زیادہ ہے۔ بلفظ دیگر یوں سمجھنا چاہیے کہ "صدوق لہ أوھام" کا مطلب بعض وہم اور "صدوق یھم" کا مطلب وہم میں استمرار اور کثرت ہے۔ لہٰذا دو مختلف راویوں پر ان دو مختلف الفاظ کے ذریعے اگر کسی حافظ ناقد نے حکم لگایا تو حدیث دونوں کی ہی حسن ہوگی۔ مگر صدوق لہ أوھام والے راوی کو مقارنہ کے وقت صدوق یھم والے پر ترجیح ہوگی... واللّٰہ تعالی اعلم.

امام طحاوی کی روایت میں دو راوی "یحیٰ بن عبد الحمید" اور "اسامہ بن زید" ہیں، میاں صاحب ان دونوں پر جرح کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

..واضح ہو کہ وہ حدیث بھی "واہی" اور "منکر" ہے اس لیے کہ دو راوی اس کے مجروح ہیں، ایک یحیٰ بن عبد الحمید حمانی کہ یہ شخص چور تھا احادیث کا اور جھوٹا تھا، کہا تقریب التہذیب میں:

یحیٰ بن عبد الحمید بن عبد الرحمن الشبھین بفتح الموحدۃ وسکون المعجمۃ الحمانی بکسر المھملۃ وتشدید المیم الکوفی حافظ الا أنھم اتھموا بسرقۃ الحدیث. انتھی

اور کہا نور الدین علی نے "مختصر تنزیہ الشریعۃ" میں: یحیٰ بن عبد الحمید کان یکذب ویسرق.. انتھی

اور ایک "اسامہ بن زید بن اسلم" کہ یہ شخص ضعیف تھا بسبب حافظ نہ ہونے کے، کہا تقریب میں: اسامہ بن زید بن اسلم العدوی مولاھم المدنی ضعیف من قبل حفظہ انتھی.(۱۲)

محدث بریلوی نے اس شبہہ پر میاں صاحب پر جو اعتراض کیے، وہ علمِ حدیث کے طالب علم کے لیے نہایت دلچسپ ہے، فرماتے ہیں:

ذرا آپ یہ تو بتایئے کہ طحاوی کی روایت حدثنا فحد ثنا الحمانی ثنا ابن المبارک عن "اسامة بن زید"، اخبرنی نافع..میں آپ نے کیسے سمجھ لیا کہ یہ "اسامہ بن زید عدوی مدنی ضعیف الحافظہ" ہے؟ اسی طبقہ میں ایک دوسرے راوی "اسامہ بن زید لیثی مدنی" بھی تو ہیں جو صحیح مسلم، سنن اربعہ کے رجال میں سے ہیں۔ امام بخاری نے تعلیقاً ان کا ذکر کیا، امام یحییٰ بن معین نے انہیں ثقہ، ثقہ صالح اور ثقہ حجت کہا ہے۔ دونوں ہی ایک طبقہ، ایک شہر اور ایک نام کے ہیں اور دونوں نافع کے شاگرد ہیں، پھر منشاے تعیین کیا ہے؟؟

آپ کو تو ہماری اس بات سے بھی حیرت ہوگی کہ "یحییٰ بن عبد الحمید" جسے آپ نے چور اور جھوٹا کہا ہے، اس روایت میں وہ نہیں بلکہ امام وقت، علامہ زمانہ، حافظ "یحی بن عبد الحمید" صاحب مسند ہیں، جس کو امام یحییٰ بن معین وغیرہ نے ثقہ اور ابن عدی نے "ارجو انه لا باس به" ابن نمیر نے "هو اكبر من هؤلاء كلهم، فاكتب عنه" کہا ہے، اسی نویں طبقے میں ان کے والد "عبد الحمید بن عبد الرحمٰن" بھی تو ہیں جو صحیح مسلم اور بخاری کے رجال سے ہیں اور دونوں کو ہی "حمانی" کہا جاتا ہے۔ ملخصا

توضیح: اسماے مبہمہ کو پہچاننے کے طریقے کا بیان پہلے کیا جاچکا، انہیں طرق کی روشنی میں امام احمد رضا نے یہ سمجھا کہ یہاں یحییٰ بن عبد الحمید صاحب مسند مراد ہیں۔

ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا سے بھی جمع بین الصلاتین (صوری) کی حدیث مروی ہے جس کو امام طحاوی، امام احمد بن حنبل اور ابن ابی شیبہ وغیرہ نے روایت کیا، اس روایت کو بھی میاں صاحب نے یہ کہہ کر رد کر دیا کہ: ایک راوی اس کا مغیرہ بن زیاد موصلی ہے اور یہ شخص مجروح ہے کہ وہمی تھا قاله الحافظ فی التقریب..(۱۳)

یہاں بھی میاں صاحب نے وہی پرانی غلطی دہرائی جس پر محدث بریلوی پہلے گرفت کر چکے ہیں، تاہم اس بار تھوڑے فرق کے ساتھ غلطی ہے۔ مذکورہ راوی کے بارے میں "اوھام" کا لفظ استعمال کیا ہے، میاں صاحب نے 'وہمی' سمجھ لیا۔ محدث بریلوی فرماتے ہیں:

ا۔ تقریب میں "صدوق" کہا تھا وہ صندوق میں رہا۔

۲۔ علماے رجال نے "له اوهام" کا لفظ استعمال کیا اور جناب والا "وہمی" سمجھ بیٹھے..!!

۳۔ صحیحین میں اس قسم کے درجنوں رجال ہیں جن پر یہی حکم عائد کیا گیا ہے، لہٰذا ان کی

روایتوں کو بھی ردّ کر دینا چاہیے..!!

۴۔ مغیرہ سنن اربعہ کے رجال سے ہیں، امام ابن معین اور امام نسائی جو متشددین ناقدین رجال میں سے ہیں، نے ان پر "لیس به باس" کا حکم لگایا، ابن معین نے ایک لفظ "له حدیث واحد منکر" کا لفظ بھی بڑھایا ہے۔ امام وکیع نے ثقہ، ابو داؤد نے صالح اور ابن عدی نے لاباس به کہا، لہٰذا ان کی حدیث کے حسن ہونے میں کوئی شک نہیں۔ جہاں تک امام نسائی کے حکم لیس بالقوی، ابو احمد حاکم کا لیس بالمتین عندھم، جیسے حکم کی بات ہے تو زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ حدیث صحیح نہیں مگر حسن ہونے سے تو کوئی نہیں روک سکتا۔ کیونکہ ان حضرات نے لیس بقوی اور لیس بمتین کے الفاظ سے ان پر کوئی حکم نہیں لگایا اور "لیس بقوی" اور "لیس بالقوی" میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ حافظ ابن حجر نے ثقہ کے ذریعے درجہ صدوق کی تعیین کر دی۔ اس قسم کے رجال صحیحین کے اسناد میں سینکڑوں ہیں تو ان سب کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں..؟؟!! ملخصا

سنن ابی داؤد میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حوالے سے ایک روایت اس طرح مذکور ہے:

"قال اخبرنی عبد اللہ بن محمد بن عمر بن علی بن ابی طالب، عن ابیه، عن جده ان علیا کان سافر"..الحدیث اس کا مطلب اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ عبد اللہ بن محمد بن عمر بن علی اپنے والد محمد سے اور محمد بن عمر نے اپنے والد عمر بن علی سے جو در اصل عبد اللہ کے دادا ہوئے، سے روایت کی کہ حضرت سیدنا علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جمع صوری کی اور نبی اکرم ﷺ سے بھی اس عمل کی روایت کی۔ بلفظ دیگر "ابیه" اور "جده" میں دونوں ضمیروں کا مرجع عبد اللہ ہیں، محدث جی نے اس ضمیر اور مرجع کے ساتھ جو کچھ کیا اس کو پڑھ کر ابتدائی درجے کا طالب علم بھی حیران ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ فرماتے ہیں:

عبد اللہ روایت کرتے ہیں اپنے باپ محمد سے، اور وہ محمد اپنے دادا علی سے۔ محمد کو اپنے دادا علی سے ملاقات نہیں تو مرسل ہوئی اور مرسل حجت نہیں..!! (۱۴)

علمِ حدیث کا ادنیٰ طالب علم بھی جانتا ہے کہ حدیث مرسل ائمہ احناف اور جمہور کے نزدیک یکساں حجت ہے..مگر میاں صاحب نے تو صحیح و ثابت حدیثوں کو رد کرنے کی قسم کھا رکھی ہے اس کے لیے انہیں جو بھی حیلہ تلاش کرنا ہو وہ اس سے باز نہیں آتے۔ عبارتوں کا مفہوم بگاڑنا، صحیح کو ضعیف، ثابت کو موضوع، متصل کو مرسل بنانا تو ان کے لیے کوئی بڑی بات نہیں..! ہمارا خیال ہے کہ میاں صاحب نے تھوڑی اور محنت کی ہوتی یا ذرا اور ذہن پر زور دیا ہوتا تو مرسل کیا حدیث مذکور سرے سے موضوع ہو جاتی اور پھر ڈنکے کی چوٹ پر اس کو ردّ کر دیتے۔ علم نحو کا قاعدہ ہے کہ ضمیر کا مرجع اقرب

ہوا کرتا ہے۔ یہاں اس عبارت میں ''ابیہ'' سے اقرب ابو طالب ہیں اور ''جد'' سے اقرب ''ابیہ'' اب قاعدہ کے مطابق معنی یہ ہوگا کہ عبد اللہ نے روایت کی ابو طالب کے باپ حضرت عبد المطلب سے، اور عبد المطلب نے اپنے دادا عبد مناف سے کہ مولا علی نے جمع صوری کی، اس صورت میں ارسال بھی معنی خیز ہوگا کہ حضرت علی کے پڑپوتے کی روایت حضرت علی کے دادا سے ہوگی، اس صورت میں حدیث کے موضوع ہونے میں بھی کچھ شک نہیں کہ کہاں عبد المطلب اور عبد مناف اور کہاں حضرت علی سے روایت، لہٰذا احناف کا مدعا کسی صورت میں حاصل نہیں...!! کچھ تو خوفِ خدا، خوف شریعت کا لحاظ وپاس کیا ہوتا..!!ملخصا

توضیح: حدیث مرسل سے متعلق غیر مقلدین عام طور پر شور مچاتے رہتے ہیں، وہ حدیث کی اس قسم کو ضعاف کے کھاتے میں رکھتے ہیں۔ اگر کوئی مرسل حدیث ان کے سامنے آئے تو جھٹ سے یہ کہہ دیتے ہیں یہ تو کہ ضعیف ہے۔ محدثین مراسیل کا اعتبار نہیں کرتے۔ اس مسئلے پر قدرے تفصیل سے روشنی ڈالی جاتی ہے تاکہ نذیری غیر مقلدین کے علم میں بھی اضافہ ہوجائے۔ ہم یہ سمجھنے کی کوشش کریں گے کہ ''حدیث مرسل'' کی حجیت صرف احناف کے نزدیک ہے یا دوسرے مذاہب کے لوگ بھی اس کی حجیت کا اعتراف کرتے ہیں، پھر یہ کہ احناف مطلقاً ''مراسیل'' سے استدلال کرتے ہیں یا اس کے کچھ شرائط وقیود بھی ہیں؟

حقیقت یہ ہے کہ ''حدیث مرسل'' کی قبولیت میں احناف تنہا نہیں ہیں، محدثین کی ایک جماعت ''حدیث مرسل'' کو قبول کرتی رہی ہے اور اس کو حجت بھی مانتی رہی ہے۔ سفیان ثوری، مالک بن انس اور امام اوزاعی جیسے قد آور محدثین نے ''حدیث مرسل'' کو قبول کیا اور اس سے استدلال کیا۔ تاریخ علم حدیث میں اس قسم کی حدیث پر کلام کرنے والے سب سے پہلے امام شافعی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔ امام المحدثین امام ابو داؤد (مؤلف سنن ابی داؤد) اہل مکہ کے نام لکھے گئے اپنے ایک پیغام میں لکھتے ہیں:

واما المراسيل فقد كان يحتج بها العلماء فيما مضى مثل سفيان الثورى، و مالک بن أنس، والأوزاعى حتى جاء الشافعى فتكلم فيها و تابعه على ذلک أحمد بن حنبل وغيره. (۱۵)

امام ابن جریر طبری لکھتے ہیں:

لم يزل الناس على العمل بالمرسل وقبوله حتى حدث بعد المأتين القول برده ...

اجمع التابعون باسرهم على قبول المراسيل، ولم يات عنهم انكاره، ولا عن احد من

الأئمة بعدهم الی راس المأتین۔ (۱۶)

ابتدا سے علما (محدثین) ''مرسل حدیث'' کو قبول کرتے آئے یہاں تک کہ دو سو ہجری کے بعد اسے رد کرنے کا قول سامنے آیا.... تمام تابعین نے ''مراسیل'' کے قبول کرنے پر اجماع کیا، کسی نے بھی ان میں سے ''مرسل'' کی قبولیت سے انکار نہیں کیا اور نہ ہی ان کے بعد دو سو ہجری تک کسی امام نے اسے قبول کرنے سے انکار کیا۔

علما کی اس جماعت نے تنبیہ کی ہے کہ اگر مرسل کے رد کرنے قول کرلیا جائے تو بہت سارے معتمد رواۃ پر حرف آئے گا، جبکہ علمائے اسلام اور محدثین ابتدا سے ان کی حدیثوں کو قبول کرتے آئے ہیں:

ان الراوی الثقة کان لایرسل الحدیث الا بعد صحته عنده، ماجاء عن الأعمش قال: قلت لابراهیم النخعی اذا حدثنی فأسند، فقال: اذا قلت لک: قال عبد اللّٰہ فقد حدثنی جماعة عنه، واذا قلت لک: حدثنی فلان عن عبد اللّٰہ فهو الذی حدثنی... (۱۷)

ثقہ راوی ارسال اسی وقت کرتا ہے جبکہ حدیث اس کے نزدیک صحیح ہوتی ہے، اعمش سے مروی ہے کہ انہوں نے ابراہیم نخعی سے کہا کہ جب مجھ سے حدیث بیان کیا کرو تو اسناد کے ساتھ بیان کرو، ابراہیم نے جواب دیا: اگر میں ''قال عبداللّٰہ'' کہوں تو یہ سمجھ لینا کہ محدثین کی ایک ایسی جماعت سے میں روایت کر رہا ہوں جنہوں نے ان سے روایت کیا ہے اور جب یہ کہوں کہ ''حدثنی فلان عن عبد اللّٰہ'' تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس ایک شخص نے ہی مجھ سے روایت کیا ہے۔

متعدد مذاہب کے علما کے اقوال سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ؟ حدیث ''مرسل'' کو قبول کرنے کا رواج ابتدا سے ہی تھا۔ امام ابو داؤد کے مطابق امام شافعی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سب سے پہلے اس کے قبول کرنے سے انکار کیا۔ علامہ طبری کی تصریح سے یہ بات سمجھ میں آئی کہ دو سو ہجری کے بعد اس بدعت کا آغاز ہوا، اگر مقام میں اتنی گنجائش ہوتی تو یقیناً میں منکرین کے دلائل کا بھی تجزیہ کرتا۔ تنگی مقام کی وجہ سے ہم اسے نظر انداز کرتے ہیں۔ یہاں یہ ملاحظہ کیجیے کہ کیا احناف کے نزدیک ''مرسل'' مطلقاً حجت ہے یا اس کی کچھ شرطیں بھی ہیں؟

علمائے شافعیہ کا ایک گروہ اس بات پر مصر ہے کہ احناف ''مرسل'' کو مطلقاً حجت مانتے ہیں۔ اس فکر کو ترویج دینے والے سرکردہ علما میں سے علامہ شیرازی، علامہ قرافی، علامہ آمدی اور امام رازی ہیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: اللمع فی اصول الفقه، ص ۷۴، مطبوعه مصطفی البابی، مصر۔ شرح تنقیح الفصول، ص ۲۷۹، مطبوعه الکلیات الأزهریه، المحصول، ۲/ ۶۵۰ دار الکتب العلمیه، بیروت

سچ یہ ہے کہ احناف کے نزدیک ''مراسیل'' مطلقاً حجت نہیں۔ اس کے مقبول ہونے کے لیے شرط یہ ہے کہ اگر ارسال کرنے والے راوی کا تعلق قرونِ ثلاثہ سے ہے تو اس کی ''مرسل روایت'' اس وقت تک قابل حجت ہوگی جب تک کہ اس کے بارے میں یہ معلوم نہ ہو کہ وہ غیر عادل اور غیر ثقہ سے روایت کرتا ہے۔ اگر یہ پتہ چل جائے کہ ارسال کرنے والا راوی غیر ثقہ سے روایت کرتا ہے تو اس کی ''مرسل روایت'' مقبول نہیں ہوگی۔ قرونِ ثلاثہ کے بعد اگر کوئی راوی ''ارسال'' کر رہا ہے تو اس کی روایت اس وقت تک قابلِ احتجاج نہیں ہوگی جب تک اس کے بارے میں یہ مشہور نہ ہو کہ وہ ثقہ اور عادل سے ہی روایت کرتا ہے۔ مزید وضاحت کے لیے علامہ سرخسی کی یہ عبارت ملاحظہ کیجیے:

و أصح الأقاويل في هذا ما قاله أبو بكر الرازي: ان مرسل من كان من القرون الثلاثة حجة مالم يعرف منه الرواية مطلقا عمن ليس بعدل ثقة ، ومرسل من كان بعدهم لايكون حجة الا من اشتهر بأنه لا يروى الا عمن هو عدل ثقة، لأن النبي ﷺ شهد للقرون الثلاثة بالصدق والخيرية فكانت عدالتهم ثابتة بتلك الشهادة مالم يتبين خلافهم، وشهد على من بعدهم بالكذب بقوله "ثم يفشو الكذب" فلا تثبت عدالة من كان في زمن شهد على أهله بالكذب الا برواية من كان معلوم العدالة يعلم أنه لا يروى الا عن عدل. (١٨)

علامہ نسفی کی عبارت اور بھی واضح ہے، وہ فرماتے ہیں:

الفصل الأول : في الانقطاع الظاهر وهو المرسل من الأخبار، وهو على أربعة أوجه: أحدها: ما أرسله الصحابي. ثانيها : ما أرسله القرن الثاني. ثالثها: ما أرسله العدل في كل عصر. رابعها: ماأرسله من وجه، و اسند من وجه. فأما الأول: فمقبول بالاجماع. و أما الثاني فحجة عندنا وهو قول مالك و جمهور المعتزلة. وأما الثالث: فكذلك عند الكرخي فانه لا يفرق بين مراسيل أهل الأعصار ويقول : من تقبل روايته مسندا تقبل روايته مرسلا... وأما الرابع: فلا شبهة في قبوله عند من تقبل المرسل، وأما من لم يقبله فقد اختلفوا فيه. قال بعض أهل الحديث :انه مردود لأن حقيقة الارسال تمنع القبول فشبهته تمنع أيضا احتياطا. وعامتهم على انهم حجة لأن المرسل ساكت عن حال الراوي، والمسند ناطق، والساكت لا يعارض الناطق.(١٩)

پہلی فصل ظاہری انقطاع کے بارے میں یہ مرسل ہے اور اس کی چار قسمیں ہیں:

اوّل: ارسال کرنے والا راوی صحابی ہو۔

دوم: ارسال کرنے والے راوی کا تعلق قرن ثانی سے ہو۔

سوم: کسی بھی زمانے میں ارسال کرنے والا راوی عادل ہو۔

چہارم: ایسی روایت جو ایک سند سے مرسل ہو اور کسی دوسری سند سے ''مسند'' ہو۔

پہلی قسم بالاجماع مقبول ہے، دوسری قسم ہمارے نزدیک حجت ہے۔ یہی امام مالک اور جمہور معتزلہ کا بھی قول ہے۔

تیسری قسم کرخی کے نزدیک مقبول ہے ان کے نزدیک اہلِ عصر کے ''مراسیل'' میں کوئی فرق نہیں، ان کا ماننا ہے کہ جس کی ''مسند'' روایت مقبول ہے اس کی ''مرسل'' بھی مقبول ہے....

چوتھی قسم جو لوگ ''مرسل'' کو قبول کرتے ہیں ان کے نزدیک چوتھی قسم کے مقبول ہونے میں بھی کوئی شبہہ نہیں۔ جو لوگ اسے قبول نہیں کرتے ان کے نزدیک اس چوتھی قسم میں اختلاف ہے۔ بعض اہلِ حدیث کا کہنا ہے کہ وہ مردود ہے کیونکہ ''مرسل'' (علی الاطلاق) غیر مقبول ہے۔ احتیاطاً جہاں شبہہ ہوگا وہ بھی روایت غیر مقبول ہوگی۔ اکثر محدثین کا ماننا ہے کہ یہ حجت ہے، کیونکہ ''مرسل'' (''س'' کے کسرہ کے ساتھ) راوی کے حال سے خاموش ہوتا ہے اور ''مسند'' ('س' کے کسرہ کے ساتھ) راوی کے حال کو بیان کرتا ہے، لہٰذا ساکت ناطق کا معارض نہیں ہوسکتا۔

ان تصریحات کی روشنی میں واضح ہوگیا کہ احناف کے نزدیک حدیث ''مرسل'' مطلقاً قابلِ قبول نہیں بلکہ ارسال کرنے والا اگر عادل و ثقہ ہے تو اس کا ارسال قبول کیا جائے گا اور وہ روایت حجت ہوگی۔ اگر ارسال کرنے والا راوی ثقہ و عادل نہیں تو اس کی روایت قابل قبول نہیں۔ اس تصریح کے بعد اب بھی اگر کوئی یہ کہے کہ احناف ''مرسل'' جو کہ ضعیف ہوتی ہے، کو قبول کرتے ہیں، تو یہ اس کا اپنا نظریہ ہوگا، احناف کے اصول کی ترجمانی نہیں ہوگی۔ مجتہد مطلق امام شافعی رضی اللہ تعالیٰ عنہ (م: ۲۰۴) جو حدیث ''مرسل'' کی قبولیت سے انکار کرنے میں سرفہرست ہیں، کا قول مضطرب ہے کیونکہ مرسل کی قبولیت اور اس کے حجت ہونے کا تو انکار کردیا مگر جب قواعد کی تطبیق کرنے آئے تو ''مراسیل'' سے استدلال کر بیٹھے۔ کبھی انہوں نے یہ کہا کہ ''مراسیل ابن مسیب کے علاوہ کوئی بھی مرسل حجت نہیں، پھر کہیں ''ابن مسیب'' کے ''مرسل'' کو بھی رد کردیا، پھر کہیں ''ابن مسیب'' کے علاوہ دیگر ''مراسیل'' کو قبول کرلیا۔ پھر یہ کہا کہ اگر ''مرسل'' کی تقویت کسی ''مسند'' سے ہوجائے تو اسے قبول کرلیا جائے گا۔ ان سب کی تفصیل اگر ملاحظہ کرنا چاہیں تو امام شافعی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی کتاب ''الرسالہ'' مطبوعہ دار التراث، قاہرہ کا فقرہ نمبر ۱۲۶۴ اور اس کے بعد کا مطالعہ کریں وہاں کافی تفصیل موجود ہے، اس لیے ہم ان تمام عبارات کو نقل کرنے سے قاصر ہیں۔ یونہی ''مراسیل ابن مسیب'' سے متعلق امام شافعی رضی

اللہ تعالیٰ عنہ کے مضطرب اقوال کو ملاحظہ کرنے کے لیے، امام شافعی کی کتاب ''الام'' ۱۵۸/۲'' پر علامہ مزنی شافعی کا مطبوع حاشیہ بنام ''مختصر مزنی''، امام ابن ابی حاتم کی ''المراسیل'' ص ۱۲، مکتبۃ مثنی بغدا، امام نووی کی کتاب ''المجموع'' ۹۹/۱، حافظ علائی کی کتاب '' جامع التحصیل فی احکام المراسیل، الدار العربیہ بغداد، ص ۴۵ اور ''تدریب الراوی'' وغیرہ کا مطالعہ کیجیے۔

''تدریب الراوی'' کے مطابق تو امام مسلم نے بھی اپنی صحیح میں ''مراسیل'' کی تخریج کی ہے، یہ اور بات ہے کہ اس تخریج سے ان کا مقصد استدلال نہیں ہے۔ تاہم اپنے مقدمہ میں بطور استدلال ضرور ذکر کیا ہے۔ اگر بعض علما کے مطابق ''مرسل'' کا عام معنی یعنی جو متصل السند نہ ہو انقطاع خواہ کہیں بھی ہو، کا اعتبار کیا جائے۔ امام شافعی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی کتاب ''مسند شافعی'' میں بھی آپ کو اس کی بہتیرے مثالیں ملیں گی۔ ان سب کے باوجود صرف امام ابو حنیفہ کو مورد الزام ٹھہرانا کہاں کا انصاف ہے...!!!

قارئین کرام! اس مختصر تحریر کے بعد آپ نے اندازہ کرلیا ہوگا کہ امام احمد رضا فاضل بریلوی کو تمام علوم کے ساتھ ساتھ علم رجال حدیث میں کس قدر مہارت حاصل تھی۔ اصولِ حدیث پر گہری نگاہ کے ساتھ ساتھ اقوال ائمہ پر کتنی عمیق نگاہ تھی۔ حاجز البحرین اور دیگر رسائل پڑھنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کسی موضوع سے متعلق بھی احادیث کا استیعاب امام احمد رضا محدث بریلوی کی خصوصی دلچسپی تھی۔ ہم اپنی اس تحریر کو اپنے ایک اور استاذ علامہ ڈاکٹر مصطفیٰ محمد محمود کے ان الفاظ پر ختم کرتے ہیں: ان **الشیخ العلامہ واسع الاطلاع، فقد نقل فی ھذا السفر الجلیل من مصادر حدیثیة... ورجع ایضا الی المطولات والمبسوطات والمختصرات ... وھذا ان دل علی شئیا فانما یدل علی عمق فکرہ وطول باعہ فی العلم (۲۰)**

علامہ امام احمد رضا بڑی وسیع اطلاع کے مالک تھے۔ انہوں نے اس مسئلہ (ختم نبوت) کو ثابت کرنے میں احادیث کی بڑی بڑی کتابوں سے رجوع کیا۔ مطولات، مبسوطات اور مختصرات بھی ان کی نگاہ سے مخفی نہیں رہیں.. ان ساری ابحاث کا اس کے علاوہ اور کیا مطلب ہوسکتا ہے کہ امام کی فکر بڑی گہری اور علم و ہنر میں ان کا قدم بہت مضبوط تھا۔

مصادر و حواشی

۱۔ مقدمہ تقبیل ابہامین، راقم نے اس کتاب کا عربی میں ترجمہ کیا ہے۔ موضوع کی مناسبت سے اس کا نام ''الھاد الکاف فی حکم الضعاف'' رکھا، جو اصل امام احمد رضا کا ہی رکھا ہوا نام

ہے۔ الازہر اور مصر کے چار جلیل القدر محدثین اساتذہ کے مقدمے کے ساتھ کتاب ۲۰۰۴ء میں مرکز اہلِ سُنّت گجرات سے چھپ کر منظر عام پر آچکی ہے۔

۲۔ راقم اس کتاب کا بھی عربی ترجمہ مکمل کر چکا ہے، کتابت بھی مکمل ہوچکی ہے، تحقیق اور ضروری حواشی کا کام چل رہا ہے۔ جلد ہی مزید افادات، شرح اور اصولی مباحث کے ساتھ چھپ کر منظر عام پر آرہی ہے۔

۳۔ ہماری یہ بحث فتاویٰ رضویہ جلد ۴، صفحہ ۱۵۹ تا ۲۳۴ سے ماخوذ ہے، تفصیل کے لیے دیکھیے فتاوی رضویہ جدید، مطبوعہ مرکز اہل سُنّت برکات رضا، گجرات۔

۴۔ معیار الحق، صفحہ ۳۹۶، مطبوعہ چٹان پریس لاہور،، جنوری ۱۹۶۵ء

۵۔ تقریب التهذیب، ترجمہ رقم ۴۵۶۷

۶۔ تهذیب الکمال ۱۵۹/۲۷، الرسالہ، بیروت

۷۔ سنن بیهقی ۴۹۰/۱، بیروت

۸۔ معیار الحق، صفحہ ۳۹۶، مطبوعہ چٹان پریس لاہور،، جنوری ۱۹۶۵ء

۹۔ معیار الحق، صفحہ ۳۹۶، مطبوعہ چٹان پریس لاہور،، جنوری ۱۹۶۵ء

۱۰۔ معیار الحق، صفحہ ۳۹۷، مطبوعہ چٹان پریس لاہور،، جنوری ۱۹۶۵ء

۱۱۔ مقدمہ تقریب التهذیب

۱۲۔ معیار الحق، صفحہ ۳۹۹، مطبوعہ چٹان پریس لاہور،، جنوری ۱۹۶۵ء

۱۳۔ معیار الحق، صفحہ ۴۰۱، مطبوعہ چٹان پریس لاہور،، جنوری ۱۹۶۵ء

۱۴۔ معیار الحق، صفحہ ۴۰۵، مطبوعہ چٹان پریس لاہور،، جنوری ۱۹۶۵ء

۱۵۔ رسالۃ ابی داؤد الی اہل مکۃ، دار العربیۃ، بیروت

۱۶۔ الاحکام ۱۷۸/۲، بیروت

۱۷۔ جامع التحصیل صفحہ ۷۷، بیروت

۱۸۔ اصول السرخسی ۳۶۴/۱، دار الکتاب العربی، بیروت

۱۹۔ کشف الاسرار علی اصول البزدوی ۲/۳، بیروت

۲۰۔ مقدمہ محمد ﷺ خاتم النبیین، دار البیان للطبع والنشر، قاہرہ۔

مجدّدِ اعظم امام احمد رضا بریلوی اور تحریکِ ندوہ

از: مولانا محمد وارث جمال قادری
صدر آل انڈیا تبلیغ سیرت، ممبئی

مولای صل وسلم دائماً ابداً علیٰ حبیبک خیر الخلق کلھم

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا بریلوی قدس سرہٗ کی تہہ در تہہ و پہلو دار شخصیت اور آپ کی ذات جامع الصفات کے کسی نہ کسی علمی گوشے، فکری زاویے، دینی خدمات، ملی کارنامے، اسلامی شوکت و عظمت کے لیے ان کے سوزِ دروں اور ان کے عشق کی بے چینیوں پر کوئی نہ کوئی نئی تحقیق، نئی تلاش، نئی جہت اور نئی نئی بلندیاں سامنے آتی رہتی ہیں۔ چھوٹی بڑی کتابیں، مقالہ جات سے مبسوط وضخیم مجلدات اور تاریخی نمبروں کا ایک تسلسل ہے۔ جو رُکنے کا نام نہیں لیتا۔ اللہ اکبر۔ کہاں کھولے ہیں گیسو یار نے خوشبو کہاں تک ہے

آپ کے علمی، دینی، ملی، فکری اور تجدیدی کارناموں کا ایک طورِ سینا ہے جس کی چوٹی تک دنیائے علم وفضل اپنی تمام کوششوں کے باوجود ابھی تک پہنچ نہیں سکی ہے۔

آپ کے انھیں روشن وتجدیدی کارناموں میں ایک بڑا وتاریخی کارنامہ "تحریکِ ندوہ" کا ردّ و استیصال اور اس فتنۂ عظیم کا قلع قمع اور اس سیلابِ بلا پر ایک مضبوط، ناقابلِ شکست و ریخت و تاریخی باندھ باندھنا ہے۔

تحریکِ ندوہ کی مضرت رسانیوں اور اسلام کے نام پر اہلِ ندوہ کی بوالعجبیوں سے اسلامیانِ ہند خصوصاً سوادِ اعظم اہلِ سُنّت و جماعت کو بچانے کے لیے اپنے رفقا، اہلِ محبت، خلفا وتلامذہ وجید ترین معاصرین علما بالخصوص حاملِ قوتِ قدسیہ حضور تاج الفحول حضرت علامہ شاہ عبدالقادر بدایونی بن سیف اللہ المسلول حضرت علامہ شاہ فضلِ رسول کی سرپرستی ومعیت میں جو کارنامہ انجام دیا ہے وہ آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہے۔

رُخِ زیبا کے جلووں سے دلِ تاریک روشن ہے
تیری یادوں کے پھولوں سے میرا صحرا بھی گلشن ہے

وہابیت کی گندی کوکھ سے جتنے بھی مذہبی و سیاسی فتنے و باطل تحریکیں پیدا ہوئیں۔ حضرت

رسانیوں اور اسلام کے روشن چہرے کو داغ دار کرنے میں ''مجلس ندوۃ العلما'' کو بھی ایک خصوصی امتیاز حاصل تھا۔ اس لیے اس عہد کے اساطینِ اُمّت جلیل القدر علما و مشائخ بالخصوص حضور تاج الفحول بدایونی اور اعلیٰ حضرت امامِ اہلِ سُنّت بریلوی نے اس کے ردّ و استیصال اور اس کی پامالی میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا اور اس تعلق سے کسی سُستی وغفلت کو قریب پھٹکنے نہیں دیا۔ اس کے لیے وہ ہمہ وقت تازہ دم و مستعد رہے۔ اور ہر آن و ہر لحظہ بے چین! اور ساتھ اپنے رب کے حضور فریاد کناں! ؎

تو فرستا دی بما روشن کتاب	می کند باما با حکایت خطاب
از طفیلِ آں صراط مستقیم	قوتِ اسلام راہ دہ اے کریم
بہر اسلامے ہزاراں فتنہا	اک مہ وصد داغ فریاد اے خدا

واضح رہے کہ ندوۃ العلما اور دارالعلوم ندوۃ العلما دو الگ الگ چیزیں ہیں اور دونوں کی الگ الگ حیثیتیں۔ موجودہ دارالعلوم ندوۃ العلما ایک معروف علمی ادارہ ہے، جو مجلس ندوۃ العلما کے ملبے پر لفظ دارالعلوم کے اضافے کے ساتھ اسی نام سے معرضِ وجود میں آیا۔ یہ خالص ایک تعلیمی ادارہ ہے جو عربی زبان و ادب کے ساتھ مسلکِ دیوبند کا ایک بڑا حامی اور برصغیر ہند میں شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی، سید احمد بریلوی اور شاہ اسماعیل دہلوی کے عقیدہ و مسلک کا نمایندہ و ترجمان ہے۔ جو چودہ سو سالہ قدیم وحقیقی اسلام سے قدم بہ قدم متصادم ہے۔

ہم یہاں جس ندوۃ العلما کا ذکر کر رہے ہیں وہ کوئی علمی ادارہ نہیں بلکہ ''مجلس ندوۃ العلما'' کے نام سے ایک تحریک تھی، جو ۱۳۱۱ھ مطابق ۱۸۹۴ء میں اُتر پردیش کے مشہور صنعتی شہر کانپور میں قائم ہوئی۔ ابتداً تاسیسِ ندوہ کا علمائے اہلِ سُنّت نے خوش دلی کے ساتھ خیرمقدم کیا بلکہ اس کے تاسیسی اجلاس منعقدہ ۱۳۱۱ھ کانپور میں علمائے اہلِ سُنّت بالخصوص اعلیٰ حضرت امام احمد رضا نے بہ نفسِ نفیس شرکت فرمائی، کہ اس کے صدر نشین استاذ العلما حضرت مولانا لطف اللہ علی گڈھی تھے، جب کہ ناظمِ اعلیٰ مولانا سید محمد علی مونگیری تھے اور ندوۃ العلما کے بظاہر جو اغراض و مقاصد تھے وہ بڑے تعمیری تھے، مگر یہ ظاہری مقاصد ہاتھی کے دکھاوے والے دانت کے مانند تھے' حقیقی مقصد تقیہ کے نقاب میں تھا، جس کے ظاہر ہونے میں زیادہ تاخیر نہیں ہوئی۔ ان کے حقیقی مقاصد کا خلاصہ ولب لباب جو تھا وہ مختصراً یہ کہ شرکتِ کلمہ و شرکتِ قبلہ کی بنیاد پر جتنے بھی اہلِ کلمہ ہیں وہ سب ایک ہیں خواہ وہ رافضی ہو یا نیچری، وہابی ہوں یا قادیانی۔ جس میں کسی کی نہ تکفیر کی جاسکتی ہے اور نہ ہی تفسیق۔ سب کے سب ایک خدا کے بندے، ایک نبی کے اُمتی، سب کا قبلہ کعبہ، سب کی مذہبی آسمانی کتاب قرآن، سب کے سب ایمان میں برابر۔ اب اگر کوئی اس میں سے کسی طبقے یا فرقے کی تکفیر و تفسیق کرے یا اسے دین سے

خارج مانے یا جہنمی جانے وہ خود کافر و بے دین، فاسق و فاجر جہنمی ہے اور خارج از اسلام ہے۔ غضب بالائے غضب یہ کہ سب دجل و فریب اور سادہ لوح مسلمانوں کی آنکھوں میں جو دھول جھونک رہے تھے وہ اہلِ سُنّت و جماعت کے نام اور اسی پلیٹ فارم سے، کہ اس وقت بھی پورے برصغیر ہند میں تقریباً سُنّی ہی سُنّی تھے جو سب کے سب حنفی المذہب ۱؎ غیر سُنّی خواہ وہ وہابی مقلد ہوں یا غیر مقلد اور رافضی ہوں یا قادیانی یا نیچری اہلِ سُنّت کے مقابلے میں کسی بھی فی صد کے زمرے میں نہیں تھے۔ برٹش حکومت کی تمام تر پشت پناہی، امداد و تعاون و خیر خواہی کے باوجود علیٰ رؤس الاشہاد انھیں غیر سُنّی ظاہر کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ البتہ نوابانِ اودھ کی حکومت کے باعث اودھ میں جو بھی شیعہ تھے وہ اپنے آپ کو شیعہ کہہ لے جاتے تھے۔ رہ گئے وہابی، دیوبندی وغیرہ، اُن کا حال بقول حضرت اجمل سلطانپوری یہ تھا کہ

وہابی سے پوچھو کہ تم ہو وہابی ۔۔۔ تو فوراً کہیں گے نہیں تو، نہیں تو

اور یہ حال نصف صدی پہلے کا تھا۔ اسی لیے اہلِ سُنّت کے نام سے اس تحریک کو چلانا اور اس کے لیے اہلِ سُنّت و جماعت کا پلیٹ فارم استعمال کرنا ان کی مجبوری تھی۔ چنانچہ اپنی اس تحریک کے لیے صدر جو بنایا تھا وہ بھی جماعتِ اہلِ سُنّت کے ایک بزرگ و نامور عالمِ دین جن کے تلامذہ بھی اس وقت بڑا علمی قد اور بڑی حیثیت لیے ہوئے تھے۔ یعنی استاذ العلما حضرت مولانا لطف اللہ صاحب علی گڑھی۔ اور ناظمِ اعلیٰ مولانا سید علی مونگیری جن کی سُنّیت و حنفیت کی شہرت تھی۔ علمائے اہلِ سُنّت بالخصوص حضور تاج الفحول بدایونی و امامِ اہلِ سُنّت مولانا شاہ احمد رضا بریلوی کا ندوہ کے تعلق سے حساس و بے چین ہونے کا سبب اہلِ ندوہ کا وہ طرزِ عمل اور دامِ تزویر تھا جو سادہ لوح مسلمانوں کو فریب دینے کے لیے انھوں نے سُنّیت کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا۔ تاکہ ندوہ کا پلیٹ فارم اہلِ سُنّت کا پلیٹ فارم سمجھا جائے۔ جس طرح آج کے موجودہ ماحول میں وہابیہ مقلدین و غیر مقلدین نے اہلِ سُنّت و جماعت کو بریلویت ۲؎ کے خول میں محبوس کردیا ہے اور وہابیہ مقلدین یعنی دیوبندیوں نے خود کو اہلِ سُنّت و جماعت کی حیثیت سے پیش کرنا شروع کردیا ہے اور بڑے دھڑلے کے ساتھ خود کو اہلِ سُنّت و جماعت کہنے لگے ہیں۔

اپنی اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لیے کیسے کیسے ہتھکنڈے استعمال کرتے اور خوفِ خدا و شرمِ رسول سے بے نیاز ہوتے، ان کے دامِ فریب کا انداز ملاحظہ ہو۔ وہابیوں، دیوبندیوں، نیچریوں اور ندویوں کے امام الہند فرماتے ہیں:

"ندوۃ العلما کے اجتماع سے مجھے روشن خیال علما کی جو حالت منکشف ہوئی (کیونکہ منتسبین ندوہ

کی طرف میرا ایسا ہی حسنِ ظن تھا) اس سے طبیعت کو اور زیادہ مایوسی ہوئی اور طبقۂ علما کی طرف سے سخت وحشت پیدا ہوگئی۔ مخالفینِ ندوہ وہاں جو کچھ کہہ رہے تھے اور کر رہے ہیں ان کی نسبت تو یہ خیال تھا کہ یہ روشن خیال نہیں ہیں مگر جو لوگ ندوہ کے لیے سرگرم تھے، اُن کی بھی عجیب حالت نظر آتی تھی۔ چونکہ پانچ چھ مہینے ان کی سرگرمیوں کو بالکل قریب سے دیکھتا رہا اس لیے اندرونی حالات بالکل میرے سامنے تھے۔ مَیں نے دیکھا بالکل چالاک، دنیا داروں کی سی کارروائیاں جاری ہیں اور وہ تمام وسائل بے دریغ عمل میں لائے جاتے ہیں جو اپنی کامیابی کے لیے ایک شاطر سے شاطر اور عیار سے عیار جماعت کرسکتی ہے۔ لوگوں کو شامل کرنے کے لیے ہر طرح کی عیاریاں کی جاتی تھیں۔ میرے سامنے ایک واعظ نے ندوے کے ایک سرگرم ایجنٹ سے مشورہ کیا کہ مجلس وعظ میں کیونکر ان کو اظہارِ جوش و خروش کرنا چاہیے اور کیونکر آخر میں نالہ و بکا شروع کردینا چاہیے۔ چنانچہ تجویز پختہ ہوگئی۔ اس کے بعد واعظ نے جوں ہی مثنوی کی ایک حکایت شروع کی، دوسرے صاحب معاً کھڑے ہوکر چال بازوں کی حرکتیں شروع کردیں۔ اس سے مجلس میں بڑی رقت طاری ہوگئی اور اس قدر آہ و بکا ہوا کہ اس پر وعظ ختم کردیا گیا۔ اس طرح کی بیسیوں باتیں مَیں روز دیکھتا تھا۔ ؎

مجلس ندوۃ العلما کے اصل مقصد کو سمجھنے اور اس کا اندازہ لگانے کے لیے کہ اہلِ ندوہ اُمتِ مسلمہ کو کہاں لے جانا چاہتے تھے، اس کی ایک ہلکی سی جھلک حضور تاج الفحول علامہ شاہ عبدالقادر بدایونی قدس سرہ العزیز کے ان گراں قدر مکتوبات میں دیکھیں، جو انھوں نے اپنے معاصرین اعیانِ اہلِ سُنّت کو لکھا۔

واضح رہے کہ مکتوباتِ شریف تو کافی طوالت لیے ہوئے ہیں، ہم یہاں ضروری اقتباسات ہی نقل کریں گے۔ حضرت اقدس مولانا محمد عادل صاحب کانپوری علیہ الرحمہ کے نام اپنے ایک مکتوب میں فرماتے ہیں:

"مجلس ندوۃ العلما جس نام سے تجویز ہوئی نہایت محبوب ہے اور شرکتِ علمائے اہلِ سُنّت موجب برکت۔ مگر روئیداد مطبوعہ میں جو سالِ گذشتہ مشتہر ہوئیں اس میں بعض مقاصد ایسے اجمال و ابہام کے ساتھ بیان کیے گئے کہ جس سے انحصار حقیقت و نجات کا مدار مذہب اہلِ سُنّت پر نہیں رکھا ہے۔ اس میں روافض و نیچریہ وغیرہ مقلدین کی بڑی تائید ہے۔ اس بنا پر مولوی احمد رضا خاں بریلوی نے ناظم صاحب سے بکمالِ عاجزی کہ شانِ دین داری ہے، واسطے اصلاحِ بیان مقاصدِ مذکورہ کے اور تبدیل صورت روداد آئندہ کے بار بار گذارش کیا۔ لیکن ناظم صاحب اپنے خیالات کے مطابق ان کی عرض کو قبول نہیں فرمایا۔"

پھر قدرے اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے مزید اسی مکتوب میں فرماتے ہیں:

''یہ تو ظاہر ہے کہ جناب ناظم صاحب (یعنی مولانا محمد علی مونگیری) سُنّی حنفی مشہور ہیں، پھر کس طرح دل سے نجات و حقیقت کو مذہب اہلِ سُنّت میں منحصر نہ جانتے ہوں گے اور روافض و نیچریہ کو کافر فی بعض المسائل و مبتدع و گمراہ فی بعض المسائل نہ جانتے ہوں گے۔ ہاں کسی مصلحت سے اگر اخفا پر عمل فرماتے ہوں تو دوسری بات ہے۔''

پھر آگے چل کر اسی مکتوب میں فرماتے ہیں:

''پھر کس واسطے خواہ مخواہ اپنی روداد کی سخن پروری کر کے مولوی احمد رضا خاں صاحب وغیرہ اتقیائے اہلِ سُنّت کے خارج کرنے کو ان اشقیائے دین کے شامل نہ کرنے پر ترجیح دی جاتی ہے۔''

پھر اپنے طویل مکتوب کے اختتام پر یوں رقم طراز ہیں:

''اور اگر خدانہ خواستہ فی الواقع ناظم صاحب موافق بیان روداد کے سب فرق مدعیانِ اسلام کے ناجی اور اہلِ حق اور اسلامی بھائی ہیں اور واجب التعظیم والمحبت ہونے کا عقیدہ رکھتے ہیں اور رودادِ سابق کو قابلِ تغیر و تبدیل نہیں جائز جانتے تو اس کا کوئی علاج نہیں۔ بہرحال آپ بھی ایک بار تکلیف فرما کر ثواب اصلاح مابین علمائے اہلِ سُنّت کا حاصل فرمالیجیے۔ اگرچہ تکلیف ہوگی لیکن اس کے جواب دو قطعہ سے مشرف فرمایئے۔ اگر ناظم صاحب کو مذہب اہلِ سُنّت پر رحم آ گیا تو میں ضرور حاضر ہوکر پوری خدمت ندوہ کی بجالاؤں گا۔''

فقط والسلام فقیر عبدالقادر عفی عنہ ؁

حاملِ قوتِ قدسیہ حضور تاج الفحول محب الرسول حضرت اقدس بابرکت مولانا شاہ عبدالقادر بدایونی علیہ الرحمہ، اعلیٰ حضرت امام اہلِ سُنّت مولانا شاہ احمد رضا خاں بریلوی علیہ الرحمہ کے نام اپنے مکتوب میں اہلیانِ ندوہ کے تعلق سے رقم طراز ہیں:

مولانا الابجل الاجل الاکرم مولانا احمد رضا خاں زاد مجدھم

بعد سلام مسنون نیاز مشحون واضح ہو۔ احقر چند روز ہوئے وارد سکندر آباد ہوا۔ جناب مولانا مفتی لطف اللہ صاحب کی خدمت میں فوراً حاضر ہوا۔ بعد قدرے مکالمہ کے اقرار فرمایا کہ فی الواقع ناظم صاحب سے غلطی اور خلافِ مصلحت کا ظہور ہوا۔ بیانات روداد مشتمل بر خدشات ہیں۔ ان کو لکھا جائے گا کہ وہ ان کی اصلاح فرمائیں گے۔ اس کے جواب میں گذارش کیا گیا، اگر اصلاح موقوف رکھی گئی انعقادِ جلسہ پر تو متضمن فسادِ عظیم ہے۔ اور اہلِ سُنّت کو جو خدشے ہیں اس کا طے ہونا اس جلسے میں جس میں مجتہدانِ شیعہ و نیچریہ، وہابیہ ارکان قرار دیئے جائیں گے، ہرگز متصور نہیں ہے۔ بلکہ لازم ہے کہ اولاً قبل انعقادِ جلسہ کے اشاعتِ مذہب اہلِ سُنّت کی بذریعہ فتاویٰ علمائے اہلِ سُنّت ہو جائے۔ پھر اگر

ارکانِ جلسہ کو پابندی ہمارے مذہب کی منظور ہو تو ہم شریک ہوں ورنہ احتراز کریں تا کہ وقت انعقادِ جلسہ احتمال وقوعِ جنگ و جدال کا نہ رہے۔ اس کو پسند فرمایا، جس کی بنا پر سوالات و جوابات لکھوا کر میں نے تصحیح ثبت کر کے ان کی خدمت میں پیش کردی۔ آج ملاقاتِ ثانیہ میں مولوی صاحب نے دستخط و مہر سے جواب کو مشرف فرمایا۔ جن کی نقل مرسل خدمت ہے۔ اعیان و حاضرین اپنی مجلس کے مواجہہ میں مولوی صاحب نے فرمایا کہ بیانِ ناظم بہت بے جا ہے۔ یہ حکم ناظم صاحب کا کہ مسائلِ نزاعیہ کے جواب میں سکوت رہے، نہایت خراب ہے۔ ملخصاً فقیر عبدالقادر عفی عنہ ۵

حضور تاج الفحول بدایونی اپنے اور اپنے والد گرامی سیف اللہ المسلول حضرت علامہ فضل رسول بدایونی کے تلمیذ ارشد حضرت اقدس بابرکت علامہ حافظ قاری سید شاہ عبدالصمد چشتی مودودی حافظ بخاری صدر مجلس علمائے اہلِ سُنّت پھپھوند شریف کے نام اپنے ایک طویل مکتوب میں ندوہ کی بابت فرماتے ہیں:

''بہ جناب مکرمی و معظمی مولوی حافظ سید شاہ عبدالصمد صاحب زاد عنایاتھم، بعد سلام مسنون و نیاز مشحون کے گذارش ہے کہ میں ایک مدت سے علیل رہتا ہوں لیکن باوجود علالت کے مجلس مبارکہ معراج شریف جو بمقام اٹاوہ منعقد تھی حاضر ہوگیا تھا۔ علاوہ وہاں کی برکت حاضری کے آپ کی خدمت کے شرف کا بھی حاصل ہونا خیال میں تھا لیکن وہاں جا کر معلوم ہوا کہ آپ اٹاوہ میں تشریف لائے نہ خانقاہ پھپھوند میں رونق افروز ہیں۔ بلکہ واسطے ہدایت دیگر مقاماتِ بعیدہ کو تشریف لے گئے ہیں۔ اپنی محرومی پر افسوس آیا۔ اس وقت موجب تکلیف دہی ایک امرِ دینی ہے۔ وہ یہ کہ کتاب مطبوع روئیداد جلسہ ندوۃ العلماء جو مقام لکھنؤ منعقد ہوا تھا کہ مقصد اس ندوہ کا یہ ہے کہ جو لوگ کلمہ **لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ** ﷺ پڑھتے ہیں اور بجانب کعبہ شریف نماز پڑھتے ہیں ان کو اپنا دینی بھائی ٹھہرایا جائے اور نزاعاتِ مذہبی سے قطع نظر کیا جائے۔ شیعہ، نیچریہ و غیر مقلدین وہابیہ کے نزاعات کو مانند نزاعاتِ حنفیہ و شافعیہ وغیرہم کے سمجھنا چاہیے۔ یہ خلاصہ ہے اصل مقصدِ ندوہ کا۔'' (پھر دو سطر بعد)

پھر جب حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی آپس میں ایک قرار دیئے جاتے ہیں اور اسلامی بھائی شمار کیے جاتے ہیں تو پھر دوسرے فرق جو مدعیانِ اسلام ہیں وہ کیوں نہیں بھائی بھائی قرار دیے جائیں گے۔ فقط''

چونکہ یہ مضمون سراسر خلاف مذہب اہلِ سُنّت ہے اور قیاس اختلاف مسائل فروع اختلافیہ صحابہ کرام پر جو درمیان مذاہب اہلِ سُنّت کے ہے خلافِ عقاید روافض و وہابیہ و نیچریہ کا کرنا قیاس مع الفارق ہے اور نیز منکر ضروریاتِ دین اگر کلمہ کا اقرار کرے اور نماز ہمارے قبلہ کی طرف پڑھے بالاجماع کافر قطعی ہے۔ منتظمین ندوہ کی تقریر پر یہ اجماع باطل ٹھہرتا ہے اور فی الحقیقت یہ فساد ایک بڑا کید روافض کا ہے۔ واسطے ابطالِ خلافتِ حقہ جناب حضرت امیرالمؤمنین ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی

کہ انھوں نے اس قوم کو جو باوجود ایمان و وحدانیتِ حق سبحانہ و رسالتِ جناب سید المرسلین ﷺ کے اور اقرارِ فرضیتِ نماز کا انکار فرضیتِ زکوۃ سے کرتے تھے، مرتد و کافر کا حکم ٹھہرا کر حکمِ جہاد کا فرمایا تھا۔ اس تقدیر فاسد پر وہ لوگ مسلمان بھائی تھے، اُن کو مرتد و کافر ٹھہرا کر حکم قتل کا دینا خلاف حق ٹھہرا ۓ۔ معاذ اللہ من ذالک۔

حضور تاج الفحول بدایونی علیہ الرحمہ کے ان مکتوباتِ گرامی سے مجلس ندوۃ العلما کے حقیقی مقاصد اور اُن کے مضمرات و مضرات کا اندازہ ہوگیا ہوگا۔ اور اس عہد کے علماے اسلام، مشائخ عظام، اساطینِ اُمت بالخصوص حضور تاج الفحول اور اعلیٰ حضرت امام اہلِ سُنّت کی بے چینیوں کا پس منظر اور ندوہ کے خلاف ان کی استقامت اور جہد وپیہم کی وجہ بھی۔

بے شک یہ مجلس ندوۃ العلما دین حق کے لیے اکبر بادشاہ کے فتنۂ دین الٰہی سے بھی (بہ فرق حالات) ایک بڑا وزبردست فتنہ تھا۔

خیر اکبر تو علم سے بے بہرہ ایک بادشاہ تھا، جس کو اپنی بے علمی و جہالت کے سبب دین کی اتنی خبر نہیں تھی۔ وہ تو اپنی بادشاہت کے استحکام، ہندو اکثریت کی خوش نودی و اپنی ہر دل عزیزی کے لیے اسلام وکفر کو بغل گیر کرانے کے لیے کوشاں تھا۔ حق و باطل، کفر و اسلام، نور وظلمت کو ایک صف میں کھڑا کر کے انھیں ایک جیسا منوانے پر مصر تھا۔ جس کے لیے علماے سوء کے تعاون سے ایک نئے دین کی راہ نکال کر اس کا نام دین الٰہی رکھا۔ جس کی سرکوبی کے لیے اللہ کے ایک برگزیدہ بندے شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی اپنے مٹھی بھر رفقا اہلِ محبت کو لے کر آگے بڑھے اور دین کے لیے اپنی عزیمت و استقامت سے ایک عظیم شہنشاہیت کو سرنگوں کیا، جو تاریخ دعوت وعزیمت کا ایک مستقل عنوان بنا۔ جس کی طرف شاعر مشرق ڈاکٹر اقبال نے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے:

وہ ہند سے سرمایہ ملت کا نگہبان　　　اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار

شیخ سرہند کی انھیں عظیم دینی خدمات، ملّی کارناموں اور دین کے لیے ان کی کفن بردوشی، اسلام کی سر بلندی کے لیے ان کی جاں نثاری، اوروں کی طرح رخصت کے بجائے عزیمت اور خدا کی راہ میں اپنی جان کی پرواہ نہ کرنے کو دیکھ کر علم وفضل کے ایک بلند مینار حضرت علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی نے انھیں مجدد الف ثانی کا خطاب دیا۔ جس کی نوبت چار دانگ عالم میں بجی اور یہ لقب ان کے فرق اقدس پر ایسا ہی سجا جو قیامت تک لیے آپ کے نام کا علم ہوکر رہ گیا۔ اب عالم یہ ہے کہ حضرت شیخ احمد بغیر مجدد الف ثانی کے سمجھ میں نہیں آتے۔ ان کی مقبولیت ومحبوبیت کا عالم یہ ہے کہ ہر زمانے میں ان کی عظمت کا گراف سوا نیزے پہ رہا۔ ذالک فضل اللہ یعطیہ من یشاء بغیر حساب۔

بندہ مومن کا دل خوف ورجاء سے پاک ہے قوت فرماں روا کے سامنے بے پاک ہے

اگر دیکھا جائے تو فتنۂ ندوہ دینِ حق کے لیے فتنۂ دین الٰہی سے زیادہ مضر وخطرناک تھا کہ دینِ الٰہی اسلام کے مقابلے میں ایک نیا دین تھا، جو ایک بے علم شہنشاہ نے اپنے سیاسی مقاصد کے لیے قائم کیا تھا۔ عام مسلمان بھی اس حقیقت کو سمجھتے تھے۔ لہٰذا وہی لوگ اس کے قریب جاتے جس کو دنیوی یا سیاسی مراعات چاہیے۔ گویا دین کے بدلے بامقصد دنیا طلبی جگ ظاہر تھا۔ اور اس بلا میں گرفتار اَن جانے میں نہیں ہوتے بلکہ خوب سوچ سمجھ اور جان بوجھ کر اسے اپناتے۔ اور اس سلسلے میں ہر طرح کا تجاہل صرف عارفانہ ہوتا۔ مگر یہاں تو اس کے کرتا دھرتا بڑے بڑے نام والے علامۃ الدہر تھے۔ عوام کی زبان میں چار آنکھ والے تھے، بلکہ اس میں کوئی کوئی قابلیت میں تو آٹھ آنکھ والے کے برابر تھا۔ جیسے علامہ شبلی نعمانی، علامہ سید محمد علی مونگیری، مولانا ابوالکلام آزاد (جن کی ندوہ سے وحشت کی کہانی ابھی پچھلے صفحات میں پڑھ چکے ہیں) وغیرہ وغیرہ۔ اور یہ فتنہ بظاہر اسلام کے مقابلے میں نہیں بلکہ اسلام کے نام پر شرکتِ کلمہ طیبہ اور شرکتِ قبلہ کی اساس پر دامِ ہمرنگ لیے ہوئے قال اللّٰہ وقال الرسول کی صدائے زمزمہ نواز لیے ہوتے۔

ندوہ کی ہولناکی کا اندازہ اس سے لگایا جائے کہ ندوہ کے ایک جلسے میں جو لکھنؤ میں منعقد ہوا۔ اس میں مولانا ابراہیم آروی نے تمام ضروریاتِ دین اور اس کے مسلمہ اصولوں کو پامال کرتے ہوئے اعلان کیا کہ اسلام کے لیے صرف لاالہ ہی کافی ہے اور صرف لا الٰہ الا اللّٰہ کو نجاتِ آخرت کے لیے کافی قرار دیا۔ شرکائے اجلاسِ خصوصی یعنی ذمہ دارانِ ندوہ نے اس خطاب پر اسے خوب داد وتحسین سے نوازا۔ جس کا ایک بڑا فایدہ یہ ہوا کہ سادہ لوحی کی بنیاد پر جو علما شریک ہوا کرتے تھے، وہ لاحول پڑھتے ہوئے اُٹھ آئے کہ "چلیے یہاں سے تو رسالت بھی تشریف لے گئی"۔ جیسے مولانا عبدالوہاب صاحب لکھنوی ہے وغیرہ اس کے علاوہ بھی بہت سارے واقعات ہیں جس کے ذریعے دینِ حق کو مسخ کیا جارہا تھا۔

بھکی ہوئی دانش سے جہالت بہتر دھوکے کی محبت سے عدارت بہتر

یہی وہ مضمرات اور دین حق کے لیے مضرت رسانیاں اور خطرناک عوامل تھے جس کے پیش نظر دینِ حق کے مجدد واہلِ سُنّت کے امام مولانا شاہ احمد رضا خاں نے مجلس ندوۃ العلما کے خلاف کمر ہمت کسی اور میدانِ عمل میں اُترے اور اس کے لیے باقاعدہ ایک لائن آف ایکشن تیار کیا۔ حضور تاج الفحول بدایونی کی سرپرستی ۸ میں اس عہد کے اساطینِ اُمت، اعاظم رجال واعیانِ اہلِ سُنّت پر مشتمل مجلس علمائے اہلِ سُنّت کے نام سے ایک محاذ قائم کیا جس کی تشکیلی میٹنگ بریلی شریف میں آپ

کے درِ دولت پر ہوئی اور صدارت کے لیے حضور تاج الفحول بدایونی کی معذرت (وہ بھی بڑھتی عمر، بیماری وجسمانی کمزوری کے سبب) کے بعد آپ کے تلمیذ ارشد حضرت اقدس بابرکت حضرت علامہ حافظ قاری مفتی سید عبدالصمد مودودی چشتی حافظ بخاری پھپھوند شریف کا انتخاب عمل میں آیا اور مجلس علمائے اہلِ سُنّت پوری تب وتابِ جاودانہ کے ساتھ مجلس ندوۃ العلما کے دینی وایمانی مضرت رسانیوں کے خلاف میدان میں اُتری۔

خود امام اہلِ سُنّت مجدّدِ دین وملت نے نصف درجن سے زاید کتابیں ندوہ کے ردّ واستیصال میں تصنیف فرمائیں اور پچاس سے زاید کتب ورسائل آپ کی نظر ثانی کے بعد مطبع اہلِ سُنّت بریلی شریف سے شائع ہوئے۔ جو بڑے پیمانے پر مسلمانوں تک پہنچائے گئے۔ ندوہ کے خلاف ایک طویل قصیدہ بھی عربی زبان میں نظم فرمایا اور ''حقائق نما بر رؤس ندوۃ العلما'' کے عنوان سے ستر ۷۰ سوالات قاہرہ ندوہ کے اربابِ حل وعقد سے کیے، جس کے جواب سے صنادیدِ ندوہ تاحیات عاجز رہے اور سوالات کے بوجھ سے اپنی کمروں کو دہرا کیے ہوئے قبر میں پہنچ گئے۔ جس کی طرف اپنے طویل قصیدہ ''چراغِ انس'' میں اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

میرے ستر سوال کا قرضہ — نہ ادا ہو سکا، محبّ رسول
نہ ادا ہوا گرچہ محشر تک — ڈھیل انھیں دے قضا محبّ رسول
بیسیوں اعلان پر بھی ہٹ نہ سکا — گھونگٹ ان مکھڑوں کا محبّ رسول

ندوہ کے خلاف جہاں امامِ اہلِ سُنّت نے جہاد بالقلم فرمایا، وہیں اس کی سرکوبی میں جہاد باللسان کے لیے بھی ہمیشہ تازہ دم رہے اور صرف ''مجلس علمائے اہلِ سُنّت'' قائم کرنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ علاج بالمثل کے طور پر اسی طرز پر ایک تحریک بھی ''جدوہ'' کے نام سے شروع کی جو ندوہ کے خلاف مسلسل سرگرم رہی اور جگہ جگہ اس کے لیے موتِ احمر کا پیغام بر بنی رہی۔

آپ کے ایک محبوب مرید خلیفہ مخیرِ اعظم نواب عبدالوحید صاحب رئیس پٹنہ نے ندوہ کی سرکوبی کے لیے اپنے جیب خاص سے پچاس ہزار روپے خرچ کیے اور جگہ جگہ اہلِ خیر نے اس فتنے سے مسلمانوں کو بچانے کے لیے اپنے دلوں کے ساتھ تجوریوں کے منہ بھی کھول رکھے تھے۔ تنہا برٹش دور کا پچاس ہزار کا آنکڑا، اس زمانے کے کروڑ کی حد کے قریب ہوگا۔ فجزاھم اللّٰہ تعالیٰ جزاء کثیرا

ندوۃ العلما کی دجل فریبیوں کے خلاف اعلیٰ حضرت امام اہلِ سُنّت کی بے چینیوں کے نقطۂ عروج کا اندازہ اس سے لگائیں کہ اہلیانِ ندوہ کی تلبیسیت پر ایک بڑا قدم اُٹھاتے ہوئے اس معاملے کو حرمین طیبین (زاد اللّٰہ شرفاً واجلالاً) کے جلیل القدر علما ومشائخ ومفتیانِ کرام کی بارگاہ میں پیش کیا اور

وہاں سے جو شرعی حکم حاصل ہوا اسے "فتوی الحرمین برجف ندوۃ المین" کے نام سے کتابی شکل میں شائع فرما کر ملک بھر میں پھیلایا۔

ایسا ہرگز نہیں ہوا کہ علماے اہلِ سُنّت بالخصوص حضور تاج الفحول بدایونی و اعلیٰ حضرت بریلوی پر جوں ہی ندوہ کے مفاسد اور دین حق کے لیے اس کی مضرت رسانیاں اور اس کا زہر ہلاہل ہونا ظاہر ہوا۔ تو فوراً کمر کس کر میدان میں اُتر گئے۔

بے شک ندوہ کے تدارک کے لیے فوری طور پر ضرور لگے مگر اس کی ابتدا اہلیانِ ندوہ و ذمہ داران و اربابِ بست و کشادِ ندوہ سے کیا۔ مجلس ندوۃ العلما سے الگ ہونے کے بعد ابتداً ذمہ دارانِ ندوہ سے ان کے مفاسدِ دینی پر بڑی نرمی و ملائمت سے گفتگو کی گئی۔ کافی دل سوزی سے افہام و تفہیم کی کوشش و تبلیغ کی گئی۔ انزلو الناس علی منازلهم کے پیش نظر اصحابِ ندوہ میں جو قابلِ ذکر شخصیات و رجال تھے، ان کے علمی مقام و مرتبے اور عرفی حیثیتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان سے مخلصانہ، عاجزانہ گزارش اور التجاے پیہم نیز ان سے دین وسُنّیت پر رحم کرنے اور مفاسدِ ندوہ پر نظر ثانی کرنے اور ان سے توبہ و رجوع کی تمام تر کوششوں اور اتمامِ حجت کی ہر منزل سے گزرنے کے بعد جب یہ یقینِ کامل ہوگیا کہ اہلِ ندوہ لایعودون کی منزل میں داخل ہوکر ختم الله علی قلوبهم کے مصداق ہوگئے ہیں پھر مسلمانوں کو ان کی گمرہی، بے دینی و غارت گری سے بچانے کے لیے پوری تب و تابِ جاودانہ کے ساتھ میدان میں اُترے اور پھر اس وقت تک چین و سکون سے نہیں بیٹھے، جب تک اُسے فنا کے گھاٹ نہیں پہنچا دیا۔ اور اس فتنۂ عظیمہ سے مسلمانوں کو نجات نہیں دلا دی۔

جزاک اللہ چشم باز کردی = مرا با جانِ جاں ہمراز کردی

پس کروڑہا کروڑ رحمتیں نازل ہوں اے امیرِ کارواں تمہاری اور تمہارے ان عظیم المرتبت و جلیل القدر رفقا، محبّین، خلفا و تلامذہ کی ارواحِ طیبہ پر جنھوں نے پوری پامردی و استقامت کے ساتھ تمہارا دست و بازو بن کر اللہ کے مقدس دین اسلام کو باطل کی آمیزش سے محفوظ کیا اور دین وسُنّیت کے روشن و بے غبار چہرے کو غبار آلود نہیں ہونے دیا۔ ورنہ خدانخواستہ بہائیت، بابیت اور مہدویت کو بھی جگہ دینی پڑتی کہ ان کا بھی کلمہ و قبلہ وہی ہے جو تمام مسلمانوں کا ہے اور کلمہ لا الہ الله محمد رسول الله ﷺ اور قبلہ نماز کی بنیاد پر مسلمانوں کے دینی بھائی ٹھہرتے اور یہ اتنی بڑی سازش اور ایک زبردست کید روافض تھا۔ مگر قربان جایئے حضور تاج الفحول اور اعلیٰ حضرت امام احمد رضا کی فراستِ ایمانی پر کہ اسلام دشمنوں کی اتنی دور سے چلنے والی چال اور اسلام کے خلاف اس بھیانک سازش کو بڑی شدت کے ساتھ محسوس کیا اور اس کے خلاف میدانِ عمل میں اُتر پڑے اتقو فراسة المؤمن انما ینظر بنور الله،

مومن کی فراست سے ڈرو کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔ مومن کی فراست ہو تو کافی ہے اشارہ

یہ انھیں نفوسِ قدسیہ اور بندگانِ بے ریا کی کوششوں اور ان کی عزیمت و استقامت اور جہاد فی سبیل اللہ ہی کی جلوہ سامانی ہے کہ آج لاکھوں قادیانی اپنے کلمہ، درود، قبلہ و کعبہ و قرآن کے باوجود دائرۂ اسلام سے باہر ہیں۔ اُن پر حج وغیرہ بند، حدودِ حرم میں ان کا داخلہ غیر مسلموں ہی کی طرح ممنوع، صرف مذہبی بنیادوں پر ہی نہیں بلکہ سرکاری سطح پر وہ پورے عالمِ اسلام میں غیر مسلم ہی ہیں۔ ان کے نماز، روزہ، کلمہ، درود، قبلہ و کعبہ، قرآن الغرض ان کا کوئی حوالہ قابلِ قبول نہیں۔ اور ان کا کوئی قدر مشترک محل نظر! یوں ہی بابی، بہائی، مہدوی اپنے کفر وطغیان میں قادیانیوں سے قدرِ مشترک رکھتے ہیں۔ جان توڑ کر مسلمانوں میں شامل و داخل ہونے کی ان کی ہر کوشش ناکام، نامراد و مردود۔ اور ان کا ہر قدرِ مشترک ناقابلِ قبول۔ وہ مسلمانوں کا سا نام رکھنے، کلمۂ طیبہ پڑھنے، کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے، روزہ رکھنے، تلاوتِ قرآن کے باوجود ختمِ نبوت کے معنیِ متواترہ و عقیدۂ حقہ کے انکار کے سبب کافر و مرتد و بے دین ہیں۔ مسلمانوں میں شامل رہنے کے لیے اُن کا ہر استدلال باطل اور ہر دعویٰ کاذب اور ہر دلیل جھوٹی۔

قادیانیوں، بہائیوں، بابیوں، مہدویوں کے تعلق سے حضور صدرالافاضل فخر الاماثل سید المفسرین امام الہند حضرت علامہ سید محمد نعیم الدین مراد آبادی قدس سرہ العزیز کے علمی خزانۂ عامرہ سے چند حقایق اختصار کے ساتھ پیش ہیں، تاکہ ندوہ کے خلاف علمائے حق کی بے چینیوں کا پس منظر سمجھنے میں آسانی ہو۔

حضور صدرالافاضل ایک استفتاء کے جواب میں فرماتے ہیں:

”قادیانی مرزا (غلام احمد قادیانی) کی نبوت کا قائل، ختمِ نبوت کے معنیِ متواترہ کے منکر ہونے کے سبب کافر ہے۔ اب وہ بہائی ہوگیا تو بہائی ہونے کے سبب اُس کا کفر اُٹھ نہیں گیا، جب تک کہ وہ اپنے کفر سے توبہ نہ کرے اور ختمِ نبوت کے معنیِ متواترہ کو تسلیم نہ کرے۔ حضور ﷺ کی نبوت کے بعد کسی نئے نبی کے آنے کے خیال سے تائب نہ ہو۔ اور تمام کفریات سے بیزاری کا اظہار کر کے نئے سرے سے اسلام نہ لائے تو وہ مسلمان نہیں ہوسکتا۔ بہائی ہو جانا اس کو کفر سے پاک نہیں کرسکتا بلکہ وہ اب بھی گندے کفر میں مبتلا ہے۔ مرزا (غلام احمد قادیانی) نے جس قسم کا دین ایجاد کیا اور ضلالت کی جو راہیں اختیار کیں وہ سب اس کی طبع زاد نہیں ہیں، (بلکہ) اس نے اپنے زمانے کے قبل کے بے دینوں، دجالوں سے بہت کچھ اخذ کیا اور ان سب کا پس خوردہ جمع کر کے ایک دوکان لگائی۔ انھیں میں سے بہائی فرقہ بھی ہے۔ تو قادیانی سے بہائی ہو جانا ایک ہی سلسلے کے کفریات میں گشت لگانا ہے۔ ان سبھی دجالوں کی مکاریاں ختمِ نبوت کے معنیِ متواترہ کے انکار کو اپنا اصول بنانے سے چلتی ہیں۔ ۱۲۴۵ھ میں

جون پور (یوپی) میں سید محمد نام کا ایک شخص پیدا ہوا، جس کے باپ کے نام سید خاں تھا اور ماں کا بی بی آقا ملک۔ اس شخص نے اپنے ماں باپ کا نام بدل کر حضور سید کونین ﷺ کے والدین کریمین کے نام پر اپنے باپ کا نام عبداللہ اور ماں کا آمنہ رکھا اور خود کو مہدی کی حیثیت سے دنیا کے سامنے پیش کیا۔ جب اس کے ماں باپ کے جاننے والوں نے اعتراض کیا تو اس نابکار نے حضور پاک ﷺ کے والد ماجد کا نام عبداللہ ہونے سے انکار کیا اور یہ مکر گڑھا کہ حضور ﷺ کا اسمِ گرامی محمد عبداللہ ہے ابن کا لفظ راویوں کی غلطی سے زاید ہوگیا، لاحول ولا قوة الا باللّٰه العلی العظیم۔ اس شخص کے معتقدین اس کی مہدویت کی تصدیق کو فرض اور اس کا انکار کفر جانتے تھے۔ جس طرح مرزا غلام احمد قادیانی کے معتقدین اس کے گھر والوں پر ''اہلِ بیت'' اور اس کی بیوی کو اُم المومنین کہکر کاشانۂ نبوت ﷺ کی نقل اُتارتے ہیں۔ اس سے قبل میر سید محمد جونپوری کے یہاں خلفاے راشدین پانچ، صدیق دو۲، مبشر بالجنۃ بارہ ۱۲، اور چوہتر ۷۴ فرقے تھے۔ اس نے بھی اپنے یہاں جنگِ بدر، فاطمہ حسین سب تھے۔ (معاذاللہ) فرقۂ مہدویہ کے لوگ اپنے گرو میر سید محمد کو خلفاے راشدین (بلکہ) تمام انبیا و مرسلین سے افضل اور مقام و مرتبے میں حضور ﷺ کے ہمسر مانتے اور اسے حضور پاک ﷺ کے برابر ٹھہراتے تھے اور اس کو مفترض الطاعۃ سمجھتے تھے۔ شریعتِ طاہرہ کے احکام کا ناسخ اور اسے صاحب شریعت جدید مانتے تھے اور اس پر وحی آنے کے معتقد بھی تھے۔ اس کے رسالہ ''ام العقائد'' کے مطابق اس کی وحی کچھ یوں ہے: **قال الامام المھدی ﷺ علمت من اللہ بالواسطۃ جدید الیوم قل اتی تابع محمد رسول اللّٰہ محمد مھدی الزمان وارث نبی الرحمن عالم علم الکتاب والایمان مبین الحقیقۃ والشریفۃ والرضوان۔**

اس وحی شیطان کی زبان و مضمون بھی قابلِ دید ہے۔ یہ شخص بلاواسطہ اللہ سے اخذ علوم کا مدعی تھا۔ ہند میں بھی وحی کا دعویٰ کرتا تھا اور نئے نئے احکام کا نزول بتاتا تھا۔ زکوۃ میں بھی بہت قطع و برید کی تھی اس کے عقائد فاسدہ و مکاید کاسدہ کہاں تک بیان کیے جائیں۔ علماے عرب و عجم و فضلاے مکہ و مکرمہ نے ان لوگوں کے تعلق سے کفر و قتل کے فتوے دیئے اور شاہانِ اسلام نے انھیں سزائیں دیں اور ہلاک کردیا۔ پھر اس قسم کا کفر ایران سے پیدا ہوا۔ ۱۸۱۹ء میں شیراز ایران میں ایک شخص پیدا ہوا جس کا نام مرزا علی محمد تھا۔ اس کو باب کہا گیا۔ اس کے معتقدین اور اس پر ایمان لانے والے بابی کہلاتے ہیں۔ یہ شخص یعنی مرزا علی محمد باب بھی مہدی ہونے کا مدعی تھا۔ خود کو مثلِ یحییٰ علیہ السلام اور ایک دوسرے شخص کو جس کا لقب اس نے خود من یظھر اللّٰہ جل ذکرہ رکھا تھا، اس کو مثلِ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کہتا تھا۔ چنانچہ بہاء اللہ کی تعلیمات کے صفحہ ۷ پر مرزا علی محمد باب کا یہ قول موجود ہے کہ میں یحییٰ

ہوں۔ مرزا علی محمد باب نے پیغمبری کا بھی دعویٰ کیا اور اس نے اپنی علیحدہ شریعت بنائی تھی۔ بہاء اللہ کی تعلیمات میں اس کا یہ قول موجود ہے: "میں نے جو شریعت لکھی ہے اس پر عمل کرنے کا حکم تم کو اسی وقت ملے گا جب کہ من یظھر اللّٰہ ظاہر ہوگا اور شریعت میں جس بات کو وہ پسند کرے گا، اس پر عمل کرنے کا حکم دے گا اور جس کو وہ ناپسند کرے گا اس کو تم مت کرنا۔"

چنانچہ طہران میں سب سے پہلے مرزا حسین علی نامی شخص اس پر ایمان لایا۔ مرزا علی محمد باب نے اس کو بہاء اللہ کا لقب دیا۔ مرزا حسین علی عرف بہاء اللہ نے دعویٰ کیا وہ من یظھر اللّٰہ ہے جس کی علی محمد باب نے بشارت دی ہے اور جس کی راہ میں انھوں نے جان فدا کی وہ میں ہی ہوں۔ من یظھر اللّٰہ میرا ہی لقب ہے۔ اس پر ایمان لانے والے بہائی کہلائے۔ وہ خبیث بھی خدا کی طرف سے بالواسطہ علم ملنے اور مبعوث من اللّٰہ کا مدعی تھا۔ اس نے اپنی نبوت کا سکہ جمانے کے لیے ختمِ نبوت کا انکار کیا۔ اس نے احکامِ شرع کو بھی درہم برہم کیا اور شریعت میں نئی نئی راہیں نکالیں۔ اس نے نکاح و طلاق کے مسئلے میں بھی بے ہودہ گوئی کی اور گانے بجانے کو بھی حلال کیا، تقیہ اس گروہ کے دستور کا ایک حصہ ہے۔

اتنے بیان سے ظاہر ہوگیا کہ مرزا غلام احمد قادیانی اور بہاء اللہ ختمِ نبوت کے معنی متواترہ کے انکار میں شریک ہیں۔ رسالت و وحی کے دعوے میں شریک ہیں۔ مثلِ مسیح کے دعوے اور تبدیلی احکامِ شرع میں بھی دونوں شریک ہیں۔ دونوں کے دونوں کافر ہوگئے۔ بہاء اللہ خود بھی رسول بنتا ہے اور اپنے اوپر وحی آنے، بے واسطہ اللہ سے علم پانے کا مدعی ہے اور مرزا علی محمد باب کو بھی پیغمبر مانتا ہے۔ حرام کو حلال اور حلال کو حرام کرتا ہے۔ خود وہ کتنے کفروں میں مبتلا ہوا اور اپنے متبعین کو بھی کیا۔"

یقیناً اس کے متبعین اور اس کی تصدیق کرنے والے سب کافر و مرتد اور خارج از اسلام ہیں۔ یہ قادیانیت، بہائیت، بابیت اور مہدویت کے تعلق سے حضور صدر الافاضل سید المفسرین حضرت علامہ مفتی سید شاہ نعیم الدین مراد آبادی کے ارشادات کا خلاصہ و نچوڑ ہے، جو فتاویٰ صدر الافاضل کے صفحات ایک سو گیارہ تا ایک سو سولہ پر پھیلے ہوئے ہیں۔ جسے ادارہ افکارِ صدر الافاضل نے شائع کیا ہے۔

اسلام کے نام پر ان خارج از اسلام فرقوں اور ان ائمہ تلبیس کے اجمالی تذکرے سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آگئی کہ تحریکِ ندوہ کا ردّ و استیصال اتنا کیوں ضروری تھا؟ اور حضور تاج الفحول بدایونی اور اعلیٰ حضرت امام احمد رضا بریلوی اور اس دور کے جلیل القدر علمائے اہلِ سنّت اس فتنے کی سرکوبی کے لیے اتنے بے چین کیوں تھے؟ اس کے پامال کے لیے اتنی بے دریغ قربانیاں کیوں دیں؟ اس راہِ عزیمت و استقامت میں ہمہ وقت تازہ دم کیوں رہے؟ اپنی دیگر اہم ترین دینی و ملی ذمہ داریوں کی تکمیل کے درمیان اسے ترجیح کیوں دی؟...... کل ندوہ کے اس سیلابِ بلا پر اگر مضبوط باندھ

نہ باندھا گیا ہوتا اور اسلام کے آہنی حصار میں اپنے مذموم مقاصد کے پیش نظر نقب لگانے میں یہ کامیاب ہوجاتے تو کیا آج حکومتِ پاکستان قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دے پاتی؟ کیا ان پر حج وغیرہ بند ہوسکتا تھا؟ کیا قادیانی کی حیثیت سے حدودِ حرم میں داخلے سے انھیں روکا جاسکتا تھا؟ عالمی سطح پر قادیانیوں کی دعوت و تبلیغ اور جگہ جگہ کیا ان کے مراکز سے انکار کیا جاسکتا ہے؟ آج بھی برصغیر سے باہر داعیانِ اسلام اور مبلغینِ اہلِ سُنّت کو جگہ جگہ ان سے بھی سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جب کہ ان کے ہاتھوں میں بھی وہی قرآن، وہی کلمہ اور قبلہ ہے جو ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ ان کا تسبیح و مصلّی، ان کا قبلہ و کعبہ، ان کا کلمہ و قرآن نہ آج کام آرہا ہے اور نہ کل کام آئے گا۔ اور ان کے لیے لاملئن جھنم تو وعدۂ ازل ہے ہی۔

لاملـئـن جھـنـم تھا وعدہ ازلی　　　　عبث نہ منکروں کو بدعقیدہ ہونا تھا

بے شک اعلیٰ حضرت امام اہلِ سُنّت مولانا شاہ احمد رضا قادری سُنّی حنفی محمدی کا عزم و استقلال، تصلّب فی الدین، اخلاص و للّٰہیت، فراستِ مومن، غیرتِ عشق اور جرأتِ مومنانہ نے برصغیر ہند میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ہر فتنے کا سدِّ باب کیا۔ فتنہ خواہ سیاسی نوعیت لیے ہوئے ہو یا مذہبی، تحریکِ ہجرت، تحریکِ ترکِ موالات، تحریکِ ترکِ گاؤکشی وغیرہ میں ان کی فراستِ ایمانی کا سورج اپنے نصف النہار پر نظر آتا ہے۔ جسے دیکھ کر بے ساختہ کہنا پڑتا ہے کہ

اک دانشِ نورانی اک دانشِ برہانی　　　　ہے دانشِ برہانی حیرت کی فراوانی

آپ کے پیش نظر ایک مقدس نصب العین الحبّ فی اللّٰہ والبغض فی اللّٰہ یعنی اللہ کے لیے دوستی اللہ کے لیے دشمنی۔ یہی پوری زندگی کا محور تھا، یہی ان کا مقدس نصب العین اور یہی معیارِ حق و باطل۔ اشداء علی الکفار ورحماء بینھم کا محسوس پیکر۔ اس کے لیے نہ کسی ستائش کی تمنا نہ صلے کی پرواہ۔

من لذت درد تو بداماں نہ فروشم　　　　کفر سر زلف تو بایماں نہ فروشم

آپ کا اخلاص فی الدین، اخلاص فی العمل مسلمانوں کے دین، ایمان کی حفاظت اور ان کے صلاح و فلاح کا جذبۂ بے کراں ہر شے سے بالاتر تھا۔ اللہ و رسول جل وعلیٰ وصلی المولیٰ تعالیٰ کی بارگاہ میں آپ کے حزم و احتیاط کا کوئی جواب نہیں تھا۔ بارگاہِ رسالت سے آپ کی شدید وابستگی اور غیرتِ عشق کی دھوم تو فرش سے عرش تک مچی ہوئی تھی اور ان کی سوزشِ عشق کا شہرہ تو ہر سو تھا۔

جلی جلی بُو سے اس کی پیدا ہے سوزشِ عشق چشم والا
کبابِ آہو میں بھی نہ پایا مزہ جو دل کے کباب میں ہے

کروں تیرے پہ جاں فدا نہ بس ایک جاں دو جہا فدا
دو جہاں سے بھی نہیں جی بھرا کروں کیا کروڑوں جہاں نہیں

اس لیے جب اسلام اور دین وسُنّیت کے خلاف کوئی اور فتنہ رونما ہوتا، خواہ وہ خارجی ہو یا داخلی تو اس کی سرکوبی کے لیے فوراً کمربستہ ہوجاتے اور یہ آپ کے اخلاصِ بے پایاں اور حسنِ نیت کے برکات وثمرات ہی تھے کہ آپ کے جلیل القدر تلامذہ وخلفا کی بات ہی کیا، اہم ترین دینی وعلمی وروحانی شخصیات ورجال جو اعاظم رجال ومعاصرینِ زمانہ تھے، وہ تمام حضرات اس فتنے کو کچلنے کے لیے آپ کے دست وبازو اور ہراول دستہ بن جاتے۔ ان کے عشق واخلاص اور وفا کی خوشبو سے اپنی اپنی مشام جاں کو معطر کرکے من انصاری الی اللّٰہ کا عملی جواب ہوجاتے۔

دستک میں کوئی درد کی خوشبو ضرور تھی دروازہ کھولنے کے لیے گھر کا گھر اُٹھا

اس لیے اعلیٰ حضرت کے عہد میں فتنہ سازوں کو کسی فتنے سازی سے پہلے اس کو بار بار سوچنا پڑتا تھا کہ امام احمد رضا بریلوی کی نگاہِ غضب اور ان کے احتساب سے بچنے کی صورت کیا ہوگی؟ اہلِ فتنہ ہندستان میں رونما ہونے والے تمام مذہبی، سیاسی اور قومی فتنوں کا حشر دیکھ چکے تھے کہ وہ احمد رضا کے حوصلوں سے ٹکرا کر کیسے بے دم ہوئے۔

یہ رضاؔ کے نیزے کی مار ہے کہ عدو کے سینے میں غار ہے
کسے چارہ جوئی کا وار ہے کہ وار وار سے پار ہے

۱۳۱۸ھ میں اعلیٰ حضرت نے عربی زبان میں ایک سو ستر اشعار پر مشتمل ایک طویل قصید لکھا جو پٹنہ میں منعقدہ تین روزہ تاریخی اجلاس جو مجلس ندوۃ العلما کی اصلاح کے لیے تھا، جس میں پانچ سو علما و مشائخ وارباب فضل وکمال نے شرکت فرمائی۔ اس عظیم تاریخی اجلاس کی اہمیت مزید فزوں تر ہوگئی کہ اعلیٰ حضرت نے خصوصی شرکت فرمائی اور اس میں اپنا تاریخی قصیدہ "آمال الابرار و آلام الاشرار" پیش کیا۔ جس میں علما ومشائخ اہلِ سُنّت کا تعارف پیش کرتے ہوئے سرفہرست اپنے ممدوح کریم حضور تاج الفحول محب الرسول حضرت علامہ شاہ عبدالقادر بدایونی کا ذکر رکھا۔ اس عظیم وتاریخی اجلاس میں حضور تاج الفحول بن سیف اللہ المسلول حضرت علامہ فضل رسول بدایونی کے فرزند اکبر وجانشینِ حضرت علامہ شاہ عبدالمقتدر بدایونی علیہ الرحمہ نے اعلیٰ حضرت امام احمد رضا بریلوی کے لیے چودھویں صدی کے مجدّد کا اعلان فرمایا، جس کی تائید وتوثیق اسی اجلاس میں پانچ سو علماے اہلِ سُنّت ومشائخ کرام نے فرمائی۔ جس کے بجا طور پر آپ مستحق تھے۔

تیری شمع حق نما میں ہے وہ زور آزمائی کہ ہزار آندھیوں میں نہ بجھی نہ جھلملائی

کتنی عجیب بات ہی نہیں بلکہ مقامِ حیرت ہے کہ آپ کے تمام روشن وتجدیدی کارناموں میں جو کارنامہ سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہو، جس کی انجام دہی کے دوران آپ کے سر زیبا کو تاجِ مجدّ دیت پہنایا گیا۔ وہ تاجِ کرامت جس کے لیے مبعوث کا اطلاق ہو، جس منصب جلیلہ کے لیے حدیث پاک کے الفاظ یہ ہوں ان اللّٰہ یبعث علی راس کل مآتہ الخ۔ وہی کارنامہ (یعنی تحریکِ ندوہ کے خلاف آپ کا جہاد بالقلم واللسان !اور اس کے خلاف آپ کے کارنامے) اہلِ تحقیق وتبصرہ کے لیے قابلِ اعتنا ہی نہیں اور نہ ہی ایسا بڑا و قابلِ ذکر کارنامہ جس کے لیے ریسرچ اور تحقیق کے گھوڑے دوڑے جائیں اور اسے بھی قابلِ توجہ سمجھا جائے۔

خامہ انگشت بدنداں ہے اسے کیا کہیے ناطقہ سر بہ گریباں ہے اسے کیا کہیے

اس وقت ہر چہار سو ملک و بیرون ملک کی بہت ساری یونی ورسٹیوں و جدید دانش کدوں کے دروازے درجنوں کے حساب سے کھلے ہوئے ہیں، جن میں آپ کی حیات وخدماتِ علمی و دینی پر اہلِ تذکرہ وتحقیق سرگرم عمل ہیں۔ محققین اور اسکالرس کا کارواں در کارواں آپ کی حیات کے کسی نہ کسی گوشے پر کوئی نہ کوئی تمغۂ امتیاز پی ایچ ڈی، ایم ایڈ، ایم فل، ڈی لٹ وغیرہ کی شکل آئے دن حاصل کرتا رہتا ہے۔ اس تعلق سے اربابِ تحقیق کی ایک طویل فہرست سکونِ قلب ونظر و باعثِ فرحت و مسرّت بنی ہوئی ہے۔ حد یہ کہ آپ کے مطبوع وغیر مطبوع خطوط کو کتابی شکل میں جمع کر دینا بھی ایک بڑا علمی کارنامہ سمجھا جانے لگا ہے اور اس پر پی ایچ ڈی کی شکل میں جو تمغۂ امتیاز ہے، اس پر تذکرہ و تبصرہ بہر سو خوب ہے۔ مگر ہائے رے گردشِ ایام کی بے مہری! آپ کی حیات کے جس رخ پر اعزازات وتمغات کے ڈھیر ہونا چاہیے، اُس رخ پر اس قدر پُر اسرار سکوت اور ایسا جاں گسل سناٹا۔

جو بات معتبر تھی وہ سر سے گذر گئی جو حرف سرسری تھا وہ دل میں اتر گیا

میرے سامنے اس وقت پوکھریرا، بہار کا پیغامِ رضا کا خصوصی شمارہ بابت مارچ ۲۰۰۷ء ہے۔ جس میں صاحبزادہ حضرت مولانا سید وجاہت رسول قادری، ایڈیٹر معارف رضا کراچی کا ایک مقالہ بعنوان ''امام احمد رضا اور انٹرنیشنل جامعات'' شاملِ اشاعت ہے، جس میں ۳۳ یونی ورسٹیوں و جامعات کے ناموں کی ایک فہرست ہے جہاں امام احمد رضا کی حیات و خدمات کے حوالے سے تحقیق مقالات لکھے جاچکے ہیں یا پی ایچ ڈی کی جاچکی ہے۔ جو گزشتہ ۲۵؍سالوں میں اعلیٰ حضرت کی حیات و خدمات پر تحقیقاتی و تصنیفاتی پیش رفت کی ایک اجمالی رپورٹ ہے۔ اسی خصوصی شمارہ میں سالنامہ ''معارف رضا'' کراچی کے حوالے سے ۱۱؍صفحات پر ایک طویل فہرست ہے جس میں اعلیٰ حضرت پر تحقیق کرنے والے ریسرچ اسکالرز کے نام، موضوع، نگران کے نام، یونی ورسٹی کا نام، پتہ پھر اسکالر کا

مکمل پتہ الغرض ایک تفصیلی رپورٹ ہے، جسے بڑی محنت سے ترتیب دیا گیا ہے۔ اس فہرست میں اعلیٰ حضرت پر پی ایچ ڈی، ایم فل، ایم ایڈ، ڈی لٹ کرنے والے سب شامل ہیں۔ مگر وہ طویل فہرست جو بڑے سائز پر باریک قلم سے ۱۱ر صفحات پر مشتمل ہے اس میں بھی یہ عنوان نظر نہیں آیا، بار بار خوردبین والا چشمہ لگا کر دیکھنے کے باوجود۔

کتنی حیرت و افسوس کی بات ہے کہ تحریکِ ندوۃ العلما کے خلاف آپ کا یہ کارنامہ تمام دینی کارناموں میں ایک نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ یہی وہ دینی ایمانی کارنامہ ہے جس کی تکمیل کے درمیان برصغیر ہند کی عظیم ترین دینی شخصیت اور سیکڑوں اعاظم رجال نے آپ کے سر زیبا پر تاجِ مجددیت رکھا تھا مگر اہلِ تحقیق و اسکالرز اسی کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ آخر ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے لیے لائن میں کھڑے ہونے والوں کو بھی آپ کی حیات کا یہ تابناک پہلو نظر نہیں آرہا ہے۔ درجنوں کی تعداد میں پی ایچ ڈی کر کے تمغۂ امتیاز جو حاصل کر چکے انھیں بھی یہ عنوان نظر نہیں آیا۔ آخر اہلِ تحقیق اس موضوع سے کترا کیوں رہے ہیں؟ اس عظیم موضوع پر کوئی تحقیقی و تفصیلی گفتگو کیوں نہیں ہو رہی ہے؟ اس سے دامن کیوں بچایا جارہا ہے؟

ضرور کوئی کمی ہے جوائے دلِ بے تاب | حدیث شوق انھیں ناگوار گذری ہے

میں پورے درد و اخلاص کے ساتھ محققین، ناقدین، اربابِ دین و دانش اور اصحابِ قلم سے اپیل کرتا ہوں کہ آپ حضرات اعلیٰ حضرت امامِ اہلِ سُنّت مجدّدِ دین وملّت مولانا شاہ احمد رضا بریلوی کے اس عظیم کارنامے کو اپنی تحقیقات کا عنوان ضرور بنائیں۔ خدانخواستہ کسی وجہ یا عصبیت کے سبب یونی ورسٹیوں میں تحقیق کے لیے یہ عنوان نہ مل سکے تو بھی ہمت نہیں ہارنا ہے۔ پورے صغیر میں پھیلے ہوئے ہمارے یہ بڑے بڑے دینی ادارے و عربی دانش کدے، یونی ورسٹیز کی سطح پر اس نوعیت کے اور بھی بہت سارے عنوان کے لیے چیئر کھولیں اور یونی ورسٹی سطح کے مساوی نوعیت کا تمغۂ امتیاز دیں اور اس پر اخراجات کے لیے مالی حوصلہ افزائی بھی کی جائے۔ تحقیقاتی ادارے اور اکیڈمیاں بھی اس خصوص میں اپنی توجہ مبذول کریں۔ نہ صرف اعلیٰ حضرت بلکہ ان کے علاوہ وہ سارے علمائے اعلام جو اپنے اپنے زمانے میں اعاظم رجال تھے۔ جنھوں نے دین وسُنّیت کی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں اور اپنے وقت میں علم وفضل کے دریا بہائے ہیں۔ اُن کی حیات و خدمات، کارناموں پر ریسرچ کی جائے۔ آج نئی نسل حق سے بہت کم واقف ہے، وہ بھی ان کی حیاتِ طیبہ سے روشنی حاصل کرے۔ ہمارے دینی ادارے، دانش کدے اور جامعات کو اس طرف سنجیدگی کے ساتھ سوچنا اور اس پر عمل کرنا ہوگا۔ حضور صدر الافاضل، حضور صدرالشریعہ، حضرت حجۃ الاسلام، حضور مفتی اعظم ہند، حضرت پیر جماعت علی

محدث علی پوری، حضرت علامہ سید دیدار علی، علامہ سیّد سعید احمد کاظمی، حضرت شاہ احمد نورانی، علامہ سید غلام جیلانی میرٹھی، حضرت پیر کرم شاہ ازہری، حضرت علامہ فیض احمد اویسی، حضور محدثِ اعظم ہند کچھوچھوی، حضور حافظِ ملّت، حضرت مولانا خیرالدین دہلوی والد ماجد ابوالکلام آزاد، حضرت مولانا ارشاد احمد مجدّدی رام پوری، حضرت علامہ عبدالحق بن علامہ فضل حق خیرآبادی، حضرت مولانا ہدایت رسول جونپوری، حضرت علامہ سید سلیمان اشرف بہاری، ملک العلما علامہ ظفرالدین بہاری، حضور مجاہد ملّت علامہ شاہ حبیب الرحمٰن قادری، حضرت عبدالسمیع صاحبِ انوارِ ساطعہ، صاحبِ تصانیفِ کثیرہ حکیم الامت حضرت علامہ مفتی احمد یار خان نعیمی، حضرت علامہ عبدالمصطفےٰ اعظمی، حضرت مولانا ابوالنور محمد بشیر کوٹلوی وغیرہ وغیرہ یہ تمام کے تمام سوادِ اعظم اہلِ سُنّت و جماعت کے قیمتی سرمایے اور اپنے اپنے زمانے میں دین وسُنّیت کے محسنین میں سے تھے۔ ھل جزاء الاحسان الا الاحسان کا تقاضہ بھی ہے اور وقت کی ضرورت بھی کہ ان کی حیات و خدمات پر ریسرچ وتحقیق کی جائے اور ان کی خدماتِ دینی و ملّی وعلمی سے روشناس کرایا جائے تاکہ موجودہ نسل کو اس کا احساس ہو کہ ہر زمانے میں سوادِ اعظم کا دامن گراں قدر شخصیات و رجال سے مالا مال تھا۔

یہ ہے دامن یہ ہے گریباں آؤ کوئی کام کریں
موسم کا منہ تکتے رہنا کام نہیں دیوانوں کا

وما توفیقی الا باللّٰہ وھو حسبی ونعم الوکیل نعم المولیٰ ونعم النصیر علیہ توکلت والیہ اُنیب۔

مأخذ و مراجع

۱؎ سب کے سب حنفی المذہب لاکثر حکم الکل کے پیش نظر کہا گیا ورنہ جنوبی ہند مالابار (کیرالا) وغیرہ اور یہاں مہاراشٹرا کے علاقہ کوکن میں شافعی المذہب ہیں، جن کی تعداد حنفیوں کے مقابلے کم اقل قلیل، از: وارث جمال۔

۲؎ اس موضوع پر راقم الحروف (وارث جمال) نے ''کیا اسلام میں بریلوی کوئی فرقہ ہے؟'' میں بڑی تفصیل کے ساتھ گفتگو کی ہے۔ جس کا دوسرا ایڈیشن مزید حقایق اور حضور مفتیٔ اعظم ہند علیہ الرحمہ کے قولِ فیصل کے ساتھ منظر عام پر آرہا ہے۔

۳؎ آزاد کی کہانی آزاد کی زبانی، ص

۴؎ ماہ نامہ مظہرِ حق: بدایوں کا تاج الفحول نمبر، ص ۴۸۵۔۴۸۷

۵؎ ماہ نامہ مظہرِ حق: بدایوں کا تاج الفحول نمبر، ص ۴۸۸

۶۔ ماہ نامہ مظہرِ حق: بدایوں کا تاج الفحول نمبر، ص ۹۲۔۱۹۱

۷۔ حضرت عبدالوہاب فرنگی محلی رئیس الاحرار حضرت مولانا سید فضل الحسن حسرت موہانی کے پیر و مرشد اور حضرت مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے والد گرامی۔

۸۔ اس وقت حضور تاج الفحول عمر کے آخری پڑاؤ میں داخل ہو چکے تھے جبکہ اعلیٰ حضرت اس وقت جوان تھے۔ حضور تاج الفحول کے عظیم دینی و علمی کارناموں و اخلاص فی الدین کے سبب اعلیٰ حضرت آپ کی بارگاہ میں بڑے مؤدب تھے اور ساتھ بہت زیادہ اخلاص رکھتے تھے اور ہمیشہ بڑی فراخ دلی کے ساتھ ان کی عظمتوں کے معترف رہے اور آپ کی مدحت میں ہمیشہ رطب اللسان۔ اردو زبان میں طویل قصیدہ ''چراغِ انس'' اور عربی زبان میں ایک طویل ترین قصیدہ ۱۷۰ اشعار پر مشتمل ''آمال الابرار و آلام الاشرار'' کے نام سے، جس میں سرفہرست حضور تاج الفحول کا ذکر بڑی عقیدت کے ساتھ کیا ہے۔ حضرت علامہ فضل رسول بدایونی کے علم و کلام کے موضوع پر ان کی عظیم عربی تصنیف ''المعتقد المنتقد'' پر ''المستند المعتمد'' کے نام پر جو تاریخی حاشیہ لکھا ہے، اس میں حضور تاج الفحول کی بارگاہ میں اپنی عقیدتوں کا وہ یوں خراج پیش فرماتے ہیں: **وقد انتدب للرد علیھم علماء اھل السنّہ من الاقطار الھندیہ و کان مقعد جمھم ابن المصنف العلام محب الرسول تاج الفحول خاتم المحققین مولانا الشاہ عبدالقادر البدایونی قدس سرھا۔**

ہندستان کے اطراف و جوانب کے علمائے اہلِ سُنّت ان کا (یعنی اہلِ ندوہ) ردّ کیا، جن کے مقتدا حضرت مصنف (علامہ فضل رسول) کے فرزند ارجمند محبِ رسول تاج الفحول خاتم المحققین مولانا شاہ عبدالقادر بدایونی تھے۔

امام اہلِ سُنّت نے حضرت علامہ فضل رسول بدایونی کی دینی خدمات اور وہابیت کے خلاف ان کی قلمی معرکہ آرائیوں سے متاثر ہوکر عربی زبان میں دو طویل قصیدے ''مدائح فضلِ رسول'' و ''حمایدِ فضل رسول'' ۳۱۳/ اشعار پر مشتمل نظم فرمایا۔ حضور تاج الفحول کی ذات سے جو انھیں والہانہ وابستگی تھی ضمناً ان کے ذکر سے خود کو روک نہ سکے۔ فرماتے ہیں: **ثمّ الدعاء فرجع غنیاً غانماً واقصد سمی البغدادی العالم العلامہ العلم الّذی ذکراہ فاتحۃ بکل** اب دعا ختم ہوئی وہاں سے مالا مال واپس ہو اور سرکارِ بغداد کے ہم نام (یعنی حضرت عبدالقادر بدایونی) کی بارگاہ میں حاضری دے جو عالم، علامہ اور بزمِ علما کے سردار ہیں، جن کی شہرت کی خوشبو ہر جگہ پھیلی ہوئی ہے۔

●●●●●●●

اعلیٰ حضرت کا فقہی مقام

از: ڈاکٹر مولانا حسن رضا
ڈائریکٹر ادارہ تحقیقاتِ عربی و فارسی، پٹنہ

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا اس خاکدانِ گیتی پر ۱۰ رشوال المکرم ۱۲۷۲ھ / ۱۸۵۶ء جلوہ بار ہوئے۔ امام احمد رضا نے مندرجہ ذیل آیت کریمہ سے اپنا سنِ ولادت تخریج فرمایا ہے: اولئک کتب فی قلوبھم الایمان وایدہ بروح منہ.

اعلیٰ حضرت جیسی نابغہ روزگار و عبقری شخصیت جو اپنے معاصرین میں حق آگاہ، حق نگر، حق پسند اور حق گو کی حیثیت سے وحیدِ عصر اور فریدِ دہر ہے، جس کے رمز شناس قلم سے علوم و معارف کے بے شمار سوتے پھوٹ پڑے ہیں۔ اس بلند پایہ ہستی کے لیے مجھ جیسے طالب علم کے لیے کچھ لکھنا حصولِ سعادت کے سوا کچھ نہیں ہے۔

تفقہ فی الدین ایک ایسا اثاثہ ہے کہ اس دولتِ بے مایہ کو ہر دل کی تجوری میں مقفل نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی اس کا رشتہ و ناطہ کسب وحصول کے تانے بانے تک محدود ہے۔ اس کا آشیانہ اتنا بلند ہے کہ ہر صاحبِ فضل و کمال اپنی جلالتِ علم و فکری بلندیوں کے بل بوتے پر اس پر کمند نہیں ڈال سکتا۔

اگر قرآن و حدیث کا گہرائی سے مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت واشگاف ہو جاتی ہے کہ تفقہ فی الدین کا تعلق کسب وحصول سے پہلے مشیتِ ایزدی اور ارادۂ الٰہی سے وابستہ ہے۔ اس سلسلے میں نبوی صراحت ہے کہ من یرد اللّٰہ خیراً یفقھہ فی الدین. اللہ تعالیٰ جس بندے پر خیر اور بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے تو اسے تفقہ فی الدین کی دولت گرانمایہ سے مالا مال فرماتا ہے۔ اس سے یہ بات یقین کے اُجالے میں آجاتی ہے کہ یہ فن بندے کی کوششوں تک محدود نہیں رکھا گیا ہے بلکہ یہ دولتِ گراں قدر ارادۂ الٰہی اور مشیتِ باری کی توفیق اور تفویض کا نتیجہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فقیہ اپنے منصب کے لحاظ سے مسائل کے استخراج میں اور ترجیح و تطبیق میں خدائے قدیر کی بخشی ہوئی بے غبار صلاحیتوں کی روشنی میں غور و فکر کرتا ہے۔ قرآن و سنت سے مسائل کے استخراج و استنباط میں کسی خارجی دباؤ کو قبول نہیں کرتا ہے بلکہ اخذِ مسائل میں قیاس کے انہیں متعینہ حدود کی پابندی کرتا ہے جس کو شرعی اصابت رائے کے ترازو پر تولا گیا ہو۔

اعلیٰ حضرت کی شانِ تفقہ کا اندازہ کرنے کے لیے فقہ کی تعریف اور اس کے لوازمات کا جاننا بھی ضروری ہے۔ اس لیے سب سے پہلے اختصار کے ساتھ اس کا بیان بھی ناگزیر ہے۔

مجتہد کے لیے اسلاف سے جن شرطوں کا ذکر ملتا ہے اعلیٰ حضرت یقیناً ان شرائط کے حامل تھے۔ امام صدرالشریعہ شرائطِ اجتہاد کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''شرطه ان يحوى علم الكتاب بمعانيه لغةً وشرعاً واقسامه المذكورة وعلم السنة متناً وسنداً ووجوه القياس كما ذكرنا۔'' (شامی جلد ۱، ص ۱۷۹ و فضل القضاء فی رسم الافتاء، ص ۲ تا ۳)

اس کی تفصیل علامہ تفتازانی اس طرح فرماتے ہیں: کتاب اللہ کے مفاہیم تک رسائی کے لیے لازمی ہے کہ لغت، نحو، صرف اور معانی و بیان میں مہارت ہو اور اصولی طور پر جو خصوصیات احکام پر اثر انداز ہوتی ہیں ان کی معرفت میں بھی کمال ہو مثلاً عام، خاص، مجمل، مفسر اور اقسامِ دلالات وغیرہ بھی جاننا ضروری ہے اور مفاہیم سنت تک پہنچنے کے لیے جہاں یہ تمام علوم اور اقسام اصولی شرط ہیں، وہیں احادیث کی سند اور احوالِ رواۃ پر بھی آگاہی ضروری ہے۔ قیاس کے شرائط و اقسام اور ان کے احکام نیز ان میں مقبول اور نامقبول میں تمیز کا علم بطور ملکہ حاصل ہو فقیہ کو اجماعِ اُمت سے آگاہ ہونا چاہیے تاکہ اس کا اجتہاد، اجماع سے مزاحم نہ ہو۔

علامہ تفتازانی نے علم کلام کی معرفت بھی شرائطِ اجتہاد میں شمار کی ہے۔

علامہ طاش کبریٰ زادہ علم فقہ کی تعریف میں لکھتے ہیں: هو علم باحث عن الاحكام الشريعة العملية من حيث استنباطها من الادلة التفصيلية ومباديه مسائل اصول الفقه وله استمداد من سائر علوم الشرعية والعربية (الفوائد البهيه، ص ۸۶)

امام سرخسی نے تمامیتِ فقہ کے لیے عملِ صالح کی قید کا بھی اضافہ فرمایا ہے: ان تمام الفقه لا يكون الا باجتماع ثلاثة اشياء العلم بالمشروعات والاتفاق فى معرفة ذلك بالوقوف على النصوص بمعانيها وضبط الاصول بفروعها ثم العمل بذلك فتمام المقصود لا يكون الا بعد العمل بالعلم. (فواتح الرحموت، ص ۶۲۴)

ان شواہد کے لکھنے سے ہمارا مقصود یہ ہے کہ ایک تخمینہ قائم کیا جا سکے کہ فقہ و اجتہاد کے لیے کتنے علوم کی مہارت شرط ہے۔ اسی طرح اصول و فروع کی تفصیلات نیز اجماع امت اور قیاس کے اقسام و احکام میں کس قدر بصیرت لازم ہے، ان شہادات سے یہ امر بھی مفہوم ہوتا ہے کہ فقیہ ہر مسئلہ کا استنباط اس کی تفصیلی دلیل سے کرنے پر قادر ہوتا ہے اور یہ ممکن نہیں جب تک وہ فقیہ ثاقب الذہن، طباع، سلیم الفکر اور نکتہ رس قابلِ اعتماد نہ ہو۔ ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوا کہ فقیہ کو تدین و تقویٰ سے بھی

متصف ہونا چاہیے تاکہ قدم بہ قدم اسے تائیدِ غیبی حاصل ہوتی رہے۔

عہدِ صحابہ کے بعد امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ تمام فقہا کے امام اور قاید شمار کیے گئے ہیں۔ امام شافعی فرماتے ہیں، ما رأیت احداً افقه منه من اراد ان یتفقه فعلیه به و باصحابه ۔
(الفوائد البہیہ، ص ۱۴۶)

اصول و فروع کی ترتیب عہدِ امام میں مکمل ہوگئی۔ البتہ فکرِ مراتب کے اعتبار سے ان کی تہذیب کا کام ہر دور میں جاری رہا۔ اس لیے طبقاتِ فقہا کا تعین بھی ضروری ہوا تاکہ ہر ایک کی منزلت اور طبقاتی خصوصیت کی رعایت سے ان کے اقوال کی تنقیح اور ترجیح کا اعتبار کیا جائے۔

علامہ ابن کمال پاشا نے فقہا کو سات طبقات میں تقسیم فرمایا ہے:

(۱) **مجتہدین فی الشرع**: وہ فقہا جنہوں نے قواعدِ اصول کی تاسیس فرمائی۔ ائمہ اربعہ اسی طبقے میں معدود ہیں۔

(۲) **مجتہدین فی المذہب**: وہ فقہا جو مجتہد فی الشرع سے منقول قواعد کی پابندی کے ساتھ دلائل سے مسائل کے استخراج پر قادر ہیں۔ اگر چہ بعض فروع میں مجتہد فی الشرع کے خلاف بھی ہیں۔

(۳) **مجتہدین فی المسائل**: وہ فقہا جو اصول و فروع میں اپنے امام کے پابند ہیں اور امام کے غیر منصوص احکام کے استنباط کرنے پر قادر ہیں۔

(۴) **اصحابِ تخریج**: یہ لوگ اجتہاد پر قادر نہیں ہوتے لیکن اصول اور مآخذ، تفسیرِ مجمل، تفصیلِ مبہم اور تعیینِ محتمل پر قادر ہوتے ہیں۔

(۵) **اصحابِ ترجیح**: مذہب کی روایتِ مختلفہ میں کسی ایک کو ترجیح دینے پر قادر ہوتے ہیں۔

(۶) **اصحابِ تمیز**: یہ حضرات قوی و اقوی اور ضعیف نیز ظاہر الروایہ اور نوادر وغیرہ میں فرق کرتے ہیں۔

(۷) **اصحابِ تلفیق**: جنہیں کھرے کھوٹے میں امتیاز کی تمیز نہیں ہوتی۔

علامہ ابن کمال نے طبقات تقسیم کے ذیل میں بطور مثال جن فقہا کا نام شمار کیا ہے، وہ محلِ نظر ہے۔ اس لیے کہ آپ نے رازی و کرخی کو اصحابِ تخریج میں اور قدوری اور صاحب ہدایہ کو اصحابِ ترجیح میں شمار کیا ہے۔ حالانکہ بلاشبہ یہ حضرات مجتہد فی المسائل تھے۔ اسی طرح آپ نے اصحابِ تخریج کے متعلق کہا کہ یہ لوگ اجتہاد پر قادر نہیں ہوتے، حالانکہ واقعہ اس کے خلاف ہے۔ اصحابِ تخریج کے ضمن میں جو فقہا شمار کیے جاتے ہیں، سب مجتہد فی المسائل کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ لہٰذا ہماری رائے یہ ہے کہ مجتہد مطلق کے بعد ہر طبقے کے لیے ایک وصف مخصوص ہے۔ اگر یہ اوصاف خاصہ کسی ایک شخصیت میں جمع ہو جائیں تو اس شخصیت کا شمار بہ یک وقت کئی طبقات میں ہوسکتا ہے۔

علامہ کفوی نے فقہاے مقلدین کے پانچ طبقات رکھے ہیں۔ اس لحاظ سے آپ نے ابن کمال پاشا کے ذکر کردہ اوّل و آخر کو ترک کر کے صرف درمیانی پانچ طبقات شمار کیے ہیں۔ دونوں راویوں میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ بعض علما نے لکھا ہے کہ مجتہد فی المذاہب کا دروازہ ابوالبرکات نسفی المتوفی ۷۱۰ھ پر ختم ہو گیا ہے۔

علامہ بحر العلوم لکھنوی نے اس قول کو ردّ فرمایا ہے۔

اور حقیقت بھی یہی ہے کہ نیرنگی زمانہ کی وجہ سے ہر دور میں گوناگوں مسائل کا پیدا ہونا لوازمِ عالم سے ہے۔ لہٰذا ہر نئے پیدا ہونے والے مسئلے کا حل نکالنے کے لیے اللہ کی رحمتوں سے مجتہدین کا سلسلہ قائم رہنا ضروری ہے۔ مجتہد مطلق کا وجود ہر دور میں ضروری نہ سہی مگر مجتہدین فی المذہب یا مجتہدین فی المسائل کے وجود کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ پھر واقعات بھی اسی کی تائید کرتے ہیں۔ چنانچہ امام نسفی کے بہت بعد امام ابن الہمام (متوفی ۸۶۱ھ) گذرے ہیں۔ آپ کی کتابیں اس پر شاہد عدل ہیں کہ آپ مجتہد تھے۔

ابن کمال اور کفوی نے مجتہد فی المذہب کی جو تعریف کی ہے، امام ابن ہمام اس پر پورے اترتے ہیں۔ اس لیے بحر العلوم کی طرح ہم بھی یہ تسلیم کرنے سے قاصر نہیں کہ مجتہد فی المذہب کا سلسلہ امام نسفی پر ختم ہو گیا۔

پھر امام ابن ہمام کے بعد اعلیٰ حضرت میں ایک عظیم فقیہ کی خصوصیات اجتماعی طور پر نظر آتی ہیں۔ اعلیٰ حضرت کی سوانح دیکھنے پر معلوم ہوتا ہے کہ آپ بچپن ہی سے صالح الفکر، صائب الرائے شخصیت کے حامل تھے۔ آپ کا بچپن ایک ذکی الطبع، قوی الفکر انسان کے شباب سے کم نہ تھا۔ آپ سرحدِ شباب میں داخل ہونے تک جملہ فنونِ عربیہ اور علومِ دینیہ اور ان کے مبادی میں ماہر نظر آتے ہیں۔ علم کے کسی میدان میں آپ کے جولانیِ قلم میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔ علمِ حدیث میں آپ امام سیوطی کے مظہر نظر آتے ہیں، تو تفسیر میں ابن جریر کے پرتو ہیں۔ علومِ عربیہ میں سحبان کی شان رکھتے ہیں تو امام ابوحنیفہ کے قواعد و اصول برتنے میں آپ پر بزدوی سرخسی کا شبہ ہوتا ہے اور صرف انہیں علوم تک نہیں بلکہ جملہ علومِ عقلیہ و نقلیہ میں آپ کی شان یکساں معلوم ہوتی ہے اور اس شان میں آپ کی انفرادیت اس درجہ ہے کہ اقران و امثال ہی نہیں بلکہ کئی صدی قبل بھی آپ کی نظیر تلاش کی جائے تو آپ منفرد نظر آئیں گے۔

اعلیٰ حضرت کے فتاویٰ کا جائزہ لینے کے بعد ہر وہ شخص جس نے مشہور فقہا کی تصانیف کا مطالعہ کیا ہوگا وہ اس نتیجے پر بہت آسانی سے پہنچ سکتا ہے کہ امام ابن ہمام کی شانِ روایت اور رنگِ

اجتہاد سے مزین فکر جو ان کی خصوصیت تھی، ان کے بعد صرف اعلیٰ حضرت کو ملی اور مسائل کی تنقیح، فقہ کی جملہ متداول کتب پر نظر رکھتے ہوئے جو علامہ شامی کی ایک مسلمہ خصوصیت تھی، اعلیٰ حضرت کے حق میں مقدر ہوگئی۔ گویا اعلیٰ حضرت بہ یک وقت ابن ہمام بھی تھے اور ابن عابدین بھی۔

عرب و عجم کے بے شمار فقہا اور اہلِ علم و دانش اعلیٰ حضرت کا تفقہ تسلیم کر چکے ہیں۔ ''الدولۃ المکیہ'' اور اعلیٰ حضرت کی دوسری تصانیف پر علمائے ہذا کی تقریظات ہمارے اس دعویٰ کا بیّن ثبوت ہیں۔ اعلیٰ حضرت فقہائے مقلدین کی جملہ خصوصیات کے حامل تھے۔

(۱) اقوالِ سلف پر آپ کی نظر بہت ہی وسیع تھی۔ جب کسی مسئلہ کی تائید میں ائمہ سابقین کی شہادتیں بیان کرنے پر اُترتے ہیں تو سیکڑوں سے بھی ان کی تعداد متجاوز ہو جاتی ہیں۔ اپنے پیش رو فقہا کے اقوال کی مکمل تنقیح فرماتے ہیں۔ کسی نقل یا دلیل پر پرکھے بغیر اعتماد نہیں کرتے۔ روایاتِ مذہب اور اگلوں کے استنباط کے قوت و ضعف اور مراتب صحت پر نشان دہی فرماتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ اصحابِ تمیز کے خواص سے یقیناً متصف تھے۔ ہمارے اس دعویٰ پر اعلیٰ حضرت کے ہزاروں فتاوے شاہد ہیں۔ بذل الجوائز، سبحان السبوح، التحریر الجید، نفی العار، ردّ الرفضہ، القطوف الدانیہ، اہادی الحاجب' جیسے پچاسوں رسالوں سے آپ کے استحضارِ روایات و عبارات پر روشنی پڑتی ہے۔

اس ذیل میں یہ خصوصیت بھی قابلِ ذکر ہے مسائل یا حکم کا منکر جن علما پر اعتماد رکھتا ہے، ان کی شہادتیں التزاماً لاتے ہیں۔ حیات الموات، الکوکب الشہابیہ وغیرہ میں ایسے مواد ملتے ہیں۔

(۲) مذہب کی روایاتِ مختلفہ کو باعتبار ترجیح ہم کئی حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ علمائے سلف نے اکثر روایات میں ترجیح و تنقیح فرمادی ہے لیکن جہاں ترجیحات میں معتمد فقہا متفق ہیں وہیں بھاری تعداد اختلافِ ترجیح کی بھی موجود ہے۔ اور بعض مسائل ایسے بھی ہیں جو ہنوز تشنۂ ترجیح ہیں۔ ترجیحاتِ سلف میں ایسا بھی ہوا ہے کہ جن اسباب کی روشنی میں کسی قول کو ترجیح دی گئی اور مرورِ زمانہ سے وہ اسباب متغیر ہوگئے اس لیے ترجیح جدید ضروری ہوئی۔

اعلیٰ حضرت نے ترجیح سابق میں کسی قسم کی تبدیلی پسند نہ فرمائی۔ مذہب جس طرح کتب متون میں منقول ہے اس پر اعتماد فرمایا۔ البتہ زمانے کے تغیرات سے شرعاً حکم پر جو اثر پڑتا ہے اس کی رعایت التزاماً ملحوظ رکھی ہے۔ کیونکہ اس پر اتفاق ہے کہ الفتوی یتغیر الزمان البتہ تبدیل حکم میں تغیراتِ ماحول کا ہر جگہ اعتبار نہ کیا جائے گا۔ اعلیٰ حضرت نے اس کے لیے چھ مواضعات کا تعین فرمایا ہے اور ایک ضابطہ وضع کر کے یہ ثابت کیا کہ تغیر حکم بھی قولِ امام کے درجے میں ہے۔ فرماتے ہیں

''قولِ امام کی دو صورتیں ہیں ظاہر اور ضروری۔ قولِ ظاہر جو امام سے صراحۃً منقول

ہو۔ قولِ ضروری یہ ہے کہ امام سے منقول تو نہ ہو لیکن کسی حکمِ عام کے تحت آسکے کہ اگر اس ماحول میں امام کے سامنے یہ صورتِ مسئلہ آتی تو یہی حکم صادر فرماتے۔ قولِ ظاہر اور ضروری میں تعارض ہو تو ضروری کو ترجیح دی جائے گی اور یہ تعارض صرف چھ صورتوں میں معتبر ہے: (۱) ضرورت (۲) رفع حرج (۳) عرف (۴) تعامل (۵) اہم دینی مصلحتوں کی تحصیل (۶) کسی فسادِ موجود یا مظنون کا ازالہ، اور انہیں وجوہ کے پیش نظر صحیح احادیث کے خلاف میں بھی فتویٰ دیا جاتا ہے جو درحقیقت مخالفتِ حدیث نہیں۔ جیسے عورتوں کا جماعت میں حاضر ہونا۔''

(فتاویٰ رضویہ، ج سوم، کتاب الصلوٰۃ)

اختلافِ ترجیح کی شکل میں آپ نے ترجیحات کو کالعدم قرار دیا اور پوری بحث وتمحیص کے بعد یہ ضابطہ مقرر فرمایا **یقدم قول الامام عند اختلاف التصحیح**، اسی طرح آپ نے صدہا غیر منقح تشنۂ ترجیح مسائل کی اسباب وعلل کی روشنی میں ترجیح فرمائی۔ آپ کے فتاویٰ کے ساتھ کتب فقہ پر آپ کے حواشی وتعلیقات ہمارے اس بیان کی واضح دلیل ہیں۔ اس لیے ہم کو بجا طور پر یہ کہنے کا حق پہنچتا ہے کہ اعلیٰ حضرت کو ائمۂ ترجیح میں بھی شمار کریں۔

(۳) روایاتِ مذہب اور فقہاے مابعد کے اقوال میں مجمل اور مبہم اقوال بھی بہ کثرت ملتے ہیں۔ ائمۂ تخریج نے مجمل کی تفسیر اور مبہم کا بیان اور دیگر قیود وشرائط کا بیان فرمایا ہے۔ اعلیٰ حضرت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور تک بھی کچھ ایسے گوشے باقی رہ گئے جن میں عملِ تخریج کی ضرورت تھی۔ آپ نے ایسے بیش تر مقامات کی تنقیح فرمائی اور اسی تخریج کے ذریعے حکم کے لیے صورتِ مسئلہ کا تعین فرمایا۔ مثلاً ماے مستعمل کی تعریف اور اس کا حکم متون مذہب میں بالفاظ ذیل منقول ہے:

والماء المستعمل لا یجوز استعماله فی طهارة الاحداث والماء المستعمل کل ماء ازیل به حدث او استعمل فی البدن علی وجه القربة۔

اعلیٰ حضرت نے کل ماء میں ماء قلیل کی قید پھر بدن سے جدا ہونے کی قید کا بھی اضافہ فرمایا اور ستائیس احتمالات قائم کرکے پانی کے مستعمل ہونے کی صورت متعین فرمائی۔ اس موضوع پر مکمل مفصل تحقیق پر مشتمل ''الطراس المعدّل'' نامی رسالہ تحریر فرمایا۔ جسمِ انسانی کا پانی سے لمس، پانی کو کب مستعمل بناتا ہے، اس پر مفصل توضیح وتفسیر اور احتمالی صورتوں کی تعلیل وغیرہ کے ساتھ نہایت درجہ محقق ومنقح بیان کے لیے ایک بسیط رسالہ النمیقة الانقی تحریر فرمایا۔ بچوں کی صغیر وکبیر اشیا کا استعمال ممنوع ہونے اور اس کا ہبہ باطل ہونے پر ایک مفصل رسالہ عطاء النبی تحریر فرمایا جس میں مبہم عبارتوں

کی تشریح اور احتمالات کی تعیین اور صورتِ مسئلہ کا تقرر وغیرہ مذکور ہے۔ اعلیٰ حضرت کے فتاویٰ اور رسائل وحواشی میں تخریجات کے نظائر کم نہیں ہیں۔

ائمہ سابقین کی تخریجات میں جو تسامح ہوا ہے اس کی نشان دہی بھی فرمائی ہے۔ رسالہ ''اضافة الطلاق'' اور ''جد الممتار'' میں اس کے نظائر وشواہد موجود ہیں۔ امام ابن ہمام، ابوالسعود، ابن کمال، برجندی، زیلعی، ملک العلما کاسانی، فخرالاسلام بزدوی اور شمس الائمہ سرخسی علیہم الرحمۃ کی تخریجات پر جابجا مدلل کلام فرمایا ہے۔

اعلیٰ حضرت کی ان ابحاث پر نظر پڑنے کے بعد ایک دانش مند قاری آپ کا مقام ائمۂ تخریج میں آسانی سے متعین کرسکتا ہے۔

(۴) حوادث و وقائع کا سلسلہ غیر متناہی ہے جب کہ نصوصِ شرعیہ متناہی ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہر نئے پیدا ہونے والے مسئلے کا حکم شرعی اجتہاد کے ذریعے حاصل کیا جائے۔ مجتہدین فی المسائل امام مطلق کے اصول وقواعد کی روشنی میں ان مسائل کو حل فرماتے ہیں۔

اعلیٰ حضرت نے اپنے دَور میں پیدا ہونے والے سیکڑوں مسائل میں احکام کا استخراج فرمایا ہے۔ مثلاً نوٹ کی ایجاد کے بعد کئی قسم کے مسائل پیدا ہوئے کہ نوٹ سونا چاندی نہیں ہے لیکن قیمتی ہے۔ اس پر زکوٰۃ ہے یا نہیں؟ جنس قدری نہیں ہے بلکہ عددی ہے تو اس کی بیع تفاضل سود کہلائے گی یا نہیں۔ اعلیٰ حضرت نے نوٹ کی حقیقتِ شرعی متعین کر کے اس سے متعلق احکام کا بیان فرمایا۔ آپ کا یہ فتویٰ ستر صفحات سے متجاوز ہوگیا۔ جس کا تاریخی نام **کفل الفقیہ الفاهم فی احکام قرطاس الدراهم** ہے۔ عرب وعجم کے مشائخ کبار نے اسے بے پناہ سراہا۔

ردسر کی شوگر مل سے متعلق یہ بات مشہور ہوکر حکمِ شرعی کی طالب ہوگئی کہ شکر کا تصفیہ ہڈیوں کے برادے سے کیا جاتا ہے اور یہ معلوم نہیں کہ یہ ہڈیاں حلال جانوروں کی ہیں یا نہیں۔ پاک ہیں یا ناپاک؟ اعلیٰ حضرت نے دریافت حکم کے لیے دس مقدمات استدلال کے ساتھ قائم فرمائے۔ اس کے بعد نہایت اعلیٰ تحقیق کے ساتھ حکم شرع کا استنباط فرمایا۔ آپ کی یہ تحقیق وسیع ہوکر رسالہ ''الاحلی من السکر'' کی شکل میں کئی اجزا میں سمائی۔ ریل پر نماز کا حکم کیا ہے؟ جن مقامات میں ایک شب وروز کا سال ہوتا ہے، وہاں روزہ نماز کا کیا حکم ہے؟ ریلوے گارڈ اور ڈرائیور، ٹرین سے مسافت سفر طے کریں تو وہ مسافر کہلائیں گے یا نہیں؟ ان تمام کا حکم استخراج فرمایا۔

سلف کے استنباط میں جو مواضع تنقیح طلب تھے، ان کی تنقیح فرمائی۔ بطور نمونہ ایک مثال پر اکتفا کرتا ہوں۔

حکمِ ائمہ یہ ہے کہ وصی یا وارث نے میت کی تجہیز و تکفین مثل اپنے مال سے کردی تو ترکہ سے اپنی رقم واپس لے گا۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ تجہیز و تکفین مثل دین میں شمار ہوگی یا اسے حقِ تکفین سے مؤخر کرنا پڑے گا۔ اور حکمِ تکفین میں رکھیں تو اس سے رقم کی ادائیگی دیون پر مقدم ہوگی؟

اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں کہ کفن دینے والا اسوۃ الغرماء ہے۔ اس کا حق دیگر قرض خواہوں پر مقدم نہیں ہوسکتا۔ اس لیے کہ دین پر تجہیز کی تقدیم حق میت کے سبب تھی۔ جس طرح حالتِ حیات میں ذاتی حق مثل نان شبینہ دیون پر مقدم تھا اور جب وصی یا وارث نے تکفین کردی تو حقِ میت ساقط ہوگیا۔ اب صرف ادائے دین کی صورت رہ گئی فھو اسوۃ الغرماء اس مسئلہ کی نظیر یہ ہے کہ کوئی شخص لباس کا ضرورت مند ہو تو اس کی یہ ضرورت عام دیون پر مقدم ہوگی۔ لیکن اگر کسی نے اسے بہ شرط رجوع لباس دے دیا تو یہ دینا دیگر دیون پر مقدم نہ ہوگا، بلکہ وہ بھی احد الدائنین میں شمار ہے۔ نیز یہ کہ آدمی اپنی حیات میں اکل و شرب و دیگر حاجاتِ اصلیہ کے لیے دین لیتا ہے تو یہ دائن کسی صورت سے اس سے کم درجہ نہیں جس نے موت کے بعد طاری ہونے والی حاجت کے لیے دین دیا۔

اعلیٰ حضرت کے استنباط و استخراج کو اگر ہم تفصیل سے قلم بند کریں تو یقیناً ایک ضخیم کتاب تیار ہوسکتی ہے۔

ان شواہد کے لکھنے سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ اعلیٰ حضرت کو مجتہد فی المسائل کہنے میں بھی ہمیں کسی قسم کا تردد یا اشکال نظر نہیں آتا بلکہ اعلیٰ حضرت میں یہ اوصاف بطور ملکہ تھے۔

(۵) اعلیٰ حضرت جہاں دین کے اصول و فروع اور عربیت کے فنون میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے، وہیں آپ فقیہ النفس بھی تھے۔ عہدِ طفلی میں بھی صاحب بصیرت مفتی دکھائی دیتے ہیں۔ آپ نے آٹھ سال کی عمر میں فرائض کا ایک دقیق فتویٰ تحریر فرمایا۔

اور جب آپ عمر کے تیرھویں سال میں داخل ہوئے، اس وقت درسِ نظامیہ سے متعلق علوم و فنون میں آپ ماہر ہو چکے تھے۔ بلکہ زیرِ تعلیم کتابوں پر آپ کے حواشی و تعلیقات بھی موجود تھے۔ اور جب آپ تیرہ سال دس مہینہ پانچ دن کی عمر کو پہنچے اسی روز آپ پر نماز فرض ہوئی اور اسی روز آپ کے والد ماجد نے منصب افتا پر مامور فرمایا۔ بیٹھتے ہی آپ کے سامنے حرمتِ رضاعت سے متعلق ایک دقّت طلب مسئلہ پیش ہوا کہ ناک کے ذریعے عورت کا دودھ بچے کے حلق میں پہنچ گیا تو حرمتِ رضاعت ثابت ہوگی یا نہیں۔ آپ نے مدلل طور پر حرمتِ رضاعت ثابت ہونے کا حکم صادر فرمایا۔

ابتدائے عمر میں ہی آپ کو فقہی جزئیات و کلیات پر عبور حاصل تھا۔ عمر کے اضافے کے ساتھ آپ کی علمی گہرائی، وسعتِ مطالعہ اور ممارست و تجربہ میں اضافہ ہوتا گیا۔

آپ کی فقہی خصوصیات میں یہ امر بہت اہمیت رکھتا ہے کہ ابتدا سے لے کر اخیر عمر تک آپ کے فتاویٰ تحقیق پر مبنی ہوتے تھے اور آپ کو کسی فتویٰ سے رجوع کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ اعلیٰ حضرت کی فقہی اور کلامی بحثیں اور اندازِ تحقیق دیکھنے کے بعد ہم درج ذیل نتائج بھی اخذ کرتے ہیں۔

(الف) کسی مسئلے پر گفتگو کرتے ہوئے کتاب اللہ سے استنباط ممکن ہو تو اسے نظر انداز نہیں ہونے دیتے۔ یہ ضرورت نہیں کہ جو مسئلہ زیرِ بحث ہے اسی پر قرآنی شہادت قائم کی جائے بلکہ ضمنی مسائل اور مسئلہ زیرِ بحث کے مقدمات پر گفتگو کرتے ہوئے بھی قرآن مجید سے استدلال کرتے ہیں اور جب آپ کتاب اللہ سے کوئی دلیل لیتے ہیں تو بسا اوقات اصولی اور تفصیلی بحثیں بھی سامنے آجاتی ہیں۔ اس سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ جملہ تفاسیر پر عبورِ تامہ رکھتے تھے۔ ہم اپنی تائید میں اعلیٰ حضرت کی تصنیف کردہ "**تجلی الیقین، جزاء اللہ عدوہ، الزبدۃ الزکیہ فی تحریم سجود التحیہ، الامن والعلیٰ، سبحن السبوح** جیسی متعدد تصانیف کو پیش کر سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں اعلیٰ حضرت کا قابلِ تعریف موقف یہ بھی ہے کہ تفسیرِ قرآن میں اپنی رائے کو ہرگز دخل نہیں دیتے۔

(ب) اعلیٰ حضرت کے تحقیقی فتاویٰ میں احادیثِ کریمہ کی شہادتیں اس وسیع پیمانے پر ملتی ہیں کہ گویا تمام احادیثِ مرویہ آپ کی نگاہ میں تھیں۔ احادیث کے راویوں، حدیث کے صحت وضعف اور دوسرے اقسام، الفاظ کے تغیرات، متن وسند کی زیادات پر موقع موقع سے بحثیں بھی فرماتے ہیں۔ جرح وتعدیل کے الفاظ ومعانی اور متن کے اقسام دلالاتِ احادیث کے محمولات اور محتملات نیز دیگر نکات پر بھی آپ گہری نگاہ رکھتے تھے۔ بالعموم کوئی بھی حدیث بے حوالۂ کتب ذکر نہیں فرماتے۔ ایک ایک حدیث کی تخریج میں کبھی کبھی دس پندرہ کتابوں کے نام بہ طور حوالہ ذکر فرماتے۔ ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ آپ اس کی تصحیح وتخریج فرماتے ہیں اور نتائج کی نشان دہی بھی فرماتے ہیں۔ اسی طرح مرادِ حدیث میں کسی سے چوک ہوئی تو اس پر بھی آگاہ فرماتے ہیں۔

(ج) مسائلِ فقہیہ کے استخراج اور استنباط وتائید میں ضمناً کئی علوم کا بکثرت استعمال فرمایا۔ لغت، صرف، معانی، بیان، منطق وفلسفہ، حساب اقلیدس اور ہیئت وغیرہ سے مدد لینے میں کسر نہیں اٹھا رکھتے۔

علوم کی معرفت ومہارت بہت ہی اہم اور مشکل شے ہے۔ لیکن کمالِ علم ووفورِ علم یہ ہے کہ علوم غیر متعلقہ سے بھی مقصد برآری میں کامیابی حاصل کرلی جائے۔ اور سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ علوم وفنون کو دینِ متین کی خدمت میں بھی لگا دیا جائے۔ اعلیٰ حضرت کو یہ خصوصیت بدرجۂ کمال حاصل تھی۔

اعلیٰ حضرت کے فتویٰ وغیرہ کا مطالعہ کرنے کے بعد اوّل نظر میں آپ کی حسب ذیل

خصوصیات کا ادراک ہر قاری کو ہوتا ہے۔

(۱) جس مسئلے کی تحقیق فرماتے ہیں اس میں اقوالِ سلف کا استقصاء فرماتے ہیں۔

(۲) احتمالِ شقوق کا استیعاب کرتے ہیں۔

(۳) غیر معتمد اقوال وشقوق پر کلام وافر فرماتے ہیں۔

(۴) کلامِ سلف کی توجیہات کرتے ہیں۔

(۵) اقوالِ سلف کی توجیہات کرتے ہیں۔

(۶) تطبیق وتوجیہ ناممکن ہو تو ترجیح دیتے ہیں۔

(۷) توجیہ وتوفیق اور ترجیح کے اسباب وعلل پر مدلل کلام فرماتے ہیں۔

(۸) ضوابط کلیہ وضع فرماتے ہیں۔

(۹) اصلاح واضافہ فرماتے ہیں۔

(۱۰) دلائل کا تکاثر پایا جاتا ہے۔

(۱۱) دلائل ومسائل کی بھر پور تنقیح فرماتے ہیں۔

(۱۲) مسائلِ جدیدہ کا استنباط فرماتے ہیں۔

(۱۳) علومِ عصریہ سے دینی مسائل کی تائید فرماتے ہیں۔

اس قسم کی بے شمار خوبیاں اعلیٰ حضرت کی فقہی تصانیف میں نظر آتی ہیں۔ جو قاری، فقہ میں جتنی بصیرت رکھتا ہوگا اتنا ہی زیادہ اس کے خزانۂ علم میں اضافہ ہوگا اور اعلیٰ حضرت کے تفقہ سے اس کا تاثر بھی اسی حساب سے ہوگا۔

اعلیٰ حضرت کی انہی فقہی تحقیقات اور بے مثال تنقیحات کے بعد علامہ سید اسماعیل مفتیِ حرم علیہ الرحمہ پکار اُٹھے: ''لو راہ الامام ابو حنیفه لجعله فی اصحابه'' (الاجازات المتینہ، ص۹)

ایک حد تک ہم بھی اس رائے سے متفق ہیں کہ اعلیٰ حضرت قواعدِ اصول وفروعِ احکام میں امام اعظم ابو حنیفہ کے مقلد تھے اور تقلیدی شان کے ساتھ ہی منصب اجتہاد فی المسائل واجتہاد فی المذہب کی پوری اہلیت رکھتے تھے۔ آپ کے معاصرین بھی آپ کی تبحر علمی اور ملکۂ استخراج پر اعتماد رکھتے تھے۔ بلاشبہ آپ نے فقۂ حنفی کے لیے بہترین مواد اور عظیم ترین سرمایہ چھوڑا ہے۔ رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً

oooooo

سلسلۂ قادریہ رضویہ کے فروغ میں امام احمد رضا کا کردار

از: (مولانا) شفیق اجمل قادری

ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، بنارس ہندو یونی ورسٹی

امام احمد رضا محدث بریلوی ۱۰ر شوال المکرم ۱۲۷۲ھ/ ۱۴ر جون ۱۸۵۶ء کو شہر بریلی کے ایک علمی گھرانے مولانا نقی علی خاں ابن مولانا رضا علی خاں کے یہاں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ماجد اپنے وقت کے جید عالم، ولی کامل، ریاضت و عبادت گزار اور متقی و پرہیزگار بزرگ تھے۔ امام احمد رضا محدث بریلوی کو علمائے عرب و عجم نے اتفاق رائے سے چودہویں صدی ہجری کا مجدد تسلیم کیا ہے۔ آپ کے علم و فضل، زہد و تقویٰ، زورِ قلم، فقہی بصیرت، ذوق شعر و ادب اور دینی فراست کا عرب و عجم معترف رہا ہے۔ امام احمد رضا محدث بریلوی نے سیکڑوں علوم و فنون پر مشتمل ایک ہزار سے زاید کتابیں تحریر فرما کر امتِ مسلمہ کی رہنمائی کا عظیم فریضہ انجام دیا۔ ایک طرف آپ نے جہاں بندگانِ خدا کی علمی پیاس بجھائی وہیں دوسری جانب آپ نے انہیں روحانیت کے جام سے بھی سرشار کیا۔ سلسلۂ قادریہ سے آپ کو خوب عقیدت و محبت تھی اور خود کو سلسلۂ قادریہ سے وابستہ کر کے اسے برصغیر میں خوب فروغ بخشا۔ لاکھوں لاکھ بندگانِ خدا اس سلسلے میں آپ کے دامنِ کرم سے وابستہ ہوئے اور آپ کی ذات کے سبب یہ سلسلہ "سلسلۂ قادریہ رضویہ" اور "خانقاہِ رضویہ" کے نام سے پوری دنیا میں مشہور ہوا۔

امام احمد رضا محدث بریلوی بلاشبہ ایک عبقری شخصیت تھے۔ آپ جس دور میں تشریف لائے وہ بڑا ہی پُرفتن دور تھا۔ تصوف و معرفت پر ہر چہار جانب سے حملے ہو رہے تھے۔ بدعت کا عام رواج ہوگیا تھا۔ شریعتِ مطہرہ کی پامالی کی جارہی تھی۔ بدمذہبیت کے خطرناک جراثیم مومنِ صادق کے ایمان کو کھوکھلا کر رہے تھے۔ امام احمد رضا محدث بریلوی نے اپنے قول و فعل سے بنی نوع انسان کے عقیدہ و عمل کی اصلاح و فلاح کا عظیم کارنامہ انجام دیا اور آپ نے اپنی زندگی کا لمحہ لمحہ اطاعتِ رسول میں گزار کر تمام مسلمانانِ عالم کو سُنّتِ مصطفویٰ ﷺ کی صحیح پیروی کا شعور بخشا۔

امام احمد رضا محدث بریلوی کو جب معرفت کی منزل طے کرنے کے لیے مرشد کامل کی ضرورت ہوئی تو ۱۲۹۴ھ/ ۱۸۷۷ء میں آپ اپنے والد ماجد مولانا شاہ محمد نقی علی خاں اور تاج الفحول مولانا شاہ عبدالقادر بدایونی کے ہمراہ خاتم الاکابر حضرت سید شاہ آلِ رسول احمدی کی خدمتِ بابرکت

میں مارہرہ مطہرہ حاضر ہوئے اور سلسلۂ عالیہ قادریہ میں انہیں سے بیعت کا شرف حاصل کیا اور ساتھ ہی اجازت و خلافت کی دولت سے بھی سرفراز ہوئے۔

خانقاہِ مارہرہ کا ہمیشہ سے یہ دستور تھا کہ بیعت کے بعد مریدین کو ریاضت و مجاہدے کے دشوار گزار مراحل سے گزارا جاتا اور ان کے میلے کچیلے دل کو ریاضت و مجاہدے کے ذریعے مصفّٰی و مجلّٰی کیا جاتا، پھر اگر وہ شیخ کے معیار پر کامل اُترتا تو اسے خلافت کی عظیم دولت سے سرفراز کیا جاتا، لیکن جب امام احمد رضا محدث بریلوی بیعت و ارادت سے مشرف ہوئے تو ساتھ ہی آپ کو خلافت بھی دی گئی۔

اس پر حضرت سید شاہ ابوالحسین نوری میاں نے حضرت شاہ آلِ رسول مارہروی سے دریافت کیا:

''حضور آپ کے یہاں تو طویل و بامشقت مجاہدات و ریاضت کے بعد خلافت و اجازت دی جاتی ہے تو پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ ان دونوں (امام احمد رضا اور ان کے والد ماجد مولانا نقی علی قدس سرہما) کو بیعت کرتے ہی خلافت دے دی گئی۔ تو حضرت نے ارشاد فرمایا میاں صاحب اور لوگ زنگ آلود میلا کچیلا دل لے کر آتے ہیں اس کی صفائی کی اور پاکیزگی کے لیے مجاہدات طویلہ اور ریاضت شاقہ کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ دونوں حضرات صاف ستھرا دل لے کر ہمارے پاس آئے تو ان کو صرف اتصالِ نسبت کی ضرورت تھی۔ اور وہ مرید ہوتے ہی حاصل ہوگئی''۔ (۱)

آپ کو اپنے مرشد کی بارگاہ سے بیعت و خلافت کی دولت ملنے کے ساتھ ہی ساتھ تمام سلاسلِ طریقت (جن کی تعداد تیرہ بتائی جاتی ہے) اور تمام موروثی اوراد و وظائف کی اجازت بھی عطا ہوئی۔ ان کے علاوہ درج ذیل مصافحات کی سندات بھی آپ کو تفویض ہوئی تھیں۔

(۱) مصافحة الجنية

(۲) مصافحة المعمرية

(۳) مصافحة الخضرية

(۴) مصافحة المنامية

خاتم الاکابر حضرت سید شاہ آلِ رسول نے سلسلۂ قادریہ میں امام احمد رضا محدث بریلوی کے بیعت ہونے کے بعد آپ کے متعلق ارشاد فرمایا:

''آج وہ فکر میرے خیال سے دور ہوگئی کیونکہ جب اللہ تعالیٰ پوچھے گا کہ آلِ رسول! تو میرے لیے کیا لایا ہے؟ تو عرض کروں گا کہ اے الٰہی! مَیں تیرے لیے ''احمد رضا'' کو لایا ہوں''۔ (۲)

امام احمد رضا محدث بریلوی نے شیخ کے وصال کے بعد امام الاولیا شاہ سیدنا ابوالحسین نوری (م ۱۳۲۴ھ/ ۱۹۰۶ء) سے علومِ باطنی کا اکتساب فرمایا۔

سلسلۂ قادریہ سے وابستہ ہوتے ہی آپ نے اسے خوب فروغ دیا۔ آپ کے وصال کے بعد بھی آپ کے فرزندان اس سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے اس کی اشاعت میں ہمہ وقت کوشاں رہے۔

خانقاہِ رضویہ نے امام احمد رضا محدث بریلوی کے بعد عالمِ اسلام کو جو مشائخ دیئے ہیں ان میں سے چند مشاہیر مشائخ عظام کے اسمائے گرامی یہ ہیں: حجۃ الاسلام حضرت مولانا شاہ محمد حامد رضا خاں (ولادت ۱۲۹۲ھ/ ۱۸۷۵ء/ وفات ۱۳۶۲ھ/ ۱۹۴۳ء)، مفتی اعظم ہند حضرت مولانا شاہ محمد مصطفیٰ رضا خاں (ولادت ۱۳۱۰ھ/ ۱۸۹۲ء/ وفات ۱۴۰۱ھ/ ۱۹۸۱ء)، مفسر اعظم حضرت مولانا شاہ ابراہیم رضا خاں (ولادت ۱۳۲۵ھ/ ۱۹۰۷ء/ وفات ۱۳۸۵ھ/ ۱۹۶۵ء) اور اس وقت تاج الشریعہ حضرت مولانا شاہ اختر رضا خاں صاحب ازہری میاں قبلہ (ولادت ۱۳۶۲ھ/ ۱۹۴۳ء) امام احمد رضا محدث بریلوی کے پیغام کو دنیا کے سامنے پیش کر رہے ہیں، اور ساتھ ہی ساتھ سلسلۂ قادریہ رضویہ کے فروغ اور اس کی اشاعت میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔

خانقاہِ رضویہ کے مشائخ عظام روحانی کمالات کے جامع تھے۔ امام احمد رضا محدث بریلوی سے لے کر آج تک پور ے تسلسل کے ساتھ اربابِ فضل و کمال، اساطینِ عشق و عرفان اور داعیانِ حق و صداقت اس خانقاہ سے پیدا ہوتے رہے اور اپنے اپنے عہد میں دعوت و ارشاد، تبلیغ و ہدایت، تزکیۂ نفوس اور تطہیر قلوب کی آفاقی خدمات انجام دیتے رہے اور ہر دور میں طالبانِ حق و معرفت اس خانقاہ میں حاضر ہو کر اپنی پیاس بجھاتے رہے۔

آج سلسلۂ قادریہ رضویہ کے فروغ کی ایک بہت بڑی وجہ یہی ہے کہ اس سلسلے میں بنیادی حقیقت ایمان کی پختگی اور شریعت و سنّت کی اتباع کا سب سے پہلے درس دیا جاتا ہے اور اوراد و وظائف کا اس کے بعد۔ کیونکہ اوراد و وظائف بھی اپنا اثر اسی وقت دکھاتے ہیں جب عامل کا ایمان درست ہو اور عقیدہ پختہ، ورنہ سب کچھ برباد ہو جاتا ہے۔ امام احمد رضا محدث بریلوی اوراد و وظائف کی بھی اجازت اسی وقت دیتے ہیں کہ جب بندہ فرائض و واجبات کو مکمل طور پر ادا کرے۔ اس سلسلے میں آپ ''الوظیفۃ الکریمۃ'' میں ارشاد فرماتے ہیں:

> ''اذکار و اشغال میں مشغولی سے پہلے اگر قضا نمازیں یا روزے ہوں ان کا ادا کرنا جس قدر ممکن ہو نہایت ضروری ہے جس پر فرض باقی ہو اس کے نفل و اعمالِ مستحبہ کام نہیں دیتے بلکہ قبول نہیں ہوتے جب تک فرض ادا نہ کرے''۔ (۳)

امام احمد رضا محدث بریلوی سلسلۂ قادریہ کی ایک اہم کڑی ہیں۔ مشائخ قادریہ رضویہ میں سے سیدنا موسیٰ کاظم (م۱۸۲ھ) سے لے کر سیدنا احمد الجیلانی (م۸۵۳ھ، تک سید علی رضا ، م۸۴۲ھ) کے علاوہ سبھی حضرات کی زندگیاں بغداد میں گزریں اور بعد وصال ان کے مزارات بغداد مقدس میں ہیں۔ شیخ بہاء الدین (م ۹۲۱ھ) مدفون دولت آباد کے واسطے سے "سلسلۂ عالیہ قادریہ رضویہ" کی اشاعت ہندستان میں ہوئی۔ دہلی، کاکوری، لکھنؤ، جہان آباد، کالپی، مارہرہ اور بریلی کے مقامات اس اعتبار سے بابرکت ہیں کہ ان میں مشائخ قادریہ رضویہ نے علم وعرفان کی شمعیں روشن کیں اور مخلوقِ خدا کو واصلِ خدا کیا۔ ان حضرات میں ہر ایک بزرگ خواجہ ومقتدر زمانہ تھا۔ مگر جو عزت وشہرت امام احمد رضا محدث بریلوی کو عطا ہوئی وہ سب سے منفرد تھی۔

امام احمد رضا محدث بریلوی کی شخصیت بڑی متحرک اور فعال تھی۔ طریقت وسلوک کی راہیں آپ نے خاندان مارہرہ کی رہنمائی میں طے کرتے ہوئے دنیا کو رشد وہدایت کا پیغام دیا۔ امام احمد رضا محدث بریلوی کے تربیت یافتہ خلفا کی ایک ایسی جماعت پیدا ہوئی۔ جنہوں نے تبلیغی، تدریسی، صحافتی، تصنیفی اور سیاسی غرضیکہ سبھی میدانوں میں قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔ آپ کے خلفا کی ایک لمبی فہرست ہے جو عرب وعجم میں پھیلے ہوئے ہیں۔ پروفیسر مسعود احمد صاحب رقم طراز ہیں:

> "مولانا بریلوی کے خلفا پاکستان و ہندستان، حجاز مقدس اور دوسرے بلادِ اسلامیہ میں پھیلے ہوئے تھے۔" (۴)

امام احمد رضا محدث بریلوی کے خلفا ومتوسلین نے نہ صرف برصغیر میں بلکہ اقوامِ عالم میں علم وعرفان کی دنیا آباد کی۔ مسلم دنیا کی اکثر آبادی میں آپ کے انوار پھیلے ہیں۔ آپ کے چند مشاہیر خلفا کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

۱۔ حجۃ الاسلام مولانا شاہ حامد رضا قادری (م ۱۹۴۳ء)
۲۔ مفتی اعظم ہند مولانا شاہ مصطفیٰ رضا قادری (م ۱۹۸۱ء)
۳۔ صدر الشریعہ مولانا مفتی امجد علی اعظمی (م ۱۹۴۸ء)
۴۔ صدر الافاضل مولانا شاہ نعیم الدین مرادآبادی (م ۱۹۴۸ء)
۵۔ ملک العلما مولانا شاہ ظفر الدین قادری (م ۱۹۶۲ء)
۶۔ محدث اعظم مولانا شاہ احمد اشرف جیلانی (م ۱۹۲۵ء)
۷۔ شیخ المحدثین مولانا سید دیدار علی الوری (م ۱۹۳۳ء)
۸۔ مبلغ اسلام مولانا شاہ عبد العلیم صدیقی میرٹھی (م ۱۹۵۲ء)

۹۔ قطب مدینہ مولانا شاہ ضیاء الدین مدنی (م ۱۹۸۱ء)

۱۰۔ حضرت مولانا عبدالسلام جبل پوری (م ۱۹۴۴ء)

۱۱۔ حضرت مولانا سید سلیمان اشرف قادری (م ۱۹۵۹ء)

۱۲۔ حضرت مولانا برہان الحق جبل پوری (م ۱۹۸۵ء)

۱۳۔ حضرت مولانا تقدس علی خان (م ۱۹۸۸ء)

امام احمد رضا محدث بریلوی کو قرآن و سنت اور دیگر علومِ عقلیہ و نقلیہ میں ملکہ حاصل تھا۔ اسی لیے وہ تصوف کے اسرار و رموز سے بھی مکمل طور پر واقف تھے۔ طریقت و معرفت کے دقیق مسائل میں اربابِ طریقت ان سے رجوع کیا کرتے تھے۔ فنِ تصوف میں امام احمد رضا محدث بریلوی نے متعدد کتابیں تحریر فرمائیں: (۱) **کشف حقائق و اسرار دقائق** (۲) **التلطف بجواب مسائل التصوف** (۳) **نقاء السلافة فی البیعة و الخلافة** (۴) **الزبدة الزکیة لتحریم سجود التحیة**...... وغیرہ

یہ وہ تصانیف ہیں جن میں تصوف کے اسرار و رموز اور حقیقت و معرفت کا بحرِ ذخار نظر آتا ہے۔ علمِ تصوف کے ساتھ ساتھ امام موصوف تصوف کے عملی میدان کے بھی شہسوار ہیں۔ ایسا نہیں کہ علوم تصوف کے دریا تو بہائے مگر خود کچھ نہ کر سکے۔ بلکہ تصوف کے وہ تمام مراحل جن سے گزر کر ایک صوفی درحقیقت صوفی بنتا ہے وہ سب کے سب امام احمد رضا محدث بریلوی نے طے کیے تھے۔ حال و وقت، مقام و تمکین، محاضرہ و مکاشفہ، قبض و بسط، انس و ہیبت، قہر و لطف، نفی و اثبات، مسامرہ و محادثہ، علم الیقین، حق الیقین، علم و معرفت اور شریعت و معرفت کی وہ کون سی منازل ہیں جن کو آپ نے سر نہ کیا ہو۔

امام احمد رضا محدث بریلوی نے علومِ تصوف کو نہ کسی درسگاہ میں حاصل کیا اور نہ ہی کسی خانقاہ میں تزکیہ نفس کے لیے برسوں ریاضتیں کیں۔ لیکن کتاب و سُنّت اور دینی علوم کی روشنی سے تصوف کے اسرار و رموز آپ پر آشکار ہو گئے۔ امام احمد رضا بریلوی اپنے عرفان کے حوالے سے خود رقم طراز ہیں:

> ''علم تصوف کہ اس کی انتہائی حد اگرچہ احاطۂ عقل میں آنے سے وریٰ ہے اور واصل الی اللہ ہونے کے بغیر وہاں تک نہیں پہنچا جا سکتا لیکن تعلیم ظاہری کی بدولت یا نظر و فکر میں کوشش کرنے کے سبب یا حسن تدبیر اور صحیح سوچ بچار کے ذریعہ جتنا تصوف حاصل ہو سکتا ہے اتنا ہے۔'' (۵)

امام احمد رضا محدث بریلوی اپنے نظریۂ تصوف میں متقدمین صوفیا کے دوش بدوش نظر آتے ہیں اور ہر ایک منزل پر شریعت کا لحاظ کامل طور پر ملحوظ رکھتے ہیں۔ وہ طریقت کو شریعت اور شریعت کو طریقت کے آئینہ میں دیکھنے اور پرکھنے کا اعلیٰ شعور رکھتے تھے۔ راہِ سلوک کے لیے مرشدِ کامل کی

ضرورت ہوتی ہے، تصوف کے منازل مرشد کامل کے بغیر طے نہیں کیے جا سکتے۔ اس سلسلے میں امام احمد رضا محدث بریلوی ارشاد فرماتے ہیں:

> ''قرآن و حدیث میں شریعت، طریقت، حقیقت سب کچھ ہے اور ان میں سے سب سے زیادہ ظاہر و آسان مسائلِ شریعت ہیں۔ ان کی تو یہ حالت ہے کہ اگر ائمہ مجتہدین ان کی شرح نہ فرماتے تو علما کچھ نہ سمجھتے اور علمائے کرام اقوالِ ائمہ مجتہدین کی تشریح و توضیح نہ کرتے تو ہم لوگ ارشادِ ائمہ کے سمجھنے سے بھی عاجز رہتے۔ جب احکامِ شریعت میں یہ حال ہے تو صاف روشن ہے کہ دقائق معرفت بے مرشدِ کامل خود بخود قرآن و حدیث سے نکال لینا کس قدر محال ہے۔ یہ راہ سخت باریک اور بے شمع مرشد نہایت تاریک ہے۔ بڑے بڑوں کو شیطان لعین نے اس راہ میں ایسا مارا کہ تحت الثریٰ تک پہنچا دیا۔ تیری کیا حقیقت کہ بے رہبر کامل اس میں چلے اور سلامت نکل جانے کا ادعا کرے۔ ائمہ فرماتے ہیں آدمی اگرچہ کتنا ہی بڑا عالم، عامل، زاہد، کامل ہو اس پر واجب ہے کہ ولی عارف کو اپنا مرشد بنائے۔ بغیر اس کے ہرگز چارہ نہیں۔'' (۶)

امام احمد رضا محدث بریلوی نے نام نہاد صوفی پیروں سے عوام کو محفوظ رکھنے کے لیے ایک ضابطہ بیان کیا تاکہ جاہل پیر بھولے بھالے مریدوں کو احکامِ شریعہ سے نہ بہکا سکیں۔ آپ نے ایک ایسا خط کھینچا جس سے یہ مسئلہ اظہر من الشمس ہو گیا۔ چنانچہ آپ نے چند شرطیں رقم کیں کہ پیر کو کیسا ہونا چاہیے۔

> ''(۱) شیخ کا سلسلہ باتصال صحیح حضور اقدس ﷺ تک پہونچا ہو بیچ میں منقطع نہ ہو کہ منقطع کے ذریعے سے اتصال ناممکن (۲) سُنّی صحیح العقیدہ ہو بد مذہب نہ ہو (۳) عالم ہو۔ علمِ فقہ اس کی اپنی ضرورت کے قابل کافی اور لازم کہ عقائد اہلِ سُنّت سے پورا واقف، کفر و اسلام اور ضلالت و ہدایت کے فرق کا خوب عارف ہو۔ (۴) فاسق معلن نہ ہو۔'' (۷)

مذکورہ بالا تمام شرطیں ایک کسوٹی ہیں۔ لگتا ہے امام احمد رضا نے اپنی عرفانی نگاہوں سے بارگاہ رسالت کو اس طرح دیکھا اور ایسی حاضری دی ہے جس سے بند دلوں کی کشود ہوتی ہے۔ پیر و مرشد کا تعلق اپنے مرید سے اتنا دل گیر اور نرالا ہوتا ہے جہاں سے رضائے الٰہی کے زینے حاصل ہوتے ہیں۔ اگر شیخ علم سے کورہ و بے بہرہ ہوگا تو اس کا پورا اثر مرید پر نمایاں ہوگا کیونکہ مرید پیر کا مظہر ہوتا ہے۔ یہ ساری کی ساری شرطیں ایک مرشدِ کامل کے لیے آئینے کا درجہ رکھتی ہیں۔ شیخ جب کامل ہوتا ہے تو

مرید میں بھی کمال ہوتا ہے۔

امام احمد رضا محدث بریلوی نے تصوف کے میدان میں پیدا شدہ تمام غلط روشوں کی سرکوبی میں کوئی کسر باقی نہ رکھی اور ان کو اصل تصوف کا رنگ دینے کی بھر پور کوشش کی۔ تصوف اور اس کے اغراض و مقاصد کا صحیح تصور آپ نے پیش کیا۔ نام نہاد صوفیا جن کی غلط روی اور بدکاری کے سبب تصوف کے دامن سے بدنما داغ کو مٹانے کے لیے پوری زندگی جہاد بالقلم کرتے رہے۔ بزرگانِ دین کے نام پر جولوٹ کھسوٹ مزارات پر مچی ہوئی تھی، اسے آپ نے صرف منع ہی نہیں فرمایا بلکہ سختی سے اس کی مخالفت کی۔ قبر پر سجدہ کرنے کو حرام لکھا اور اس کے تعلق سے ''الزبدة الزكية لتحريم سجود التحية'' کے نام سے ایک کتاب تحریر فرمائی۔

امام احمد رضا محدث بریلوی نے خانقاہوں اور صاحب خانقاہ کے تقدس کی خاطر اپنی پوری زندگی کو وقف کردیا تھا۔ آپ نے خانقاہی نظام کو درست کرنے کا انمول ضابطۂ حیات عطا فرمایا۔ یقیناً خانقاہوں پر امام احمد رضا کا ایک عظیم احسان ہے، آج اگر خانقاہیں محفوظ ہیں۔ مقابر کی عظمت کو برقرار رکھا گیا۔ آثارِ مقدسہ کی حفاظت کو ملحوظ رکھا گیا تو کاوش اور ثمرہ ہے امام احمد رضا محدث بریلوی کی عظیم خدمات کا۔

امام احمد رضا محدث بریلوی نے تصوف کے اسرار و رموز کو ہر طرح بیان فرمایا وہ طریقت کو شریعت اور شریعت کو طریقت کے آئینے میں دیکھتے تھے۔ آپ یہ بات بخوبی جانتے تھے کہ تصوف کے راستے پر شریعت کے اصول کی خلاف ورزی کرکے چلنا ممکن نہیں ہے۔ امام احمد رضا نظری تصوف سے کہیں زیادہ عملی تصوف کے پیکر تھے۔ اس لیے ان کی تحریروں میں متصوفانہ افکار و خیالات جابجا جلوہ گر نظر آتے ہیں اور یہی ''سلسلۂ قادریہ رضویہ'' کی اشاعت اور اس کے فروغ کی بنیادی اساس بھی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ حاشیہ تذکرہ نوری، ص ۴۰ بحوالہ تذکرہ مشائخ قادریہ رضویہ المجمع المصباحی مبارک پور ص ۳۹۹

۲۔ سیرتِ امام احمد رضا، عبدالحکیم اختر شاہ جہاں پوری، رضوی کتاب گھر دہلی ص ۴

۳۔ الوظیفة الکریمة، امام احمد رضا بریلوی اسلامک پبلشر دہلی ص ۲۵

۴۔ حیاتِ مولانا احمد رضا خاں بریلوی، پروفیسر محمد مسعود احمد، ادارۂ تحقیقات امام احمد رضا کراچی، ص ۱۴۵

۵۔ الاجازت المتینة، امام احمد رضا بریلوی، رضا اکیڈمی ممبئی ص ۱۵۱

۶۔ نقاء السلافته فی احکام البیعة والخلافته، امام احمد رضا بریلوی رضا اکیڈمی، ممبئی ص ۹

۷۔ تاریخ مشائخ قادریہ ڈاکٹر غلام یحیٰ انجم کتب خانہ امجدیہ دہلی ص ۳۹۰

ooooo

امام احمد رضا اور دعوت و تبلیغ

از: توفیق احمد برکاتی مصباحی، ممبئی

مجددِ اعظم اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی علیہ الرحمۃ والرضوان (۱۲۷۲ھ/۱۳۴۰ھ) کی ہمہ جہت ذات اور قابلِ قدر شخصیت کسی تعارف و تبصرے کی محتاج نہیں۔ آپ نے پوری زندگی دین کی ترویج و اشاعت کے لیے وقف کردی، پژمردہ قلوب میں عشقِ نبوی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا چراغ جلایا، شعائرِ اسلام کے تحفظ و بقا کی خاطر قلمی جہاد کیا، اُمّتِ مسلمہ کے عقاید کو استحکام عطا کیا، خدا و رسول کی ذات پر، معمولاتِ اہل سُنّت پر اور مسلّمہ عقاید پر ہونے والے حملوں کا بھرپور دفاع کیا اور دلائل و شواہد کی روشنی میں احقاقِ حق و ابطالِ باطل کا فریضہ انجام دیا۔ آپ کے علمی و فقہی کارہائے نمایاں اور دینی و ملّی خدماتِ جلیلہ آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہیں۔ جن پر عالمی جامعات میں تحقیقات کا سلسلہ جاری ہے۔ [1]

آپ کی آفاقی شخصیت کے نت نئے گوشے سامنے آرہے ہیں۔ تابندہ نقوش سے عالمِ اسلام بہرہ ور ہورہا ہے۔ [2]

مذہب کے فروغ و ابلاغ میں امام احمد رضا کی تعلیمات اور عالم گیر ذات سنگِ میل کا درجہ رکھتی ہے۔ جس کی خوش نما اور رنگا رنگ کرنوں سے پوری دنیاے اسلام رہنمائی حاصل کررہی ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر مسعود احمد نقش بندی رقم طراز ہیں:

> ''امام احمد رضا کی ذات ایک بحرِ ذخّار اور روشن آفتاب و ماہتاب ہے جس کی موجوں اور شعاعوں کا شمار ممکن نہیں۔'' [3]

حضرت علامہ سید آلِ رسول حسنین میاں نظمی مارہروی فرماتے ہیں:

> ''امام احمد رضا علیہ الرحمۃ والرضوان کا یہ کمال نہیں کہ وہ علومِ عقلیہ و نقلیہ کے ماہر تھے، یہ بھی کمال نہیں کہ وہ بہت بلند پائے کے فلسفی تھے، یہ بھی کمال نہیں کہ ریاضی و ہیئت کے دانائے راز تھے، یہ بھی کمال نہیں کہ فقہ کے اُفق کے درخشاں آفتاب تھے، یہ بھی کمال نہیں کہ عربی، فارسی، اردو اور ہندی میں اچھی شاعری کرتے تھے۔ کمال تو یہ ہے کہ وہ ان تمام خوبیوں کے جامع تھے جو انفرادی طور پر دوسرے لوگوں میں

شانِ افتخار اور اولو العزمی کا سبب بنا کرتی ہیں۔'' ۴

دعوت وارشاد کی حقیقت، اس کا حقیقی مفہوم، اسلوبِ دعوت اور اس کے بنیادی نکات امام احمد رضا کی نگاہ میں کیا تھے، آپ کی تعلیمات سے کیا اشارہ ملتا ہے، اس کی اہمیت وافادیت کے تعلق سے آپ نے کیا نظریہ پیش کیا؟ زیرنظر مضمون میں ان تمام باتوں پر قدرے تفصیلی بحث کی گئی ہے۔

دعوت وتبلیغ ایک عظیم مذہبی فریضہ ہے جو ایمان والوں پر خداوند قدس کی جانب سے تفویض ہوا ہے۔ قرآن مجید کی بہت سی آیات اور احادیث اس پر شاہد ہیں، خود امت محمدیہ کی افضلیت وبرتری اور شان وعظمت کی وضاحت میں قرآن کریم میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر جیسی صفات کا استعمال ہوا۔ ۵ انبیاے کرام ورسلانِ عظام کی بعثت وتشریف آوری کا مقصد دعوت الی الحق ہی تھا۔ ۶

بقدر استطاعت گرد وپیش پھیلے ہوئے منکرات کا قلع قمع اور خلافِ شرع امور کا انسداد اور قوم کی مناسب رہنمائی بہت ضروری ہے۔

اعلیٰ حضرت قدس سرہ فرماتے ہیں: ''ازالۂ منکر بقدر قدرت فرض ہے۔'' ۷

مزید فرماتے ہیں:

''امر بالمعروف ونہی عن المنکر ضرور بنصوص قاطعہ قرآنیہ اہم فرائض دینیہ سے ہے اور بحال وجوب اس کا تارک آثم وعاصی اور ان نافرمانوں کی طرح خود بھی مستحق عذاب دنیوی واخروی۔ احادیث کثیرہ اس معنی پر ناطق ہیں۔'' ۸

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''یوں نہیں خدا کی قسم یا تو تم ضرور امر بالمعروف کروگے، ضرور نہی عن المنکر کروگے۔ یا ضرور اللہ تعالیٰ تمہارے دل ایک دوسرے پر مارے گا، پھر تم سب پر اپنی لعنت اُتارے گا جیسی ان بنی اسرائیل پر اتاری۔'' ۹

دعوت وتبلیغ کی اہمیت وافادیت وضرورت مسلم تو ہے ہی، اس سے زیادہ اہمیت اُن لازمی امور کی ہے جن کی بجا آوری اس عمل میں بے حد ضروری ہے۔ یہ میدان بڑا دشوار گذار اور پُر آشوب ہے جس میں حکیمانہ طرزِ عمل اور ناصحانہ اسلوبِ بیان اختیار کرنا، نیز عصری تقاضوں کو پیش نظر رکھنا اور بہترین تدابیر کو عمل میں لانا بہت ضروری ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اپنے رب کی راہ کی طرف بلاؤ پکی تدبیر اور اچھی نصیحت سے'' ۱۰

یہی وجہ ہے کہ حدیث شریف کے اندر حکم دیا گیا کہ تبلیغ سامعین کے حال کے مطابق ہونی چاہیے۔ اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ نے فتاویٰ رضویہ میں اس طرز کی کئی احادیث ذکر کی ہیں۔ ۱۱

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جب تو کسی قوم کے آگے وہ باتیں بیان کرے گا جن تک ان کی عقلیں نہ پہنچیں تو ضرور وہ ان میں کسی پر فتنہ ہوں گی۔'' ۱۲

دین کی ترویج واشاعت میں حکمت وموعظت، نرمی وملائمت، خوش اخلاقی ونرم خوئی کو روح کا درجہ حاصل ہے اس لیے کہ سنجیدہ گفتگو دل پذیر ہوتی ہے اور اذہان خود بخود اس کی طرف جھکتے ہیں۔ اس کے برخلاف غیر سنجیدہ جذباتی اور تشدد پسندانہ طرز تکلم سے کام بننے کی بجائے بگڑ جاتا ہے اور اس سے منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

نرمی کے فواید کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں:

''دیکھو نرمی کے جو فوائد ہیں وہ سختی میں ہرگز حاصل نہیں ہو سکتے۔ اگر اس شخص سے سختی برتی جاتی تو ہرگز یہ بات نہ ہوتی۔ جن لوگوں کے عقائد مذبذب ہوں ان سے نرمی برتی جائے کہ وہ ٹھیک ہو جائیں یہ جو وہابیہ کے بڑے بڑے ہیں ان سے بھی ابتداء نرمی برتی گئی۔'' ۱۳

اپنے ایک فتویٰ میں تحریر کرتے ہیں:

''مقاصد شرع سے ماہر خوب جانتا ہے شریعت مطہرہ رفق وتیسیر پسند فرماتی ہے، نہ معاذ اللہ تضییق وتشدید۔'' ۱۴

لوگوں کو برائیوں سے منع کرنے اور نیک باتوں کا حکم دینے میں حدود اللہ کی رعایت اور اس کا پاس ولحاظ ناگزیر ہے، بے جا تشدد اور تعصب زدہ اسلوب بیان سخت نقصان کا پیش خیمہ ہے۔

فرماتے ہیں:

''امر بالمعروف ونہی عن المنکر عمدہ تمغائے مسلمانی ہے۔ اس نیک کام میں بہت لوگ حدودِ خداوندی کا خیال نہیں رکھتے اور تشدد وتعصب کو یہاں تک نباہتے ہیں کہ ان کا گناہ ان جاہلوں کے گناہ سے بدرجہا زائد ہو جاتا ہے، جن کے لیے یہ ناصح مشفق بنے تھے۔'' ۱۵

والدین کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید قرآن وحدیث میں واضح الفاظ میں کی گئی ہے۔ ان کی دلداری اور اطاعت بہر حال لازم ہے۔ ہاں اگر یہ دل داری اور فرماں برداری شرعی امور میں حائل ہو تو جائز نہیں۔ ماں باپ اگر خلافِ شرع کام بھی کریں تو انہیں اس سے روکنے اور باز رکھنے کے لیے سختی سے پیش آنے کی ممانعت ہے بلکہ نرمی اور ان کا ادب واحترام بہر صورت ضروری ہے۔ اس حقیقت کی

نشان دہی کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''امر و نہی میں والدین سے سخت کلامی جائز نہیں۔'' ۱۶

ایک دوسرے فتویٰ میں تحریر کرتے ہیں:

''اطاعتِ والدین جائز باتوں میں فرض ہے اگر چہ وہ خود مرتکب کبیرہ ہوں، ان کے کبیرہ کا وبال ان پر ہے مگر اس کے سبب یہ اُمور جائزہ میں ان کی اطاعت سے باہر نہیں ہوسکتا، ہاں اگر وہ کسی ناجائز بات کا حکم کریں تو اس مین ان کی اطاعت جائز نہیں لا طاعة لاحد فی معصیة الله تعالیٰ، ماں باپ اگر گناہ کرتے ہوں ان سے بہ نرمی وادب گذارش کرے، اگر مان لیں بہتر ورنہ سختی نہیں کرسکتا، بلکہ غیبت میں ان کے لیے دعا کرے۔'' ۱۷

انسدادِ جرائم و دفع منکرات میں جہاد کافی موثر ذریعہ ہے اور منکر کے ازالے میں بہت اہم رول ادا کرتا ہے۔ امام احمد رضا قادری قدس سرہٗ جہاد کی تقسیم کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''جہاد کہ اعظم وجوہ ازالہ منکر ہے اس کی تقسیم تین اقسام پر ہے: سنانی، لسانی، جنانی یعنی کفر و بدعت، فسق کو دل سے برا جاننا، یہ ہر کافر، مبتدع و فاسق سے ہے اور ہر مسلمان کہ اسلام پر قائم ہو اسے کرتا ہے۔ مگر جنہوں نے اسلام کو سلام اور اپنے آپ کو کفار ومشرکین کا غلام کیا ان کی راہ جدا ہے، ان کا دین غیر دین خدا ہے۔ اور لسانی کہ زبان وقلم سے ردّ بحمدہٖ تعالیٰ خادمانِ شرع ہمیشہ سے کررہے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی مدد شاملِ حال ہو تو دمِ آخر تک کریں گے، وہابیہ، نیاچرہ، دیوبندیہ، قادیانیہ، روافض، غیر مقلدین، ندویہ، آریہ، نصاریٰ وغیرہم کا ردّ کیا اور اب گاندھویہ سے بھی وہی برسرِ پیکار ہیں۔ حق کی طرف بلاتے اور باطل کو باطل کر دکھاتے ہیں اور مسلمانوں کو گمراہ گروں سے بچاتے ہیں ولله الحمد آگے ہدایت رب عزوجل کے ہاتھ ہے۔ الخ'' ۱۸

اس اہم اور پُر اثر کام میں اپنے معمولات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''دفع گمراہاں میں جو کچھ اس حقیر میرز سے بن پڑتا ہے بحمد اللہ تعالیٰ ۱۴ برس کی عمر سے اس میں مشغول ہے اور میرے رب کریم کے وجہ کریم کو حمد کہ اس نے میری بساط، میرے حوصلے، میرے کاموں سے ہزاروں درجہ اس سے زائد نفع بخشا۔'' ۱۹

آپ نے پوری زندگی اشاعتِ دین ومذہب میں گذاردی، بد مذہبوں کا رد بلیغ کیا، ہزار سے

زائد کتب و رسائل تصنیف کیے، تحریر و تقریر اور وعظ و نصیحت بلکہ اپنے کردار و عمل، معمولات و تعلیمات کے ذریعہ مذہب اسلام کی بیش بہا خدمات انجام دیں اور ہمیشہ ہر وقت فکرِ اُمت میں لگے رہے۔ دین کی اشاعت کے لیے خاطر خواہ کام نہ ہونے کی وجہ سے اپنا دردِ دل کچھ یوں بیان کیا:

''بڑی کمی اُمرا کی بے توجہی اور روپے کی ناداری ہے۔ حدیث کا ارشاد صادق آیا کہ ''وہ زمانہ بھی آنے والا ہے کہ دین کا کام بھی بے روپیہ کے نہ چلے گا'' کوئی عالی شان مدرسہ تو آپ کے ہاتھ میں ہے نہیں، کوئی اخبار پرچہ آپ کے یہاں نہیں۔ واعظین، مدرسین، مناظرین، مصنفین کی کثرت بقدرِ حاجت آپ کے پاس نہیں، جو کچھ کرسکتے ہیں فارغ البال نہیں، جو فارغ البال ہیں وہ اہل نہیں، بعض نے خونِ جگر کھا کر تصانیف کیں تو چھپیں کہاں سے، کسی طرح سے کچھ چھپا تو اشاعت کیوں کر ہو۔'' [20]

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری نے خود اپنے طرزِ عمل اور مدبرانہ تفہیم کے ذریعہ نظریۂ دعوت کو آشکار کیا اور سامنے والے کی نفسیات کو پرکھ کر تبلیغ دین کے لیے زاویے متعین فرمائے۔ ایک سید صاحب کی اصلاح کا ایمان افروز واقعہ ملاحظہ ہو! امام اہلِ سُنّت فرماتے ہیں:

''ایک صاحب سادات کرام میں سے اکثر میرے پاس تشریف لاتے اور غربت وافلاس کے شاکی رہتے، ایک مرتبہ بہت پریشان آئے۔ مَیں نے اُن سے دریافت کیا کہ جس عورت کو باپ نے طلاق دے دی ہو، کیا وہ بیٹے کو حلال ہوسکتی ہے؟ فرمایا، نہیں۔ حضرت امیر المومنین مولیٰ علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم نے جن کی آپ اولاد ہیں تنہائی میں اپنے چہرہ مبارکہ پر ہاتھ پھیر کر ارشاد فرمایا: اے دنیا! کسی اور کو دھوکہ دے، مَیں نے تجھے وہ طلاق دی جس میں کبھی رجعت نہیں، پھر ساداتِ کرام کا افلاس کیا تعجب کی بات ہے؟ سید صاحب نے فرمایا: واللہ میری تسکین ہوگئی، وہ اب زندہ موجود ہیں، اس دن سے شاکی نہ ہوئے۔'' [21]

سوچیے غور کیجیے! کس خوبصورت اندازِ تخاطب کے ذریعہ اعلیٰ حضرت نے سید صاحب کی اصلاح فرمائی اور دین کا پیغام دیا۔ یہ اسلوب دعوت اور طرزِ عمل آپ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ سے سیکھا جس میں سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جوان کو زنا کے متعلق اجازت طلب کرنے کے سوال و استفسار پر اس کی قباحت وشناعت سے آشنا کرادیا اور شائستہ طرزِ عمل سے زنا کاری جیسے عظیم تر گناہ کو اس کی نگاہ میں ناپسندیدہ بنادیا۔ خود امام احمد رضا قدس سرہ نے اس عظیم تاریخی

واقعہ کو بیان فرمایا:

''ایک شخص خدمتِ اقدس حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر ہوئے اور عرض کی، یارسول اللہ! میرے لیے زنا حلال فرما دیجیے۔ صحابہ کرام نے انہیں قتل کرنا چاہا کہ خدمتِ اقدس میں حاضر ہوکر یہ گستاخی کے الفاظ کہے۔ حضور نے منع فرمایا اور ان سے فرمایا، قریب آؤ، وہ قریب حاضر ہوئے۔ اور قریب فرمایا، یہاں تک کہ ان کے زانو زانوے اقدس سے مل گئے۔ اس وقت ارشاد فرمایا، کیا تو چاہتا ہے کہ کوئی شخص تیری ماں سے زنا کرے۔ عرض کی نہ، فرمایا، تیری بیٹی سے، عرض کی نہ، فرمایا، تیری بہن سے، عرض کی نہ، فرمایا، تیری پھوپھی سے، عرض کی نہ، فرمایا، تیری خالہ سے، عرض کی نہ، فرمایا کہ تو جس سے زنا کرے گا آخر وہ بھی کسی کی ماں یا بیٹی یا بہن یا پھوپھی یا خالہ ہوگی یعنی جو بات اپنے لیے پسند نہیں کرتا دوسرے کے لیے کیوں پسند کرتا ہے۔ دستِ اقدس ان کے سینہ پر مار کر دعا فرمائی کہ الٰہی زِنا کی محبت اس کے دل سے نکال دے۔ وہ صاحب کہتے ہیں، جب میں حاضر ہوا تھا تو زِنا سے زیادہ محبوب میرے نزدیک کوئی چیز نہ تھی اور اب اس سے زیادہ کوئی چیز مجھے مبغوض نہیں۔'' ۲۲

امام احمد رضا نے اس طرز کے اور واقعات اپنی کتب و رسائل میں تحریر کیے ہیں اور وعظ و نصیحت میں بیان فرمائے، جس سے یہ نظریہ اخذ ہوتا ہے کہ دعوت کی اہمیت کیا ہے اور اسلوبِ بیان اور موثر تدبیریں کتنا اثر رکھتی ہیں۔ اس لیے ہم پر لازم ہے کہ اعلیٰ حضرت رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جو تعلیمات ہمیں عنایت فرمائی ہیں اقوامِ عالم کو ان سے روشناس کرائیں اور دعوت و تبلیغ کا جو نظریہ پیش کیا ہے اس کی روشنی میں اُمتِ مسلمہ کی مناسب رہنمائی کریں۔

مآخذ

۱۔ 'امام احمد رضا اور عالمی جامعات' از پروفیسر محمد مسعود احمد

۲۔ 'حیاتِ رضا کی نئی جہتیں' از غلام جابر شمس مصباحی

۳۔ چشم و چراغِ خاندانِ برکاتیہ از پروفیسر محمد مسعود احمد

۴۔ مقدمہ 'کہی ان کہی' از: علامہ عبدالستار ہمدانی، ص ۲

۵۔ آل عمران ۳۔ آیت ۱۱۰

٦ تفسیر ابن عباس ۲۹۵

۷ فتاویٰ رضویہ، ص ۱۶۹، ج ۹ رضا اکیڈمی

۸ فتاویٰ رضویہ، ص ۲۱۵، ج ۹ رضا اکیڈمی

۹ سنن ابو داؤد الملاح، ص ۵۹٦، ج ۲

۱۰ سورہ نحل ۱٦۔آیت ۱۲۵

۱۱ جامع الاحادیث، ص ۱۹۴۔۱۹۳، ج ۱

۱۲ جامع صغیر، امام سیوطی، ص ۴۷۹، ج ۲

۱۳ الملفوظ، حصہ اوّل ص ۳۲ رضا اکیڈمی

۱۴ فتاویٰ رضویہ، ص ۱۵۱، ج ۱۱ پور بندر

۱۵ فتاویٰ رضویہ، ص ۱۰۹، ج ۱۱ رضا اکیڈمی

۱٦ فتاویٰ رضویہ، ص ۲٦۱، ج ۹ رضا اکیڈمی

۱۷ فتاویٰ رضویہ، ص ۲٦۱، ج ۹ رضا اکیڈمی

۱۸ رسالۃ المحجة الموتمنه، ص ۹۴

۱۹ فتاویٰ رضویہ، ص ۱۳۳ ج ۱۲

۲۰ فتاویٰ رضویہ، ص ۱۳۳ ج ۱۲

۲۱ الملفوظ حصہ اوّل ص ٦۳ رضا اکیڈمی

۲۲ الملفوظ حصہ اوّل ص ۳۲

☆☆☆☆☆☆

امام احمد رضا اور حسام الحرمین

''حسام الحرمین کے سو سال'' پر ایک تجزیاتی نظر

از۔ محمد صادق رضا مصباحی

چند ماہ پہلے ایک کتاب ''حسام الحرمین'' کے سو سال دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ خوب صورت سرورق اور نئے عنوان نے مطالعہ پر ابھارا۔ مطالعے کے بعد اندازہ ہوا کہ کتاب کافی معلومات افزا ہے۔ اس کے مصنف کوئی ڈاکٹر الطاف حسین سعیدی ہیں۔ یہ کتاب ''**حسام الحرمین علی منحر الکفر و المین**'' کے پس منظر اور اسباب ومحرکات کا کلی طور پر احاطہ کرتی ہے۔ اس سلسلے میں مصنف نے خاصہ مواد جمع کر دیا ہے۔ کتاب کے ایجابی اور سلبی پہلوؤں سے پردہ اٹھانے سے پہلے حسام الحرمین کے بارے میں قارئین کے افادہ کے پیش نظر کچھ گفتگو کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔

''**حسام الحرمین علی منحر الکفر والمین**'' امام احمد رضا بریلوی کی وہ کتاب ہے کہ جس سے برصغیر ہندو پاک اور بنگلہ دیش کے مسلمانوں کا ایمانی رشتہ وابستہ ہے۔ دراصل یہ کتاب علماے حرمین شریفین کے ان فتاویٰ اور امام احمد رضا کی ''**المستند المعتمد بناء نجاۃ الأبد**'' کی تقاریظ پر مشتمل ہے جو علماے حرمین نے مرزا غلام احمد قادیانی، رشید احمد گنگوہی، اشرف علی تھانوی، قاسم نانوتوی اور خلیل احمد انبیٹھوی کے کفریہ کلمات پر تحریر فرمائی ہیں اس اجمال کی قدرے تفصیل جاننا ضروری ہے۔

چالاک انگریز کی عیاری اور کچھ اپنوں کی غداری کی بدولت ۱۸۵۷ء میں سلطنت مغلیہ کا چراغ گل ہو چکا تھا۔ اس کا پس منظر یہ ہوا کہ انگریزوں نے ہندستان کی زرخیزی اور خوش حالی دیکھ کر ایسٹ انڈیا کمپنی کی شکل میں ہندستان میں پنجے گاڑنا شروع کر دیے اور رفتہ رفتہ یہاں ان کے تسلط کا راستہ ہموار ہو گیا۔ اس کے لیے انہوں نے کیا کیا جتن کیے، تاریخ کا ہر ہر ورق اس کی شہادت کے لیے کافی ہے۔ پہلے پہل انہوں نے اپنے مذہب عیسائیت کی تبلیغ کی۔ بہت سارے پادریوں کو لندن سے بلا کر ہندستان کی زمین میں اتار دیا۔ اسی ماحول میں ایک دن ہندستان کے تمام تعلیم یافتہ مسلمانوں اور حکومت کے مسلم ملازموں کے پاس ایک خط روانہ کیا گیا جس کا مضمون یہ تھا:

> ''اب ہندستان میں ایک عمل داری ہو گئی۔ تار برقی سے ہر جگہ کی خبر ایک ہو گئی ریلوے اور سڑک سے ہر جگہ کی خبر ایک ہو گئی، مذہب بھی ایک چاہیے اس لیے مناسب ہے کہ تم لوگ عیسائی ایک مذہب ہو جاؤ''۔

(۱۸۵۷ مصنف غلام رسول مہر بحوالہ الصوارم الھندیہ تقدیم مولانا اختر شاہ جہاں پوری ص ۸)

لیکن متحدہ ہندستان کے غیور مسلمانوں نے ان کے خوابوں کا جنازہ نکال کر رکھ دیا اور انہیں اس میں قطعاً کامیابی نہ مل سکی، بلکہ اُلٹا نقصان اٹھانا پڑا۔ اور ۱۸۵۷ء میں ہندستانیوں اور انگریزوں کے درمیان ایک بھیانک تصادم ہوا۔ قریب تھا کہ انگریز ہندستان چھوڑ کر بھاگ جائیں کہ ضمیر فروشوں اور وطن غداروں نے ہندستان کے ماتھے پر ظلم و بربریت اور غلامی کا جھومر لگانے میں ایسا لائق مذمت اور قابلِ افسوس کارنامہ انجام دیا جس کی وجہ سے ہندستان کی شوکت و رفعت کے سورج کو گرہن لگ گیا۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ انگریز ۱۹۴۷ء تک مزید نوے سال کے لیے وطنِ عزیز پر مسلط ہو گئے۔

ایک پالیسی میں ناکام ہونے کے بعد دوسری ترکیب یہ نکالی گئی کہ ایسے ایسے لوگوں کو تیار کیا جائے کہ جن کے ذھن وفکر سے انہیں کی صداے بازگشت سنائی دیتی ہو، جنھوں نے ان کی تہذیب وفکر کا دامن تھام رکھا ہو اور جو وطن کے اعتبار سے تو ہندستانی ہوں لیکن فکری سطح سے مغربی۔ چنانچہ اس ترکیب میں ان کو بڑی زبردست کامیابی ملی اور سرسید احمد خان (متوفی ۱۳۱۶ ھ) کی شکل میں انہیں مطلوبہ آدمی مل گیا۔ سرسید عربی و فارسی کو براے نام رکھتے ہوئے انگریزی تعلیم کا قصیدہ پڑھنے لگے۔ انہوں نے تقریر وتحریر کے ذریعے اس طور پر تبلیغ کی گویا مسلمانوں کا تابناک مستقبل انگریزی تعلیم کی راہ ہی سے اوجِ ثریا پر پہنچ سکتا ہے۔ ان کی تقریر وتحریر سے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ملتِ اسلامیہ کی بدحالی کا درد اُن کے سینے میں نچوڑ دیا گیا ہے۔ اپنے تعلیمی منصوبے کو لباسِ عمل پہنانے کے لیے علی گڑھ میں ایک کالج کی بنیاد رکھی، جو آج علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے نام سے دنیا بھر میں معروف ہے۔ انگریزیت کے زیر اثر سرسید نے کئی متفق علیہ اور منصوص عقاید و مسائل کا انکار کردیا اور ایک نیچری فرقہ کے بانی بن بیٹھے۔ آج بھی کثیر لوگ ان کے عقایدی خطوط پر گامزن ہیں۔ اُن کے عقاید کے خلاف علماے اہلِ سُنّت نے نعرۂ احتجاج بلند کیا اور سرسید پر کفر کا فتویٰ لگا دیا۔ علماے دیوبند نے بھی ان کے خلاف اپنے قلم کا نشتر چلانے سے گریز نہ کیا۔ سرسید کے حمایتی آج بڑے زور وشور سے یہ پروپیگنڈہ کرتے ہیں کہ سرسید پر علماے کرام نے محض انگریزی تعلیم کی حمایت کرنے پر کفر کا فتویٰ لگایا تھا حالانکہ یہ ایک ایسا جھوٹ ہے جس کی کوئی بھی دلیل پیش نہیں کی جاسکتی۔ سرسید کی تحریک کے زیر اثر مسلمانوں کا ایک بڑا حلقہ انگریزی تعلیم کے موافق ہوگیا، بس پھر کیا تھا رفتہ رفتہ عصری ادارے قائم کیے جانے لگے اور دینی علوم کو براے نام نصاب میں شامل کیا گیا اور آج بھی ایسے ہزاروں مکاتب اور اسکول ہندستان بھر میں موجود ہیں۔ یہاں غیر مسلم اسکولز اور کالجز کو تو جانے دیجیے کہ ان کا قیام ہی اسلام کی جڑیں اُکھاڑنے کے لیے کیا گیا ہے، افسوس تو ان مکاتب اور مسلم اسکولوں پر ہے جہاں براے نام دینی تعلیم ہوتی ہے اور وہ بھی نہایت سطحیت بداماں۔ یہاں کے طلبہ کا فکری ونظریاتی رخ کس طرف ہوتا ہے؟ ان مکاتب اور اسکولز کا معیار، نصاب اور نظام کیا ہے؟ یہاں کے مسلم اساتذہ مسلم نونہالوں کے بے نقش و

غبار اذہان و افکار کا کس طرح سے غیر شعوری طور پر اسلامی تہذیب سے اغوا کر رہے ہیں؟ یہ ایسے تلخ مگر صداقت سے مملو حقایق ہیں جو ایک تفصیلی مضمون کے متقاضی ہیں، اس پر گزارشات پھر کبھی بتوفیق الٰہی۔

قارئین کرام! ان معروضات سے میرا زاویۂ نظر یہ نہیں کہ ماضی قریب میں جن بزرگوں نے انگریزی تعلیم کی وکالت کی تھی، ان کا بھی نظریاتی رشتہ انگریزوں کی سازشوں سے جوڑا جائے بلکہ ان کی حمایت و وکالت کرنے کا مقصد صرف یہ تھا کہ مسلمان دینی علوم کے ساتھ عصری علوم حاصل کر کے اسلام پر کیے جا رہے حملوں کا جواب دینے کے لیے تیار ہوں۔ گویا ان کے مقاصد اور تائید و حمایت میں خلوص کی آمیزش تھی اور سر سید کی تحریک سے اگرچہ مسلمانوں کو فایدہ ہوا اور ہو رہا ہے۔ ان کی تعلیمی بدحالی پر کچھ حد تک بریک لگ چکا ہے لیکن تاریخی حقایق کی روشنی میں یہ تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ سر سید کی فکری جڑیں انگریزی سازشوں کی زمین میں پیوست تھیں۔ لیکن ملّتِ اسلامیہ کی بدحالی پر مصنوعی درد، بناوٹی ہم دردی اور اس کے مذہبی پیکر نے اس پر پردہ ڈال رکھا تھا تو نتیجے کے طور پر یہ عرض کرنے میں مجھے کوئی باک نہیں کہ انگریز آقاؤں کی خوش نودی اس کا مقصدِ اوّلی تھا اور مسلمانوں کے لیے تعلیمی اُٹھان کی کوشش ثانوی اور ضمنی۔ یہ بات جملۂ معترضہ کے طور پر نکل آئی چلیے پھر اپنے ذہن کا رشتہ سابقہ سطور سے جوڑ لیں۔

ایک طرف تو یہ گھناؤنی سازش کی گئی کہ دنیا دار لوگوں کو خریدا گیا اور دوسری طرف ایسے علما کو ڈھونڈا گیا جو اُن کے زر خرید غلام ہوں۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ عوام علما سے وابستہ رہتے ہیں، ان کی قیادت و رہنمائی کا فریضہ یہی علما انجام دیتے ہیں، دنیا دار لوگوں کو یہ گھاس بھی نہیں ڈالتے۔ چنانچہ انہوں نے مولوی مملوک العلی (متوفی ۱۳۹۸ھ) کی سرکردگی میں ایسے علما کی کھیپ تیار کرائی تاکہ ان سے تخریب دین اور مسلمانوں کے درمیان نفرت و اختلاف کے بیج بونے کا کام بآسانی لیا جا سکے۔ انگریزوں نے انہیں واسطہ یا بالواسطہ وظیفہ دے کر ایسے ایسے دعاوی کرائے اور ایسی ایسی کتابیں لکھوائیں جو صدیوں سے چلے آرہے متوارث عقاید و معلومات کے یکسر متصادم تھیں۔ مرزا غلام احمد قادیانی سے نبوت کا دعویٰ کرایا گیا، مولوی اسماعیل دہلوی سے 'تقویۃ الایمان' لکھوائی گئی، قاسم نانوتوی نے 'تحذیر الناس' لکھی، اشرف علی تھانوی نے 'حفظ الایمان' میں اپنی خباثتوں کا اظہار کیا، خلیل احمد انبیٹھوی اور رشید احمد گنگوہی نے 'براہین قاطعہ' لکھ کر خود کو انگریزوں کا زر خرید غلام ثابت کیا۔ ان کے علاوہ اور بھی انگریزوں کے وظیفہ خواروں (علما) نے اس طرح کی کتابیں لکھیں۔ ان کتابوں کا وجود میں آنا تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ متحدہ ہندستان میں آگ لگ گئی ہو، گھر گھر سے نفرت و اختلاف کا دھواں بلند ہونے لگا، ایک بھائی دوسرے بھائی سے برسرِ پیکار نظر آتا تھا اور آج بھی یہ فتنہ تھما نہیں ہے بلکہ یہ نظریاتی جنگ برصغیر کی سرحدوں سے پار نکل چکی ہے۔ علماے اہلِ سُنّت نے ان کتابوں کا ڈٹ کر

مقابلہ کیا اور بے شمار کتابیں معرضِ وجود میں آگئیں اور آج بھی تردیدی تحریریں شائع ہو رہی ہیں۔

اسی ماحول میں حضرت امام احمد رضا بریلوی قدس سرہ ۱۲۷۲ھ/۱۸۵۶ء کو بریلی میں پیدا ہوئے۔ اور اپنے تجدیدی کارناموں سے ان کفریات کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی۔ اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ نے ان کفریات سے برصغیر کے مسلمانوں کو عقایدی سطح پر محفوظ فرما دیا ورنہ بدعقیدگی کا طوفان اتنے زور وشور سے اُٹھا تھا کہ اس کی موجوں سے برصغیر کے مسلمان کا بچنا بہت مشکل نظر آرہا تھا، مسلمانوں کی ایمانی کشتی اسی طوفان میں ڈوبی جارہی تھی لیکن امام احمد رضا بریلوی نے بروقت ملت کی ناخدائی کا فریضہ انجام دیا اور اپنے قلم کا ایسا نشتر چلایا کہ انگریزوں کے یہ ایجنٹ کراہے بغیر نہ رہ سکے اور آج تک کراہ رہے ہیں کیونکہ

کلکِ رضا ہے خنجرِ خوں خوار برق بار اعدا سے کہہ دو خیر منائیں، نہ شر کریں

ان کفریات کا سلسلہ ۱۲۹۰ھ سے جاری ہوا اور ۱۳۲۰ھ میں امام احمد رضا نے "المستند المعتمد بناء نجاۃ الابد" تحریر فرمائی اور اس میں پانچوں ایجنٹوں (مرزا غلام احمد قادیانی، قاسم نانوتوی، اشرف علی تھانوی، خلیل احمد انبیٹھوی اور رشید احمد گنگوہی) کی تکفیر کا شرعی فریضہ انجام دیا اور ۱۳۲۳ھ میں جب آپ حج کو گئے تو علمائے حرمین شریفین نے اس کتاب پر اپنی تائید وتوثیق کی مہر ثبت فرمائی اور اس پر اپنی شاندار تقاریظ رقم فرمائیں اور ان کفریات کے قائلین کو حرمین شریفین کے علما نے خارج از اسلام قرار دیا اور جو ان کے کفر میں شک کرے اسے بھی کافر قرار دیا۔ اس طرح اللہ عزوجل نے امام احمد رضا قدس سرہ کے فتویٰ کے آبگینے کو علمائے حرمین شریفین کی تائید وتوثیق کے فانوس سے روشن کیا۔

اس سلسلے میں ہمارے فکری حریفوں کی جانب سے آفاقی سطح پر یہ پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے کہ مولانا احمد رضا خاں کافر کہنے میں بہت بے باک تھے ان کے قلم کے منجنیق سے سوائے کفر کی گولہ باری کے اور کچھ نہ نکلتا تھا۔ چلیے ہم حقائق کو ہم آئینہ کر کے اس جھوٹ اور پروپیگنڈے کا جائزہ لیتے ہیں۔

راقم اوپر عرض کر چکا کہ ان کفریات کا سلسلہ ۱۲۹۰ھ سے شروع ہوا اور امام احمد رضا نے ۱۳۲۰ھ میں المستند المعتمد لکھ کر ان کی شرعی تکفیر اور تین سال بعد علمائے حرمین نے ان کے اس فتویٰ پر تصدیقات وتقریظات تحریر فرمائیں۔ ان تیس سالوں میں امام احمد رضا نے خطوط کے ذریعے انہیں خوب سمجھایا اور انتظار کیا کہ وہ اپنے کلمات خبیثہ سے باز آجائیں لیکن وظیفہ خواری کی حرص وطمع نے ان کی زبان گنگ اور قلم کی روشنائی خشک کر دی تھی۔ بریلی شریف سے ساری کفریہ عبارتوں کا ایک رد شائع ہو تھا اس سے بیس سوالات منتخب کر کے ایک وفد کے ذریعے تھانوی صاحب کے پاس بھیجے گئے کہ ان سوالات کا بالقلم خود جواب دیجیے۔ لیکن تھانوی صاحب نے کیا کہا، سُنیے:

"ایک نہ ہزار نہ معاف کیجیے میں اس فن میں جاہل، مَیں اور میرے اساتذہ جاہل

ہیں جو شخص تم سے دریافت کرے اسے ہدایت کرو۔ طبیب کا کام نسخہ لکھ دینا ہے، یہ نہیں کہ مریض کی گردن پر چھری رکھ دے کہ تو پی لے۔ تم اپنی اُمت میں سب کو داخل کرلو، مَیں جو کچھ کہہ چکا ہوں، کہوں گا۔ مجھے مقتول بھی کر دیجیے تو بھی یہی کہے جاؤں گا۔ مجھے معاف کیجیے، آپ جیتے، میں ہارا۔"

(وقعات السنان مطبوعہ لاہور ص ۶۷، بحوالہ الصوارم الھندیہ تقدیم مولانا اختر شاہجہاں پوری ص ۲۷)

تھانوی صاحب کا جواب ایک بار پھر پڑھ لیجیے، اگر آپ واقعی حق کے دوست اور باطل کے دشمن ہیں تو بتائیے کہ کیا اس جواب سے مذکورہ پروپیگنڈہ اور جھوٹ کا جنازہ نہیں نکل رہا ہے؟ اگر واقعی اعلیٰ حضرت نے ان کے خلاف کفر کی مشین چلائی تھی تو کیوں نہ تھانوی صاحب نے اس وفد سے اپنا مدعا رکھا؟ اس جواب سے پتہ چل رہا ہے کہ اس اعتراض کی حقیقت صرف یہ ہے کہ وہ جھوٹ ہے، جھوٹ ہے اور صرف جھوٹ ہے۔

اگر نظروں پر بار نہ ہو تو ایک اور ناقابل تردید حقیقت سنیے، جو ان کے جھوٹ کے غبارے کی ہوا نکالنے کے لیے کافی ہے۔

مولانا عبدالحکیم اختر شاہ جہاں پوری لکھتے ہیں:

"جن اشرف علی تھانوی نے یہ کہہ کر جان چھڑائی، تحریری جواب نہ دیے تو وہی سوالات ان کے پاس بذریعہ رجسٹری بھیجے گئے۔ تھانوی جی نے رجسٹری واپس کردی۔ تیسری مرتبہ رسالہ "ظفرالدین الجید" ۱۳۲۳ھ کی صورت میں پیش کیے گئے، لیکن مصنف کے حکیم الامت جناب تھانوی جی کا منھ (تھا) نہ کھلا۔ چوتھی مرتبہ رسالہ "بطش غیب" کے ذریعہ تھانوی صاحب اور سارے دیوبندی قبیلے سے جواب مانگا لیکن وہی یا مظہر العجائب، جواب مع مجیب غائب۔"

(الصوارم الہندیہ تقدیم مولانا اختر شاہجہاں پوری ص ۲۷ مطبوعہ جامعہ اشرفیہ مبارک پور)

یہی نہیں اس زمانے میں اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ نے اپنی کئی تصانیف میں ان کے کفریات گنوائے لیکن تکفیر سے گریز کیا۔ حتیٰ کہ ۱۳۰۹ھ میں رسالہ "سبحان السبوح" پہلی بار شائع ہوا تو اس میں قائلِ کذب باری گنگوہی صاحب پر ۷۸ وجہ سے لزومِ کفر ثابت کیا لیکن تکفیر نہیں کی۔ ۱۳۱۶ھ میں رسالہ "الکوکبۃ الشہابیہ" شائع ہوا جس میں اسماعیل دہلوی کے ۷۰ کفریات کو شمار کرایا لیکن تکفیر سے اجتناب کیا۔ امام احمد رضا نے ۱۳۱۹ھ میں تھانوی صاحب کے پاس ایک مکتوب بھی روانہ کیا تھا اور انہیں توبہ کرنے کی تلقین کی تھی لیکن ساری کوششیں بے کار ثابت ہوئیں۔ بالآخر مجبور ہو کر ۱۳۲۰ھ میں امام احمد رضا نے "المستند المعتمد" تحریر فرمائی اور تکفیر کا شرعی فریضہ انجام دیا۔ اور علمائے حرمین شریفین

نے بھی اس کتاب پر تصدیق فرمائی اور ان کے کفریہ کلمات پر کفر و ارتداد کی مہر لگا دی۔ ان ہی تقاریظ و تصدیقات اور توثیقات و تائیدات کے مجموعہ کا نام ''حسام الحرمین علی منحر الکفر و المین'' ہے جو ۱۳۲۲ھ سے اب تک شائع ہو رہی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دیار سے بھی کافر و مرتد قرار دیے جانے کے بعد متحدہ ہندستان میں ان لوگوں کی بڑی بھد ہوئی، تو انبیٹھوی صاحب نے اندھے عقیدت مندوں کی تحریک پر اور اپنی عزت کا بھرم رکھنے کی خاطر ''المہند'' لکھی اور دارالعلوم دیوبند کے مولوی حسین احمد ٹانڈوی نے ''شہاب ثاقب'' لکھی، جسے کتاب نہیں گالی نامہ کہنا زیادہ صحیح ہے۔ جسے یقین نہ آئے پڑھ لے۔ اس کے ردِّ عمل میں حضرت صدر الافاضل مولانا نعیم الدین مراد آبادی نے ''التحقیقات لدفع التلبیسات'' نامی رسالہ لکھ کر ''المہند'' کے فریب اور جعل سازی کو سرِ عام ننگا کر دیا اور مفتی سنبھل مولانا مفتی شاہ اجمل صاحب (متوفی ۱۹۶۴ء) نے ردِّ شہاب ثاقب نامی کتاب تحریر فرمائی اور ٹانڈوی صاحب کے لگائے گئے الزامات کا اچھی طرح تعاقب فرمایا۔ جب ان کی یہ کوشش ثمر بار نہ ہوئی تو ایک سازش کے تحت یہ غوغا آرائی کی کہ اعلیٰ حضرت نے علمائے حرمین کو دھوکے میں رکھا۔ حرمین شریفین کے علما چونکہ اردو سے ناواقف تھے، اس لیے علمائے حرمین نے ناواقفی میں تصدیق کر دی تھی۔ اگر ان کے سامنے صحیح صورتِ حال پیش کی جاتی تو وہ ہرگز ایسا نہ کرتے۔ ان کا یہ اعتراض اتنا کمزور ہے کہ تارِ عنکبوت بھی اس کے سامنے ہیچ ہے۔ اس اعتراض کی حقیقت کیا ہے؟ اہلِ علم حضرات سے قطعاً مخفی نہیں۔ بہر حال ان کا منھ بند کرنے کے لیے شیر بیشۂ اہلِ سنّت مولانا حشمت علی خان علیہ الرحمۃ نے ''الصوارم الہندیہ علی مکر الشیاطین الدیوبندیہ'' ترتیب دے کر ان کے ترکش کے آخری تیر کو بھی زنگ آلود بنا دیا۔ آپ نے 'الصوارم الہندیۂ' میں ہندستان کے ۲۶۸ علمائے کرام و مشائخ عظام سے حسام الحرمین کے مندرجات پر ان کے تائیدی فتوے اور تصدیقات لے کر شائع کیے۔ آج تک حسام الحرمین ان انگریزی ایجنٹوں کے معتقدین کے سروں پر تلوار بن کر لٹک رہی ہے۔ ان کی ساری سازشیں ناکام ہو چکی ہیں اور ان کے سارے کرتوت عوام کے سامنے آ چکے ہیں۔ یہ لوگ ویسے تو جزوی طور پر کوئی نہ کوئی سازش کرتے ہی رہتے ہیں اور خود کو مسلکِ حق پر ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتے ہیں لیکن حسام الحرمین کا جواب ان کے بس کی بات نہیں ہے۔ حسام الحرمین کی اشاعت سے پہلے نانوتوی اور گنگوہی تو مر چکے تھے لیکن اشاعت کے بعد انبیٹھوی صاحب ۲۲ سال اور تھانوی صاحب ۳۹ سال تک زندہ رہے۔ اگر ان کے اندر دم خم تھا تو علمائے حرمین کے پاس جا کر اعلیٰ حضرت کی جانب سے دیے گئے فتوے کا ازالہ کیوں نہیں کیا اور اپنی صفائی کیوں نہیں پیش کی؟

محترم ڈاکٹر الطاف حسین سعیدی صاحب مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے حسام الحرمین کی عمر سو سال ہونے پر "حسام الحرمین کے سو سال" نامی کتاب لکھ کر پورے دیوبندی کنبے کو ایک بار پھر چوراہے پر ننگا کر دیا ہے۔ اور مخالفین کی جانب سے پھیلائی گئی غلط فہمیوں اور پروپیگنڈوں کے ازالے کا بہت اچھا موقع فراہم کیا ہے۔ موصوف تحصیل جہانیاں، ضلع خانیوال، ملتان شریف، پاکستان کے باشندے ہیں۔ پیشہ سے ایم بی بی ایس ڈاکٹر ہیں، غزالیٔ زماں علامہ سید احمد سعید کاظمی علیہ الرحمہ سے شرف بیعت رکھتے ہیں، ان کو پڑھنے لکھنے سے خاصہ شغف ہے اور ماشاء اللہ صوم و صلاۃ کے پابند ہیں۔ یہ کتاب ان کی قابل قدر کوشش ہے۔ یہ ۳۶×۲۳/۱۶ سائز کے ۶۴ صفحات پر مشتمل ہے کاغذ اچھا اور سرورق دیدہ زیب ہے۔ اس کی اشاعت کا طرۂ امتیاز تحریک فکر رضا، ممبئی نے اپنی کلاہ میں سجایا ہے۔ کتاب کیا ہے معلومات کا خزینہ ہے۔ انگریز کے مذکورہ پانچ زرخرید غلاموں کی کفریہ عبارات کے خلاف علمائے اہل سُنّت نے جو تقریری اور تحریری خدمات سرانجام دی ہیں، ان کا خلاصہ پیش کر دیا گیا ہے۔ گویا یہ کتاب ہزاروں صفحات کا عطر اور بے شمار کتابوں کا خلاصہ ہے۔ سعیدی صاحب (مصنف) نے امام احمد رضا پر عائد کردہ ان الزامات پر جرح و نقد بھی کی ہے اور پھر ان کا مدلل و مفصل جواب تحریر فرمایا ہے جو علمائے دیوبند وقتاً فوقتاً پیش کرتے رہتے ہیں۔

جماعتِ اہل سُنّت کے عظیم عالم و مصنف حضرت علامہ پیر محمد کرم شاہ ازہری کے سلسلے میں ہمارے بعض علمائے اہلِ سُنّت کو جو غلط فہمی ہے اس کے اسباب تحریر کیے ہیں اور پھر اس کے ازالے کی سعی بھی فرمائی ہے۔ اسی طرح علامہ ڈاکٹر اقبال کے حوالے سے ہمارے یہاں کثیر لوگوں کو غلط فہمی ہے کہ وہ اہل سُنّت کے مکتب فکر کے ہیں یا نہیں؟ ان کے بعض اشعار شریعت کے مزاج سے قطعاً میل نہیں کھاتے اور بالعموم دوسرے شعرا کی طرح اقبال بھی آزاد خیال تھے، وغیرہ وغیرہ۔ ڈاکٹر اقبال کے بارے میں سعیدی صاحب مولانا منشا تابش قصوری کی کتاب "دعوتِ فکر" ص ۳۵۔۱۰۶ کی عبارت پیش کرتے ہیں:

> "۱۵ر شوال ۱۳۵۲ھ کو مسجد وزیر خاں لاہور میں مولانا حامد رضا خاں علیہ الرحمہ کا مولوی اشرف علی تھانوی سے عبارات متنازعہ پر فیصلہ کن مناظرہ طے پایا۔ مولانا حامد رضا خاں لاہور میں موجود رہے لیکن اشرف علی نہ آیا۔ اس موقع پر علامہ اقبال مرحوم نے دیوبندیوں کی متنازعہ عبارات سن کر کہا، مولانا یہ ایسی عبارات گستاخانہ ہیں۔ ان لوگوں پر آسمان کیوں نہیں ٹوٹ پڑتا۔ ان پر تو آسمان ٹوٹ پڑ جانا چاہیے۔"

بہرحال سعیدی صاحب کی یہ کتاب ہر جہت سے مفید ہے اور اس موضوع پر ایک قابلِ قدر اضافہ بھی۔ اس کتاب کو دنیا کی مختلف زبانوں میں شائع کیا جائے اور اس کو زیادہ سے زیادہ لوگوں میں تقسیم کیا جائے۔ برصغیر کے ہر سُنّی مسلمان کو اس کتاب کے بارے میں تھوڑی بہت جان کاری ناگزیر

ہے۔اس کتاب کے بارے میں میرا شخصی تاثر یہ ہے کہ یہ کتاب جتنی معیاری ہے، اتنی ہی معیاری اس کی کمپوزنگ اور سرورق ہے۔لیکن کہیں کہیں سعیدی صاحب کے قلم سے کچھ خامیاں بھی رہ گئی ہیں جو ان کے قلم کے اعتبار کو مجروح کرتی ہیں۔جن کا تذکرہ نہ کرنا انصاف و دیانت کے منافی ہے۔

سعیدی صاحب نے ص نمبر ۴۴ پر **قل ربی زدنی علماً** الآیۃ کے سامنے قوسین میں سورہ کہف آیت نمبر ۱۱۴ تحریر فرمایا ہے یہ غلط ہے یہ سورۂ طٰہٰ کی آیت ہے یوں ہی ص ۴۵ پر **ان فی خلق السمٰوٰت والارض واختلاف اللیل والنہار لآیات لاولی الالباب** ۔الآیۃ کے تحت سورۃ انعام آیت نمبر ۴۹ لکھا ہوا ہے۔ حالانکہ یہ سورۂ آل عمران آیت نمبر ۱۹۰ ہے۔ ایک جگہ آپ نے کرم نوازی استعمال فرمایا ہے۔ یہ غلط ہے یہاں کرم فرمائی ہونا چاہیے تھا۔ص ۲۹ پر لکھتے ہیں:''مولانا سعید احمد قادری بھی طویل بحث و مباحثے کے بعد اپنی دیوبندیت سے **تائب ہو کر بریلوی بنے**۔'' سعیدی صاحب آپ کے خط کشیدہ جملے سے ہم قطعاً اتفاق نہ کریں گے۔ ہم نے تقریروں اور تحریروں میں ایسے ہی جملے استعمال کرکے اپنے خلاف ماحول سازگار کیا ہے۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ غیروں نے ہی ہماری سُنّی جماعت کو پوری دنیا کو بریلوی فرقہ سے متعارف کرایا اور آج بھی یہ سلسلہ رکنے کا نام نہیں لے رہا ہے۔ ہم لوگ مسلکی شدت کے زیر اثر لفظ بریلوی کو اتنا زیادہ استعمال کرتے ہیں کہ ایک خالی الذہن آدمی بریلوی کو فرقہ تصور کرنے لگتا ہے۔تو ہم لوگ کیوں اپنے پیروں پر کلہاڑی مار رہے ہیں۔اس تناظر میں ہم سعیدی صاحب کے اس جملے پر سراپا احتجاج ہیں اور اہل سُنّت کے مصنفین، محققین اور مقررین کی بارگاہ میں عرض پرداز ہیں کہ آپ لوگ ایسے جملے قطعی استعمال نہ فرمائیں، ورنہ یہ تاریخ کی اتنی بڑی بھول ہوگی کہ جس کا خمیازہ ہماری آنے والی نسلوں کو بھگتنا پڑسکتا ہے اور موجودہ ماحول کے تیکھے تیور نے اس کی پیشین گوئی بھی کردی ہے۔سعیدی صاحب نے کئی مقامات پر حاشیہ 'المعتمد المستند' کو 'المستند المعتمد' لکھا ہے، خیر یہ کوئی قابلِ ذکر بات نہیں ہے۔اسماعیل دہلوی کی کتاب کو آپ نے ''تقویت الایمان'' لکھا ہے، حالانکہ اس کا صحیح رسم الخط ''تقویۃ الایمان'' ہے۔کئی مقامات پر حسام الحرمین کو حسّام الحرمین (تشدید کے ساتھ) لکھا گیا ہے۔ یہ غلطی اتنی عام ہوچکی ہے کہ بعض خواص بھی احتیاط نہیں کرپاتے۔

ص ۲۴ پر لکھتے ہیں:''**وہ بالفرض مانا بھی تو کیا مانا**'' یہاں اس نے بالفرض مانا ہونا چاہیے تھا۔

ہمیں امید ہی نہیں یقین ہے کہ سعیدی صاحب ہماری ان گزارشات کو خندہ پیشانی سے قبول فرمائیں گے۔نقطۂ اختتام تک پہنچنے سے پہلے ہم ایک بار پھر مصنف کو لائق تعریف کوشش پر دل کی اتھاہ گہرائیوں سے تہنیت پیش کرتے ہیں اور یہ امید کرتے ہیں کہ قارئین بھی اسے پڑھے بغیر نہ رہ سکیں گے۔

OOOOOO

فکریات

فکر کسی بھی شخصیت کا آئینہ ہوتی ہے۔ اُس شخصیت کے مختلف رنگ جو اس آئینے میں منعکس ہوتے ہیں، اُن سے اُس کی کتابِ حیات کی سطر سطر نمایاں ہوجاتی ہے اور غیر جانب دار مورخ ٹھوس اور مضبوط رائے قائم کرتا ہے۔ امام احمد رضا بریلوی کی کتابِ حیات کا جب ہم مطالعہ کرنے بیٹھتے ہیں تو تمام پہلوؤں کے ساتھ ساتھ ان کا فکری چہرہ بھی نہایت تابندہ نظر آتا ہے۔ اُن کی محسوسات کا جو دبستاں اُن کی فکر میں کِھلتا ہے اُس میں مذہب و ملت کے حوالے سے اُن کے خونِ جگر کی سُرخی اور اُن کی سوچ کی ہریالی دونوں نمایاں طور پر جلوہ نما ہوتی ہیں۔ ہر میدانِ فکر میں امام احمد رضا کا شناختی عَلَم نصب ہے، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اُن کے افکار سے غیر معمولی حد تک اغماض برتا گیا ہے۔ اس کا جو منطقی نتیجہ برآمد ہوا وہ ہمارے سامنے ہے۔ راقم نے اپنے مضمون "امام احمد رضا کا فکری نظام اور ہماری بے اعتنائیاں" میں اس قسم کی سخن گستری کی ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر امجد رضا امجد، مولانا فصیح الدین نظامی، مولانا قطب الدین رضا مصباحی، مولانا غلام مصطفٰی باسنوی، جناب غلام مصطفٰی مالیگ اور مولانا توفیق احمد برکاتی مصباحی کی تحریریں بھی فکرِ رضا کے حوالے سے ہیں۔ ڈاکٹر امجد رضا امجدؔ صاحب نے اپنے مضمون "سائنسیات میں امام احمد رضا کی فکری تنقیدیں" میں اپنی تحریر کے مندرجات سے جو نتیجہ نکالا کہ اعلیٰ حضرت ایک عظیم سائنس داں بھی تھے، اس پر مَیں اپنی طرف سے کچھ نہ کہہ کر یہ قضیہ اربابِ علم و دانش کے سامنے رکھتا ہوں کہ کسی فن کے ایک پہلو یا متعدد پہلوؤں پر علم رکھنے سے کیا کوئی اس فن کا امام تسلیم کیا جاسکتا ہے؟ اب تک تو ہم بھی سمجھتے تھے کہ اعلیٰ حضرت ایک عظیم مذہبی رہنما کے ساتھ ساتھ عظیم مجدّد بھی تھے لیکن آج پتہ چلا کہ وہ عظیم سائنس داں بھی تھے۔ خیر دیکھیے اس سلسلے میں اربابِ علم و دانش کا کیا موقف سامنے آتا ہے۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ ایسے نظریات رکھنے والے اپنی عقیدت کی پیاس تو بجھا لیتے ہیں لیکن بعد میں جو نتائج سامنے آتے ہیں اُن کا سامنا کون کرتا ہے؟ زیرِ نظر باب میں رضا بریلوی کی فکریات کے تعلق سے بحث کی گئی ہے۔

.... **ص۔ ر۔ مصباحی**

باب چہارم

مسلکِ اعلیٰ حضرت کیا ہے؟

از: سید محمد حسینی اشرفی مصباحی سجادہ نشین آستانۂ عالیہ اشرفیہ
رائچور و چیف ایڈیٹر ماہنامہ سُنّی آواز، ناگپور

''دین اسلام و مذہب اہلِ سُنّت کا سچا و مختصر خلاصہ مسلکِ اعلیٰ حضرت ہے۔ یہی وہ مجمع البحار ہے، جو آج حنفیت و شافعیت و مالکیت وحنبلیت اور قادریت و چشتیت و سہروردیت ونقشبندیت و مجددیت و برکاتیت و اشرفیت وغیرہم سب سمندروں کا سنگم ہے۔''

(ارشادِ اعلیٰ امام المناظرین مظہر اعلیٰ حضرت شیر بیشۂ اہلِ سُنّت رحمۃ اللہ علیہ)

امام المناظرین مظہر اعلیٰ حضرت شیر بیشۂ اہلِ سُنّت حضرت علامہ مولٰنا حشمت علی خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جو ارشاد فرمایا، وہ بالکل صحیح اور حق ہے۔ اب اس کے بعد میرا آنے والا مضمون حضرت شیر بیشۂ اہلِ سُنّت رحمۃ اللہ علیہ کے مذکورہ بالا ارشادگرامی کی تفصیل وتشریح ہے:

''بریلوی مسلک یا مسلکِ اعلیٰ حضرت کی اصطلاح گمراہ و مرتد فرقوں اور ان کے نام نہاد ادعاے حنفیت وسُنّیت سے ممتاز کرنے کے لیے ایک سو پچیس سال سے زاید عرصے سے اب تک ہزاروں عرب وعجم کے اکابر ومعتمد ومستند، مرجع عالم علماے کرام اور کروڑوں عوام وخواصِ اہلِ سُنّت میں رائج ہے۔ سبھوں نے اس کو حق جانا اور سُنّیت وحنفیت بلکہ صحیح اسلام و دینِ حق کی پہچان کے لیے اسی مسلک کو مانا اور جانا اور وہ اسی پر قائم ہیں۔

حنفیت کے نام پر مسلکِ وہابیت و دیوبندیت اور اسی حنفیت کے نام پر قادیانیت ونیچریت و صلح کلیت جیسے مرتد و بے دین مسالک وجود میں آچکے تھے، حنفیت وسُنّیت کے خدوخال کو مٹا کر رکھ دیا تھا۔ بنام حنفیت سیلابِ کفر وارتداد اتنا تیز تھا کہ حقیقی حنفیت وسُنّیت کو ختم کرکے اپنے خودساختہ عقاید و نظریات کو جاری کردیا تھا۔ ڈر تھا کہ مسلکِ حنفیت بلکہ چاروں برحق مسالک کو ہی یہ کافرومرتد ختم نہ کردیں۔

اعلیٰ حضرت مجدد اعظم سیدنا امام احمد رضا بریلوی قدس سرہ کا احسان ہے کہ عقاید اسلام اور چاروں مسالک پر کفر والحاد و بے دینیت کی تیز آندھی کے ذریعے بگاڑ پیدا کرنے کی جو کوشش کی گئی تھی، جو غبار اُڑایا گیا تھا، اُسے صاف کرکے کھرا، نکھرا، چمک دار دین اور مسلکِ حنفیت وسُنّیت کو پیش کیا۔ اسی لیے زمانۂ دراز سے نہ صرف ہند بلکہ دنیا کے مرجع ومعتمد ومستند اکابر علماے اہلِ سُنّت نے

گمراہ و مرتد مسلکوں کے مقابل چاروں برحق مسلکوں اور اہلِ سُنّت کے تشخص کو برقرار رکھنے کے لیے، اسے مسلکِ اعلیٰ حضرت سے معروف کردیا۔ اب یہاں چاروں مسلکوں کا تشخص مسلکِ اعلیٰ حضرت سے برقرار ہے۔ حنفیت، شافعیت، مالکیت، حنبلیت کے نام پر جتنے گمراہ و مرتد فرقے اُٹھے تھے، بریلوی مسلک یا مسلکِ اعلیٰ حضرت کہنے سے، وہ فنا ہوگئے اور اسی نام سے مسلکِ حق کی شناخت ہوگئی۔

اگر کوئی یہ کہے کہ میں حنفی ہوں، تو یہ سوال باقی رہتا ہے یہ کون سا مدعی حنفیت ہے، دیوبندی حنفی یا قادیانی حنفی، یا مودودی حنفی، وغیرہ۔ جب قائل نے یہ کہا کہ میں سُنّی حنفی بریلوی ہوں یا یہ کہا کہ میں مسلکِ اعلیٰ حضرت پر عامل ہوں تو اب وہابی، دیوبندی، قادیانی، مودودی، صلح کلی و نیچری وغیرہ مدعیانِ حنفیت وسُنّیت خارج ہو گئے۔

دین و مذہب میں فتنے کے زمانے میں جن ائمہ و علما نے خدماتِ دین انجام دے کر دین و مذہب کو صیقل کیا، دین و مذہب ان کے نام سے معروف ہوا اور انھیں امام کہہ کر پکارا گیا۔ جیسے امام غزالی، امام رازی وغیرہ رضی اللہ عنہم۔ ان حضرات کو امام یا ان کے دین و مذہب کی طرف اشارہ کرکے اہلِ سُنّت کے تشخص کو برقرار رکھنے کے لیے اپنے آپ کو ان کے مسلک کا حامل قرار دے لینا ہی عین دین اسلام ہے۔ آپ نے اپنی حنفیت وسُنّیت کی حفاظت کرلی۔ اسی لیے شہزادۂ حضرت محدث اعظم ہند حضرت شیخ الاسلام علامہ مدنی میاں صاحب نے فرمایا:

> ''اب کوئی اشاعرہ سے ہو یا ماتریدیہ سے، حنفی ہو یا شافعی، مالکی ہو یا حنبلی، وہ صحیح طور پر مسلکِ اہل سُنّت و جماعت کی روشنی میں بریلوی ہے۔''

(ماہ نامہ سُنّی آواز، مئی و جون ۱۹۹۷ء ص ۶)

آپ قرنِ اوّل سے لے کر آج تک تاریخ اسلام کا مطالعہ کیجیے تو یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہوجاتی ہے کہ ہر دور میں عقایدِ باطلہ کے حاملین و عاملین کے خلاف دین و مذہب، اصول و عقاید میں حفاظت اور اپنے ایمان و عقیدے کی سلامتی کے لیے، اپنے آپ کو کسی ذات یا شہر کی طرف منسوب کیا گیا، جو زمانے میں دین و ایمان کی حفاظت کے ضامن کہلائے۔ ورنہ عام مسلمان ان مدعیانِ اسلام کے دعویٔ ایمان و اسلام اور ان کی ظاہری چمک دمک کی وجہ سے گمراہیت و کفر و ارتداد میں مبتلا ہو جاتے۔ اگر یہ ضروری نہ ہوتا تو چاروں مسلک اور عقاید میں دو مسلک، مسلکِ ماتریدی اور مسلکِ اشعری وجود میں نہ آتے۔ حالانکہ اس وقت اجلہ ساداتِ کرام و اہلِ بیت اطہار موجود تھے۔ حضور سیدنا علی بن موسیٰ رضا ۲۰۳ھ، سیدنا امام موسیٰ رضا بن حضرت جعفر کاظم رضا ۱۸۳ھ، حضور سیدنا امام جعفر صادق ۱۴۸ھ، حضور سیدنا امام باقر و حضور سیدنا امام زید مظلوم شہید ۱۲۴ھ، حضور سیدنا امام زین

العابدین ۹۴ھ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے بڑھ کر اہلِ بیت میں کون ہوسکتا تھا۔

ان حضرات کی موجودگی میں غیر اہلِ بیت ائمہ کا مسلک کیسے رائج ہوا؟ مذکورہ حضرات کے مراتب سے اُمت اچھی طرح واقف ہے۔ ہدایت و رہنمائی کے لیے مذکورہ حضرات کی ذواتِ مقدسہ کیا کافی نہیں تھیں؟ انھیں مذکورہ اور اولوالعزم حضرات، ہر طرح کی عظمت کے حامل اہلِ بیت اطہار کی اولاد طیبات بعد میں مسلکِ حنفیت کی مقلد کہلائی، بلکہ ان حضرات نے اپنے حنفی ہونے پر فخر فرمایا۔

اگر کوئی مسلکِ علی بن موسیٰ رضا یا مسلکِ کاظمی یا مسلک جعفری یا مسلکِ باقری یا مسلکِ عابدی یا مسلکِ حسینی کا مقلد کہلائے، تو کیا نجات کے لیے کافی نہیں تھا؟ یقیناً ان حضرات کی طرف نسبت کرنا نجات کے لیے کافی ہے، تو پھر کیوں سیدنا امام اعظم ابو حنیفہ، سیدنا امام شافعی، سیدنا امام احمد بن حنبل و سیدنا امام مالک و سیدنا امام ابو منصور ماتریدی و سیدنا ابوالحسن اشعری رضی اللہ عنہم کی طرف منسوب کرتے ہوئے، مسلکِ حنفی، مسلکِ شافعی، مسلکِ مالکی، مسلکِ حنبلی، مسلکِ ماتریدی و مسلک اشعری وجود میں آئے، کہ جن مسلکوں اور مذہبوں پر اُمت میں بڑے بڑے اولیاے کرام، اغواث و اقطاب، بدلا و نجبا و فقہا و مشائخ علما و عامۃ المسلمین قائم ہیں اور ان مذہبوں اور مسلکوں پر فخر کرتے ہیں۔

کوئی کہہ سکتا ہے کہ مسلکِ جعفری و باقری وغیرہ مسالک حق پر نہیں ہیں؟ یقیناً یہ مسلک حق ہیں اور مدارِ نجات ہیں، لیکن انھیں حضرات کا نام لے کر گمراہ و مرتد فرقے پیدا ہوئے۔ ہمارے ائمہ اربعہ و ائمہ فقہا و عقاید رضی اللہ عنہم کا احسان ہے کہ صحیح خد و خال کو پیش کرنے کے لیے اور عقاید کی درستگی اور نجاتِ آخرت کے لیے خوب محنتیں کیں اور اُمت کا حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی، ماتریدی و اشعری مسالک پر اجماع ہوگیا۔ جس پر اُمت کے اکابر اولیا کرام سمیت بڑے بڑے فقہا، محدثین، اغواث، ابدال، اقطاب، ائمہ و علما انھیں کے مسلکوں پر قائم رہے اور خود اس پر چلے اور اُمت کو انھیں پر چلنے کی تلقین و تاکید فرماتے رہے۔ حالانکہ ہمارے ائمہ اربعہ اور حضرت امام ابو منصور ماتریدی اور حضرت ابوالحسن اشعری رضی اللہ عنہم وہی فرماتے رہے جو حضور سیدنا امام حسین و سیدنا امام زین العابدین و سیدنا امام باقر و سیدنا امام جعفر صادق و سیدنا امام زید مظلوم رضی اللہ تعالیٰ عنہم ارشاد فرما چکے ہیں۔ اس کے باوجود حسینی مسلک، عابدی مسلک، باقری و زیدی مسلک و جعفری مسلک کا نام اُمت میں رائج نہیں ہے۔ کیا مذکورہ مسالک نجات کے لیے کافی نہیں ہیں؟

چونکہ ان مسالک کا نام لے کر گمراہ و بدمذہبوں اور مرتدوں نے دین کے اندر عقاید اسلامیہ کے خلاف نئے نئے فتنے پیدا کیے، اس لیے ان سے اپنے آپ کو ممتاز کرنے کے لیے تقلید ائمہ اربعہ کو واجب قرار دیا گیا۔ اسی طرح جب حنفیت و مالکیت وحنبلیت وشافعیت و ماتریدیت اور اشعریت نے

عقایدِ باطلہ کو چھانٹ کر گمراہیت و بے دینیت سے ممتاز کر دیا، جس ذات نے یہ فریضہ انجام دیا، اس ذات کی طرف اپنے آپ کو منسوب کرنا، حنفیت، مالکیت، شافعیت، حنبلیت، ماتریدیت و اشعریت پر قائم رہنے کے لیے ضروری ہوگیا۔

اس سلسلے کی ایک کڑی حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔ تاریخ کا قاری جانتا ہے کہ اکبری دورِ الحاد میں جب سُنّیت وحنفیت کے نام پر دینِ الٰہی قائم کرکے دینِ متین میں فتنے برپا کیے گئے۔ اُس وقت اصل مذہب حنفیت پر قائم رہنے کے لیے اپنے آپ کو مسلکِ مجدد کا حامل کہلانا یا صرف مجددی ہونے کا یقین دلانا کافی تھا۔ اس وقت کسی نے یہ نہیں کہا کہ یہ پانچواں مسلک ہے یا مجدد الف ثانی پانچویں امام ہیں یا مَیں مسلکِ اعتدال پر قائم ہوں، جس طرح جامعہ نظامیہ حیدرآباد کے علما کا مسلک ہے۔

مسلکِ مجددی سے مراد اس زمانے میں، مذہب اہل سُنّت، حنفی و ماتریدی ہی مسلک مراد لیا جاتا تھا۔ اس سے کوئی نیا دین یا نیا مذہب مراد نہیں لیا جاتا تھا۔ اسی طرح پھر جب مسلکِ حنفیت و سُنّیت کے نام پر دین حنفیت کے خلاف فتنے برپا کیے گئے، یہاں تک کہ ملک ہند میں انگریزوں کا تسلط ہوا اور اس میں وہابی، دیوبندی، نیچری، قادیانی وغیرہ مسالک وجود میں آئے اور سب نے حنفی بن کر اپنے من گھڑت باطل وکفری عقاید سے دین میں فتنے برپا کیے۔ ان کے عقایدِ باطلہ سے بچنے، عقایدِ اسلامیہ پر کاربند رہنے اور نجاتِ آخرت کے لیے مذکورہ گمراہ ومرتد بے دین فرقوں اور مسلکوں سے الگ رہنے کے لیے عرب وعجم کے اکابر ائمہ ومعتمد علما وفقہاے کرام نے مسلکِ اعلیٰ حضرت یا مسلکِ بریلویت جیسے الفاظ صحیح اسلامی تشخص کو برقرار رکھ کر مسلکِ حنفیت کو معروف کیا اور اسی کو مدارِ نجات جانا۔ اب یہ الفاظ دین وسُنّیت وحنفیت وشافعیت و مالکیت وحنبلیت و ماتریدیت واشعریت کے لیے علامتی نشان بن گئے۔ ایک مرتبہ پھر حضرت علامہ مدنی میاں کے اسی قول کو تفصیلاً ملاحظہ کیجیے۔

> ''اب کوئی اشاعرہ سے ہو یا ماتریدیہ سے حنفی یا شافعی یا مالکی ہو یا حنبلی، اگر وہ صحیح طور پر مسلکِ اہلِ سُنّت و جماعت پر ہے تو مذکورۃ الصدر مروجہ اصطلاح کی روشنی میں ''بریلوی'' ہے۔
>
> اب بریلوی ہونے کے لیے فاضل بریلوی کی ذات گرامی تک کسی سلسلۂ علمی یا سلسلۂ بیعت وارادت کا پہنچنا یا شہر بریلی میں مقیم رہنا ضروری نہیں رہ گیا۔ اسی لیے ایسوں کو بھی بریلوی کہا جاتا ہے جس نے عمر بھر کبھی بریلی شریف کو خواب میں بھی نہیں دیکھا، نیز جس کا علمی یا نسبی یا کسی دوسری طرح کا کوئی سلسلہ فاضل بریلوی

تک نہیں پہنچتا بلکہ جہاں فاضل بریلوی کی آواز تک نہیں پہنچتی، اس اصطلاح نے ''بریلویت'' کو وہاں تک پہنچا دیا۔ اب اس دنیا کا ہر فرد ''بریلوی'' ہے جو مسلکِ اہلِ سُنّت پر واقعی طور پر گامزن ہے۔''

(ماہ نامہ حجازِ جدید، دہلی، ستمبر اکتوبر ۱۹۸۹ء، ص ۹۴ بحوالہ سُنّی آواز، مئی جون ۱۹۹۷ء، ص ۱۱۔۱۲)

علامہ مدنی میاں صاحب نے پورے انشراحِ صدر کے ساتھ تمام عالمِ اسلام کے اہلِ سُنّت کو بریلوی قرار دیا۔ اسی اصطلاح کو ایک سو پچیس سال سے زاید عرصے سے ہزاروں عرب و عجم کے معتمد و مستند علماے اہلِ سُنّت حقیقی دینِ اسلام اور سُنّیت و حنفیت جانتے اور مانتے رہے اور مسلکِ اعلیٰ حضرت کہنے پر فخر فرماتے رہے۔ اب اہلِ سُنّت کے چند اکابر و اساطین کے مسلکِ اعلیٰ حضرت پر تاثرات اور اقرارِ حق ملاحظہ کیجیے:

تاج دارِ کچھوچھہ شریف: حضرت شیخ المشائخ سید شاہ علی حسین صاحب اشرفی میاں علیہ الرحمۃ والرضوان امامِ اہلِ سُنّت اعلیٰ حضرت رضی اللہ عنہ کے عہدِ مبارک میں جب کبھی ریل گاڑی سے بریلی شریف کے ریلوے اسٹیشن سے گزرتے تو احتراماً دست بستہ کھڑے ہوجاتے اور جب ٹرین بریلی شریف کی حدود سے گزرتی تو بیٹھتے۔ کسی نے عرض کیا، حضور آپ بریلی شریف کے حدود میں سے گزرتے ہوئے کھڑے کیوں ہوجاتے ہیں؟

حضرت شیخ المشائخ علیہ الرحمہ نے فرمایا، جب ایک نائب رسول، ایک آلِ رسول کی تعظیم کے لیے کھڑا ہے تو آلِ رسول کیوں نہ نائبِ رسول کی تعظیم کے لیے کھڑا ہو، نیز فرمایا، میرا مسلک شریعت و طریقت میں وہی ہے جو حضور پُرنور اعلیٰ حضرت مولانا شاہ احمد رضا خاں صاحب بریلوی کا ہے۔'' (ماہ نامہ سُنّی آواز، ناگپور، مئی جون ۱۹۹۷ء)

حضرت محدث اعظم ہند کچھوچھوی: جس مہینہ میں اللہ تعالیٰ کا ایک مقبول بندہ اور رسولِ پاک کا سچا نائب، علم کا جبلِ شامخ اور عملِ صالح کا اسوۂ حسنہ، معقولات میں بحرِ ذخار، منقولات میں دریاے ناپیدا کنار، اہلِ سُنّت کا امام واجب الاحترام، اس صدی کا باجماعِ عرب و عجم مجدد، تصدیقِ حق میں صدیقِ اکبر کا پَرتو، باطل کو چھانٹنے میں فاروقِ اعظم کا مظہر، رحم و کرم میں ذوالنورین کی تصویر، باطل شکنی میں حیدری شمشیر، فقہ و درایت میں امیرالمؤمنین اور سلطنتِ قرآن و حدیث کا مسلم الثبوت وزیر المجتہدین، اعلیٰ حضرت علی الاطلاق امامِ اہلِ سُنّت فی الآفاق مجددِ مأتہ حاضرہ، مؤیدِ ملّتِ طاہرہ اعلم العلما عند العلما، قطب الارشاد بلسان الاولیا مولانا و اولانا فی جمیع الکمالات، فنا فی اللہ والباقی باللہ عاشقِ کامل رسول اللہ مولانا الشاہ احمد رضا رحمۃ اللہ علیہ و رضی اللہ تعالیٰ

عنہ ورضاہ عنا۔

جب تکمیلِ درسِ نظامی و درسِ حدیث کے بعد میرے مربّیوں نے کارِ افتا کے لیے اعلیٰ حضرت کے حوالے کیا، زندگی کی یہی گھڑیاں میرے لیے سرمایۂ حیات ہوگئیں اور محسوس کرنے لگا کہ آج تک جو کچھ پڑھا تھا، وہ کچھ نہ تھا اور اب دریائے علم کے ساحل کو پالیا ہے۔ علم کو راسخ کرنا اور ایمان کو رگ و پے میں اُتارنا اور صحیح علم دیکر نفس کا تزکیہ فرما دینا، اعلیٰ حضرت کی وہ کرامت تھی جو ہر منٹ میں صادر ہوتی رہتی تھی۔

ہم کو اور ہمارے ساتھ سارے علمائے عرب و عجم کو اعتراف ہے کہ یا حضرت شیخ محقق مولانا عبدالحق محدث دہلوی یا حضرت بحرالعلوم فرنگی محلی یا پھر اعلیٰ حضرت کی زبان وقلم نقطہ برابر خطا کرے اس کو ناممکن فرمادیا۔

(مجددِ اعظم، از محدّث اعظم بحوالہ ماہ نامہ سُنّی آواز مئی جون ۱۹۹۷ء)

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا کی ذات اور آپ کے مسلکِ حق پر حضرت محدث اعظم ہند علیہ الرحمہ کا عظیم اعتراف حق ہے۔

''مسلک کا لغوی معنی راستہ کا ہے، مسلک قاعدہ اور دستور کے معنی میں بھی آتا ہے۔ تو مسلکِ اعلیٰ حضرت کے معنی ہوئے، اعلیٰ حضرت کا راستہ، یا راہِ اعلیٰ حضرت یا قاعدۂ اعلیٰ حضرت یا طریقۂ اعلیٰ حضرت۔ لہٰذا مذکورہ معنوں میں سے کسی بھی معنی کے اعتبار سے مسلکِ اعلیٰ حضرت کہنے میں کوئی شرعی ممانعت یا قباحت نہیں اور اس کے منع پر قطعاً کوئی شرعی دلیل موجود نہیں۔ محض اتنا کہہ دینا کہ مسلکِ اعلیٰ حضرت نئی اصطلاح ہے، بلکہ مسلکِ امام اعظم ابوحنیفہ اور مسلکِ امام شافعی و مسلکِ امام حنبل و مسلکِ امام مالک کہا جاتا ہے، اس لیے مسلکِ اعلیٰ حضرت کہنا صحیح نہیں۔ یہ کوئی ممانعت کی شرعی دلیل نہیں، جس دلیل سے مسلکِ امام اعظم ابوحنیفہ کہنا جائز ہے، اسی دلیل سے مسلکِ اعلیٰ حضرت کہنا بھی جائز ہے۔ اگر کوئی کہے کہ مسلکِ اعلیٰ حضرت، مسلکِ امام اعظم سے بڑھ کر ہے؟ مسلکِ اعلیٰ حضرت کے بجائے مسلکِ امام اعظم ہی کیوں نہ کہا جائے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس قسم کا اعتراض پہلے دیوبندی یا وہابی غیر مقلدین یا دوسرے فرقہائے باطلہ کیا کرتے تھے۔ ان کا دیکھا دیکھی اب بعض نادان سُنّی بھی کرنے لگے ہیں تو پھر یہ اعتراض بھی قائم ہوگا کہ مسلکِ امام اعظم یا مسلکِ امام شافعی کیوں کہتے ہو؟ کیا مسلکِ صدیق اکبر یا مسلکِ فاروق اعظم کافی نہیں؟ کیا مسلکِ امام اعظم یا مسلکِ حنفی، مسلکِ صدیق اکبر یا مسلکِ فاروق اعظم سے زیادہ ہے؟ بہر حال اس وہمی و خیالی دلیل میں کچھ وزن نہیں۔ نہ مسلکِ امام اعظم، مسلکِ صدیق اکبر سے جدا وعلیحدہ ہے نہ مسلکِ اعلیٰ حضرت، مسلکِ امام

اعظم سے جدا ہے تو پھر وہ معترض ہوتے ہیں کہ پھر مسلکِ امام اعظم ابو حنیفہ ہی کیوں نہ کہا جائے؟ تو ہم عرض کریں گے کہ اس دَور میں دیو بندی وہابی بھی حنفی کہلاتے ہیں، تبلیغی وہابی، الیاسی بھی حنفی کہلاتے ہیں، اکثر مودودی بھی حنفی کہلاتے ہیں۔ حتیٰ کہ قادیانی بھی حنفی کہلاتے ہیں، ندوی، نیچری بھی حنفی کہلاتے ہیں، خدا جانے کتنی نسلوں کے بدمذہب بھی حنفی کہلاتے ہیں۔ سیدنا اعلیٰ حضرت مجددِ دین وملت رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا ۔

سُنّی حنفی اور چشتی بن بن کے بہکاتے یہ ہیں

ثابت ہوا بے شمار بدمذہب و باطل فرقوں نے حنفیت کو بطور جال اور دامِ تزویر کے استعمال کیا ہے، لہٰذا حقیقی سُنّیت اور اصلی حنفیت کا خصوص و امتیاز برقرار رکھنے کے لیے مسلّم ومعتمد اکابر اہلِ سُنّت و اعاظم مشائخ طریقت نے مسلکِ اعلیٰ حضرت کا استعمال شروع کیا اور اب یہ خالص سُنّیت، اصلی حنفیت کا علامتی نشان بن گیا۔ اور اس اصطلاحِ مسلکِ اعلیٰ حضرت کی افادیت و اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے، ورنہ ہر بدمذہب و ہر بدعقیدہ و مصنوعی اور بناسپتی حنفی خود کو حنفی بنا کر امام وخطیب اور ہمارے مدرسوں میں مدرس و شیخ الحدیث بن جائے گا۔ ایسے نازک دور میں جبکہ آنکھ سے کاجل صاف چرالیں یاں وہ چور بلا کے ہیں، کا تقاضا ہوا کہ محض کسی کے سُنّی اور حنفی کہلانے کا اعتبار نہ کریں۔ اب مسلکِ اعلیٰ حضرت کی سند چلے گی، اس کا سُنّی حنفی ہونے کے ساتھ بریلوی مسلک کے حامل ہونے کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ اگر کوئی مکاری، عیاری اور کیادی سے خود کو حنفی سُنّی کہلاتا ہے تو اس کی مصنوعی سُنّیت حنفیت کو ننگا و بے نقاب کرنے کے لیے مسلکِ اعلیٰ حضرت یا بریلوی مسلک کی سند کام دے گی۔ اس لیے مسلکِ اعلیٰ حضرت گذشتہ سوا سو سال سے جاری ہے۔ جب ہم کسی سے اس کا مسلکِ اعلیٰحضرت پر ہونا دریافت کریں گے تو اس کا مطلب یہی ہوگا کہ تم مسلکِ اہلِ سُنّت کے راستہ پر گامزن ہو؟“

(ماہ نامہ سُنّی آواز ناگپور، جولائی وستمبر ۱۹۹۷ء، ص ۴۲ تا ۴۴)

صدر الافاضل مراد آبادی علیہ الرحمۃ: حضرت صدر الافاضل مولانا سید شاہ محمد نعیم الدین صاحب مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ کی ذات کے بارے میں ہفت روزہ سواد اعظم لاہور، حیات صدر الافاضل میں ہے۔ بلاشبہ مسلک سیدنا امام اہلِ سُنّت مجددِ دین وملّت کی ترویج و اشاعت میں جو حصہ حضرت صدر الافاضل رحمۃ اللہ علیہ کو حاصل ہے، وہ آپ کی تالیفات و تصنیفات سے ظاہر ہے۔ ہمیں باوثوق ومعتمد علیہ روایات پہنچی ہیں کہ بار بار حضرت صدر الافاضل رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا، ”ہمیں مجدد اعظم سیدنا اعلیٰ حضرت رضی اللہ عنہ کے آستانۂ قدسیہ سے حقیقت میں ایمان ملا، سیدنا اعلیٰ حضرت کا ملک وملّت و سوادِ اعظم پر احسانِ عظیم ہے کہ آپ نے ہمیں ایمان و کلمے کی چاشنی سے روشناس

فرمایا" یہ نہایت آبدیدہ ہو کر ارشادہ فرماتے۔ تحقیقاتِ سیدنا اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ پر صدر الافاضل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو آپ کے ارشادات پر اس قدر اعتماد و وثوق تھا، ارشاد فرماتے ہیں: ایک بار سیدنا مجدّد اعظم اعلیٰ حضرت رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا، فقہ مجھے علامہ ابن عابدین سے حاصل ہوئی تو ہم نے اسے تواضع پر محمول کیا، اس لیے کہ ہماری نگاہ میں سیدنا اعلیٰ حضرت قدس سرہ کی تحقیقاتِ عالیہ علامہ شامی کی تحقیقات سے عالی و بلند تر ہیں۔"

(حیاتِ صدر الافاضل، ص۲۶۱ و ہفت روزہ سواد اعظم لاہور جون ۱۹۵۹ء جلد ۲ نمبر ۲۳۔۲۴ ص ۴۱ بحوالہ ماہ نامہ سُنّی آواز ناگپور جولائی تا ستمبر ۱۹۹۷ء، ص ۴۹)

سُنّی کی تعریف میں مسلک اعلیٰ حضرت کی شرط: تقسیمِ ملک سے قبل جب آل انڈیا سُنّی کانفرنس کا قیام عمل میں آیا تو (۱) صدر الشریعہ حضرت مولانا محمد امجد علی صاحب اعظمی رضوی مصنف بہارِ شریعت (۲) مفتیِ اعظم ہند مولانا شاہ مصطفیٰ رضا خاں صاحب بریلوی، سجادہ نشین آستانہ عالیہ رضویہ بریلی شریف (۳) صدر الافاضل مولانا محمد نعیم الدین صاحب مراد آبادی (۴) رئیس المتکلمین مولانا سید ابوالحامد سید محمد صاحب محدث اعظم ہند (۵) امیر ملت پیر جماعت شاہ صاحب، محدث علی پوری (۶) مبلغ اسلام مولانا عبدالعلیم صاحب صدیقی میرٹھی (۷) محدث اعظم پاکستان مولانا سردار احمد صاحب (۸) علامہ ابوالحسنات سید محمد احمد قادری (۹) مولانا ابوالبرکات سید احمد قادری (۱۰) افتخار العلما حضرت مفتی محمد عمر صاحب نعیمی مراد آبادی جیسے کثیر تعداد میں مشائخ طریقت شامل تھے۔ آل انڈیا سُنّی کانفرنس کے جلیل القدر اکابر نے سُنّی کی تعریف کی تھی وہ یہ ہے۔

سُنّی کی تعریف اور مسلک اعلیٰ حضرت: "سُنّی وہ ہے جو ما انا علیہ واصحابی کا مصداق ہو۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ائمہ دین، خلفاے راشدین، مسلّم مشائخ طریقت اور متاخرین علما میں سے حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی، حضرت ملک العلما مولانا بحر العلوم فرنگی محلی، حضرت فضل حق خیر آبادی، حضرت مولانا مفتی شاہ فضل رسول بدایونی، حضرت مولانا مفتی ارشاد حسین رامپوری، اعلیٰ حضرت مولانا مفتی شاہ احمد رضا خاں صاحب بریلوی رحمہم اللہ تعالیٰ عنہم کے مسلک پر ہو۔"

(قرطاسِ رکنیت آل انڈیا سُنّی کانفرنس و حیاتِ صدر الافاضل ص ۱۸۱۔۱۸۲ بحوالہ سُنّی آواز مذکور ص ۵۱)

ملاحظہ ہو اس میں نہ صرف مسلکِ اعلیٰ حضرت بلکہ مسلکِ شیخ عبدالحق محدث دہلوی و مسلکِ مولانا بحر العلوم فرنگی لکھنوی، مسلکِ مولانا فضلِ رسول بدایونی وغیرھم کا بھی ذکر ہے۔ یہ تمام اکابر اہلِ سُنّت کا متفقہ فیصلہ و متفقہ مرتبہ قرطاسِ رُکنیت تھا۔ (بحوالہ سُنّی آواز مذکور)

مبلغ اسلام مولانا شاہ عبدالعلیم صاحب میرٹھی: خلیفۂ اعلیٰ حضرت مبلغ یورپ

وایشیا و افریقہ حضرت مولانا الشاہ عبدالعلیم صاحب صدیقی میرٹھی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق ان کے فرزند مولانا شاہ احمد نورانی میاں نے ۱۳۹۷ھ کے عرس امجدی کے موقع پر دارالعلوم امجدیہ کراچی کے جلسۂ عام میں بتایا کہ میرے والدگرامی مبلغ اسلام مولانا شاہ عبدالعلیم صاحب صدیقی میرٹھی کی ایک نصیحت میرے پاس موجود ہے۔ فرمایا، ''الحمد للہ میں مسلکِ اہلِ سُنّت پر زندہ رہا اور مسلکِ اہلِ سُنّت وہی ہے جو مسلکِ اعلیٰ حضرت، جو اعلیٰ حضرت کی کتابوں میں مرقوم ہے اور الحمدللہ اسی پر میری عمر گزری اور الحمدللہ آخری وقت اسی مسلک (اعلیٰ حضرت) پر حضور پُرنور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے قدم مبارک میں خاتمہ بالخیر ہو۔'' (ماہ نامہ ترجمانِ اہلِ سُنّت کراچی ذی الحجہ ۱۳۹۷ھ و ماہ نامہ سُنّی آواز ناگپور، ستمبر اکتوبر ۱۹۹۵ء و جولائی تا ستمبر ۱۹۹۷ء)

امیر ملت و نبیرۂ امیر ملت: نبیرۂ امیر ملت پیر سید جماعت علی شاہ صاحب محدث علی پوری، حضرت مولانا صاحبزادہ پیر سید اختر حسین صاحب علی پوری۔ ایک مرتبہ حضرت مولانا مفتی ظفر علی صاحب نعمانی رضوی مہتمم دارالعلوم امجدیہ کراچی کی سانگلہ ہل کی قیام گاہ پر تشریف فرما تھے۔ فقیر راقم الحروف محمد حسن علی رضوی بریلوی سے گفتگو کے دوران فرمایا، ''میرا (یعنی پیر سید اختر حسین صاحب علی پوری) اور جدِّ محترم حضرت محدث علی پوری رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک وہی ہے جو اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خاں صاحب بریلوی کا ہے۔'' (ماہ نامہ رضائے مصطفیٰ، گوجرانوالہ بحوالہ ماہ نامہ سُنّی آواز جولائی تا ستمبر ۱۹۹۷ء، ص ۵۲)

حضرت محدث اعظم پاکستان: فخر الاماثل حضرت علامہ مولانا محمد حسن علی صاحب میلسی مدظلہ العالی تحریر فرماتے ہیں۔ حضرت علامہ ابوالفضل مولانا شاہ محمد سردار صاحب قادری چشتی رضوی محدث بریلوی قدس سرہ نے راقم الحروف فقیر قادری محمد حسن علی الرضوی کے نام بیشتر مکاتیب میں مسلکِ اعلیٰ حضرت مذہب اہلِ سُنّت پر مضبوطی سے قائم رہنے کی تلقین فرمائی۔ حضرت ممدوح کے ایک سو کے قریب اہم خطوط فقیر کے پاس محفوظ ہیں۔ جن میں مذہب اہلِ سُنّت مسلکِ اعلیٰ حضرت پر مضبوطی سے قائم رہنے کی دعا فرمائی گئی ہے۔ حضرت سیدی محدث اعظم پاکستان قدس سرہ نے اپنے شجرۂ قادریہ رضویہ چشتیہ صابریہ میں ضروری ہدایات کے ذیل میں فرمایا، ''امام اہلِ سُنّت مجدد دین و ملت اعلیحضرت عظیم البرکت مولانا شاہ احمد رضا خان صاحب قدس سرہ العزیز کے مسلک پر مضبوطی سے قائم رہیں ان کا مسلک مذہب اہلِ سُنّت و جماعت ہے۔''

(شجرۂ مبارکہ محدثِ اعظم پاکستان ص ۲۲ و کتاب محدثِ اعظم پاکستان ص ۱۰۰، جلد دوم بحوالہ ماہ نامہ سُنّی آواز ناگپور جولائی تا ستمبر ۱۹۹۷ء)

مفتیِ اعظم دھلی: حضرت علامہ الحاج مفتی محمد مظہر اللہ صاحب نقشبندی شاہی امام وخطیب جامع مسجد فتح پوری دہلی رحمۃ اللہ علیہ، فقیر راقم الحروف محمد حسن علی الرضوی غفرلہ کے نام اپنے ایک اہم مکتوب گرامی میں ارقام فرماتے ہیں۔ ''اعلیٰ حضرت قدس سرہ کے مسلک وتحقیقات میں کس کا زہرہ ہے کہ جرأتِ لب کشائی کر سکے۔'' (بحوالہ ماہ نامہ سُنّی آواز ناگپور جولائی تا ستمبر ۱۹۹۷ء)

شیخ المشائخ شعیب الاولیا: حضرت مولانا صوفی شاہ محمد یار علی صاحب قدس سرہ براؤں شریف مدت العمر اعلیٰ حضرت امام اہلِ سُنّت کے مسلک حق کی تبلیغ واشاعت فرماتے رہے۔ وہ اصول وفروعات میں مسلکِ اعلیٰ حضرت پر تھے۔ تیس سال سے زاید سے آپ کے آستانۂ عالیہ اور دارالعلوم فیض الرسول براؤں شریف ضلع سدھارتھ نگر یوپی سے رسالہ فیض الرسول جاری ہے جس کی پیشانی پر لکھا ہوتا ہے، ''مذہب اہلِ سُنّت کا ترجمان، مسلکِ رضویت کا نقیب۔''

(بحوالہ ماہ نامہ سُنّی آواز ناگپور جولائی تا ستمبر ۱۹۹۷ء)

مفتی پاکستان علامہ ابوالبرکات: مولانا سید احمد قادری کے فقیر (علامہ حسن علی صاحب میلسی) کے ایک جواب میں ارشاد فرماتے ہیں، ''تعجب ہے کہ اعلیٰ حضرت امام اہلِ سُنّت بریلوی قدس سرہ کا فتویٰ ہوتے ہوئے فقیر سے استفسار کیا جا رہا ہے۔ فقیر کا اور فقیر کے آبا واجداد (باپ، دادا) کا وہی مسلک ہے جو اعلیٰ حضرت قدس سرہ کا ہے۔''

(ماہ نامہ سُنّی آواز ناگپور ستمبر اکتوبر ۱۹۹۵ء ص ۳۳ و ماہ نامہ رضوان لاہور اپریل ۱۹۹۶ء ص ۱۹)

دینِ حق مذہب اہلِ سُنّت مسلکِ اعلیٰ حضرت پر استقامت علامہ ابوالبرکات سید احمد قادری رضوی اشرفی کا طرۂ امتیاز تھا۔ (ماہ نامہ رضوان اپریل ۱۹۹۶ء ص ۱۹ بحوالہ ماہ نامہ سُنّی آواز ناگپور، جولائی وستمبر ۱۹۹۷ء ص ۵۶)

حضرت محدث امروھوی کاظمی: علامہ قاری سید محمد خلیل کاظمی امروہوی پیر ومرشد واستاذ محترم حضرت علامہ سید احمد سعید کاظمی انوار العلوم ملتان شریف، فرماتے ہیں، ''فقیر کا مسلک ان دونوں مسئلوں میں یعنی ریڈیو کے اعلان کے حجتِ شرعیہ نہ ہونے میں اور لاؤڈ اسپیکر پر نماز نہ ہونے میں اعلیٰ حضرت قدس سرہ کے مسلک کے بالکل موافق ہے، طوالت کی ضرورت نہیں ملخصاً۔''

(ماہ نامہ نوری کرن، بریلی شریف دسمبر ۱۹۶۷ء بحوالہ ماہ نامہ سُنّی آواز جولائی تا ستمبر ۱۹۹۷ء)

صدر الافاضل و شیر بیشۂ اهلِ سُنّت: حضرت صدر الافاضل مولانا محمد نعیم الدین مراد آبادی اور حضرت شیر بیشۂ اہلِ سُنّت مولانا محمد حشمت علی خان صاحب قدس سرہما نے دارالعلوم حزب الاحناف لاہور میں مندرجہ ذیل تحریر ودستخط فرما کر مسلکِ اعلیٰ حضرت کی تائید وحمایت فرمائی، وہ تحریر یہ

ہے:

"بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم نحمدہ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم، سُنّی وہ ہے جو ما انا علیہ و اصحابی کا مصداق ہو۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ائمۂ دین، خلفائے راشدین، مسلّم مشائخ طریقت اور متاخرین علما میں سے حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی، حضرت ملک العلما مولانا بحرالعلوم لکھنوی، حضرت مولانا فضل حق خیر آبادی، مولانا فضل رسول بدایونی، شیخ الاسلام والمسلمین حجۃ اللہ علی الارضین حضور پر نور سیدنا اعلیٰ حضرت عظیم البرکت امام اہلِ سُنّت مجدد دین و ملت مولانا شاہ عبدالمصطفیٰ احمد رضا خاں صاحب قادری برکاتی بریلوی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مسلک حق پر ہو۔ ملخصاً۔"

(ماہ نامہ رضوان اپریل ۱۹۶۶ء، ص ۲۳۔ بحوالہ ماہ نامہ سُنّی آواز جولائی تا ستمبر ۱۹۹۷ء)

فقیہہ اعظم محدّث کوٹلوی و امام العلما مولانا امام الدین: کے متعلق ماہ نامہ "ماہِ طیبہ" میں آخری وصیت میں مسلکِ اعلیٰ حضرت سے وابستگی ظاہر کی گئی اور حضرت مولانا محمد امام الدین صاحب کوٹلوی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق یہ الفاظ ہیں، فرمایا بشیر مجھ سے مصافحہ کرلو، مَیں اب جانے والا ہوں اور میری تمہارے لیے دعا ہے۔ دیکھو تمہارے والد فقیہہ اعظم رحمۃ اللہ علیہ اور تمہارے تایا حضرت مولانا محمد عبد اللہ قادری رضوی اور مَیں عمر بھر اعلیٰ حضرت بریلی شریف والوں کے مسلک کی تبلیغ کرتے رہے، تم بھی اسی مسلک (اعلیٰ حضرت) پر قائم رہنا، خدا تمہاری مدد فرمائے گا۔

(ماہ نامہ ماہِ طیبہ کوٹلی لوہاراں، اکتوبر ۱۹۶۱ء ص ۵۰، بحوالہ ماہ نامہ سُنّی آواز ناگپور جولائی تا ستمبر ۱۹۹۷ء)

مذکورہ بالا مسلّم اکابر اہلِ سُنّت کے علاوہ اور بہت سے اکابر کرام نے مسلکِ اعلیٰ حضرت امام اہلِ سُنّت سے اتفاق فرمایا اور مسلکِ اعلیٰ حضرت کی اصطلاح کوئی بچوں کی رائج کی ہوئی نہیں ہے بحمدہ تعالیٰ اکابرِ اہلِ سُنّت کی اکثریت مسلکِ اعلیٰ حضرت ہے۔

سائنسیات میں
امام احمد رضا کی فکری تنقید: مختصر جائزہ

ڈاکٹر امجد رضا امجد، ایڈیٹر رضا بک ریویو، پٹنہ

امام احمد رضا نے اعتقادیات و شرعیات اور ادبیات و سیاسیات کے ساتھ سائنسیات میں بھی اپنی فکری تنقیدوں کے جو اثاثے چھوڑے ہیں وہ یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ وہ ایک بہت بڑے سائنس داں تھے اور سائنسیات پر ان کا مطالعہ وسیع اور بڑا گہرا تھا۔ انہوں نے اپنے تنقیدی سرمایے میں فکری تنقید کا جو نمونہ چھوڑا ہے وہ اس رخ سے بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ انہوں نے تنقیدی عمل کے دوران ''کون ہے'' کی بجائے ''کیا ہے'' کو پیش نظر رکھا ہے۔ پیش نظر رسالہ ''نزولِ آیاتِ فرقان بسکونِ زمین و آسمان'' میں جس شخصیت پر فکری تنقید کی گئی ہے، وہ اس کی واضح مثال ہے۔

مذکورہ رسالہ میں جس شخصیت کے سائنسی افکار پر امام احمد رضا نے تنقید کی ہے وہ آپ کے نیاز مندوں میں تھے، آپ سے عقیدت رکھتے تھے اور آپ کے نزدیک ان کی شخصیت ''مجاہد کبیر'' ہی نہیں ''مجاہد اکبر'' کہلانے کی مستحق تھی۔ اور وہ شخصیت تھی پروفیسر حاکم علی لاہوری کی، جو ایک ''فہیم سائنس داں'' کا درجہ رکھتے تھے۔ وہ صرف سائنس کے مضمون سے شغل و شغف رکھنے والے انسان ہی نہیں بلکہ دین سے محبت رکھنے والے، وسیع المطالعہ، حق پسند اور اپنے نفس سے جہاد رکھنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ خود ناقد یعنی امام احمد رضا کو اس بات کا اعتراف تھا کہ ''رجوع الی الحق'' کا مادّہ ان کے اندر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے مگر اس کے باوجود جو فکر ان کی طرف سے آئی وہ چونکہ اسلامی نظریے کے خلاف تھی۔ اس لیے ان کی فکر کو امام احمد رضا نے تنقید کی میزان پہ رکھا اور اپنے تنقیدی اصولوں کی روشنی میں اس کی حقیقت واضح کردی۔

اس رسالہ کو بخوبی سمجھنے کے لیے یہ پہلو سامنے رکھنا ضروری ہے کہ حرکتِ زمین کے تعلق سے تین طرح کے نظریات سامنے آئے ہیں۔

(۱) قدیم سائنس، یعنی سولہویں صدی عیسوی سے پہلے کا نظریہ کہ زمین ساکن ہے۔

(۲) جدید سائنسی نظریہ کہ زمین متحرک ہے۔

(۳) قرآنی نظریہ جو زمین و آسمان کو ساکن قرار دیتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ زمین و آسمان دونوں ساکن ہیں، کواکب چل رہے ہیں۔

سکونِ زمین کا یہ قرآنی نظریہ، کوئی اچھوتا، انوکھا اور نیا نظریہ نہیں بلکہ یہ وہی نظریہ ہے جسے قدیم سائنس بھی تسلیم کرتی تھی اور کوپرنیکس کا نظریہ سامنے آنے سے پہلے تک نصاریٰ بھی تسلیم کرتے تھے۔--- بہرحال قرآن اور جدید سائنس کے نظریے میں تضاد سامنے آنے کے بعد، اواخر انیسویں صدی میں، مذہب اور سائنس کے گوناگوں تصادم کو دور کرنے اور انھیں ایک دوسرے سے قریب لانے کی کاوشیں شروع ہوئیں کہ مذہب اور سائنس میں ٹکراؤ کی وہ صورت کچھ حقیقی نہیں جو عموماً تصور کی جاتی ہے۔ اسی سلسلے میں دیگر پہلوؤں کے ساتھ ساتھ یہ ذہن بھی اُبھرا کہ ''سائنس کو مسلمان'' بنایا جائے اور متصادم سائنسی اور قرآنی نظریوں میں مطابقت کی علمی صورتیں تلاش کی جائیں۔ اس کام کی بہرحال علمی اہمیت ہوسکتی تھی اور آج بھی ہے۔ لیکن اس تعلق سے دو نظریاتی جماعت سامنے آئی، ایک جماعت اس بات کی قائل ہوئی کہ دراصل مذہب اور سائنس کے نظریاتی تصادم کے نقصانات کو دور کرنے کے لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ

''سائنس کو جتنے اسلامی مسائل سے ...... خلاف ہے سب میں مسئلہ اسلامی کو روشن کیا جائے، دلائلِ سائنس کو مردود و پامال کر دیا جائے، جابجا سائنس ہی کے اقوال سے اسلامی مسئلہ کا اثبات، سائنس کا ابطال و اسکات ہو۔''

یہ دراصل امام احمد رضا کی سائنسی فکری تنقید کا نظریہ ہے اور اس کے بالمقابل دوسری جماعت جس کے سرخیل حاکم علی صاحب تھے، اس نظریے کی قائل ہوئی کہ ''اسلامی مسائل کو .... سائنس کے مطابق کرلیا جائے'' یعنی اگر سائنس حرکتِ زمین کا نظریہ رکھتی ہے تو تفاسیرِ قرآن کی روشنی میں یہ ثابت کیا جائے کہ قرآن بھی اسی نظریے کا حامی ہے، لہٰذا یہ سائنسی نظریہ اسلام مخالف نہیں، اسلام کا مؤید ہے۔

اپنے موقف کے اثبات کے لیے پہلے انہوں نے آیتِ کریمہ **ان اللّٰہ یمسک السمٰوٰت والارض ان تزولا، اولم تکونو اقسمتم من قبل مالکم من زوال،** اور **ان کان مکرھم لتزول منہ الجبال** میں لفظ تزولا، زوال، تزول پر تفسیر جلالین اور تفسیر حسینی کے حوالے سے بحث کرتے ہوئے اس کے مختلف معنیٰ بتائے اور پھر نتیجے کے طور پر یہ لکھا:

زمین کے زوال نہ کرنے کے یہ معنیٰ ہیں کہ جن اماکن میں اللہ تعالیٰ نے اس کو امساک کیا ہے اس سے یہ باہر نہیں سرک سکتی مگر ان اماکن میں اس کو حرکت امر کردہ شدہ عطا فرمائی ہوئی ہے... اسی طرح (زمین) اپنے مدار میں اور سورج کی ہم راہی میں امساک کردہ شدہ ہے ... جیسا کہ سورج **والشمس تجری لمستقر لھا** کے رو سے اپنے اماکن میں امساک کیا گیا ہے اور اپنے مجرا میں چل رہا ہے، مگر اس کے اس چلنے کا نام زوال نہیں بلکہ جریان ہے۔ تو زمین کا بھی اپنے مدار میں اور سورج

کی ہمراہی میں چلنا اس کا جریان ہے نہ کہ زوال۔

ظاہر ہے کہ مفکر سے بظاہر دلیل کے انتخاب اور نتیجہ نکالنے میں کوئی غلطی نہیں ہوئی ہے۔ بلکہ ایسا لگتا ہے کہ مفکر نے جو بات کہی ہے، اس کے لیے اپنی طرف سے نہ تو کسی من گڑھت دلیل کا سہارا لیا ہے اور نہ ہی جس مقصد کے لیے فکر کے عمل سے گذرا ہے، اس مقصد میں کوئی خرابی یا اس کے سوچ میں خلوص کی کوئی کمی ہے۔

لیکن درحقیقت اس فکر میں ایک سے زیادہ باتیں محلِ نظر اور قابلِ گرفت ہیں اور ایک سے زیادہ ایسے مقامات ہیں، جہاں فکر نے مختلف پہلو سے ٹھوکر کھائی ہے اور ایک ناقدِ فکر کی حیثیت سے امام احمد رضا نے اس کی نشاندہی کی ہے۔ مفکر کے خلوصِ نیت اور اس کے ہدفِ مقصد سے ناقد کو چنداں اختلاف نہیں لیکن حصولِ مقصد کے لیے استعمال کیا گیا ''طریق عمل'' ناقد کے نزدیک درست نہیں ہے۔ مفکر اگرچہ یہ چاہتا ہے کہ سائنس مشرف بہ اسلام ہو لیکن اس کے لیے جو طریقہ اپنایا گیا ہے، وہ بالکل ہی برعکس ہے۔ یعنی وہ جس چیز کو مسلمان کرنا چاہتا ہے، اسے اسلام کی طرف نہیں کھینچتا ہے بلکہ اسلام کو اس کی طرف کھینچ کر لانا چاہتا ہے جس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ بقول امام احمد رضا ''اسلام نے سائنس قبول کی نہ کہ سائنس نے اسلام''۔

اس رسالہ میں جو فکر سامنے آئی ہے اس کا منظر نامہ یہ ہے کہ سکونِ زمین و آسمان کا نظریہ جس آیت کریمہ سے لیا گیا ہے اس میں ''ان تـزولا'' کا لفظ آیا ہے یعنی قرآن پاک نے ''زوالِ ارض و سما'' کی نفی کی ہے جس سے زمین و آسمان کے سکون کا نظریہ بنا ہے اور مفکر نے لفظ زوال کے اصل مفہوم کو سمجھنے میں متعدد وجوہات سے دھوکہ کھایا ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں فکری ناقد ہونے کی حیثیت سے امام احمد رضا نے اس کی صاف صاف نشان دہی کر دی ہے کہ مفکر نے اپنی فکر کو باوزن کرنے کے لیے جو دلائل دیے ہیں، ان میں

(۱) کیا کیا اور کہاں کہاں دھوکہ ہوا ہے۔

(۲) کس طرح مفکر نے کھینچ تان کر حرکت کو زوال کے بجائے جریان کا نام دے دیا ہے۔

(۳) قرآن پاک نے جس چیز کو مطلقاً بیان کیا ہے، اسے مقید اور جسے عام رکھا ہے اسے مخصص بنا دیا ہے۔

مفکر کو ایک بڑا دھوکہ اس بات سے ہوا ہے کہ اس نے زوالِ آفتاب کا مفہوم سمجھنے یا اس کا مفہوم نکالنے میں غلطی کی ہے۔ اس فکر پر اپنی تنقید کا خلاصہ سپردِ قرطاس کرتے ہوئے امام احمد رضا نے لکھا:

''زمین ساکن محض ہے...... اور خود مخالفین کو تسلیم کے طلوب و غروب زوال نہیں مگر حرکتِ یومیہ سے، تو جس کے یہ احوال ہیں حرکتِ یومیہ اسی کی حرکت ہے، تو قرآن عظیم اور احادیثِ متواترہ و

اجماعِ اُمت سے ثابت کہ حرکتِ یومیہ حرکتِ شمس ہے نہ کہ حرکتِ زمین۔ لیکن اگر زمین حرکت محوری کرتی، تو حرکتِ یومیہ اسی کی حرکت ہوتی، جیسا کہ مزعوم مخالفین ہے۔ تو روشن ہوا کہ زعم سائنس باطل و مردود ہے، پھر شمس کی حرکتِ یومیہ جس سے طلوع و غروب و زوال ہے نہ ہوگی، مگر یوں کہ وہ گردِ زمین دورہ کرتا ہے تو قرآن عظیم اور احادیث و اجماعِ اُمت سے ثابت ہوا کہ آفتاب حول ارض دائر ہے۔ لاجرم زمین مدارِ شمس کے جوف میں ہے تو ناممکن ہے کہ زمین گردشِ دورہ کرلے اور آفتاب مدارِ زمین کے جوف میں ہو تو بحمداللہ تعالیٰ آیاتِ متاکاثرہ و احادیثِ متواترہ و اجماعِ اُمتِ طاہرہ سے واضح ہوا کہ زمین کی حرکت محوری و مداری دونوں باطل ہے۔"

اس رسالہ میں امام احمد رضا نے متعدد آیات، احادیث، اقوال اور کتب لغات کے حوالے سے بحث کرتے ہوئے مفکر کے ہر اعتراض، شبہات اور دلیل کا سنجیدگی، متانت اور علمی انداز میں جائزہ لیتے ہوئے اسلام مخالف سائنسی نظریات کے بالمقابل اسلامی نظریۂ سائنس کو واضح کردیا ہے۔ یہاں تفصیل کی گنجائش نہیں۔ اس کی مدلل بحث میرے تحقیقی مقالہ "امام احمد رضا کی فکری تنقیدیں" میں آرہی ہے۔

اس مقام تک پہنچ کر ایک فکری ناقد کی حیثیت سے امام احمد رضا بریلوی کے ان کارناموں کا مرتبہ سمجھنا چنداں دشوار نہیں، جن کا رشتہ سائنسیات سے ہے۔ ان کی سائنسی فکری تنقید کا یہ بڑا وصف ہے کہ وہ ایسی قوتِ شناخت سے پوری طرح مالا مال نظر آتی ہے جس سے تنقید کا دبستان خالی نظر آتا ہے۔ ان کا تنقیدی اصول، مذہبیات و اسلامیات اور ادبیات ولسانیات کی علمی و اصولی قدروں کو سائنس کے نام نہاد حامیوں اور مفکروں کے ہاتھوں کا کھلونا بننے سے بچالیتا ہے اور یقیناً یہ اردو تنقید کے لیے بڑا سرمایہ ہے۔

سائنسیات میں امام احمد رضا کی فکری تنقید کا ایک روشن وصف یہ بھی ہے کہ پڑھنے والے کی عقل اور معلومات میں اضافہ کرتی اور معلوماتِ عامہ کا دل چسپ خزانہ مہیا کردیتی ہے۔ مثلاً اسی رسالہ میں فکری تنقیدات کے دوران ایک عبارت آتی ہے "دھوپ گھڑی کو مزولہ کہتے ہیں یعنی زوال پہچاننے کا آلہ" اور یہ دل چسپ موضوع ہمیں غور وفکر کے لیے ملتا ہے کہ اگرچہ جدید سائنس نے حرکتِ زمین کا نظریہ لا دیا ہے یعنی اس نظریہ کی رو سے زمین زوال کرتی ہے لیکن قدیم نظریہ کے مطابق آج بھی زوال آفتاب ہی بولا جاتا ہے۔ امام احمد رضا نے سائنسی فکری تنقید کے دوران یہ بات بھی لکھی ہے کہ "یوروپ والوں کو طریقۂ استدلال نہیں آتا، انھیں اثباتِ دعویٰ کی تمیز نہیں، ان کے اوہام جن کو وہ بنام دلائل پیش کرتے ہیں یہ یہ علتیں رکھتے ہیں" اور اپنی فکری تنقید میں اس کے واضح ثبوت بھی پیش کردیے ہیں۔

ooooo

عصرِ حاضر میں فکرِ رضا کی معنویت

مولانا شاہ محمد فصیح الدین نظامی
مہتمم کتب خانہ جامعہ نظامیہ حیدرآباد

اسلام کا نظامِ عقل و دانش پر مبنی ہے اور حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام حکمت و دانش کو بالعموم کلامِ الٰہی سے وابستہ کر کے مطالعہ کیا جاتا ہے۔ معلمِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں دانش وری کے ایسے جوہر پائے جاتے ہیں جن کی نظیر پیش کرنے سے انسانی تاریخ قاصر ہے۔

ایسا نہیں کہ پہلی آسمانی کتابوں میں علم وحکمت اور فکر و دانش کی تعریف نہیں ملتی لیکن قرآن حکیم وہ آسمانی کتاب ہے جس میں سوچنے اور غور کرنے کی پُرزور حمایت کی گئی ہے۔ قرآن حکیم نے مظاہر فطرت، تہذیب وتمدن، مقصدِ تخلیق، اساطیر الاولین کا اس انداز میں تذکرہ کیا ہے جس سے غور وفکر کو زبردست تحریک ہوتی ہے اور ہر جگہ یہ ذکر دعوتِ غور وفکر ہے۔ تفکر، تدبر، تعقل قرآن کے کلیدی الفاظ ہیں، جن کی پُرزور اور پُر تاثر تلقین پورے قرآن میں جاری وساری ہے۔

فکر انسان کی امتیازی صفت ہے۔ فکر ہی انسانی حقیقت کی فصلِ ممیز ہے۔ فکر ہی سے علم و معرفت کے باب وا ہوتے ہیں۔ فکر ہی انسان کی ظاہری و باطنی قوتوں کی امام اور سربراہ ہے۔ اگر فکر اسلام میں مطلوب نہ ہوتی تو اجتہاد کا دروازہ مسدود ہوجاتا اور شرائع فرعیہ اُمت کے سامنے نہ آسکتیں۔ فکر و تدبر، چشمِ بینا اور گوش شنوا کا کام نہیں بلکہ قلبِ متفکر کا کام ہے اور اسی فکر کو فقہ قلبی، لب عرفانی، نظر باطنی اور بصیرت سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس لیے یہ قوتِ فکر نہ صرف یہ کہ انسان کی خصوصیت ہے جو اس کی ماہیت کا سرنامہ ہے۔ بلکہ مجددین ومفکرین چونکہ اسی صفتِ خاص کے حامل ہوتے ہیں، اس لیے کارِ تجدید انہیں کے سپرد کیا جاتا ہے۔ انہیں سے افکار کی تطہیر اور اعمالِ صالحہ کا فروغ ہوتا ہے۔ تربیت کا مرحلہ بڑا اہمیت کا حامل ہوتا ہے، اس لیے تربیت کا سب سے بڑا ماخذ شخصیت ہوتی ہے، کاغذ اور نوشتے نہیں۔ کیوں کہ ایک صحیح الفکر اور صحیح المنہاج مربی، معلم ومفکر ہی صحیح رہنمائی کرسکتا ہے۔ ورنہ ذہنی مزاج زیغ ہی سے بھردے گا۔ امام احمد رضا چودہ سو سالہ اسلامی تاریخ کے وہ عظیم محقق ومفکر ومصلح ہیں جن کے قرآنی، عرفانی، فقہی، سیاسی، تعلیمی، اقتصادی، معاشی، معاشرتی، عمرانی، تہذیبی، تمدنی، ادبی، انسانی، اخلاقی، سماجی افکار وخیالات نے نہ صرف یہ کہ انقلاب بپا کیا بلکہ شکوک وشبہات کے گرداب

سے نکال کر قلوب و اذہان کو طمانیت و سکینت سے ہم کنار کیا۔ انہوں نے منابع اسلامی سے کسب نور کر کے اتنا کچھ زیب قرطاس کیا ہے جس کی ربع مسکون کے باشندوں کو ضرورت لاحق تھی۔ اس لیے فکرِ رضا کا محور ایک ہے لیکن اس کو کسی ایک نکتے پر مرکوز کر دینا فکرِ رضا کو محدود کر دینے کے مترادف ہوگا۔ فکرِ رضا نے ہر میدان میں جولانی دکھائی ہے اور اس کے لیے جو خاص طرزِ بیان و اظہار ایجاد کیا اور جس انداز میں اُمت کے ہمہ جہتی مسائل کا صرف مطالعہ نہیں بلکہ تنقیحی مطالعہ کیا اور اس کی تشریحات وتوضیحات میں مبدأ فیاضی کی جانب سے غیر معمولی ادراک اور وافر حصہ عطا کیا گیا تھا بلاشبہ وہ انشراحِ صدر کی دولت سے مالا مال تھے، جس نے اسلامی تاریخ کو وسیع فضا مہیا کی۔

فکرِ رضا کی معنویت کے مطالعہ و جائزے سے پہلے آیئے عہدِ رضا کو دیکھا جائے کہ اس عہد کے بارے میں مؤرخین کیا کہتے ہیں۔ امام احمد رضا بریلوی (۱۲۷۲ھ/۱۸۵۶ء۔۱۳۴۰ھ/۱۹۲۱ء) کا دَور سیاسی اعتبار سے پہلے زوال اور پھر عروج کا زمانہ ہے، لیکن علمی، ادبی اور فکری لحاظ سے یہ دور مسلمانانِ ہند کا زرّین دور ہے۔ اس عرصے میں جتنی قد آور شخصیتیں افقِ ہند و پاک پر نمودار ہوئیں، بعد کے زمانوں میں ان کی مثال نہیں ملتی۔ حکیم عبدالحئی لکھنوی نے ''نزھۃ الخواطر'' میں علمائے ہند کا تذکرہ کیا ہے۔ ساتویں اور آٹھویں جلد میں تیرھویں اور چودھویں صدی کے علما کا تذکرہ ہے۔ ایک نظر ان جلدوں کے دیکھنے سے ہمارے بیان کی صداقت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

ابوالحسن علی ندوی، آٹھویں جلد کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

> ''اور اس جلد میں سابقہ تمام زمانوں کی نسبت حالاتِ علما کی کثرت اور رنگا رنگی میں زیادہ وسعت ہے اس میں بڑے بڑے علما، نابغۂ عصر مؤلفین، اجلہ مشائخ، تربیت دینے والے اربابِ قلوب، عظیم معلم، اصحابِ درس وتخریج ہیں، ان میں جدید فکر قائدین اور تحریکوں کے رہنما ہیں، ان میں ادبا ہیں، شعرا ہیں اور سیاسی معرکوں میں بے خطر کود جانے والے لیڈر ہیں۔''

(ابوالحسن علی ندوی، مقدمہ نزھۃ الخواطر جلد ۸، ص ۸، نور محمد کراچی)

فکر رضا اور ناموسِ رسالت:

بعض افراد پیدائشی طور پر جینئس (Genius) ہوتے ہیں۔ قدرتِ کاملہ انہیں حیرت انگیز صلاحیتیں عطا فرما کر دنیا میں بھیجتی ہے۔ بڑے بڑے عقلا ان کی صلاحیتوں کو دیکھ کر انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں۔ امام احمد رضا بھی ایسے ہی عبقری ہیں۔ اُن کی فکر کا منبع و سرچشمہ اللہ تعالیٰ اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں سرشاری تھا، کیوں کہ محبت وہ نازک اور لطیف جذبہ ہے جو محبوب کی شان میں

کسی توہین اور بے ادبی کو برداشت نہیں کرسکتا۔ امام احمد رضا کی وصیت کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

''جس سے اللہ و رسول کی شان میں ادنیٰ توہین پاؤ پھر وہ تمہارا کیسا ہی پیارا کیوں نہ ہو، فوراً اس سے علیحدہ ہوجاؤ، جس کو بارگاہِ رسالت میں ذرا بھی گستاخ دیکھو پھر وہ تمہارا کیسا ہی بزرگ معظم کیوں نہ ہو اپنے اندر سے اسے دودھ سے مکھی کی طرح نکال کر پھینک دو۔''

(مولانا حسنین رضا خان، وصایا شریف، ص ۱۹، مکتبہ اشرفیہ مرید کے)

ناموسِ رسالت کے تحفظ میں فکرِ رضا تہذیب و شائستگی کے ساتھ شمشیر بکف نظر آتی ہے مگر ان کے مخالفین ناموسِ اسلاف کی حفاظت میں تیغ براں لیے نظر آتے ہیں۔ دونوں کے طرزِ عمل میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

مسئلہ تکفیر اور فکر رضا:

''مسئلہ تکفیر میں فکرِ رضا یہ ہے کہ جن عبارات پر کفر کا فتویٰ لگایا گیا، وہ یقیناً نیک نفسی اور شرعی دیانت سے لگایا گیا تھا اور یہ کہ وہ ایسا کرنے پر مجبور تھے۔ کیوں کہ ان کے نزدیک یہ عبارات قابلِ تاویل ہرگز نہ تھیں۔''

(مقالاتِ یومِ رضا، ص ۱۵)

دعوائے ہمسری دنیائے توہب کی قدیم فکر ہے۔ اس کا ردّ فکرِ رضا آج بھی جس جذبے و والہانہ وارفتگی سے کرتی ہے، دیکھنے کے لائق ہے۔

آں یکے گویاں محمد آدمی ست — چوں من و دروی اورا برتریست
جز رسالت نیست فرقے درمیاں — من برادر خورد پاشم او کلاں
او نداند از عمٰی آنا سزا — یا خودست ایں ثمرۂ ختم خدا
کہ بود مرلعل را فضل و شرف — کے بود ہمسنگ او سنگ و خزف
واں دمے کز حلق مذبوحے جہد — کے بفضل مشک از فری رسد
ہے چہ گفتم ایں چنیں شبہ شنیع — کے بود شایان آں قدر رفیع
لعل چہ بود جوہرے یا سرخیے — مشک چہ بودن خون ناف و چشیے
مطصفیٰ نور جناب امرِ کن — آفتاب برج علم من لدن
معدن اسرار علام الغیوب — برزخ بحریں، امکان و وجوب

(امام احمد رضا بریلوی، حدائق بخشش، جلد ۲، ص ۸۸، مدینہ پبلشنگ کراچی بحوالہ اندھیرے

سے اجالے تک، محمد عبدالحکیم شرف قادری)

ترجمہ: ☆ ایک شخص کہتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم میری طرح آدمی ہیں، انہیں وحی میں مجھ پر برتری حاصل ہے۔

☆ رسالت کے علاوہ اور کوئی فرق نہیں، وہ بڑے بھائی ہوتے اور میں چھوٹا۔

☆ وہ نالائق، نابینائی کے سبب نہیں جانتا، یا یہ خدائی قہر کا نتیجہ ہے۔

☆ کہ سنگریزہ اور ٹھیکرا، فضیلت وشرافت میں لعل کا ہمسر کیسے ہوسکتا ہے؟

☆ وہ خون جو ذبیحہ کی شہ رگ سے نکلتا ہے وہ مشک اذفر کا ہم پایہ کیسے ہوسکتا ہے؟

☆ ہائے افسوس میں نے یہ نامناسب تشبیہ کیا بیان کردی، یہ اس شان بلند کے شایان شان کیسے ہوسکتی ہے۔

☆ مصطفیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم بارگاہِ الٰہی کا نور اور علم لدنی کے برج کا آفتاب ہیں۔

☆ علام الغیوب جل وعلا کے اسرار کی کان اور امکان و واجب کے دریاؤں کی حدِ فاصل ہیں۔

فکر رضا اور احکامِ شریعت:

عصرِ حاضر میں جب کہ انسان رغبتوں، خواہشوں، شہوتوں اور شریعتِ مطہرہ کی خلاف ورزیوں کا خوگر بنتا جارہا ہے، شریعت کو موخر اور طبیعت کو مقدم کررہا ہے۔ ایسے ناگفتہ بہ حالات میں فکرِ رضا ربطِ شریعت سے گوشہ ہائے حیات منور کرنے کا پیغام نظر آتی ہے۔

ہوں اپنے کلام سے نہایت محظوظ　　بے جا سے ہے المنۃ للہ محفوظ
قرآن سے میں نے نعت گوئی سیکھی　　یعنی رہے احکام شریعت ملحوظ

امام احمد رضا نے ان اشعار میں دعویٰ کیا ہے کہ انہوں نے احکامِ شریعت کو ملحوظ رکھا ہے اور کہیں ان سے روگردانی یا گریز کی راہ اختیار نہیں کی اور اگر تعصب کی عینک کے بغیر ان کی نثری اور منظوم تصانیف کا مطالعہ کیا جائے تو ان کا ایک ایک حروف اس دعویٰ کی دلیل نظر آتا ہے۔

(ماہ نامہ استقامت ڈائجسٹ جنوری ۱۹۸۲ء ربیع الآخر ۱۴۰۲ء کانپور)

فکر رضا اور عظمتِ سادات:

خانوادۂ امام احمد رضا آلِ رسول کی عظمت کا رازداں ہے۔ فکرِ رضا یہی ہے کہ ادب واحترام آلِ رسول کہیں بھی، کبھی بھی، کسی بھی زاویے سے ترک نہ ہونے پائے۔ یہاں صرف ایک واقعہ مولانا سید محامد جیلانی میاں کے حوالے سے زیب قرطاس کیا جاتا ہے:

''رضوی دارالافتا میں علما ومشائخ، اساتذہ وتلامذہ موجود ہیں، تلامذہ میں مفتی گجرات

حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب قبلہ بھی ہیں۔ اسی وقت ایک استفتا آتا ہے جس کا مفہوم ہے کہ کسی فاسق و فاجر چاہے وہ سید ہو، آلِ رسول ہی کیوں نہ ہو تعظیم و احترام کرنا چاہیے یا نہیں؟ اور جو شخص ایسے فاسق و فاجر آلِ رسول کی تعظیم و توقیر کرے، اس کے بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟ حجۃ الاسلام کا چہرہ متغیر ہوتا ہے اور انتہائی ذمہ دارانہ اور فقیہانہ و عاشقانہ لہجہ میں فرماتے ہیں کہ "عزیز الرحمٰن لکھ دو کہ ہم نسبت کا احترام کرتے ہیں اور نسبت کبھی فاسق و فاجر نہیں ہوتی۔"

(ماہ نامہ استقامت ڈائجسٹ شعبان المعظم ۱۴۰۴ھ ص ۱۱۷ کانپور)

فکر رضا اور قرآن:

"کنزالایمان" ایک ترجمۂ قرآن کے علاوہ امام احمد رضا کی قرآنی فکر کا آئینہ دار ہے، جہاں لسانی رویہ اپنی معراج پر نظر آتا ہے۔ ماہرین نے تسلیم کیا کہ کنزالایمان تنقیصِ خدا سے پاک ہے۔ یہ علوم و معارف کا خزانہ ہے، اس میں اہانت رسول نہیں ہے، یہ عشقِ خدا اور محبتِ رسول کا مرقع ہے۔ یہ کلامِ الٰہی کا صحیح اور بے عیب ترجمان ہے۔ امام احمد رضا کی قرآنی فکر کنزالایمان کی عظمت و اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے مشہور ماہ نامہ الحسنات، رامپور کا 'شخصیات نمبر' یوں رقم طراز ہے:

"یہ ترجمہ (کنزالایمان) اس حیثیت سے ممتاز نظر آتا ہے کہ چند آیاتِ قرآنی کے ترجمہ میں ذرا سی بے احتیاطی سے حق جل مجدہ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ اقدس میں بے ادبی کا شائبہ نظر آتا ہے۔ احمد رضا خان نے ان کے بارے میں خاص احتیاط برتی ہے۔"

("الحسنات" رامپور، شخصیات نمبر، ص ۵۴ بحوالہ ماہ نامہ استقامت ڈائجسٹ جنوری ۱۹۸۳ء)

فکر رضا اور تعلیم و تعلّم:

فکرِ رضا کا ایک پہلو تعلیم کا فروغ، مکاتب و مدارس کا پھیلاؤ، تدرس و تدریس کی چھاؤنیوں کا قیام بھی ہے۔ فتاویٰ رضویہ کے حوالے سے فکرِ رضا کے اس نکتے کی توضیح ملتی ہے کہ امام احمد رضا کے نزدیک تعلیم بنیاد کے پتھر کی حیثیت رکھتی ہے، جس کے بغیر قوم و ملت اپاہج و معذور ہے۔ فتاویٰ رضویہ کے چارٹر میں جو دس نکات پر مشتمل ہیں فروغِ اہلِ سُنّت و افتخارِ اہلِ سُنّت و امتیازِ اہلِ سُنّت کی صورت گری ہے، جس میں داخلی و خارجی عناصر یعنی قوتِ فکر و عمل سے رنگ بھرا جاسکتا ہے۔ جس سے عصرِ حاضر میں فکرِ رضا کی معنویت، اہمیت، افادیت کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ امام احمد رضا اس بات سے بہت اچھی طرح واقف تھے کہ

قوتِ فکر و عمل پہلے فنا ہوتی ہے
تب کسی قوم کی شوکت پہ زوال آتا ہے

زوال کو کمال سے بدلا جاسکتا ہے اور کمال، فن و ہنر سے آتا ہے اور فن و ہنر، تعلیم و حکمت و دانائی سے وابستہ ہے۔ امام احمد رضا کی یہ فکر تھی کہ مسلمان جگہ جگہ مدارس کھولیں، ایوانِ علم کو تحقیق و تدقیق سے معمور کریں۔ اسی فکر کو لے کر الحمدللہ کئی مدارس و جامعات قائم ہوئے اور گذشتہ صدی کے ربع آخر میں رئیس القلم حضرت علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ برطانیہ میں ورلڈ اسلامک مشن اور اسلامک مشنری کالج کے قیام کے سلسلہ میں تشریف لے گئے تھے، جہاں مسلم عمائدین سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا تھا کہ

''یورپ میں اسلام کے تبلیغی نظام کے قیام کے لیے سب سے بنیادی ضرورت ایسے مبلغین کی فراہمی ہے جو اسلام کا گہرا علم بھی رکھتے ہوں اسلام کے اصل ماخذ کتاب و سنت کے ذریعہ اور اسی کے ساتھ ساتھ یوروپین اقوام کے مزاج، ان کی تہذیب، ان کی تاریخ، ان کے مذاہب، ان کی فکری تحریکات اور ان کی زبان سے بھی پوری طرح واقف ہوں۔''

اس کے علاوہ ایک عظیم الشان دینی درس گاہ جامعہ مدینۃ الاسلام کے قیام کا منصوبہ بھی بنایا گیا تھا۔ اس کے جو اغراض و مقاصد متعین کیے گئے تھے، وہ فکرِ رضا سے ہی مستعار تھے۔ یعنی یورپ کے مسلمان بچوں اور بچیوں کے لیے اردو، عربی، انگریزی، ٹرکی، ڈچ، جرمنی اور فرنچ زبانوں میں دینی تعلیم کا نصاب تیار کرنا اور اسے منظم طریقے پر تمام مذہبی درس گاہوں میں رائج کرنا، مختلف زبانوں میں اسلامی لٹریچر کی تصنیف، طباعت و اشاعت کا ایک عظیم مرکز قائم کرنا، یورپ کے ملکوں میں جگہ جگہ دینی تعلیم کے مکاتب قائم کرنا اور جامعہ مدینۃ الاسلام سے اس کا الحاق کرنا۔ عصر حاضر کے جدید مسائل پر اسلام کا نقطۂ نظر واضح کرنے کے لیے جگہ جگہ بحث و مذاکرہ کی مجالس منعقد کرنا اور ان مجالس میں غیر مسلم دانش وروں کو خصوصیت کے ساتھ شریک کرنا۔ اسلام کی روحانی، اخلاقی اور اجتماعی تعلیمات کو غیر مسلم اقوام میں پھیلانے کے لیے ایک بین الاقوامی سطح کا مرکز قائم کرنا۔

فکر رضا شعر و ادب میں:

شاعری کے بارے میں مختلف تنقید نگاروں نے مختلف خیالات کا اظہار کیا ہے۔ شاعری خیالات اور الفاظ کا مجموعہ ہے، شاعری تمام علم کی روح ہے، شاعری حسن کی متوازن تخلیق ہے، شاعری تخیل کی مدد سے پاکیزہ جذبات کے اظہار کا نام ہے۔ شاعری، زندگی کی تفسیر ہے اور شاعری ایک ایسا

فن ہے جس میں صداقت و تخیل کا امتزاج ہوتا ہے کہ راجہ رشید محمود کے بقول یہ اور اس قسم کے بیشتر خیالات پر اعلیٰ حضرت کی شاعری پوری اُترتی ہے۔ اگرچہ ان کی شاعری محض محبت اور ناموسِ مصطفیٰ کا تحفظ ہے، جذبہ ہے، خلوص ہے، ان کے خیالات میں لطافت و نزاکت ہے، وہ وارداتِ قلبیہ کو شعر کی زبان بخشتے ہیں۔

یہ اردو زبان و ادب کی خوش قسمتی ہے کہ امام احمد رضا نے اسے اپنے افکار و تخیلات کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ اردو ختم نہیں ہوسکتی، جب تک اس کے بولنے والوں میں امام احمد رضا جیسی شخصیات پیدا ہوتی رہیں گی۔ اعلیٰ حضرت کی شاعری محض قافیہ پیائی نہیں از اوّل تا آخر اس میں اسلامی افکار کی کرنیں جگ مگ جگ مگ، روشن روشن ہیں۔

انسانی زندگی کی گاڑی جن شاہ راہوں سے ہوکر گزرتی ہے، راستے وہی ہوں البتہ انسان سفر کا مقصد بدل ڈالے تو بلاشبہ منزل کا انجام بدل جائے۔ اس کے لیے اس سے زیادہ اور کچھ کرنا نہیں ہے کہ جن کاموں کو وہ اب تک کارِ دنیا سمجھ کر کرتا رہا ہے، اُسے حکمِ مولیٰ سمجھ کر کرنا شروع کردے۔ اتباعِ رسول کے جذبے سے خالص دنیاداری بھی دین داری ہے۔

فکر رضا اور للٰہیت:

امام احمد رضا کے خلوص اور للٰہیت کا اندازہ ان کی تحریرات سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ فرماتے ہیں:

> ''یہاں بحمدہٖ تعالیٰ نہ کبھی خدمتِ دینی کو کسبِ معیشت کا ذریعہ بنایا گیا، نہ احباب علمائے شریعت یا برادرانِ طریقت کو ایسی ہدایت کی گئی، بلکہ تاکید سخت تاکید کی جاتی ہے کہ دستِ سوال دراز کرنا تو درکنار، اشاعتِ دین و حمایت میں جلبِ منفعت مالی کا خیال دل میں نہ لائیں کہ ان کی خدمت خالصتاً لوجہ اللہ ہو، اگر بلا طلب اہلِ محبت سے کچھ نذر تحفہ پائیں ردّ نہ فرمائیں کہ اس کا قبول کرنا سنت ہے''۔

(سید ریاست علی قادری، معارف رضا ص ۳۲۳، ۱۹۸۳ء مطبوعہ کراچی)

فکر رضا صحافت میں:

صحافت، جمہوریت کا چوتھا ستون ہے۔ آج کی دنیا میں میڈیا نے دنیا کو ایک شہر میں تبدیل کردیا ہے۔ کسی بھی خبر کو پہنچنے کے لیے اب زیادہ دیر انتظار کرنا نہیں پڑتا، چند منٹوں میں ایک خبر آگ سے بھی زیادہ تیز دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچ جاتی ہے۔ ذرا غور کیجیے، آج سے ایک صدی پیش تر امام احمد رضا نے سوادِ اعظم اہلِ سنّت کو یہ مخلصانہ دردمندانہ فکر دی تھی کہ

''آپ کے مذہبی اخبار شائع ہوں اور وقتاً فوقتاً ہر قسم کے حمایتِ مذہب میں مضامین

تمام ملک میں بقیمت و بلاقیمت، روزانہ یا کم سے کم ہفتہ وار پہنچاتے رہیں۔''

(فتاویٰ رضویہ جلد۱۲، صفحہ ۱۳۳، رضا اکیڈمی، ۱۹۹۴ء)

فکری مزاج کی تعمیر میں قلم کی اسی اہمیت کے پیشِ نظر سلطانِ قلم آبروے صحافت نازشِ اہلِ سُنّت حضرت علامہ ارشد القادری نے وقت سے گریز کرنے والوں کو اپنے خاص اسلوب میں فکرِ رضا کی معنویت کو یوں اجاگر کیا تھا:

''ہم خفتگانِ شب کے غفلت کی نیند اور گہری ہوتی جارہی ہے۔ ہمارے یہاں نکتہ چینی کرنے والوں کی کمی نہیں ہے، البتہ تعمیری ذہن رکھنے والے افراد بہت کم ہیں۔ اجتماعی محاذ پر جو لوگ کام کررہے ہیں، ان سے پوچھیے کتنی کٹھنائیوں سے انہیں گذرنا پڑتا ہے۔ ساحل پر کھڑے ہوکر ڈوبنے کا تماشہ دیکھنا کوئی بہت بڑا ہنر نہیں ہے۔ پچھلے دنوں ہماری جماعت کے کئی جوان ہمت علما نے صحافت کے میدان میں قدم رکھا اور متعدد ماہ ناموں کے اجرا سے انہوں نے اپنی مہم کا آغاز کیا، لیکن کچھ ہی دور چلنے کے بعد انہیں محسوس ہوا کہ وہ اس راہ میں بالکل تنہا ہیں، جماعت کا کوئی خاص تعاون انہیں حاصل نہیں ہے۔ بالآخر مسلسل پسپائیوں کی وجہ سے وہ تھک کر بیٹھ گئے اور مجبور ہوکر انہیں رسالہ بند کرنا پڑا۔ بجائے اس کے کہ جماعت کے افراد ان کی مشکلات کا بوجھ آپس میں تقسیم کرکے انہیں کام کا سلسلہ جاری رکھنے کی ترغیب دیتے اُلٹے ان کی ناکامی پر تالیاں بجانے لگے اور ان کی ناکامی ایک مثل بن گئی''۔

(ماہ نامہ استقامت ڈائجسٹ، کانپور صفحہ ۱۲۴)

عصر حاضر میں ماہنامہ اشرفیہ مبارکپور، اعلیٰ حضرت بریلی، کنزالایمان، جام نور دہلی، سہ ماہی افکار رضا ممبئی، تجلیاتِ رضا (سالنامہ) بریلی، جامِ شہود، نالندہ، امجدیہ گھوسی و دیگر رسائل و جرائد فکرِ رضا کے ترجمان و نقیب بنے ہوئے ہیں۔

امام احمد رضا نے سو سال قبل سوادِ اعظم اہلِ سُنّت کو جو فکری و عملی چارٹر عطا کیا تھا، وہ آج بھی اپنی معنویت، بے پناہ افادیت اور اہمیت رکھتا ہے۔ یہ ایسا عظیم الشان ہدایت نامہ ہے جس میں من حیث القوم افتخار و اعزاز و اکرام کا راز مضمر ہے۔ ذرا فکرِ امام احمد رضا کے اس خانۂ روشن کو ملاحظہ کیجیے جس میں مسطور ہے کہ

''عظیم الشان مدارس کھولے جائیں، طلبہ کو وظائف ملیں کہ خواہی نہ خواہی گرویدہ ہوں، مدرّسوں کی بیش قرار تنخواہیں ان کی کاروائیوں پر دی جائیں۔ طبائع طلبہ کی

جانچ ہو، جو جس کام کے زیادہ مناسب دیکھا جائے معقول وظیفہ دے کر اس میں لگایا جائے۔ ان میں جو تیار ہوتے جائیں تنخواہیں دے کر ملک میں پھیلاتے جائیں کہ تحریراً و تقریراً و وعظاً و مناظرۃً اشاعتِ مذہب کریں۔ حمایتِ مذہب و ردّ بدمذہبیان میں مفید کتب و رسائل مصنفوں کو نذرانے دیکر تصنیف کرائے جائیں۔ تصنیف شدہ اور نو تصنیف شدہ رسائل عمدہ اور خوشخط چھاپ کر ملک میں مفت تقسیم کیے جائیں۔ شہروں شہروں آپ کے سفیر نگراں رہیں، جہاں جس قسم کے واعظ یا مناظر یا تصنیف کی حاجت ہو آپ کو اطلاع دیں، آپ سرکوبیِ اعداد کے لیے اپنی فوجیں، میگزین اور رسالے بھیجتے رہیں۔ جو ہم میں قابل کار موجود اور اپنی معاش میں مشغول ہیں، وظائف مقرر کر کے فارغ البال بنائے جائیں اور جس کام میں انہیں مہارت ہو لگاتے جائیں۔ آپ کے مذہبی اخبار شائع ہوں اور وقتاً فوقتاً ہر قسم کے حمایتِ مذہب میں مضامین تمام ملک میں بقیمت و بلاقیمت، روزانہ یا کم سے کم ہفتہ وار پہنچاتے رہیں۔ حدیث کا ارشاد ہے کہ آخر زمانہ میں دین کا کام بھی درم و دینار سے چلے گا اور کیوں نہ صادق ہو کہ صادق و مصدوق صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام ہے۔"

(فتاویٰ رضویہ جلد ۱۲، صفحہ ۱۳۳ رضا اکیڈمی، ۱۹۹۴ء)

فکرِ رضا کے غماز کشور عثمانی مرادآبادی کے ان اشعار پر گفتگو کا اختتام ہے کہ

جھوم اُٹھتی ہے جسے سُن کے یہ ساری دنیا
میرے افکار کو وہ سوز مکرّر دے دے
اقتباسات مرے عہدِ گزشتہ کے مجھے
اے مؤرخ، مری تاریخ پلٹ کر دے دے

☆☆☆☆

امام احمد رضا کا فکری نظام اور ہماری بے اعتنائیاں

از : محمد صادق رضا مصباحی

مدیرِ اعلیٰ محترم زبیر قادری صاحب کے حکم پر آج جب پہلی بار امام احمد رضا بریلوی قدس سرہ کے حوالے سے اپنے مضمون کی بسم اللہ کرنے بیٹھا ہوں تو حیاتی فضا میں یہ بات برابر گردش کر رہی ہے کہ اپنی بونی فکر وقلم سے اس عبقری شخصیت کو ناپوں تو کیسے؟ اس کی خداداد صلاحیتوں کو قلم کے کیمرے میں بند کروں تو کس طرح؟ اور ان کو علمی، مذہبی، سماجی اور فکری خدمات کو قرطاس کی دیواروں پر چسپاں کروں تو کیوں کر؟ امام احمد رضا، علوم و معارف کا ایک ایسا جہاں آباد کر کے چلے گئے جس میں داخل ہوتے ہی آنکھیں منور ہو جاتی ہیں، ذہن مہکنے لگتا ہے، دل کا بوستاں لہلہا اُٹھتا ہے اور خیمۂ جاں معطر ہو اُٹھتا ہے۔ اور کیوں نہ ہو مسلک وملت کے خلاف جو کچھ بھی انہوں نے دیکھا، تو ان کی محسوسات کی انگلیاں فوراً حرکت میں آ گئیں اور جس کے نتیجے میں اظہاری پیکروں کی ایک لمبی قطار لگ گئی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غیر معمولی خدمات کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے اب تک ہزاروں کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں، بے شمار تحقیقی مقالات لکھے جا چکے ہیں، پچاسیوں ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں حاصل کی جا چکی ہیں۔ لیکن اب بھی یہ شکوہ کیا جا رہا ہے جو میرے عندیہ کے مطابق بالکل بجا اور درست ہے کہ رضا شناسی کا عمل ہنوز پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچا ہے، اس لیے تحقیقاتی تسلسل اب بھی جاری ہے۔

اس تحقیقی تناظر میں امام احمد رضا بریلوی کی فکریات کا اگر جائزہ لیا جائے تو یہ بے داغ حقیقت صفحات کے سینے میں جذب ہو جاتی ہے کہ مسلمانوں کے عصری منظر نامے میں امام احمد رضا کے افکار و تعلیمات کا سایہ حاصل کرنے کے لیے اگر اپنے اپنے عمل کے دریچے وا کیے جائیں اور اپنی بدحال بستی پر اس کا چھڑکاؤ کیا جائے تو ناکامیوں اور پستیوں کے فاسد مادّے خود بخود ختم ہو جائیں گے۔ پسماندگی اور خستہ حالی مسلمانوں کو جہاں جہاں تک لے گئی ہے، امام احمد رضا کی تصوراتی آنکھوں نے وہاں تک اس کا تعاقب کیا ہے اور مسلمانوں کو اس سے نجات کے لیے ایسا فکری نظام بنایا جو در اصل اہلِ سُنّت کی ترقی کا آئینہ خانہ ہے۔ لیکن افسوس آج اس سے شدید بے اعتنائی ہے، ان کے نام اور خدمات پر تو اہلِ سُنّت جان چھڑک رہے ہیں، ان کی شخصیت کی سحر طرازی میں وہ اس طرح گم ہیں کہ ان کے افکار وتعلیمات کی انگلی اُن کے ہاتھ سے چھوٹ گئی ہے۔ وہ مسلکِ اعلیٰ حضرت کے نام پر دیوانہ وار ٹوٹے پڑ رہے ہیں۔ لیکن یہ سمجھنے کی کوشش نہیں کر رہے ہیں کہ آخر مسلکِ اعلیٰ حضرت کیا ہے؟ آج امام احمد رضا

کے فکری نظام پر کھلے عام پتھر مارے جارہے ہیں لیکن پھر بھی مسلکِ اعلیٰ کا نعرہ اتنے جوش وخروش اور عقیدت سے لگایا جارہا ہے، جیسے امام احمد رضا کی محبت وعقیدت ان کے دل میں قطرہ قطرہ نچوڑ دی گئی ہو۔ لیکن اس عقیدت و محبت کا وزن کیا ہے، اہلِ نظر خوب جانتے ہیں۔ اس سے بھی بڑھ کر ہماری عقیدتِ محضہ یہاں تک دراز ہوچکی ہے کہ جو اعلیٰ حضرت کے نام کا ورد نہ کرے اور مسلکِ اعلیٰ حضرت کا کلمہ نہ پڑھے، تو ایک لمحے کا انتظار کیے بغیر جماعتِ اہلِ سُنّت کے مکتب کے داخلہ رجسٹر سے اس کا نام خارج کردیا جاتا ہے اور صرف یہی نہیں بلکہ اس سے ہماری عقیدت بے بصر کے ساز پر خوشی کے نغمے لہرانے لگتے ہیں۔ اس سے جو جماعتی خسارہ ہورہا ہے، اس کا اندازہ کون کرسکتا ہے؟

امام احمد رضا بریلوی قدس سرہ سے سچی عقیدت و محبت کا اظہار تو یوں تھا کہ اُن کے فکری پہلوؤں پر بھی سنجیدگی سے عمل کیا جاتا، اعلیٰ حضرت کے مسلک کو حقیقی طور پر سمجھنے کی کوشش کی جاتی۔ امام احمد رضا کو وصال فرمائے ہوئے تقریباً ایک صدی مکمل ہورہی ہے، کاش اُن کی خدمات کو اُجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ اُن کی فکریات کا علمی رخ متعین کرنے کی کوشش کی جاتی تو فکرِ رضا کی مٹی اُن مسائل کی کھائیوں کو بہت خوب صورتی کے ساتھ پاٹ سکتی تھی جو مسائل آج ہماری آنکھیں چھلکا دیتے ہیں۔ آیئے سب سے پہلے تعلیم پر گفتگو کریں۔

اس وقت تعلیم کی ضرورت واہمیت پر قلم کا چراغ روشن کرنا بے سود ہے۔ تعلیم کی حیثیت کیا ہے، آج اس سے پوری دنیا کا ادنیٰ سے ادنیٰ انسان بھی واقف ہوچکا ہے۔ لیکن اس سے عملی اختلاف نے ہمیں ایک صدی پیچھے ڈھکیل دیا ہے۔ ہمارے مدارسِ اسلامیہ کا رخ روایت کی طرف مڑا ہوا ہے الا ما شاء اللہ بہت سارے مدارس اعلیٰ حضرت کے نام پر چل رہے ہیں، اعلیٰ حضرت کے نام پر چندہ کیا جارہا ہے اور اساتذہ، اراکین اور طلبہ سب مسلکِ اعلیٰ حضرت کے پابند ہیں لیکن مدارسِ اہلِ سُنّت اور مسلمانوں کی تعلیم کے سلسلے میں امام احمد رضا نے جو تعلیمی نکات اور فکری نظام پیش فرمایا ہے، عملی سطح پر اس کو بروے کار لانے والا کون ہے؟ امام احمد رضا کے تعلیمی وترقیاتی منشور کو صرف عمل کا سہارا دینے کی ضرورت تھی، خود بخود ہمارے ترقیاتی قدموں میں سرعت پیدا ہوجاتی لیکن کیا اس طرف کسی کی توجہ ہے؟

تعلیم سے لگا ہوا ایک شعبہ تبلیغ کا بھی ہے۔ اس کے چہرے پر بھی جہاں تہاں خراشیں پڑی ہوئی ہیں۔ جلسے روایت پسندی سے اتنے زیادہ چپکے ہوئے ہیں کہ ان کو آسانی سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ یہ جلسے کس معیار کے ہوتے ہیں، خطبا وسامعین کی علمی سطح کیا ہوتی ہے اور ان کے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں؟ اربابِ علم ودانش اسے خوب جانتے ہیں۔ لہٰذا دعوتی وتبلیغی چہرے کو بارونق، وجیہہ اور خوب صورت بنانے کے لیے امام احمد رضا کی فکر کو عمل کے پل صراط سے گزارنا ہوگا اور مسلکِ اعلیٰ حضرت

کے حقیقی اور واقعی مفہوم و مطلب تک رسائی حاصل کرنا ہوگی، ورنہ صرف کھوکھلے نعروں کے کاندھوں پر ہم کب تک اپنی جماعت کا وجود ڈھوتے رہیں گے۔

طالبانِ علوم کی ترغیب وتشویق کے سلسلے میں بھی امام احمد رضا کا فکری منظر نامہ ہمیں متوجہ کرتا ہے تاکہ غریب اور ذہین طلبہ بغیر کسی رکاوٹ کے حصولِ تعلیم کرسکیں اور متعدد علوم وفنون میں اپنی صلاحیت و انفرادیت کے نقوش چھوڑیں، تاکہ جماعت کے لیے باصلاحیت افراد مہیا ہوسکیں۔ لیکن آج اس پر کتنے فی صد عمل کیا جارہا ہے؟

اقتصاد و معاش دنیاے اہلِ سُنّت کے لیے بڑا اہم اور پریشان کن مسئلہ ہے۔ لیکن اگر ایک جہت سے دیکھا جائے تو یہ بھی دقت طلب بات نہیں ہے کیونکہ اہلِ ثروت حضرات کی کرم فرمائیاں اس زخم کو آسانی بھرسکتی ہیں۔ لیکن یہ اسی وقت ہوسکتا ہے جب مزاج میں احساس کی لَو جلتی رہے اور دل کے تار اضطراب کے ساز سے جھنجھناتے رہیں۔ ہماری ترقی میں سب سے بڑا روڑہ اسی معاشی بدحالی نے اٹکار کھا ہے۔ امام احمد رضا نے اس کے لیے جو فکری نقشہ تیار فرمایا ہے اس سے یقیناً تصوراتی سطح پر مسلمانوں کی تعمیر وترقی رقص کرنے لگتی ہے۔ امام احمد رضا کے معتقدین اور مسلکِ اعلیٰ حضرت کے نام پر پانی کی طرح پیسہ بہا دینے والے ان نکات پر غور کیوں نہیں کرتے؟ ہزاروں مسائل صرف اس کی بناپر سرد خانے کی دھول چاٹ رہے ہیں۔ غریب مسلم لڑکیوں کی شادیاں رکی ہوئی ہیں اور نہ جانے کتنے مسلمان ہیں جو معاش کی مار سے بلبلا رہے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ ہر سال زکوٰۃ، فطرہ، صدقات اور امداد کے نام پر مسلمانوں کی اربوں کھربوں رقم کس مد میں صرف ہورہی ہے؟ اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ کے نام پر جان چھڑکنے والے اہلِ ثروت حضرات کہاں ہیں؟ کیا اس سلسلے میں امام احمد رضا کی فکر ونظریہ ان کی رہ نمائی نہیں کررہا ہے؟

ہمارے معاشرے میں اس طرح کی بے پناہ خامیاں پرورش پاکر جوان ہوچکی ہیں جنھوں نے معاشرے کی صالحیت کو نچوڑ کر پھینک دیا ہے۔ نیز وہ بدعات ورسوم بھی مروج ہیں جن کے خلاف امام احمد رضا نے اپنی فکر اور قلم کے تیر چلائے تھے، کتابیں لکھی تھیں۔ لیکن ہمیں یہ بتایئے کہ آج کتنے لوگ اعلیٰ حضرت کی اس فکر اور تحریک کو اپنے احساس کے زینے سے عمل کی سطح تک پہنچا رہے ہیں۔ جن بدعات کے خلاف امام احمد رضا نے اپنے قلم کا لہو بہایا تھا، آج اسی پر ان کے متبعین کہلانے والے حضرات شعوری یا غیر شعوری پر ڈٹے ہوئے ہیں۔ غیروں نے امام احمد رضا پر اسی نوعیت کا الزام لگایا تھا اور اس الزام کی تردید میں امام احمد رضا نے ایک عظیم تحریری سرمایہ چھوڑا ہے، لیکن افسوس آج پھر اسی چیز کی عملی تصدیق کی جارہی ہے اور یہ تصدیق کرنے والے کوئی اور نہیں، مسلکِ اعلیٰ حضرت کی فضاؤں

میں رہنے بسنے والے ہیں۔

صرف انہیں سلسلے میں نہیں امام اہلِ سُنّت نے اہلِ سُنّت و جماعت کے ہر گوشے کو منور و تاباں اور اس کی تعمیر و تطہیر کے لیے انمول فکری نقوش چھوڑے اور بے پناہ اصلاحی مساعی فرمائیں۔ استاذ گرامی علامہ محمد احمد مصباحی پرنسپل جامعہ اشرفیہ مبارک پور نے ان تمام افکار و مساعی کو تین قسموں میں تقسیم فرمایا ہے۔

۱۔ اصلاحِ عقاید و تصحیح نظریات ۲۔ اصلاحِ اعمال و تصحیح عادات ۳۔ علمی افادات و فنی تحقیقات۔ موخر الذکر کو چھوڑ کر بقیہ دونوں میں امام احمد رضا کے غیر معمولی افکار کے تربیتی، تنظیمی، اصلاحی، معاشرتی، معاشی، تہذیبی، دعوتی، تبلیغی، تعمیری، ترقیاتی، مذہبی اور صحافتی موتی بکھرے پڑے ہیں۔ ضرورت ہے کہ انہیں سلک عمل میں پرویا جائے اور ان سے تعمیر و ترقی کشید کی جائے۔ آج کا دور کھوکھلے نعرے لگانے کا نہیں اور نہ ہی جذبات کی رَو میں بہنے کا ہے۔ بلکہ اس وقت حقیقی اور واقعاتی تناظر میں الجھے ہوئے مسائل کو سمجھنے اور ان کا ممکنہ عملی حل پیش کرنے کی ضرورت ہے۔ اب اعلیٰ حضرت کے نام پر چولہا جلانے اور اس پر اپنی شہرت و مقبولیت اور معاش کی ہانڈی پکانے کا وقت نہیں بلکہ مسلکِ اعلیٰ حضرت یعنی مسلکِ اہلِ سُنّت و جماعت کے چمن میں امام احمد رضا کی فکر کے گلاب لگانے اور انہیں اپنے عمل کے پانی سے سینچنے کا وقت ہے۔

اس سیاق میں عوام سے زیادہ خواص سے گزارش کروں گا کہ وہ عوامِ اہلِ سُنّت کی ذہن سازی کریں اور امام احمد رضا کا فکری چہرہ انہیں دکھائیں کہ وہ عصری تناظر کے آئینے میں اس کا مشاہدہ کریں اور اس کی معنویت پر غور و فکر کریں۔ ماضی کی تلخ یادوں کو بھلا کر اب ہمیں اس رخ پر سوچنا ہے کہ مسلکِ اعلیٰ حضرت یعنی مسلکِ اہلِ سُنّت و جماعت کی ابلاغی جہت کیسے روشن ہو۔

مجھے بڑے افسوس کے ساتھ لکھنا پڑ رہا ہے کہ اپنوں کی بے حسی اور قلمی و مالی تعاون نہ ملنے کی وجہ سے اسی رسالے ''افکارِ رضا'' کے مدیر جناب زبیر قادری صاحب نے جب دل برداشتہ ہو کر ''افکارِ رضا'' بند کرنے کا اعلان کیا تو اس شمارے کا تبصرہ کرتے ہوئے راقم نے لکھا تھا:

''کہاں ہیں ملی درد مندوں اور مذہبی قایدوں کی جماعتیں جو قدم قدم پر مسلکِ اعلیٰ حضرت کا نعرہ لگاتی ہیں اور مسلکی خیر خواہی کے لمبے لمبے بیانات ان کی زبانِ اقدس سے جاری ہوتے ہیں؟ اپنے مسلکی فکر کے ترجمان کی ناگفتہ بہ حالت پر ان کی عقیدتوں کا اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا؟ کیا وہ مالی اور قلمی تعاون فرما کر اس کے لیے آبِ حیات کا انتظام نہیں کر سکتے؟ خدارا کیجیے ورنہ تاریخ کی مرقد میں پہنچنے سے اسے کوئی نہیں روک سکتا۔ یاد رکھیے کہ اگر افکارِ رضا بند ہو گیا تو ایک فکر پر ضرب پڑے گی،

ایک تحریک پر آنچ آئے گی، ایک تنظیم کے تار و پود بکھریں گے۔

پھر کچھ سطور کے بعد لکھا تھا:

"لیکن جب وہ (زبیر قادری) احساس کی اس منزل پر پہنچ چکے ہیں اور اُن کے حوصلوں اور جذبات کا غبارہ پھوٹنے کے قریب ہے، تو تصور کیجیے، کیا اُن کی امیدوں کا لاشہ بے گور و کفن نہیں پڑا ہوگا؟ اُن کے تصورات کے بت پاش پاش نہیں ہو رہے ہوں گے؟ اُن کی تمنائیں چراغِ سحری نہیں بن رہی ہوں گی؟ لہٰذا مسلکِ اعلیٰ حضرت کے ماننے والوں سے پُرخلوص گزارش کی جاتی ہے کہ افکارِ رضا کے چراغ کو گل ہونے سے بچائیں۔ کاش مزارِ اعلیٰ حضرت کی چادروں کی ایک سال کی قیمت بھی اگر افکارِ رضا کے حوالے کر دی جائے تو افکارِ رضا کے کمزور بازو مضبوط ہو جائیں۔"

اس تبصرے کی اشاعت کے بعد ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ افکارِ رضا کی کمزور پشت کو سہارا دیا جاتا، زبیر قادری صاحب کی خوب خوب حوصلہ افزائی کی جاتی اور انہیں قلمی و مالی تعاون کا یقین دلایا جاتا لیکن افسوس باستثنائے چند سبھی کی جانب سے سرد مہری کا مظاہرہ ہوا۔ بہر حال یہ ہماری سرد مہری اور خود پسندی کی ایک مثال ہے۔ ایسی تمثیلات بہت سارے مسائل سے نبرد آزما ہے۔

مدعائے نگارش یہی ہے کہ بے مصرف اُمور میں توانائیاں صرف کرنے کے بجائے بامقصد اور تعمیری کاموں میں اپنی قوتوں کا لہو اُنڈیلا جائے تا کہ مسلکِ اعلیٰ حضرت کی فکری چھاؤں سے تمام اہلِ سُنّت مستفید ہو سکیں۔ امام احمد رضا کا فکری نظام اب کسی سے ڈھکا چھپا نہیں ہے۔ اس لیے مَیں نے انہیں قصداً قلم انداز کیا ہے۔ تعلیم و تربیت، صحافت، مسلکی اشاعت و ابلاغیت، فکری و نظریاتی وحدت، سیاست، معیشت، عورتوں کی مزارات پر حاضری، اعراس، چادر و مزار، عقاید و نظریات، عادت و اطوار، علما و قایدین کی سہل پسندی، تیجے و چالیسویں وغیرہ کی دعوت، رسومِ شادی، قبرِ ولی پر چادر، آتش بازی، قبر کا بوسہ و طواف، قوالی مع مزامیر، تعزیہ داری اور سجدۂ تعظیمی وغیرہ وغیرہ متعدد راہوں میں امام احمد رضا نے منزل کی رہ نمائی کے لیے اپنے افکار کے پتھر نصب فرمائے ہیں۔ زندگی کا سفر کرتے جایئے اور ان پتھروں کے اشارات سے اپنی مرکبِ حیات کی سمت کا تعین کرتے جایئے۔ یہی دراصل مسلکِ اعلیٰ حضرت ہے اور یہی مسلکِ اہلِ سُنّت و جماعت۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ میری ان کج مج آرائیوں کے اثرات کیا ہوں گے۔ شاید ہوں، شاید نہ بھی ہوں۔

میرؔ سے معذرت کے ساتھ ؎

شعر میرے ہیں گو عوام پسند پر مجھے گفتگو خواص سے ہے

OOOOOO

امام احمد رضا قدس سرہٗ کی فکر انگیز تحقیقات

محمد قطب الدین رضا مصباحی

ریسرچ اسکالر جامعہ اشرفیہ مبارک پور، اعظم گڑھ

سیدنا اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قدس سرہٗ کے زر نگار قلم سے لاتعداد فتاویٰ صادر ہوئے۔ آپ کے فتاویٰ میں بے شمار فقہی خصوصیات موجود ہیں۔ ایک اہم خصوصیت مشکل مقامات کی دل پذیر عقدہ کشائی اور حیرت انگیز طریقۂ استدلال ہے۔ آپ نے اپنی خداداد علمی لیاقت کی بدولت مسئلے کی تنقیح و توضیح میں تحقیق کے بے شمار جواہر پارے لٹائے ہیں۔ چند شواہد کی روشنی میں اس پہلو کو اجاگر کیا جاتا ہے:

(۱) بنی ہاشم پر اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ اور صدقۂ واجبہ کا لینا حرام فرمادیا ہے۔ البتہ اس کے عوض حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بنی ہاشم کو مالِ غنیمت سے پانچواں حصہ ملا کرتا تھا۔ عہدِ رسالت کے بعد یہ بند ہوگیا اور صدقات لینا جوں کا توں حرام ہی رہا۔ مالِ غنیمت کے اس پانچویں حصے کے بند ہوجانے کے بعد کچھ فقہا نے صدقات کو بنی ہاشم کے لیے حلال قرار دیا کہ جس وجہ سے صدقات کی حرمت کا حکم تھا وہ اب باقی نہ رہا لہٰذا تحریم صدقات کا حکم ساقط ہوجائے گا۔

اس سلسلے میں سیدنا اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ نے بڑی نفیس تحقیق فرمائی ہے جس کے بعد مسئلے میں کسی طرح کی کوئی تشنگی نہیں رہ جاتی۔ آپ نے سب سے پہلے سادات کرام پر زکوٰۃ وصدقات لینے کی حرمت اور اس کی علت بیان فرمائی اور پھر یہ ثابت فرمایا کہ جب تک علت موجود رہے گی اس وقت تک حکم بھی پایا جائے گا۔ گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ ساداتِ کرام پر صدقات لینا اس لیے حرام ہے کہ وہ مالوں کے میل ہوتے ہیں اور ان کی شان ارفع و اعلیٰ اور عزت و کرامت کی حامل ہے۔ تو ان کی پاک ستھری ذات اس سے برتر ہے کہ ایسی چیزوں سے آلودہ ہوں۔ ایسا نہیں کہ انھیں مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ ملا کرتا تھا اس لیے صدقات حرام کردیے گئے۔ تو جب صدقات حرام ہونے کا سبب مالوں کا میلا کچیلا ہونا ہے تو اب صدقات ہمیشہ کے لیے حرام ہوں گے کیوں کہ یہ ایک ایسی علت ہے جو زمانہ کے ہزار بدلنے سے متغیر نہیں ہوسکتی اور ہمیشہ ہمیش باقی رہے گی تو پھر حکم بھی بلا شبہ اپنے حال پر باقی رہے گا۔

اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ کی اس توضیح و تنقیح سے مسئلہ نہایت واضح اور شفاف ہوجاتا ہے۔ پھر بھی آپ نے اس پر اکتفا نہ کر کے خمس سے وارد ہونے والے اشکال کو مزید جس تحقیقی انداز میں دفع فرمایا ہے اس سے آپ کی دقتِ نظر اور فقہی عبور پورے طور پر نمایاں ہے۔ آپ کی اس نفیس تحقیق کا خلاصہ یہ

ہے کہ بنی ہاشم پر پہلے صدقات حرام ہوئے پھر اللہ تعالیٰ نے خمس کو ان کے رزق کا ذریعہ بنایا۔ اس طرح خمس کا اثبات صدقات کے حرام ہونے کے سبب ہوا۔ ایسا نہیں کہ خمس کو ثابت کرنے کے بعد صدقات حرام کردیے گئے۔ تو گویا خمس، صدقات کا عوض ہوا، اور اس مسئلے میں عوض یعنی خمس جب ساقط ہوگیا تو اس کی بنیاد پر معوض ثابت نہ ہوگا۔ کیوں کہ معوض کا ثبوت اسی جگہ ہوتا ہے جہاں عوض کے حاصل ہونے کی وجہ سے اس کا زوال ہوا ہو۔ ورنہ معوض کا زوال اگر کسی ایسی علت سے ہو جو عوض کے علاوہ ہو تو جب تک وہ علت باقی رہے گی معوض ضرور ساقط رہے گا۔ عوض حاصل ہو چاہے ساقط ہو۔ تو بنی ہاشم کی عزت وحرمت کے سبب جب ان پر صدقات حرام فرمادیے گئے اور اس کے عوض خمس کا ثبوت ہوا تو اب اس خمس کے ساقط ہوجانے سے صدقات کی حرمت ختم نہیں ہوگی بلکہ یہ حکم اس وقت تک رہے گا جب تک علت پائی جائے گی۔ اور بنی ہاشم کی عزت وحرمت ہمیشہ باقی رہے گی تو اس طرح صدقات کی حرمت بھی ہمیشہ رہے گی۔ اعلیٰ حضرت نے اس کو ایک بڑی واضح مثال سے آسان فرمادیا ہے کہ کسی مریض سے جب وضو کی فرضیت ساقط ہوجائے اور اس کے عوض تیمم لازم ہو تو پاک مٹی دستیاب نہ ہونے کے وقت تیمم بھی ساقط ہوجاتا ہے۔ تو ایسی صورت میں تیمم کے ساقط ہوجانے سے وضو کی فرضیت نہ لوٹے گی بلکہ اجتماعی طور پر وضو اور تیمم دونوں دونوں ساقط ہوجائیں گے۔

اس مسئلے کو امام احمد رضا قدس سرہ نے جتنے نفیس اور خوب صورت انداز مین ثابت فرمایا ہے۔ وہ انھیں کے علم وفن کا حصہ ہے۔ مسئلے کی اس توضیح وتنقیح کے بعد کوئی تشنگی نہیں رہ جاتی۔ اس کامل تحقیق کے بعد اعلیٰ حضرت کو خود اس کا احساس ہوتا ہے اور شکر خدا بجالاتے آخر میں رقم فرماتے ہیں:

"وللہ الحمد ھکذا ینبغی التحقیق واللہ سبحانہ ولی التوفیق"۔

(۲) فقہِ حنفی کی کتابوں میں یہ مسئلہ پوری صراحت کے ساتھ موجود ہے کہ دھواں یا غبار حلق میں خود داخل ہوجائے تو روزہ نہ ٹوٹے گا اور اگر کوئی اپنے قصد و ارادے سے داخل کرے تو اس سے روزہ جاتا رہے گا۔ اس سلسلے میں سیدنا اعلیٰ حضرت کی خدمت میں ایک استفتا پیش ہوا۔ آپ چاہتے تو کتب حنفیہ سے جزئیات نقل کرکے نفس مسئلہ بیان کردیتے کہ روزہ نہ ٹوٹے گا مگر آپ نے اس پر اکتفا نہ کرکے صورت مسئلہ کی پوری تحقیق فرمائی اور خدا کے عطا کردہ علم لدنی سے ایسی توضیح وتشریح فرمائی کہ پڑھ کر طبیعت میں تازگی پیدا ہوجاتی ہے۔

اس سلسلے میں تمہیدی طور پر اعلیٰ حضرت قدس سرہ نے تین چیزیں بیان فرمائی ہیں۔ ایک تو روزے کی حقیقت کہ مفطرات شرعیہ سے باز رہنے کا نام روزہ ہے۔ دوسری چیز یہ کہ حقیقت کے فنا ہونے کے بعد شے کا وجود نہیں رہ جاتا بلکہ لازمی طور پر وہ شے بھی فنا ہوجاتی ہے۔ خواہ حقیقت کا انتفا

کسی ضرورت کے تحت ہو یا بلا ضرورت۔ ضرورت اور عدم ضرورت کی اس میں کوئی تفریق نہیں اور تیسری چیز یہ کہ شریعت کے احکام انسانی طاقت ہی کے مطابق ہوتے ہیں۔

اس کے بعد نفس مسئلہ کی تحقیق کرتے ہوئے اعلیٰ حضرت نے ان چیزوں کا جائزہ لیا جو خارج سے جوف صائم میں داخل ہوتے ہیں۔ تو اس کی تین قسمیں بیان فرمائیں۔ (۱) کچھ چیزیں تو ایسی ہیں جن سے روزہ دار کسی وقت نہیں بچ سکتا جیسے ہوا کہ انسان کو ہر لمحہ اس کی ضرورت ہے۔ (۲) کچھ چیزیں ایسی ہیں جن سے کسی نہ کسی وقت ہر شخص کو تلبس ہوتا ہے اور پورے طور پر ان سے بچنا ناممکن ہے۔ جیسے گرد وغبار اور دھواں وغیرہ کہ پورے طور پر ان سے نہیں بچا جا سکتا۔ (۳) اور کچھ چیزیں ایسی ہیں جن سے پورے طور پر بچا جا سکتا ہے۔ البتہ کبھی کسی شخص کے ساتھ ایسے حالات آ سکتے ہیں جو تلبس پر مجبور کرے۔ ان مذکورہ تینوں قسموں میں جس طرح پہلی قسم سے روزہ نہیں ٹوٹتا اسی طرح دوسری قسم میں بھی مطلقاً روزہ نہ ٹوٹے گا۔ کیوں کہ مفطر ماننے کی صورت میں دو حال سے خالی نہیں۔ یا تو اسے ہمیشہ مفطر مانیں کہ ضرورت کے باوجود اگر گرد وغبار یا دھواں حلق میں چلا جائے تو اس سے بھی روزہ جاتا رہے گا یا پھر ضرورت کے وقت تو مفطر نہ مانیں البتہ بلا ضرورت تلبس کو مفطر شمار کریں۔ پہلی صورت میں تکلیف مالا یطاق لازم آئے گی اور دوسری صورت میں حقیقت کے فنا ہونے کے باوجود شے کا وجود لازم آئے گا۔ اس صورت میں حکم یہی ہوگا کہ یہ مفطر صوم نہیں یا گرد وغبار اور دھواں کے داخل ہونے سے روزہ نہ ٹوٹے گا۔

اس صورت میں ایک شبہہ یہ ہوتا ہے کہ کسی جگہ اگر لوبان جل رہا ہو اور وہاں جانے سے حلق میں دھواں داخل ہونے کا اندیشہ ہو، تو ایسی جگہ جانا قصداً دھواں داخل کرنا ہے یا نہیں۔ سیدنا اعلیٰ حضرت قدس سرہ نے اس شبہہ کا جواب بڑی دقت نظر اور کمال فقیہانہ سے سپرد قلم فرمایا ہے اور بڑی تفصیل سے اس کے گوشوں پر روشنی ڈالی ہے۔ آپ کی تفصیلی گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ کسی چیز کا سبب جو مسبب تک مفضی ہو اس کی دو قسمیں ہیں: ایک تو یہ کہ سبب کے ارتکاب کے بعد مسبب کا وقوع یقینی ہو یا کم از کم اس کا غالب گمان ہو۔ دونوں حالتوں میں سبب کا ارتکاب مسبب ہی کا ارتکاب ہوگا، کیوں کہ باب فقہ میں غالب گمان بھی یقین سے ملحق ہوتا ہے۔ لہٰذا اس صورت میں مسبب کے کرنے پر جو حکم ہوتا سبب کے ارتکاب پر بھی وہی حکم نافذ ہوگا۔ دوسری قسم یہ ہے کہ سبب ایسا ہو جس کے بعد بسا اوقات مسبب کا وجود ہوتا ہو اور کبھی نہیں۔ اس صورت میں سبب کے ارتکاب کرنے پر کسی طرح مسبب کا حکم نہ ہوگا۔ تو ایسی جگہ جانا جہاں لوبان جل رہا ہو، دخول دخان کا سبب غالب نہیں ہے، لہٰذا یہ قصداً دھواں داخل کرنا نہ ہوگا اور اس سے روزہ نہ ٹوٹے گا۔

امام احمد رضا قدس سرہ نے کتنی مہارت سے شبہے کا ازالہ فرمایا ہے اور نفس مسئلہ کو بے غبار فرما

دیا ہے۔

(۳) مذہب حنفی میں نمازِ جنازہ کی تکرار ناجائز و نامشروع ہے۔ ہاں! اگر ولی کی اجازت کے بغیر کسی اجنبی نے نماز پڑھا دی ہو تو ولی کو اعادے کا حق حاصل ہے، اس پر چند احادیث کریمہ سے اعتراض واقع ہوتا ہے۔ ایک حدیث میں حضرت سکینہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بارے میں مروی ہے کہ وہ جب بیمار ہوئیں تو سرکارِ دوعالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کہ جب ان کا انتقال ہو تو مجھے خبر کرنا۔ شب مین ان کا انتقال ہوا تو صحابۂ کرام نے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بیدار کرنا خلافِ ادب سمجھا اور اندھیری رات میں کیڑے مکوڑے کا بھی خوف ہوا۔ یہ خیال کر کے صحابۂ کرام نے دفن کر دیا اور حضور کو اس کی اطلاع نہ دی۔ صبح حضور کو جب خبر ہوئی تو آپ نے فرمایا کہ کیا میں نے تم سے نہ کہا تھا کہ مجھے اس کی خبر دینا، تو صحابۂ کرام نے عرض کی کہ ہمارے دلوں کو یہ گوارا نہ ہوا کہ رات میں حضور کو باہر آنے کی زحمت دیں یا بیدار کریں۔ پھر صحابۂ کرام نے ان کی قبر پر صف لگائی اور حضور نے نماز پڑھائی۔ اسی طرح کے چند واقعات اور مروی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ نمازِ جنازہ کی تکرار صحیح و درست ہے۔

ان واقعات کا جواب اعلیٰ حضرت قدس سرہ نے ایک بڑی ہی لطیف گفتگو سے دیا ہے۔ جس کے بعد سارے اعتراضات یکسر ختم ہو جاتے ہیں اور شکوک وشبہات کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ نمازِ جنازہ ایک طرح کی شفاعت ہے اور شفاعت کے مالک صرف اور صرف سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ حضور کے علاوہ جو بھی شفاعت کرے گا وہ حضور کی نیابت سے کرے گا۔ آپ کی اجازت کے بغیر اگر کوئی شفاعت کرے تو وہ فضولی کا تصرف ہوگا اور فضولی کا تصرف مالک کی اجازت پر موقوف رہتا ہے۔ مالک اگر اجازت دے دے اور اس کو جائز کر دے تو جائز ہو جائے گا اور اگر مالک خود تصرف کرے تو فضولی کا تصرف باطل ہوگا۔ تو جن واقعات میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود نماز پڑھی تو یہ نماز کی تکرار نہ ہوگی بلکہ نمازِ اوّل یہی قرار پائے گی۔

اعلیٰ حضرت قدس سرہ کے فتاویٰ میں اس طرح کی قیمتی تحقیقات جا بہ جا موجود ہیں۔ فتاویٰ سے ان کی نشان دہی لوگوں کے سامنے انھیں لانا ایک اہم کام ہے۔ جس کے لیے محنت و جدو جہد اور ایک لمبا وقت درکار ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے لیے یہ اسباب فراہم فرمائے۔ (آمین)

OOOOOOO

تعلیم اور فکر رضا

از: غلام مصطفیٰ رضوی
نوری مشن، مالے گاؤں

کسی بھی قوم کی تعمیر و ترقی میں تعلیم کو بنیادی حیثیت حاصل رہی ہے۔ مسلمانوں نے دنیا کو علم کا ایک نیا تصور دیا جس میں انسانی اقدار کا پورا پورا لحاظ رکھا گیا۔ اور تعلیم کا مقصد انسانیت کو اس کے اصل مقام سے آشنا کرانا، ظلم و بربریت کا خاتمہ، اور تہذیب و تمدن کی درستی کے ساتھ ہی اخلاق کی آراستگی ٹھہرا۔ تعلیم کی بنیاد پر بہت جلد مسلمانوں نے دنیا کے کئی براعظموں میں اسلام کی حقانیت و صداقت کے جھنڈے گاڑ دیئے دراصل یہ کامیابی اسلام کے عطا کردہ اس نظام تعلیم کی تھی جو سرور کائنات فخر موجودات حضور رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے تشکیل فرمایا تھا۔ صدیوں تک مسلمان دنیا کے معلم بنے رہے اور جب سے علم سے رشتہ ٹوٹا زوال سے دوچار ہوئے۔

ماضی کی قد آور علمی شخصیات مثلاً حضرت امام غزالی، حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی، حضرت مجدد الف ثانی، امام احمد رضا محدث بریلوی علیہم الرحمۃ والرضوان نے اپنے کارہائے علمیہ سے زمانے کو متاثر کیا ان کے افکار و نظریات پر دنیا بھر میں حقیقی کام ہو رہے ہیں اور اہل علم و نظر حیران و ششدر رہ جاتے ہیں کہ کس طرح ان شخصیات نے عظیم کام انجام دے کر اسلام کی شان و عظمت کو دوبالا کیا اور ایک انقلاب برپا کیا۔

امام احمد رضا قادری برکاتی محدث بریلوی (ولادت ۱۰ رشوال المکرم ۱۲۷۲ھ/ ۱۸۵۶ء، وصال ۲۵ رصفر المظفر ۱۳۴۰ھ/ ۱۹۲۱ء) علومِ دینیہ میں دسترس رکھتے تھے ہی اور علوم قدیمہ و جدیدہ میں بھی یکتائے روزگار تھے۔ آپ نے عمر بھر علم دین کی ترویج و اشاعت کی۔ آپ کے تلامذہ و خلفا نے برصغیر میں علم دین کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا اور مابعد زوال ایک نئی تاریخ مرتب کی جو حوصلہ افزا قرار دی جاسکتی ہے۔

علم اور تعلیم کے حوالے سے امام احمد رضا قدس سرہ کے نظریات و تجاویز ضرور اس لائق ہیں کہ انھیں عام کیا جائے ان پر تحقیق و تدقیق کی جائے۔ آپ کے فتاویٰ، تصانیف اور تالیفات میں تعلیم و تدریس، نصاب اور علم کے اسلامی اصول و ضابطے پر بہت سارے نکات ملتے ہیں، جن کی تصریح و توضیح کر لیے بہت سے مقالے اور مضامین لکھے جاسکتے ہیں۔ راقم اس مقالے میں علم سے تعلق رکھنے والے چند امور پر اجمالی روشنی ڈالے گا۔

ایک ماہر تعلیم ہونے کی حیثیت سے امام احمد رضا قدس سرہ نے علم دین کی عظمت و برتری، تعلیم کے طرق و اصول، نصاب کی خصوصیات و تدوین، استاذ کا مقام و مرتبہ اور ادب و احترام، شاگرد کے حقوق، علم کے دقائق اور فنی لوازمات، دستور سزا اور ضابطۂ اخلاق، لسانی تعلیم، تجرباتی علوم پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ آپ ۵۴ سے زیادہ علوم و فنون میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ بیسویں صدی کے آغاز میں اسلامی دنیا میں آپ جیسا ماہر تعلیم نہیں گزرا جس نے اس قدر علوم کو برتا اور مسلمانوں کے تعلیمی عروج و ارتقاء کے لیے موثر جدو جہد کی۔

ذہانت و فطانت اور تبحر علمی: زمانۂ طالب علمی سے ہی امام احمد رضا کی ذہانت و فطانت کے آثار نمایاں ہونے شروع ہوگئے تھے۔ آپ نے طلبہ کی آسانی و تفہیم کے لیے درس کی بڑی بڑی کتابوں پر حاشیے تحریر فرمائے۔ لکھتے ہیں:

> ''اور میں نے ان جملہ علوم کی بڑی بڑی کتابوں پر حواشی بھی لکھے ہیں۔ حاشیہ نویسی کا سلسلہ زمانۂ طالب علمی سے اب تک جاری ہے کیوں کہ اس وقت میر یہ دستور رہا کہ جب کوئی کتاب پڑھی اگر وہ میری ملک میں تو اس پر حواشی لکھ دیے اگر اعتراض ہوسکتا ہے تو اعتراض لکھ دیا اور اگر مضمون پیچیدہ ہے تو اسکی پیچیدگی دور کردی حنفی اصول فقہ کی کتاب مسلم الثبوت پر، صحیح بخاری کے نصف اول پر، صحیح مسلم اور جامع ترمذی پر، شرح رسالہ قطبیہ پر حاشیہ امور عامہ پر اور شمس بازغہ پر اکثر حواشی اس وقت لکھے جب کہ طلب علم کے زمانہ میں اپنے سبق کے لیے مطالعہ کرتا تھا۔
> علاوہ ازیں تیسیر شرح جامع صغیر پر، شرح چغمینی اور تصریح پر، اقلیدس کے تین مقالوں اور الزیج الاجد اور علامہ شامی کی ردالمختار پر بھی حواشی لکھے۔'' [1]

علوم الفرائض میں وراثت سے متعلق حساب کی ضرورت ہوتی ہے، اس علم کو صرف چند ساعتوں میں ازبر کرلیا وہ بھی زبانی درس لے کر۔ آپ تحریر فرماتے ہیں:

> ''بچپن میں استاذ محترم نے علم فرائض میں وارثوں کے حصے اور ان کی تقسیم کا طریقہ بتایا تھا وہ بھی زبان مبارک سے، کتاب کے بغیر صرف ایک گھڑی کے اندر اور حساب کے صرف چار قاعدے سکھائے تھے۔ ۱۔جمع، ۲۔تفریق، ۳۔ضرب، ۴۔تقسیم۔
> ان قاعدوں کی تعلیم اس لیے دی تھی کہ علم فرائض میں جو علوم دینیہ کا نصف ہے ان کی ضرورت پڑتی رہتی ہے اور علم ہیئت سے شرح چغمینی کے چند اوراق دائرۃ الارتفاع تک پڑھائے تھے۔ اور علم ہندسہ سے نصیر طوسی کی تحریر اقلیدس کی صرف

شکل اول کی تعلیم دی تھی۔" ۲؎

علمائے حرمین کے نام جو اجازات و اسانید جاری فرمائے ان کے مطالعہ سے امام احمد رضا کے استحضار و وجاہت علمیہ اور ذہانت و فطانت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ایک اقتباس کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں،

"ان علموں کی بھی اجازت دیتا ہوں جنہیں میں نے کسی افادہ بخش استاذ سے حاصل نہیں کیا نہ پڑھ کر نہ سن کر نہ باہمی گفتگو سے اور حاصل کردہ علموں کی تحصیل سے نہ مستغنی کر سکتے ہیں نہ ان کی استعداد دے سکتے ہیں اور مجھ جیسے ہمزمان ایسے علموں کی تعلیم و تعلم کے بغیر حاصل کرنے کے عادی بھی نہیں مگر اس عاجز و فقیر پر رب قدیر نے ایسا فضل فرمایا کہ میں نے انہیں محض کتب بینی سے اور نظر و فکر کے استعمال سے حل کر لیا کسی پر اعتماد کر کے اس کے حضور زانوئے تلمذ تہہ کرنے کی ضرورت نہ پڑی گویا اپنے اقران میں ان علوم کا موجد ہوں۔" ۳؎

یہ امام ممدوح کے استحضار علمی کی ایک جھلک ہے۔ اس موضوع پر تفصیل و وضاحت کے لیے قرطاس و وقت دونوں درکار ہیں۔

علم دین کی فرضیت: اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ دنیوی علوم اور جدید تہذیب کے دلدادہ حدیث پاک، **طلب العلم فریضة علیٰ کل مسلم و مسلمة** (ہر مسلمان مرد و عورت پر علم حاصل کرنا فرض ہے۔) بیان کرتے رہتے ہیں اور اس سے مراد کوئی بھی علم لے لیتے ہیں۔ چاہے وہ غیر مفید علوم ہوں یا علوم جدیدہ سائنس و اقتصادیات وغیرہ۔ جب کہ حدیث پاک کی مراد صرف "فرض عین علم یعنی علم دین ہے۔ امام احمد رضا قدس سرہ فرماتے ہیں:

"علمِ دین سیکھنا اس قدر کہ مذہب حق سے آگاہ ہو، وضو، غسل، نماز، روزے وغیرہا ضروریات کے احکام سے مطلع ہو، تاجر تجارت، مزارع زراعت، اجیر اجارے، غرض ہر شخص جس حالت میں ہے اس کے متعلق احکام شریعت سے واقف ہو، فرض عین ہے۔" ۴؎

اس پہلو سے امام ممدوح نے جو علمی بحث فرمائی ہے وہ فتاویٰ رضویہ (جدید) جلد ۲۳ آخر میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔ جو بڑی مبسوط، مدلل، مبرہن اور جامع و مانع ہے۔

غیر مفید علوم: یہود و نصاریٰ نے نظام تعلیم کے ایسے ضابطے تشکیل دیئے جن سے اخلاقی گراوٹ آئے، بے حیائی اور برے کاموں کو فروغ ملے۔ ایسے نظریات اختراع کر لیے جن سے عقائد تباہ ہو جائیں اور دینی حمیت رخصت ہو کر رہ جائے۔ غالباً علم اور مذہب کی جدا جدا خانوں میں تقسیم کے پیچھے یہی فکر مضمر تھی کہ دینی علوم کا ماہر دوسرے علوم سے بے بہرہ ہو جائے اور دنیوی علوم کا ماہر دین

کے علم سے دور رہے۔ یہ امر بھی پوشیدہ نہیں کہ باعث فخر و انبساط صرف دنیا کا علم تصور کیا جانے لگا جن میں دین سے دوری کا بہت کچھ سامان موجود ہے۔ امام احمد رضا قدس سرہ تحریر فرماتے ہیں:

"جو چیز اپنا دین و علم بقدر فرض سیکھنے میں مانع آئے حرام ہے اس طرح وہ کتابیں جن میں نصاریٰ کے عقائد باطلہ مثل انکار وجود آسمان وغیرہ درج ہیں ان کا پڑھنا بھی روا نہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم" ۵

فلاسفہ نے اپنے نظریات میں اسلام سے جدا راہیں تراش لیں۔ عقل خام کو ہی قبلہ قرار دے لیا اور اس ناپائیدار کسوٹی پر اسلامی عقائد کو پرکھنے کی کوشش کی اور ٹھوکر کھا گئے۔ بہت سے من گڑھت نظریات تراش لیے ایسے ہی گردش زمین کا نظریہ، آسمانوں اور جن و شیطان کے وجود کا انکار اور بہت سے قیاسات، جس کے سبب فلسفہ کی ایسی تعلیم کا حاصل کرنا مضر ٹھہرا۔ امام احمد رضا قدس سرہ اپنے فتاویٰ میں تحریر فرماتے ہیں:

"غیر دین کی ایسی تعلیم کہ تعلیم ضروری دین کو روکے مطلقاً حرام ہے۔ فارسی ہو یا انگریزی یا ہندی نیز ان باتوں کی تعلیم جو عقائد اسلام کے خلاف ہوں جیسے وجود آسمان کا انکار یا وجود جن و شیطان کا انکار یا زمین کی گردش سے لیل و نہار یا آسمانوں کا خرق و التیام محال ہونا یا اعادۂ معدوم ناممکن ہونا وغیرذلک عقاید باطلہ کہ فلسفہ قدیمہ وجدیدہ میں ہیں ان کا پڑھنا پڑھانا حرام ہے۔ کسی زبان میں ہو نیز ایسی تعلیم جس میں نیچریوں دہریوں کی صحبت رہے۔" ۶

ایک اور مقام پر تحریر فرماتے ہیں:

"سائنس وغیرہ وہ فنون و کتب پڑھنی جن میں انکار وجود آسمان و گردشِ آفتاب وغیرہ کفریات کی تعلیم ہو حرام ہے۔" ۷

فلسفہ اور امام ربانی و امام احمد رضا کا موقف: گزشتہ سطور میں فلسفہ اور فلاسفہ کے غلط نظریات سے متعلق امام احمد رضا قدس سرہ کا اقتباس گزرا۔ موقع کے مناسب یہاں امام ربانی مجدد الف ثانی کا تاثر تحریر کر دیا جاتا ہے تاکہ مجددین کی فکری مماثلت کا ایک پہلو بھی واضح ہو جائے۔

امام ربانی اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:

"لوگ فلاسفہ کے علوم کو پورا اور منتظم جانتے ہیں اور غلطی اور خطا سے محفوظ سمجھتے ہیں، اگر بفرض اس قسم کے ان علوم میں سچا بھی سمجھ لیا جائے جن میں عقل کو استقلال و دخل ہے تو وہ خارج از بحث ہیں اور بیکار کے دائرہ میں داخل ہیں اور آخرت سے

جو کہ دائمی ہے کوئی کام نہیں رکھتے اور اخروی نجات ان سے وابستہ نہیں ہے۔" 8

امام احمد رضا قدس سرہ کے الفاظ ملاحظہ فرمائیں اور دیکھیں کہ کیسی فکری یکسانیت و مناسبت ہے:

"اور فلسفہ تو حرام ہے، مضر اسلام ہے، اس میں منہمک رہنے والا اجھل جاہل، اجہل بلکہ اس سے زائد کا مستحق ہے۔" 9

فلاسفہ کے باطل نظریات کی بیخ کنی میں مجدد الف ثانی و امام احمد رضا کے کردار کے موضوع پر ایک تحقیقی مقالہ قلم بند کیا جاسکتا ہے۔ ارباب قرطاس وقلم کی اس سمت تھوڑی سی توجہ درکار ہے۔

استاذ کا منصب اور اس کے آداب: استاذ علم سے نوازتا ہے، امام احمد رضا قدس سرہ نے اپنی تصانیف میں متعدد مقامات پر استاذ کے ادب و احترام اور اکرام نیز اس کے مقام و منصب کی وضاحت فرمائی ہے۔ اور تعلیم وتعلم میں استاذ کے کردار کو اجاگر کیا ہے۔ امام احمد رضا قدس سرہ نے علم دین کے استاذ کی جو قدر ومنزلت ظاہر فرمائی ہے اور ان کے مرتبے کو بتایا ہے۔ اسے راقم بہ شکل نکات تحریر کرتا ہے:

(۱) "عالم دین ہر مسلمان کے حق میں عموماً اور استاذِ علم دین اپنے شاگرد کے حق میں خصوصاً نائب حضور پرنور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہے۔" 10

(۲) "حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں، جب میں بغرض تحصیل علم حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے درِ دولت پر جاتا اور وہ باہر تشریف نہ رکھتے ہوتے تو براہ ادب ان کو آواز نہ دیتا ان کی چوکھٹ پر سر رکھ کر لیٹ رہتا، ہوا خاک اور ریت اڑا کر مجھ پر ڈالتی پھر جب حضرت زید کاشانۂ اقدس سے تشریف لاتے اور فرماتے، اے ابن عم رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم، آپ نے مجھے اطلاع کیوں نہ کرادی، میں عرض کرتا مجھے لائق نہ تھا کہ میں آپ کو اطلاع کراتا۔" 11

"(۳) اگر اس کا (استاذ کا) حکم مباحات میں ہے تو حتی الوسع اس کی بجا آوری میں اپنی سعادت جانے،

(۴) علما فرماتے ہیں، جس سے اس کے استاذ کو کسی طرح کی ایذا پہنچی وہ علم کی برکت سے محروم رہے گا،

(۵) امام احمد رضا کے نزدیک اساتذہ کو دھوکا دینا خصوصاً امرِ دین میں گناہ کبیرہ ہے اور یہ یہودیوں کی خصلت ہے۔" 12

(۶) "پیر و استاذ علم دین کا مرتبہ ماں باپ سے زیادہ ہے۔ وہ مربی بدن ہیں یہ مربی

روح، جونسبت روح سے بدن سے ہے وہی نسبت استاد و پیر سے ماں باپ کو ہے۔" ۱۳

استاذ کا انکار کفرانِ نعمت ہے: صاحب علم کولازم ہے کہ استاذ کی عنایات ونوازشات کو یاد رکھے۔ جس نے علم جیسی دولت سے نوازا، سکھایا پڑھایا سنوارا، اگر اسی کا انکار کردیا جائے۔ اس کی خدمات کوفراموش کر دیا جائے۔ یہ غیر اخلاقی بلکہ غیر انسانی کام ہے۔ اور کفرانِ نعمت۔ امام احمد رضا قدس سرہ سے دریافت کیا گیا،

اگر کوئی صاحب اہل علم ہوکر اپنے استاد مربّی کا انکار کرے کہ ہمارا کوئی استاد نہیں باوجودیکہ گواہ موجود ہوں، تو اس کے واسطے کیا حکم ہے؟ بینوا توجروا۔

آپ نے جواب ارشادفرمایا:

"استاد کا انکار کفرانِ نعمت ہے اور کفرانِ نعمت موجب سزا وعقوبت۔" ۱۴

امام احمد رضا کا طریقِ تدریس:

امام احمد رضا قدس سرہ دورانِ تدریس چند امور کی طرف توجہ مبذول کراتے ہیں۔ مثلاً

(۱) جوعلم سکھایا جائے سیکھنے والا اس کا اہل ہو۔

(۲) استاذ جو پڑھا رہا ہے اس میں خود غواصی رکھتا ہو۔

(۳) استاذ متعلقہ کتابیں پوری تحقیق اور گہرائی کے ساتھ پڑھائے۔

(۴) تنقید کا پہلو بھی پیش نظر رہے تا کہ طلبہ کے ذہن میں کوئی اشکال وارد ہوتو اس کا تصفیہ بھی ہو۔

امام احمد رضا قدس سرہ اپنی تدریس کا حال تحریر فرماتے ہیں:

"فقیر نے قدرت والے رب کی مدد سے ان تمام علوم وفنون میں غواصی کی اور ان کے دقائق وحقائق آسان کر کے ان کے اصحاب کو سکھائے اور ان کی کتابیں پوری چھان بین اور تنقید کے ساتھ پڑھائیں۔" ۱۵

نا اہل کوعلم دینا علم کی توہین ہے۔ یہی سبب ہے کہ آج صلاحیت و قابلیت سے محروم سند یافتہ افراد کی بہتات ہے جو فتنے کا سبب بھی بنتے ہیں اورعلم کا ادب و احترام بھی اٹھتا جا رہا ہے۔ اور عمل کا فقدان مستزاد۔ امام احمد رضا قدس سرہ اپنے فتاویٰ میں صحیح بخاری کتاب العلم کی ایک حدیث پاک کے حوالے سے تحریر فرماتے ہیں:

"قابلیت سے باہر علم سکھانا فتنہ میں ڈالنا ہے اور نا قابل کو مباحث ومجادل بتانا دین کو معاذ اللہ ذلت کے لیے پیش کرنا ہے۔ نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

"اذا وسد الامر الیٰ غیر اھلہ فانتظر الساعۃ (جب نا اہل کو کام سپرد کیا

جائے تو قیامت کا انتظار کرو) واللہ تعالیٰ اعلم۔" ١٦

مدرّس کیسا ہو: عصری علوم کے ماہرین عموماً دین کی قدر و وقعت نہیں رکھتے یا اسے ثانوی حیثیت کا سمجھتے ہیں، معاذ اللہ۔ جو تعلیم یافتہ ایسی غلط فکر رکھتے ہوں ایسے کو استاذ بنانا شرعاً ممنوع ہے۔ ایسے سے دین کی تعلیم لینا ضرر کا سبب ہوگا اور ان سے احتراز چاہیے۔ امام احمد رضا قدس سرہ فرماتے ہیں:

"اور جب وہ (مدرس) دین کا تنزل چاہنے والا ہے تو تعلیم دین کی ترقی اس سے کیوں کر متوقع ہے، اس مدرسہ کے پاس نہ جانا چاہیے اور چھوڑ دیا جائے کہ اسی کے خیال والے اس میں پڑھیں۔" ١٧

ایک مقام پر آپ تحریر فرماتے ہیں:

"مدرس کے لیے ذی علم، ذی فہم، سنّی صحیح العقیدہ ہونا کافی ہے۔" ١٨

سند کی ضرورت: عصر حاضر میں ایسے افراد کی بہتات ہے جو تھوڑی بہت علمی شُد بُد رکھ لینے پر خود کو بہت بڑا اہل علم گردانتے ہیں۔ افسوس تو اس کا ہے کہ بے علم بھی خود کو دھڑلے سے عالم کہہ اور کہلوا رہے ہیں۔ بعض تو چند کتابیں پڑھ لیتے ہیں اور اثر و رسوخ کا استعمال کر کے کہیں کی سند حاصل کر لی تو مولانا کہلواتے پھرتے ہیں۔ یا پھر تھوڑی بہت لفاظی سیکھ لی اور تقریریں کر لیں، چند لطیفے، غیر مستند روایات بیان کر دیں اور خود کو علامہ جان بیٹھے۔ پھر جب کوئی مسئلہ دینی پوچھا جاتا ہے تو عدم واقفیت کے باوجود اپنی بنانے کے لیے الٹے سیدھے جواب دے کر فتنوں کے راستے کھول دیتے ہیں۔ امام احمد رضا قدس سرہ نے با ضابطہ درس لینے اور علم حاصل کرنے کو اہمیت دی ہے اور بے قاعدہ تعلیم پا کر صاحب علم منوانے اور کہلوانے والے افراد کو جاہل قرار دیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"سند حاصل کرنا تو کچھ ضروری نہیں، ہاں باقاعدہ تعلیم پانا ضرور ہے۔ مدرسہ میں ہو یا کسی عالم کے مکان پر، اور جس نے بے قاعدہ تعلیم پائی وہ جاہل محض سے بدتر، نیم ملاّ خطرۂ ایمان ہوگا ایسے شخص کو فتویٰ نویسی پر جرأت حرام ہے۔ حدیث میں ہے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں: من افتی بغیر علم لعنتہ ملٰئکۃ السماء والارض۔ جو بے علم فتویٰ دے اس پر آسمان و زمین کے فرشتوں کی لعنت ہے۔" ١٩

صحبت کا اثر: صحبت کے بارے میں امام احمد رضا قدس سرہ کے متعدد فتاویٰ میں بحث ملتی ہے۔ آپ عقیدے کو فوقیت دیتے ہیں۔ اس سبب جن کے عقیدے کھوٹے ہیں ان سے تعلیم لینے ان کی صحبت اختیار کرنے کو مضر قرار دیتے ہیں۔ ایک طالب علم نے سوال کیا کہ؟

"وہابیوں کے پاس اپنے لڑکوں کو پڑھانا کیسا ہے اور جوان کے پاس اپنے لڑکے کو پڑھانے کے لیے بھیجے اس کے واسطے کیا حکم ہے؟

جواب ارشاد فرمایا:

"حرام حرام حرام اور جو ایسا کرے بدخواہ اطفال و جلائے آثام۔ قال اللہ تعالی.

یاَیُّھَا الَّذِیْنَ امنوا قو انفسکم و اھلیکم ناراً (اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو دوزخ کی آگ سے بچاؤ۔) واللہ سبحنہ و تعالی اعلم۔" [20]

صحبت کے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ والدین کو چاہیے کہ بچوں کو ایسی صحبت سے بچائیں جو اخلاق و کردار کی تباہی و بربادی کا سبب ہو اور ایسی صحبت تو بڑی خطرناک ہے جس سے ایمان و عقیدے کو خطرہ لاحق ہو۔

تعلیمی پیغام: ۱۵ ر جمادی الاخریٰ ۱۳۳۰ھ کو مولانا شاہ محرم علی چشتی صدر ثانی انجمن نعمانیہ لاہور نے دینی و تعلیمی، قومی و ملی اور اشاعتی و اعتقادی مسائل سے متعلق دس نکاتی سوال نامہ امام احمد رضا کی بارگاہ میں ارسال کیا جن کا جواب بڑا انقلابی، فکری و ہمہ پہلو خوبیوں پر مبنی ہے۔ امام احمد رضا نے اس میں قوم کے تعلیمی و فکری انحطاط اور اس کے تدارک پر روشنی ڈالی ہے نیز دس نکاتی تعلیمی منصوبہ بھی دیا ہے جس پر عمل کرلیا جاتا تو آج قوم کی حالت قدرے مختلف ہوتی اور بہتر ہوتی۔ افسوس صد افسوس! اس تعلیمی پیغام کو سو سال پورے ہونے کو آئے مگر ہم اس پر عمل سے غافل ہی رہے۔ راقم ان نکات کو نمبر وار درج کرتا ہے جو ہمیں بیداری کا پیغام دے رہے ہیں اور دعوت فکر بھی:

"(۱) عظیم الشان مدارس کھولے جائیں۔ باقاعدہ تعلیمیں ہوں۔

(۲) طلبہ کو وظائف ملیں کہ خواہی نخواہی گرویدہ ہوں۔

(۳) مدرسوں کی بیش قرار تنخواہیں ان کی کارروائیوں پر دی جائیں کہ لالچ سے جان توڑ کر کوشش کریں۔

(۴) طبائع طلبہ کی جانچ ہو جو جس کام کے زیادہ مناسب دیکھا جائے معقول وظیفہ دے کر اس میں لگایا جائے۔ یوں ان میں کچھ مدرسین بنائے جائیں، کچھ واعظین، کچھ مصنفین، کچھ مناظرین، پھر تصنیف و مناظرہ میں بھی توزیع ہو۔ کوئی کسی فن پر کوئی کسی پر۔

(۵) ان میں جو تیار ہوتے جائیں۔ تنخواہیں دے کر ملک میں پھیلائے جائیں کہ تحریراً و تقریراً، وعظاً و مناظرۃً اشاعت دین و مذہب کریں۔

(۶) حمایت (مذہب) و ردّ بد مذہباں میں مفید کتب و رسائل مصنفوں کو نذرانے دے کر تصنیف کرائے جائیں۔

(۷) تصنیف شدہ اور تو تصنیف رسائل عمدہ اور خوش خط چھاپ کر ملک میں مفت

شائع کیے جائیں۔

(۸) شہروں شہروں آپ کے سفیر نگراں رہیں جہاں جس قسم کے واعظ یا مناظر یا تصنیف کی حاجت ہو آپ کو اطلاع دیں۔ آپ سرکوبیٔ اعدا کے لیے اپنی فوجیں، میگزین رسالے بھیجتے رہیں۔

(۹) جو ہم میں قابل کار موجود اور اپنی معاش میں مشغول ہیں، وظائف مقرر کر کے فارغ البال بنائے جائیں۔ اور جس کام میں انھیں مہارت ہو لگائے جائیں۔

(۱۰) آپ کے مذہبی اخبار شائع ہوں اور وقتاً فوقتاً ہر قسم کے حمایت مذہب میں مضامین تمام ملک میں بقیمت و بلا قیمت روزانہ یا کم از کم ہفتہ وار پہنچاتے رہیں۔" [۳۱]

یہ پیغام اپنانے اور عمل کرنے کے لیے دیا گیا۔ تبرک جان کر رکھنے کو نہیں۔ ہم نے ان پر عمل نہیں کیا۔ عمل کب کریں گے؟ کیا عمل کا وقت نہیں آیا؟ کب تک سوتے رہیں گے؟ خواب غفلت سے جگانے والے نے تو جگا دیا تھا۔ بیدار کر دیا تھا۔ اس کو پیغام سنائے ایک صدی گزرنے کو آئی ؎

سونا جنگل رات اندھیری چھائی بدلی کالی ہے = سونے والو! جاگتے رہیو چوروں کی رکھوالی ہے

وقت کی اہمیت کو اب بھی پہچان لیں۔ دشمنان اسلام تو اپنے مشن میں لگے ہی رہے۔ آگے بڑھتے ہی رہے۔ باطل قوتیں سرگرم عمل رہیں۔ ہم جاگ گئے ہوتے تو ایک انقلاب برپا ہوتا۔ ایک صالح انقلاب آج جس کی ضرورت ہے۔ جس کی بنیاد اسلام کے نظام علم پر ہے۔ امام احمد رضا کے پیغام کا ایک ایک نکتہ ایسا کہ ان پر عمل کر لیا جائے تو بہار ہی بہار، عروج ہی عروج اور اقبال ہی اقبال۔

اساتذہ سے مدد اور رائے لینا: درس سے فراغت کے بعد بھی تجربہ کار استاذ کی مدد پیش آسکتی ہے۔ مثلاً طب سے متعلق استاذ سے رائے مشورہ کی ترغیب دیتے ہوئے مولانا عبدالعزیز بریلوی (رنگون) کے نام ایک مکتوب میں امام احمد رضا قدس سرہ تحریر فرماتے ہیں۔

"کسی استاذ شفیق نے تمھیں مجاز و ماذون کر دیا مگر میری رائے میں تم ہرگز ہرگز ہنوز مستقل تنہا گوارا نہ کرو اور جب تک ممکن ہو مطب دیکھتے اور اصلاحیں لیتے رہو۔ میں نہیں کہتا کہ جداگانہ معالجہ کے لیے نہ بیٹھو۔ بیٹھو مگر اپنی رائے کو ہرگز رائے نہ سمجھو اور ذرا ذرا میں اساتذہ سے استعانت لو۔ رائے لینے میں کسی چھوٹے بڑے سے عار نہ کرو۔ کوئی علم (میں) کامل نہیں ہوگا، جب تک آدمی بعد فراغ درس جس دن اپنے آپ کو عالم مستقل جانا اسی دن اس سے بڑھ کر کوئی جاہل نہیں۔ [۳۲]

بچیوں کی تعلیم و تربیت: امام احمد رضا قدس سرہ بچیوں کی تعلیم کے سلسلے میں شرعی احکام کی

پاس داری کو فوقیت دیتے ہیں۔ پردہ کی تاکید کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں،

"رہا پردہ اس میں استاذ وغیر استاذ، عالم وغیر عالم، پیر سب برابر ہیں۔ نو برس سے کم کی لڑکی کو پردہ کی حاجت نہیں اور جب پندرہ برس کی ہو سب غیر محارم سے پردہ واجب، اور نو برس سے پندرہ تک اگر آثار بلوغ ظاہر ہوں تو واجب اور نہ ظاہر ہوں تو مستحب، خصوصاً بارہ برس کے بعد بہت مؤکد کہ یہ زمانہ قرب بلوغ وکمال اشتہا کا ہے۔" ۲۳

یوں ہی بچیوں کی ضروری دینی تعلیم سے متعلق ایک سوال کے جواب میں متعدد ضابطے اور تربیتی نکات تحریر فرمائے جنہیں ترتیب وار لکھا جاتا ہے:

"(۱) عقائدِ اہلِ سُنّت و مسائلِ اہلِ سُنّت کی کتابیں پڑھائی جائیں، عقائد و مسائلِ ضروریہ کی تعلیم فرض ہے۔

(۲) حساب وغیرہ بعض مفید باتیں بھی سکھانے میں حرج نہیں۔

(۳) اصولِ حفظانِ صحت جہاں تک مسائل اسلامیہ کے خلاف نہ ہوں ان کی تعلیم میں مضائقہ نہیں اور جو مخالف ہیں بیماری اڑ کر لگنے کے دھوے، ان کی تعلیم جائز نہیں۔

(۴) تدبیر منزل بروجہ مطابق شرعی وحقوق شوہر واولاد۔

(۵) مذمتِ کذب وغیبت وضرورتِ پردہ وحجاب کی بھی تعلیم ہو۔" ۲۴

عہدِ حاضر میں ضرورت ہے کہ امام احمد رضا قدس سرہ کے تعلیمی افکار ونظریات کو فروغ دیا جائے۔ آپ کے تعلیمی پیغام کو مسلمانوں میں عام کیا جائے، تجاویز پر عمل کیا جائے تاکہ علم سے رغبت بڑھے، دینی علوم کا احترام قلب میں راسخ ہو اور عصری علوم کا حصول بھی دین کی مضبوط بنیادوں پر ہو تاکہ تمدن مغرب کی چمک دمک نگاہوں کو خیرہ نہ کر سکے اور حضور رحمت عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کی محبت والفت کا سرمہ نگاہوں میں رچا بسا رہے۔

حوالہ جات:

(۱) احمد رضا خاں، امام، الاجازات المتینۃ لعلماء بکۃ و المدینۃ، مشمولہ رسائل رضویہ، ادارہ اشاعت تصنیفات رضا بریلی، ترجمہ محمد احسان الحق قادری رضوی، مولانا، ص ۱۵۷

(۲) ایضاً، ص ۱۶۳

(۳) ایضاً، ص ۱۵۵

(۴) احمد رضا خاں، امام، فتاویٰ رضویہ (جدید) جلد ۲۳، مرکز اہلِ سُنّت برکات رضا پور بندر رت، ص ۶۴۷

(۵) ایضاً، ص ۵۴۳
(۶) ایضاً، ص ۷۰۶
(۷) ایضاً، ص ۷۰۹
(۸) شیخ احمد سرہندی، مجدد الف ثانی، مکتوبات امام ربانی، جلد ۳، دفتر سوم، اسلامک پبلشر دہلی، ص ۷۲
(۹) احمد رضا خاں، امام، فتاویٰ رضویہ (جدید) جلد ۲۳، مرکز اہلِ سُنّت برکات رضا پور بندر گجرات، ص ۶۲۸
(۱۰) ایضاً، ص ۶۳۸
(۱۱) محمد مصطفیٰ رضا خاں، مولانا، الملفوظ، حصہ اول، رضا اکیڈمی بمبئی ۲۰۰۶ء، ص ۷۶
(۱۲) ملاحظہ فرمائیں۔ فتاویٰ رضویہ (جدید) جلد ۲۳، مرکز اہلِ سُنّت برکات رضا پور بندر گجرات، ص ۶۳۹، ص ۶۸۲
(۱۳) ایضاً، ص ۷۰۱
(۱۴) ایضاً، ص ۷۰۷
(۱۵) احمد رضا خاں، امام، الاجازات المتینہ لعلماء بکۃ و المدینۃ، مشمولہ رسائل رضویہ، ادارہ اشاعت تصنیفات رضا بریلی، ترجمہ محمد احسان الحق قادری رضوی، مولانا، ص ۱۶۳۔
(۱۶) احمد رضا خاں، امام، فتاویٰ رضویہ (جدید) جلد ۲۳، مرکز اہلِ سُنّت برکات رضا پور بندر گجرات، ص ۷۱۴
(۱۷) ایضاً، ص ۶۹۴
(۱۸) احمد رضا خاں، امام، فتاویٰ رضویہ (قدیم) جلد ۱۲، رضا اکیڈمی ممبئی، ص ۱۳۱
(۱۹) احمد رضا خاں، امام، فتاویٰ رضویہ (جدید) جلد ۲۳، مرکز اہلِ سُنّت برکات رضا پور بندر گجرات، ص ۷۱۶
(۲۰) ایضاً، ص ۶۸۲۔ / التحریم ۲
(۲۱) احمد رضا خاں، امام، فتاویٰ رضویہ (قدیم) جلد ۱۲، رضا اکیڈمی ممبئی، ص ۱۳۳۔۱۳۴۔
(۲۲) غلام جابر شمس مصباحی، ڈاکٹر، کلیات مکاتیب رضا، جلد ۲، دارالعلوم قادریہ صابریہ برکات رضا کلیر شریف، ص ۱۴۷۔ ۱۴۸
(۲۳) احمد رضا خاں، امام، فتاویٰ رضویہ (جدید) جلد ۲۳، مرکز اہلِ سُنّت برکات رضا پور بندر گجرات، ص ۶۳۹
(۲۴) ایضاً، ص ۶۸۷

امام احمد رضا کے تعلیمی نظریات پر ریسرچ ورک

از: غلام مصطفیٰ رضوی (نوری مشن مالیگاؤں)

اسلام نے اپنی آفاقی تعلیمات میں علم اور تعلیم کو بڑی اہمیت دی ہے۔ قرآن مقدس اور احادیث میں علم کے فضائل ببرکات بیان ہوئے ہیں اور علم دین کا سیکھنا فرض قرار دیا گیا ہے۔ علم حاصل کر کے اسے عام کرنے پر انعامات خسروانہ کی بشارت دی گئی ہے۔ علمائے حق نے علم دین کے فروغ میں سرگرم کردار ادا کیا۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا محدث بریلوی (ولادت: ۱۲۷۲ھ/۱۸۵۶ء۔ وصال: ۱۳۴۰ھ/۱۹۲۱ء) کی دینی وعلمی خدمات کا معترف سارا عالمِ اسلام ہے۔ آپ کی ہشت پہلو شخصیت کا ایک گوشہ تعلیم (ایجوکیشن) کے شعبے میں مہارت بھی ہے۔ آپ جدید وقدیم علوم وفنون میں دست رس رکھتے تھے۔ آپ نے نظام ہائے تعلیم میں در آئی غلطیوں کی اصلاح بھی کی اور غیر اسلامی نظریات کا سدباب کیا اور تعلیم کا بنیادی مقصد معرفتِ الٰہی عزوجل ومحبتِ رسالت پناہی ﷺ قرار دیا۔ آپ نے استاذ کا احترام سکھایا، صالح معاشرے کے قیام میں تعلیم کے رول کو واضح کیا، علم کے آداب بتائے، استاذ وشاگرد کے حقوق ومراتب واضح کیے، علوم وفنون کے ضابطے مقرر کیے، سائنس اور دیگر علومِ عقلیہ کی اصلاح کی، علم وعلما کے فضائل بتائے، تربیتِ اولاد میں والدین کی ذمہ داریوں کو اجاگر کیا۔

امام احمد رضا قدس سرہ کی شخصیت اور حیات و خدمات کے موضوع پر دنیا کی بیش تر یونی یورسٹیوں اور جامعات میں ریسرچ وتحقیق کی جارہی ہے اور مقالۂ تحقیق پر ڈگری ایوارڈ کی جارہی ہے۔ درج ذیل سطور میں ہم امام احمد رضا قدس سرہ کے تعلیمی نظریات پر ہونے والے علمی وقلمی امور پر اجمالی روشنی ڈالیں گے۔

☆ **ایم۔ایڈ فیکلٹی کے لیے امام احمد رضا قدس سرہ کے تعلیمی افکار پر پاکستان میں بہتر کام ہوئے ہیں اور مقالۂ تحقیق لکھے گئے ہیں اس ضمن میں ایک فہرست درج کی جاتی ہے۔**

مقالہ جات (برائے ایم۔ایڈ)

نمبر شمار	عنوان	مقالہ نگار	مقام تحقیق
۱	مولانا احمد رضا بریلوی کے تعلیمی نظریات وافکار	(۱) محمد افضل	آئی۔ای۔آر،
		(۲) عبدالقیوم	جامعہ پنجاب (لاہور)

۲	اعلیٰ حضرت امام احمد رضا بریلوی کی علمی خدمات	ایس۔شاہد علی	آئی۔ای۔آر، جامعہ پنجاب (لاہور)
۳	مولانا احمد رضا اور مولانا مودودی کے تعلیمی نظریات کا تقابلی جائزہ	(۱) چوہدری محمد یعقوب (۲) محمد حفیظ کمبوہ	آئی۔ای۔آر، جامعہ پنجاب (لاہور)
۴	مولانا احمد رضا کے افکار کی روشنی میں تصور تعلیم ونصاب	محمد اسلم اصغر علی	آئی۔ای۔آر جامعہ پنجاب (لاہور)
۵	مولانا احمد رضا خاں کی اصلاحی وتعلیمی خدمات	(۱) خادم حسین (۲) محمد اشرف	آئی۔ای۔آر جامعہ پنجاب (لاہور)
۶	مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے تعلیمی نظریات و افکار	(۱) عبدالوحید گل (۲) رشید احمد	آئی۔ای۔آر جامعہ پنجاب (لاہور)
۷	مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے تعلیمی نظریات کا جائزہ	(۱) حافظ ذوالفقار علی (۲) غلام احمد	آئی۔ای۔آر جامعہ پنجاب (لاہور)
۸	مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے تعلیمی افکار	خالدہ پروین	گورنمنٹ کالج آف ایجوکیشن (فیصل آباد)
۹	اصلاح معاشرہ کے لیے مولانا احمد رضا کی سعی وکاوش کا جائزہ	ایس۔ایم۔وارث	گورنمنٹ کالج آف ایجوکیشن (فیصل آباد)
۱۰	مولانا احمد رضا خاں اور علامہ اقبال کے تعلیمی نظریات کا تقابلی جائزہ	عظیم اللہ جندران	اسلامیہ یونی ورسٹی، بہاول پور، شعبۂ ٹیچرز ٹریننگ
۱۱	امام احمد رضا خاں بریلوی کے تعلیمی نظریات	ترک ولی محمد	جامعہ کراچی، ڈپارٹمنٹ آف ایجوکیشن

راقم کی ناقص معلومات کے مطابق مذکورہ مقالہ جات غیر مطبوعہ ہیں۔ان کی اشاعت ضرور کی جانی چاہیے۔ماہنامہ معارف رضا کراچی کے مدیر سیدوجاہت رسول قادری لکھتے ہیں:''تعلیمات رضویات سے شغف رکھنے والے احباب سے درخواست ہے کہ وہ ایم۔فل یا پی۔ایچ۔ڈی درجہ کے تحقیقی کام کے لیے قدم آگے بڑھائیں۔مثلاً Imam Ahmed Reza Khan as an Islamic Educationist کے موضوع پر مزید کام کیا جاسکتا ہے۔ملکی جامعات کے شعبۂ علوم اسلامیہ شعبۂ ایجوکیشن سے رجسٹریشن ممکن ہوسکتی ہے۔

Foundation of Islamic Education system in the light of Imam

ahmed Reza Khan's teachings کے موضوع پر بھی تحقیقی کام کی گنجائش اور ضرورت موجود ہے۔" (امام احمد رضا اور انٹرنیشنل جامعات ص۳۱۔۳۲ طبع کراچی)

امام احمد رضا کے تعلیمی افکار وتصورات کے موضوع پر اب تک درجنوں مقالے قلم بند کیے جاچکے ہیں، تاہم بہت سارے عنوانات اب بھی تشنۂ تحقیق ہیں۔ امام احمد رضا کے فتاویٰ "فتاویٰ رضویہ" (قدیم ۱۲ جلدیں، جدید ۳۰ جلدیں) کا زیرِقلم موضوع پر عمیق مطالعہ کرنے سے بہت سے لعل و جواہر منظر عام پر آسکتے ہیں۔ اُمید کہ اربابِ تحقیق غواصی کریں گے اور مسلمانوں کے وقار کو بلند کرنے کے لیے اس موضوع کو آگے بڑھائیں گے۔ علم وتعلیم سے مسلمانوں کے ذوق وشوق کو مربوط کرنے کا سامان مہیا کریں گے۔

یہ خبر بھی خوش آیند ہے کہ برصغیر کے کئی جامعات ویونیورسٹیز کے نصاب میں امام احمد رضا کی دینی وعلمی خدمات کو شامل کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں ادارۂ تحقیقات امام احمد رضا انٹرنیشنل کراچی نے عالمی جامعہ امام احمد رضا (Imam Ahmad Reza World University) کا ایک خاکہ مرتب کیا ہے جس پر پیش رفت کی جاچکی ہے۔ تشنہ موضوعات پر امام احمد رضا کے کارہائے علمیہ کی روشنی میں کام کرنے کے لیے سلیم اللہ جندران (ریسرچ اسکالر جامعہ پنجاب لاہور) نے چند اہم موضوعات متعین فرمائے ہیں۔ جن میں بعض درج کئے جاتے ہیں:۔

چند اہم موضوعات

(۱) فاصلاتی نظام تعلیم وتربیت کی ترویج وارتقا میں فتاویٰ رضویہ کا حصہ

(۲) امام احمد رضا بحیثیت ماہر تعلیم

(۳) ترقی ادب (اردو، عربی، فارسی) میں امام احمد رضا خاں کا کردار

(۴) افکار رضا کی عصر حاضر میں افادیت

(۵) فکرِ رضا کی روشنی میں مسلم اُمہ کے اتحاد کے لیے لائحہ عمل

(۶) امام احمد رضا خاں بحیثیت سائنسداں یا امام احمد رضا خاں کی سائنسی خدمات کا جائزہ

(۷) امام احمد رضا خاں ماہر لسانیات (عربی، فارسی، اردو، ہندی)

(۸) درسیات ونصابیات کے لیے انتخاب رضویات

(۹) امام احمد رضا خاں، ماہر ارضیات

(۱۰) برصغیر پاک وہند میں مسلم ایجوکیشن کے فروغ میں امام احمد رضا کا کردار (ماہنامہ معارف رضا کراچی، اگست ۲۰۰۶ء)

(۱۱) علم ریاضی میں امام احمد رضا کی خدمات کا تحقیقی جائزہ

راقم نے فتاویٰ رضویہ کے حوالے سے تعلیم کے بعض جزئیات پر علمی کام کا آغاز کیا اور محسوس کیا کہ جدید نظام تعلیم، نصاب تعلیم میں لادینی نظریات کی آمیزش، علوم عقلیہ سائنس وفلسفہ کے ضوابط اور ان موضوعات پر ریسرچ وتحقیق اور اصلاح نیز ان کے توسط سے اسلامی عقاید وتعلیمات کے فروغ و اشاعت کے لیے فتاویٰ رضویہ میں بحرِ علم موجزن ہے۔ نیز ۱۳۳۰ھ میں امام احمد رضا نے جودس نکاتی منصوبہ پیش فرمایا تھا وہ بھی فروغ علم ہی سے متعلق ہے۔ ڈاکٹر عبدالنعیم عزیزی (ایم۔اے، پی۔ایچ۔ڈی) رقم طراز ہیں:

> '' امام احمد رضا اپنے تعلق پروگرام کے توسط سے جس ماڈل اسلامی معاشرہ کی تشکیل چاہتے ہیں اس معاشرہ میں تعلیم دینے والے اساتذہ کو ایسا استاذ دیکھنا چاہتے ہیں کہ جو تعلیم دینے کا مقصد فقط ڈیوٹی کی انجام وہی نہ سمجھیں وہ ایسے افراد کی پیداوار میں اضافہ کریں اور اس اضافہ کو یقینی بنائیں جن سے اسلامی فلاحی معاشرہ کی تشکیل ہو۔''

(ماہنامہ کنزالایمان دہلی ستمبر ۲۰۰۶ء،۳۰)

ذیل میں ایسے مقالہ جات کی ایک فہرست درج کی جاتی ہے جو امام احمد رضا کے تعلیمی تصورات کے تحت لکھے گئے ہیں اور مطبوع ہیں تاہم انھیں مقالہ جات کا اندراج کیا جاتا ہے جن تک راقم کی رسائی ہوئی ہے۔

تعلیمی موضوع پر مضامین ومقالہ جات

نمبر شمار	عنوان	مقالہ نگار	اشاعت
۱	امام احمد رضا خاں کا طریقۂ تدریس	سلیم اللہ جندران	معارف رضا کراچی، سالنامہ ۲۰۰۴ء
۲	طلب علم کی فرضیت: فکر رضا کی روشنی میں (مشمولہ علم دین ودنیا)	مولانا محمد عبدالمبین نعمانی مصباحی	رضا اکیڈمی مالیگاؤں
۳	دارالعلوم منظر اسلام	پروفیسر محمد مسعود احمد/ سید وجاہت رسول قادری	ادارۂ تحقیقات امام احمد رضا کراچی
۴	امام احمد رضا کے جدید تعلیمی نظریات	ڈاکٹر عبدالنعیم عزیزی	ماہ نامہ کنزالایمان دہلی، ستمبر ۲۰۰۶ء
۵	امام احمد رضا کے جدید اسلامی تعلیمی نظریات	نومسلم پروفیسر ڈاکٹر محمد ہارون	رضا اکیڈمی برطانیہ
۶	معلم مطلوب ومتعلم مطلوب	عظیم اللہ جندران	معارف رضا کراچی، سلور جوبلی سالنامہ ۲۰۰۵ء

۷	امام احمد رضا کا تصور نصاب	عظیم اللہ جندران	سالنامہ یادگارِ رضا ۲۰۰۴ء رضا اکیڈمی ممبئی
۸	امام احمد رضا کے نظریۂ تعلیم کی خصوصیات	سلیم اللہ جندران	سہ ماہی افکار رضا، ممبئی جنوری تا جون ۲۰۰۲ء
۹	تعمیرِ شخصیت اور تربیتِ اولاد کا اسلامی ماڈل (تعلیماتِ رضا کی روشنی میں)	سلیم اللہ جندران	معارف رضا کراچی ،سالنامہ ۲۰۰۳ء
۱۰	مولانا احمد رضا خاں اور احترام استاذ	ڈاکٹر ظہور احمد اظہر	ماہنامہ معارف رضا کراچی، ستمبر ۲۰۰۴ء
۱۱	امام احمد رضا کا نظریۂ تعلیم	جلال الدین قادری	رضا دارالاشاعت لاہور
۱۲	فاضل بریلوی کے تعلیمی نظریات	پروفیسر محمد مسعود احمد نقشبندی	ماہنامہ معارف رضا کراچی ،منظر اسلام نمبر ۲۰۰۱ء
۱۳	علمیات امام احمد رضا خاں کی نظر میں	سلیم اللہ جندران	مجلّہ علم کی روشنی، اسلام آباد شمارہ نمبر ۲ جلد ۲
۱۴	عہد رضا میں دینی تعلیم کی اہمیت اور معیار تعلیم	حسن رضا خاں	ماہنامہ معارف رضا کراچی، منظر اسلام نمبر ۲۰۰۱ء
۱۵	اعلیٰ حضرت کے تعلیمی نظریات	عابد میر قادری	مجلّہ نوائے اساتذہ لاہور، ستمبر اکتوبر ۲۰۰۳ء
۱۶	تکریم اساتذہ: اعلیٰ حضرت کی نظر میں	محمد حسین امام	ماہنامہ جہانِ رضا لاہور، جنوری ۲۰۰۶ء
۱۷	اعلیٰ حضرت کے تعلیمی مقاصد	سید محمد علیم الدین شاہ الازہری	ماہنامہ معارف رضا کراچی نومبر ۲۰۰۱ء
۱۸	خطاب: اعلیٰ حضرت اور جامعہ منظر اسلام	سید قمر الزماں شاہ	ماہنامہ معارف رضا کراچی، نومبر ۲۰۰۱ء
۱۹	خلیفۂ اعلیٰ حضرت صدر الشریعہ اور ان کا نظریۂ تعلیم	مفتی محمد اختر حسین قادری خلیل آبادی	سالنامہ یادگار رضا ۲۰۰۷ء رضا اکیڈمی ممبئی
۲۰	اعلیٰ حضرت اور استاذ کا مقام و مرتبہ	غلام مصطفےٰ رضوی	سہ ماہی سُنّی دعوت اسلامی، ممبئی (جنوری تا مارچ ۲۰۰۷ء)

۲۱	تعلیم و تعلّم اور امام احمد رضا	غلام مصطفےٰ رضوی	سہ ماہی افکار رضا، ممبئی (اپریل تا جون ۲۰۰۶ء)
۲۲	معلّم و متعلّم اور علم کے اسلامی تصورات (فکرِ رضا کی روشنی میں)	غلام مصطفےٰ رضوی	سہ ماہی افکار رضا، ممبئی
۲۳	امام احمد رضا اور تصورِ تعلیم	غلام مصطفےٰ رضوی	نوری مشن مالیگاؤں ۲۰۰۷ء
۲۴	دار العلوم منظر اسلام اور امام احمد رضا	غلام مصطفےٰ رضوی	ماہنامہ ضیائے حرم لاہور، مئی ۲۰۰۷ء
۲۵	مولانا احمد رضا خاں کا نصاب تربیت	سلیم اللہ جندران	ماہنامہ ضیائے حرم لاہور
۲۶	مقاصدِ تعلیم امام احمد رضا کی نظر میں	سلیم اللہ جندران	معارف رضا کراچی، سالنامہ ۱۹۹۹ء
۲۷	منصبِ تعلیم اور تعلیماتِ رضا	پروفیسر انوار احمد زئی	ماہنامہ معارف رضا کراچی، مئی ۲۰۰۲ء
۲۸	امام احمد رضا کے حوالے سے تدریس	ڈاکٹر حسین مجیب مصری	ماہنامہ معارف رضا کراچی، مارچ ۲۰۰۳ء
۲۹	امام احمد رضا کا نظریۂ تعلیم	پروفیسر عبدالغفار گوہر	معارف رضا کراچی، سالنامہ ۲۰۰۱ء
۳۰	امام احمد رضا کے طریقۂ تدریس کی امتیازی خصوصیات	عظیم اللہ جندران	معارف رضا کراچی، سالنامہ ۲۰۰۷ء
۳۱	Imam Ahmed Reza concept of Teacher	رانا دلشاد احمد	معارف رضا سالنامہ ۲۰۰۳ء (انگریزی ایڈیشن)
۳۲	Imam Ahmed Reza theories on Eeducation	ترک ولی محمد قادری	معارف رضا سالنامہ ۲۰۰۵ء (انگریزی ایڈیشن)
۳۳	The importance of Imam Ahmed Reza ten point plan for Modem Muslim Education	نومسلم پروفیسر ڈاکٹر محمد ہارون	معارف رضا سالنامہ ۲۰۰۵ء (انگریزی ایڈیشن)

OOOOOO

رسومِ شادی اور فکرِ امام احمد رضا

از: **غلام مصطفےٰ قادری رضوی**، باسنی، ناگور، راجستھان

امام احمد رضا محدث بریلوی قدس سرہ نے معاشرتی خرابیوں کے سدِ باب کے لیے جو کاوشیں کی ہیں وہ بے مثال ہیں۔ اس سلسلے میں آپ نے زبان سے زیادہ قلم کا استعمال کیا اور کئی ایک اصلاحی کتب قومِ مسلم کو عطا فرمائیں اور بقول مولانا محمد مصباحی اعظمی "امام احمد رضا قادری بریلوی علیہ الرحمہ (۱۲۷۲ھ/۱۳۴۰ھ) کی تصنیفات تین اہم حصوں میں تقسیم کی جاسکتی ہیں جس کی روشنی میں ان کی تجدیدی، اصلاحی اور علمی خدمات کا اجمالی نقشہ سامنے آجاتا ہے: (۱) اصلاحِ عقاید اور تصحیح نظریات (۲) اصلاحِ اعمال اور تصحیح عادات (۳) علمی افادات اور فنی تحقیقات۔

شادیوں میں جو غیر شرعی رسمیں اور برائیاں پائی جاری ہیں ان سے سوائے نقصان کے کچھ ہاتھ نہیں آتا لیکن مغربی تہذیب و تمدن (Western Civilisation) پر عمل کرنے میں کامیابی تصور کرنے والا مسلمان آج ان خرافات کو بجالانے میں فخر محسوس کرتا ہے۔ یہ بات قابلِ افسوس ہے۔ اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے، اس کی تعلیمات و ہدایات ہماری کامیابی کی ضمانت ہیں۔ اس مذہب مہذب نے ہر موڑ پر ہماری رہنمائی فرمائی ہے، چاہے وہ شادی بیاہ کا معاملہ ہو یا دیگر دینی و دنیوی معاملات۔

امام احمد رضا زندگی بھر اصلاحِ اعتقاد و اعمال میں سرگرم عمل رہے۔ اچھی اور اسلامی باتوں کے فواید بھی مسلمانوں کے سامنے بیان کرتے رہے اور غیر شرعی اور بے جا رسوم کے مضر اثرات بھی واضح کرتے رہے۔ وہ ہمارے خیر خواہ تھے، اس لیے ہمیشہ خیر خواہی کرتے رہے۔ ملتِ اسلامیہ ان کے احسانات کا کما حقہ شکریہ ادا نہیں کرسکتی۔

۱۳۱۲ھ میں مولوی احمد احسن نے کانپور سے ایک استفتا امام موصوف کی بارگاہ میں بھیجا جس میں خرافاتِ نکاح و شادی کی نشان دہی کرتے ہوئے ان کا حکم دریافت کیا۔ امام احمد رضا کی خداداد صلاحیتوں اور وسعتِ تحریر کا اکابر علما و مشائخ نے اعتراف کیا۔ مختصر سے سوال کو مدلل اور مبرہن کرکے حسین انداز میں تفصیلی جواب دینا آپ کا کمال تھا اور یہاں بھی ایسا ہی ہوا۔ کہ امام احمد رضا نے شادی کی خرافات اور غیر مناسب رسموں کے بارے میں مفصل جواب عنایت فرمایا، جو مستقل رسالہ کی شکل اختیار کرگیا اور "ھادی الناس فی رسوم الاعراس" (لوگوں کا رہنما شادیوں کی رسموں کے بارے

میں) کے تاریخی نام سے منظر عام پر آیا۔ مذکورہ رسالے میں آپ نے شادی اور نکاح کے جائز طریقے بھی بیان فرمائے اور غیر اسلامی طریقوں کے نقصانات کی نشان دہی بھی فرمائی۔

• کئی جگہ مسلمانوں کے اسلامی تہواروں میں دوسری بہت سی رسموں کے ساتھ آتش بازی بھی پائی جاتی ہے۔ اسی طرح شادی کے موقع پر بھی آتش بازی خوب ہوتی ہے، جس میں فایدہ تصور کرنا بے وقوفی ہے، بلکہ سلیم الفطرت سوچنا بھی غلط سمجھے گا۔ امام احمد رضا اس کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''آتش بازی جس طرح شادیوں اور شب برأت میں رائج ہے بے شک حرام اور پورا جرم ہے کہ اس میں تضیع مال (مال برباد کرنا) ہے۔ قرآن مجید میں ایسے لوگوں کو شیطان کے بھائی فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''اور فضول نہ اُڑا بے شک اڑانے والے شیطان کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے رب کا بڑا ناشکرا ہے۔''

(پارہ ۱۵ ع ۳، ترجمہ کنزالایمان)

رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں: ''بے شک اللہ تعالیٰ نے تین چیزیں تمہارے لیے ناپسند رکھیں (۱) قیل و قال (بے کار گفتگو) (۲) بربادی (۳) کثرتِ سوال

بعدہٗ محقق علی الاطلاق سیدنا شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

> ''بہت بُری بدعتوں میں سے ہے جو اکثر بلادِ ہند میں متعارف ہے کہ لوگ آگ سے کھیل تماشہ کے لیے اکٹھا ہوتے ہیں اور پٹاخے چھوڑتے ہیں۔''

(ماثبت بالسنۃ، مترجم)

جہالت میں زندگی گذارنے والے لوگ اپنی شادیوں کے موقع پر گانا بجانا بھی فخر سمجھتے ہیں اور کہیں یہ رسم و رواج ناک مونچھ کا مسئلہ بن جاتا ہے۔ اور رشتے داروں کے طعن و تشنیع سے بچنے کے لیے ایسی محفلیں آراستہ کی جاتی ہیں۔ بھلے ہی ان میں ہزاروں لاکھوں روپے کیوں نہ خرچ ہو جائیں، معاذ اللہ جس شادی میں یہ ناچ گانے نہ ہوں اسے شادی ہی نہیں سمجھا جاتا، جبکہ اسلام ان سے سخت منع کرتا ہے۔ امام احمد رضا اس سلسلے میں رقم طراز ہیں:

> ''اسی طرح یہ گانے باجے کہ ان بلاد (شہروں) میں معمول و رائج ہیں بلاشبہ ممنوع و ناجائز ہیں۔ خصوصاً وہ ناپاک ملعون رسم کہ بہت خسران بے تمیز، احمق جاہلوں نے شیاطین ہنود، ملاعین بے بہود سے سیکھی، یعنی فحش گالیوں کے گیت گوانا اور مجلس کے حاضرین و حاضرات کو لچھے دار سنانا، سمدھیانہ کی عفیف پاک دامن عورتوں کو الفاظِ زنا سے تعبیر کرانا، خصوصاً اس ملعون بے حیا رسم کا مجمع زناں میں ہونا، ان کا اس

ناپاک فاحشہ حرکت پر ہنسنا، قہقہے اُڑانا، اپنی کنواری لڑکیوں کو یہ سب کچھ سنا کر بدلحاظیاں سکھانا، بے حیا، بے غیرت، خبیث، .... کبھی برائے نام لوگوں کے دکھاوے کو جھوٹ سچ ایک آدھ بار جھڑک دینا مگر بندوبست قطعی نہ کرنا۔

یہ وہ شنیع گندی مردود رسم ہے جس پر صدہا لعنتیں اللہ عزوجل کی اترتی ہیں اس کے کرنے والے، اس پر راضی ہونے والے، اپنے یہاں اس کا کافی انسداد (روک) نہ کرنے والے سب فاسق فاجر، مرتکب کبائر، مستحق غضب جبار و عذاب نار ہیں۔

والعیاذ باللہ تبارک وتعالیٰ، اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو ہدایت بخشے آمین"۔

(ھادی الناس، اردو ترجمہ: رسوم شادی ص:۵۔۶)

آگے مزید فرماتے ہیں:

"جس شادی میں یہ حرکتیں ہوں مسلمانوں پر لازم کہ اس میں ہرگز شریک نہ ہوں۔ اگر دانستہ شریک ہوگئے تو جس وقت اس قسم کی باتیں شروع ہوں یا ان لوگوں کا ارادہ معلوم ہو سب مسلمان مردوں عورتوں پر لازم ہے کہ فوراً فوراً اُسی وقت اُٹھ جائیں اور اپنی جورو، بیٹی، ماں بہن کو گالیاں نہ دلوائیں، فحش نہ سنوائیں، ورنہ یہ بھی ان ناپاکیوں میں شریک ہوں گے اور غضب الٰہی سے حصہ لیں گے، والعیاذ باللہ العلمین"

(حوالہ مذکورہ ص ۶)

جو لوگ امام احمد رضا کو بدعتیوں کے امام، بدعات و منکرات کو فروغ دینے والا اور ان جیسے نہ جانے کیسے کیسے القاب دیتے ہیں، وہ مذکورہ سطور کو بغور پڑھیں اور اپنی غلط گمانی کا محاسبہ کریں۔ نیز اندازہ لگائیں کہ انہوں نے بدعتوں کا سدِ باب کیا یا ان کو فروغ دیا۔ جو اسلامی شریعت کے خلاف شادی بیاہ کی مجلسوں کو گوارا نہ کرے وہ بدعات و منکرات کو کیسے گوارا کر سکتا ہے۔ پروفیسر محمد مسعود احمد مظہری نے کتنی حقیقت بھری بات کہی ہے کہ:

"جہلا نے جو نت نئی بدعات نکالی ہیں ان سے امام احمد رضا کو کوئی تعلق نہیں، وہ ایک جہانِ علم وفضل تھے۔ کوئی اس جہان کی سیر تو کرے پھر جو نہ دیکھا تھا دیکھے، اور جو نہ سنا تھا سنے۔ امام احمد رضا نے معاشرہ کو برائیوں سے پاک کرنے کے لیے بڑی جدوجہد کی۔ ان برائیوں کی نشان دہی کی جو منشائے شریعت کے خلاف اور حرام و ناجائز ہیں۔" (رہبر و رہنما ص:۱۱)

آج بھی ان کے بتائے ہوئے طریقوں پر چلنے کی کوشش کی جائے تو معاشرے پر نکھار آ سکتا ہے۔ بدعات و منکرات کی بیخ کنی کے لیے تصنیفات امام احمد رضا سے ہمیں بہت کچھ مل سکتا ہے اور ہم

بے جا رسوم جو برسوں سے ہمارے معاشرے اور ماحول کو کھوکھلا کر رہی ہیں، سے نئی نسل کو بچا سکتے ہیں۔
ہاں یہ بھی سچائی ہے کہ رسم و رواج کی جڑیں جب کسی قوم یا خاندان یا اس کے افراد و اشخاص کے رگ و پے میں سرایت کر جاتی ہیں اور ان رسوم و عادات کے پاؤں مضبوطی سے ان میں جم جاتے ہیں تو انہیں ترک کرنا نفس پر بڑا شاق گزرتا ہے اور انسان انہیں بہت جلد چھوڑنا گوارا نہیں کرتا۔ تاہم یہ تو سوچیے کہ ہم مسلمان ہیں اور مسلمان کے لیے وہی کام کرنا ضروری ہے جو خدا و رسول جل جلالہ وﷺ کو راضی کرنے والا ہو اور ہر اُس فعل سے اجتناب کرنا لازم ہے جو خدا اور رسول کی ناراضی کا سبب بنتا ہو۔ کیا قرآن کریم میں آپ نے نہیں پڑھا کہ مسلمانوں کو شیطان کے بتائے ہوئے طریقے پر چلنے سے منع کیا گیا ہے اور اسلام میں پورے طور پر داخل ہونے کا حکم دیا گیا ہے۔ اسلام ترقی اور کامیابی کا ضامن ہے مگر اس کی برکتیں تب ہی رونما ہو سکتی ہیں جب اہلِ اسلام اس کی ہر ہدایت و تعلیم پر دل و جان سے عمل پیرا ہوں۔ امام احمد رضا خاں قادری نے بھی پیغام دیا اور ہر موڑ پر اسلامی احکام کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنا سفر شوق آگے بڑھانے کی تلقین فرمائی۔

شادی میں دولہا اور دلہن کے گلے میں پھولوں کے ہار بھی ڈالے جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں امام احمد رضا ہماری رہنمائی کرتے ہوئے ارقام فرماتے ہیں:

> ''شرع شریف کا قاعدہ کلیہ ہے کہ جس چیز کو خدا و رسول اچھا بتائیں وہ اچھی ہے اور جسے بُرا فرمائیں وہ بُری اور جس سے سکوت فرمائیں یعنی شرع سے نہ اس کی خوبی نکلی نہ برائی وہ اباحتِ اصلیہ پر رہتی ہے کہ اس کے فعل و ترک میں ثواب نہ عتاب۔ یہ قاعدہ ہمیشہ یاد رکھنے کا ہے کہ اکثر جگہ کام آئے گا۔'' (رسومِ شادی ص: ۴۰)

پھر اس کا حکم بیان فرماتے ہیں: ''پھولوں کا سہرا جیسا سوال میں مذکورہ، رسومِ دنیویہ سے ایک رسم ہے جس کی ممانعت شرع مطہر سے ثابت نہیں، نہ شرع میں اس کو کرنے کا حکم آیا، تو مثل اور تمام عادات و رسوم مباحہ کے مباح رہے گا۔'' (مرجع سابق)

قارئین کرام! غور کریں! مسلمان اپنے نبی کی سُنّت (نکاح و شادی) ادا کرتے وقت وہ رسمیں کیوں اختیار کرتا ہے جو دشمنانِ اسلام نے جاری کی ہیں۔ ہمیں خدا و رسول کو خوش کرنا ہے تو رضائے رب اور خوش نودیِ رسول حاصل ہونے والے طریقے اپنانے چاہیے نہ کہ مغربی طرزِ شادی اور مغرب کے رسوم و رواج جن کے شامل ہونے کے سبب شادی خانہ آبادی کے بجائے شادی خانہ بربادی بن جائے۔

اسلوبیات

کسی بھی تصنیف کو شہ پارہ بنانے میں اسالیب و لفظیات کی رعنائی بھی اُجالی جاتی ھے۔ ہر عھد کا اپنا اپنا اسلوب اور الگ الگ معیار ہوتا ھے۔ کسی بھی ادب کے ادبا اپنے زمانے کی فھم کے مطابق اسلوب اختیار کرتے ھیں۔ گویا ہر اسلوب اور پیمانۂ اظھار اپنے عھد کا ترجمان ہوتا ھے۔ امام احمد رضا کی تحریری خدمات کو اگر ھم اس رُخ پر موڑ کر دیکھیں تو ان کے اسلوبیاتی و لفظیاتی نقشے میں بھی ایسی قندیلیں روشن دکھائی دیتی ھیں جس کی روشنی میں ان کے ادبی و تخلیقی سراپا کا حُسن نکھر کر سامنے آ جاتا ھے۔ انھوں نے خشک سے خشک موضوعات پر اپنے قلم کی سحر کاری اور تخلیق کاری کے آتش داں کو سرد ہونے نہیں دیا ھے۔ اس موضوع پر اربابِ قلم نے متعدد تصانیف تحریر کی ھیں، لیکن امام احمد رضا کے اسلوب کو وہ قرار واقعی حیثیت نہیں مل سکی جس کا وہ مستحق تھا۔ زیر نظر باب میں پہلا مضمون ڈاکٹر غلام غوث قادری کا ھے۔ غالباً انھوں نے اسی موضوع پر پی، ایچ، ڈی بھی کی ھے۔ مولانا محمد حسین مصباحی نے بھی اپنے مضمون میں اسلوبِ رضا پر روشنی ڈالی ھے۔ ان دونوں مضامین میں امام احمد رضا کے ادبی پیکر کا جائزہ لیا گیا ھے اور ادبا کو ان کی طرف متوجہ ہونے کی دعوت دی گئی ھے۔ امام احمد رضا کے اسلوبِ جرح و تعدیل پر ایک مضمون مولانا اسلم رضا قادری کا ھے۔ یہ مضمون فل اسکیپ کے ۲۲ صفحات پر مشتمل تھا اور ساتھ ھی صاحبِ مضمون نے یہ بھی لکھا تھا کہ ہمارے دو مفتی اساتذہ کرام نے اس کی صحت کی تصدیق بھی کی ھے۔ اسے پڑھنے کے بعد اندازہ ہوا کہ اکثر مندرجات موضوع سے خارج ھیں اور پھر بلاوجہ تطویل سے کام لیا گیا ھے۔ اس لیے جو موضوع کے مطابق تھا اسے عنوان بدل کر شامل کرکے بقیہ کو حذف کردیا گیا ھے۔ اُمید ھے کہ مضمون نگار کبیدہ خاطر نہ ہوں گے۔ ایک بحث جو مضمون نگار نے اُٹھائی تھی اُس پر مولانا منظر الاسلام ازھری کی تحریر موصول ہوئی، اس لیے اُسے بھی حذف کردیا گیا۔ مولانا ازھری صاحب کی تحریر باب "خدمات" میں شامل ھے۔

.... ص۔ ر۔ مصباحی

باب پنجم

امامِ اہلِ سنّت امام احمد رضا خان قدس سرہ کا اسلوبِ نگارش

از غلام غوث قادری پی. ایچ. ڈی، رانچی۔ جھارکھنڈ

انگریزی کا محاورہ ہے کہ آدمی اپنے انداز سے پہچانا جاتا ہے۔ (Style is the Man) یہ انداز آدمی کی پوری شخصیت کا ہوتا ہے۔ جس میں گفتار' اُس کے کردار سے ہم آہنگ ہوتی ہے۔ ایک شخص کا بولا ہوا ہر لفظ اس کی مخصوص شخصیت کا اشاریہ ہوتا ہے۔ اس طرح اسلوبِ بیان کو اظہارِ شخصیت کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ مثل ہے کہ ''کوزے سے وہی ٹپکتا ہے جو اس کے اندر ہوتا ہے''۔ ایک فرد کا ذہن و مزاج اس کی ہر حرکت خاص کر اس کی بولی سے آشکار ہو جاتا ہے۔

ذہنی رجحان اور طبعی میلان سے منسلک ایک فرد کے کچھ مقاصد ہوتے ہیں اور ممکن ہے اس کی زندگی کا کوئی نصب العین ہو' یعنی ایک انسان کی زندگی کا کوئی پیغام ہوسکتا ہے۔ زمانے اور معاشرے کے تعلق سے اس کا کچھ نقطۂ نظر ہوسکتا ہے۔ جس کے اظہار و ابلاغ کے لیے یقیناً ایک وسیلے کی ضرورت ہوگی۔ انسان اپنے مافی الضمیر اور اپنے نقطۂ نظر کے اظہار و ابلاغ کے لیے جس وسیلے کا سہارا لیتا ہے' وہ وسیلہ بلاشبہ زبان ہے۔ زبان بولی یا بولیوں کی اس بالیدہ و تراشیدہ صورت کا نام ہے جس کی معنوی ترتیب و تنظیم اور تہذیبی عمل سے ادب ظہور پذیر ہوتا ہے۔ زبان اور ادب کے درمیان ایک اٹوٹ رشتہ اور ناگزیر ربط ہے۔

کسی مقصد اور پیغام کے اظہار و ابلاغ کے لیے وہ تمام وسائل استعمال کیے جاتے ہیں، جو فصاحت کے ساتھ ساتھ بلاغت کے محاسن پر مشتمل ہوں' مگر یہ ضرور ہے کہ اس بلاغتِ اظہار میں مقصدِ تحریر کی زیادہ سے زیادہ وضاحت مقصود ہوتی ہے۔ جبکہ وسیلۂ اظہار کی تزئین محض وسیلہ ہے نہ کہ مقصد۔ گویا ہیئت پر مواد مقدم ہے اور یہ فطری صورت حال ہے۔ جبکہ بے مقصد اور جمال پرست فن کار بالعموم صرف معمہ باز یا رنگ باز ثابت ہوئے ہیں اور بلاغت تو دور کی بات فصاحت سے بھی محروم رہے ہیں۔ صحیح معنی میں صاحب طرز ادیب طرز پرست نہیں ہوتا اور اس کا سارا زورِ بیان ایک اعلیٰ مقصد کے تابع ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کے مقصد کا اظہار و ابلاغ عمدہ اسلوبِ نگارش کے ذریعہ ہوتا ہے۔ چنانچہ انگریزی کے صاحب طرز ادیب ... کا ...

''ایک سچا اور اصلی اسلوب کبھی اسلوب کے لیے حاصل نہیں ہوتا' تاثیرِ بیان اسلوب کا اوّل و آخر ہے۔ جس کے پاس کچھ کہنے کے لیے نہیں ہے، اس کا کوئی اسلوب نہیں اور نہ ہوسکتا ہے۔ جس کے پاس کچھ کہنے کے لیے ہے وہ اسلوب کی طاقت کو وہاں تک پہنچائے گا جہاں تک بات کی اہمیت اور اس کا اعتقاد اسے لے جائے گا'' ۱

بہر حال اسلوب کا مطلب طرزِ بیان ہے اور جو باتیں طرزِ بیان سے متعلق ہوں اسلوبیات کہلاتی ہیں۔ عام تاثر یہ ملتا ہے کہ اسلوبیاتی تنقید صرف ہیئتِ ادب سے بحث کرتی ہے اور مواد کو نظر انداز کرتی ہے، مگر اسلوبیاتی تنقید درجۂ کمال پر اس وقت پہنچ سکتی ہے جب وہ ادب کے پوست کے ساتھ ساتھ اس کے مقصد کو بھی سامنے رکھے۔ چنانچہ رینی ویلک اور آسٹن وارن (Rene Wellek and Austin Warren) کی لکھی کتاب میں درج ہے:

(۱) ''براہ راست علمی اور سماجی اثرات سے ادب کی علاحدگی ممکن نہیں۔''

(۲) ''بلاشبہ کسی زبان کی صوتیاتی سطح کو ادبی معاملات میں اس کے معانی سے الگ نہیں کیا جاسکتا ہے۔'' ۲

گویا معنی و بیان ایک دوسرے کے ساتھ پیوستہ ہیں۔ لہٰذا ادب میں کمالِ فن کی تفتیش اسی نہج پر ہونی چاہیے۔

اردو زبان کی نشوونما میں صوفیاے کرام کا حصہ تحقیق سے ثابت ہوچکا ہے۔ یہ سب صوفیاے کرام، علماے دین اور مبلغین تھے جن کے ملفوظات کا مقصد لوگوں کی اصلاح و ہدایت تھی۔ لیکن اصلاح و ہدایت کا یہ کام لسانی تشکیل کے اُس دور میں ہوا جب ملک کے مختلف علاقوں میں فارسی و عربی اور مقامی پراکرتوں کی آمیزش سے اردو زبان کا خمیر اُٹھ رہا تھا۔ اس کے بعد ادبی دور کا آغاز ہوا جس میں صوفیاے کرام، علماے عظام کا بھرپور تعاون رہا اور ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر عبدالنعیم عزیزی رقم طراز ہیں:

''اردو نثر و نظم کی نشوونما اور فروغ و ارتقا' صوفیا و علما ہی کی رہینِ منت ہے۔ آج بھی حلقۂ مذہب اور اولیا و صوفیا کے ماننے والے صاحبانِ علم و قلم اردو کی بقا و تحفظ کے ساتھ اسے فروغ دینے میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔''

نیز راقم طراز ہیں:

''نثر اردو نے اپنی ابتدا (حضرت شاہ اشرف سمنانی قدس سرہ العزیز کو پہلا نثر نگار کہا گیا ہے) سے لیکر بیسویں صدی کی تیسری دہائی تک مذہبی و تقدیسی ادب کے توسط سے ہی گراں قدری اور وقار جمال حاصل کیا ہے۔'' ۳

ان کے اس خیال کی تائید ڈاکٹر شہناز انجم کی درج ذیل تحریر سے بھی ہوتی ہے:

''ان صوفیا کے پیغام کے ذریعہ اردو زبان تیزی سے ملک کے مختلف علاقوں میں پھیلی۔ ان بزرگوں کے مختلف سلسلے تھے جو ملک کے مختلف علاقوں میں تبلیغ دین اور اشاعتِ زبان کے کام میں مصروف تھے۔ ان کے اردو الفاظ، جملوں اور فقروں کی لڑیوں میں پروئے گئے اور اس طرح الفاظ کے بکھرے موتی صوفیا، علما اور بزرگانِ دین کے ان ملفوظات و اقوال کی شکل میں تبدیل ہوگئے جو اردو نثر کے ارتقا میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔''[۴]

زبان کے پختہ و شستہ ہونے اور اظہار و ابلاغ کی اہلیت پیدا کرنے میں وقت لگا۔ اگرچہ اٹھارہویں صدی سے قبل بھی حسبِ ضرورت تصنیف و تالیف کا کام ہوتا رہا مگر اس کے بعد ہی زبان میں ادبی اور فنی حسن پیدا ہوسکا۔ اس کی ایک کڑی فورٹ ولیم کالج، دلّی کالج کی ورنا کیولر ٹرانس لیشن سوسائٹی اور لکھنؤ میں سائنس کی بعض کتابوں کے تراجم ہیں' جو بہت عام نہ ہونے کی وجہ سے ادیبوں اور عام قارئین پر اثر انداز تو نہیں ہوسکے مگر ہیئت، ترتیب اور ترکیب میں جدید تصوریت کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔

اسالیبِ ادب کا ارتقا اگرچہ ادیب کی شخصیت کا مظہر ہوتا ہے لیکن ارتقائے زبان کی ایک منزل ہوتی ہے۔ اس منزل کے بغیر اس کا تصور نہیں کیا جاسکتا اور یہ منزل انیسویں صدی میں اس وقت آئی جب وہ سارے تعلیمی، سماجی، تہذیبی اور ذہنی اسباب یکجا ہوگئے جن کی وجہ سے زندگی کے نئے تقاضے وجود میں آتے گئے اور لوگ اپنے مسائل کا حل تلاش کرنے میں سرگرداں ہوئے۔

انیسویں صدی کے بدلتے ہوئے شعور نے ذہنی کش مکش کی وہ صورت پیدا کردی تھی جہاں مختلف نقطہ ہائے خیال رکھنے والے اپنے افکار و نظریات کی تبلیغ ضروری سمجھنے لگے تھے اور اپنے اپنے نقطۂ نظر کی برتری ثابت کرکے دوسروں کو اس سے متاثر کرنا چاہا۔ ایسی صورت میں انھیں اظہار و ابلاغ کے لیے ایک ایسے اسلوب کا سہارا لینا پڑا جو مدلل، جان دار، رواں، عام فہم اور اثر انگیز ہو۔ یہی چیز جدید نثر کے ارتقا کا سنگِ بنیاد بن گئی۔ اور ایسے حالات میں زبان و ادب کو پھولنے پھلنے کا موقع مل گیا۔ ہر وہ شخص جو اپنے افکار و نظریات کو دوسروں تک پہنچانا چاہتا' اپنی انفرادیت کے ساتھ مدلل صاف، شستہ، رواں دواں اور عام فہم اندازِ تحریر اختیار کرتا۔ ایسی صورت میں زبان کا ارتقا بدیہی تھا۔ کسی فردِ واحد یا کسی خاص جماعت کے ذریعے زبان و ادب کا ارتقا ثابت کرنا درست نہیں۔ اسی ارتقائی زمانے میں سرسیّد احمد خاں اور ان کے رفقا نظر آتے ہیں۔ جہاں انھوں نے اردو زبان میں جدید رنگ و

آہنگ کے ساتھ صاف، سلیس، غیر مقفّٰی اسلوب پیش کیا' وہیں اولیاے کرام، علماے عظام نے بھی ان سے بڑھ کر اردو کو سنوارا۔ چنانچہ اس سلسلے میں ڈاکٹر عبدالحق رقم طراز ہیں:

''یہ بزرگ اس زبان کے ادیب و شاعر نہ تھے یا کم از کم اُن کا مقصد اس زبان کی ترقی نہ تھی' نہ اس کا انھیں کچھ خیال تھا۔ اُن کی غایت ہدایت تھی لیکن ضمن میں خود بخود اس زبان کو فروغ ہوتا گیا اور عہد بہ عہد نئے اضافے ہوئے اور اصلاحیں ہوتی گئیں۔ اور ان کی مثال نے دوسروں کی ہمت بڑھائی، جس سے اس کے ادب میں نئی شان پیدا ہوگئی۔'' ۵

جس عہد میں سرسیّد احمد خان اپنے رفقا کے ساتھ اردو کو جدید رنگ و آہنگ کے ساتھ نکھارنے میں لگے تھے، اسی عہد میں جماعتِ صوفیا سے ایک عبقری شخصیت امام احمد رضا قدس سرہٗ کی تھی، جنھوں نے مختلف علوم و فنون میں ایک ہزار سے زاید کتب و رسائل تصنیف کیے۔ ۶ جو علمی، تحقیقی اور اعلیٰ ادبی معیار کے عظیم شاہ کار ہیں۔ آپ کی بیش تر تصانیف اردو زبان میں ہیں جو علمی، ادبی محاسن کے اعتبار سے اردو کے عناصرِ خمسہ سے کسی قدر کم نہیں۔ مگر تاریخ اردو کے اکثر و بیش تر مؤرخین نے اس عظیم نابغۂ روزگار ہستی کو یکسر فراموش کر دیا۔ چنانچہ پروفیسر ڈاکٹر فاروق احمد صدیقی رقم طراز ہیں:

''امام احمد رضا عبقری شخصیت کے مالک...... اُن کی گوناگوں خوبیوں اور متنوع کارناموں کا احاطہ آسان نہیں۔ جہاں تک اردو ادب سے ان کے تعلق کا سوال ہے، تو ظاہر ہے کہ اُن کے رشحاتِ قلم کا بیش تر سرمایہ اردو ہی میں ہے۔ بحیثیت شاعر اور نثر نگار جنھوں نے اردو کو جو بخشا ہے اس سے کسی ناواقف ہی کو انکار ہوسکتا ہے۔'' ۷

بہر کیف اس دور کے علمی، ادبی، تحقیقی اور تنقیدی ماحول میں امام احمد رضا خان قدس سرہٗ العزیز مختلف رنگ و آہنگ لیے نظر آتے ہیں۔ اُن کی تحریر میں متانت کے ساتھ ظرافت کی چاشنی بھی ہے، سنجیدگی کے ساتھ شگفتگی اور انضباط کے ساتھ انبساط بھی ہے۔ ہر موضوع کے مضمرات و اشارات کی تشریح ایک ترتیب کے ساتھ منظم طور پر منطقی انداز سے پائی جاتی ہے کہ پڑھنے والا' پڑھتے جاتا ہے اور معانی و مفاہیم کی گرہیں کھلتی جاتی ہیں۔ پھر زورِ بیان ایسا کہ قاری کا ذہن اس زور پر بہتا چلا جاتا ہے جو آپ کی تحریر میں بجلی کی طرح دوڑ رہی ہے۔ آپ کی تحریر میں غایت درجہ موثر اسلوبِ نگارش موجود ہے۔ جس کے ذریعہ مقاصد کی تبلیغ بحسن و خوبی انجام پاتی ہے۔

امام احمد رضا قدس سرہ کا ایک مقصدِ حیات تھا' وہ زندگی کا نظریہ اور نصب العین رکھتے تھے۔ اُن کا ایک پیغام تھا جس کی تبلیغ و تعمیل کے لیے انھوں نے اپنے آپ کو وقف کر دیا تھا۔ وہ اپنے مشن کی

تکمیل تقریر وتحریر اور اقدام وعمل کے ہر ممکن وسیلے سے کرنا چاہتے تھے۔ وقت کے بگڑتے ماحول کو بدلنے اور لوگوں کو راہِ راست پر لانے' غیر اسلامی تہذیب وتمدن سے دور رکھنے کا عہد رکھتے تھے۔ وہ ایک عظیم عالم دین اور مدبّر کی حیثیت رکھتے تھے۔ وہ ایک پکّے موحد اور سچے عاشق رسول تھے۔ انھیں مسلمانوں کی ذاتی زندگی میں انگریزی دخل اندازی بالکل ناپسند تھی۔ انھوں نے اپنے بزرگوں کے قائم کیے ہوئے نشانات کو زیادہ روشن کرکے اپنے دور اور مستقبل کے لوگوں کو منزل کے ساتھ ساتھ ان کی رسم، راہ کا پتہ بھی دیا۔ ان کے اسلوب نگارش کا ارتقا اسی تناظر میں ہوا۔ یہ ارتقا ظاہر ہے بتدریج اور بہ مراحل ہوا۔ کثیر علوم وفنون میں بسیار نویسی کی وجہ سے اُن کے اسلوبِ نگارش بھی مختلف ہیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر صابر سنبھلی رقم طراز ہیں:

> ''امام احمد رضا فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ نے زندگی بھر نثر نگاری کی اور اردو ادب کے سرمایے میں قابلِ قدر اضافہ کیا۔ لیکن ابھی تک نہ تو اُن کی نثر کی کیت کا صحیح اندازہ ہو پایا ہے اور نہ کیفیت کا۔ جیسا کہ سبھی جانتے ہیں اُن کی نثر کا موضوع اوّل تا آخر دین اسلام رہا۔ لیکن طویل مدّت تک لکھنے اور بسیار نویسی کے باعث اُن کی نثر کا اسلوب بھی ایک نہیں۔ تحقیقی تحریر کا اسلوب الگ ہے تو تنقیدی تحریروں کا الگ، فقہ کا ایک ہے تو عقاید کا الگ، منقولات سے کام لیتے ہیں تو اندازِ بیاں اور ہوتا ہے، معقولات کا سہارا لیتے ہیں تو اور، فلسفے اور منطق میں نثر کا جو انداز ہے سائنسی موضوعات میں اس سے ہٹ کر ہے، جہاں عقلیت کی کارفرمائی ہے وہاں تحریر کا رنگ دوسرا ہے اور جہاں جذباتِ عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم الفاظ کا جامہ پہنتے ہیں وہاں اور۔'' 8

امام احمد رضا قدس سرہ العزیز کی نگارشات بے شمار کتب و رسائل پر مشتمل ہیں۔ جن میں مذہبی مسائل، فتاویٰ اور ترجمے کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ ان کی نگارشات کے موضوعات ایسے ہیں جن میں تخیل پردازی کا گزر بالکل نہیں ہوسکتا، تاہم جملوں کی ترکیب تہذیب میں نہ صرف ایک مخصوص رنگ آہنگ ملتا ہے بلکہ ادبی حیثیت سے آپ نے ان خشک موضوعات میں بھی زبان و ادب کا ایسا جوہر دکھایا ہے کہ ان کے موضوعات پر نظر ٹھہرا کر ان کے ادبی جوہر کو ان کے غیر متعصب ہم عصر ادبا بھی دیکھ کر معترف ہوجاتے ہیں۔ گویا انھوں نے ایک نئے اسلوب کی طرح ڈالی۔

آپ کی مختلف تصانیف سے نوع بہ نوع کی نگارشات اور ان کے اسالیب ملاحظہ ہوں:

کنزالایمان کا اسلوب نگارش: امام احمد رضا قدس سرہ کی خدمات کا عظیم شاہکار قرآن کریم کا

ترجمہ ہے۔ جس کا نام ''کنزالایمان فی ترجمۃ القرآن'' ہے۔ آپ کے اردو ترجمۂ قرآن کریم کے قبل متعدد ترجمے منظر عام پر آگئے تھے اور کچھ بعد میں بھی وجود میں آئے؛ مگر آپ نے قرآن کریم کے معانی ومطالب اور اس کے اسرار و معارف کو جن ماہرانہ خوبیوں کے ساتھ اردو میں منتقل کیا ہے، اس کی مثال نہیں ملتی۔ قرآن کریم کا اپنا اسلوبِ بیان نہ لفظی ہے نہ ہی بامحاورہ۔ قرآن کریم چونکہ کلامِ الٰہی ہے لہٰذا اس کا اپنا اسلوب منفرد ہے۔ حسنِ کلام، رواں بیان، شکوہ لفظی اور مضامین میں ربط وضبط وغیرہ قرآنی اسلوب کی ایسی خوبیاں ہیں جنہیں نہ لفظی ترجمہ اپنے اندر پیوست کرسکتا ہے نہ ہی بامحاورہ ترجمہ۔

امام احمد رضا قدس سرہ کا ترجمہ قرآن کریم لفظی ترجمہ کے نقائص سے بھی پاک ہے اور بامحاورہ ترجمے کی کمزوریوں سے مبرّا بھی۔

آپ کے ترجمۂ قرآن کریم سے متعلق استاذ سعید بن یوسف زئی امیر جمعیۃ اہلِ حدیث، پاکستان کا خیال ہے۔

> ''میں نہایت وضاحت کے ساتھ یہ کہوں گا الٓمٓ سے لے کر وَالنَّاس تک ہم نے کنزالایمان میں نہ تو تحریف پائی ہے نہ ہی کسی بدعت اور شرک کے کرنے کا جواز پایا ہے۔ بلکہ یہ ایک ایسا ترجمۂ قرآن مجید ہے کہ جس میں پہلی بار اس بات کا خاص خیال رکھا گیا ہے کہ جب ذاتِ باری تعالیٰ کے لیے بیان کی جانے والی آیتوں کا ترجمہ کیا گیا ہے تو بوقتِ ترجمہ اس کی جلالت، علوت، تقدس و عظمت و کبریائی کو بھی ملحوظِ خاطر رکھا گیا ہے۔ جب کہ دیگر تراجم خواہ وہ اہلِ حدیث سمیت کسی بھی مکتبِ فکر کے علما کے ہوں ان میں یہ بات نظر نہیں آتی۔'' [9]

امام موصوف کے ترجمۂ قرآن کریم کے اسلوبِ نگارش کے متعلق پروفیسر ڈاکٹر طاہر القادری رقم طراز ہیں:

> ''اعلیٰ حضرت (امام احمد رضا خان) کا ترجمۂ قرآن سامنے ہو تو پتہ چلتا ہے کہ جس طرح قرآن کا اپنا اسلوب ہے' جو نہ تقریری نہ تحریری بلکہ ایک جداگانہ اور منفرد اسلوب ہے۔ اسی طرح اس عظیم ترجمے کا بھی اپنا خاص اسلوب ہے، جو نہ تقریری کہا جاسکتا ہے نہ تحریری۔ اور جس طرح قرآنی اسلوبِ بیان کی مثال پیش نہیں کی جاسکتی' اسی طرح یہ ترجمہ بھی بے نظیر و بے مثال ہے۔'' [10]

آپ کے اس ترجمے میں خاص بات جو پائی جاتی ہے وہ ہے اس کی ادبی حیثیت اور منفرد اسلوبِ نگارش۔ جبکہ اس عہد میں اردو زبان پر عربی اور فارسی کے اثرات موجود تھے اور امام موصوف خود

عربی، فارسی کے معتبر عالم بھی تھے۔ تاہم آپ نے پورے ترجمے میں اردو زبان کے محاورے کا خاص خیال رکھا اور اس بات کا خاص لحاظ رکھا ہے کہ ترجمے میں قرآن کریم کے عظمت و وقار میں فرق نہ آنے پائے۔ آپ کے ترجمے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ لفظی ترجمے کے حوالے سے قرآن کریم کے ہر ہر لفظ کا مفہوم اس طرح واضح کردیا ہے کہ اسے پڑھ لینے کے بعد کسی لغت کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اس قرآن کریم کی ایک آیت پاک کے چند الفاظ یہ ہیں:

''وَلِيُعَلِّمَكَ مِنْ تَاوِيلِ الْاَحَادِيْثِ''۔ [۱]

اکثر ترجمہ نگار اس کا بامحاورہ ترجمہ اس طرح کرتے ہیں:

''اللہ تجھے خوابوں کی تعبیر سکھادے گا۔''

جبکہ لفظی ترجمہ کرنے والوں نے بھی ''تاویل الاحادیث'' کا ترجمہ کچھ اس طرح کیا ہے کہ بات صاف نہیں ہوتی اور دونوں قسم کے ترجموں سے لفظ ''تاویل'' کا معنی واضح نہ ہوسکا اور یہ پتہ نہ چل سکا کہ ''تاویل'' کسے کہتے ہیں۔

امام احمد رضا قدس سرہ العزیز اس آیت کا ترجمہ یوں کرتے ہیں:

''اور (تیرا رب) تجھے باتوں کا انجام نکالنا سکھادے گا۔''

امام موصوف نے ''احادیث'' کا ترجمہ ''باتوں'' کیا ہے، اس لیے کہ حدیث بات کو کہتے ہیں۔ اسی طرح آپ نے ''تاویل'' کا معنی ''انجام نکالنا'' کیا۔ ''تاویل'' کا معنی متعین کرنے اور یہ دیکھنے کے لیے کہ کیا یہ معنی واقعی عربی قداعد کی رو سے درست ہے؟ تو کتب لغت کے مطالعے سے معلوم ہوا کہ از روئے لغت ''تاویل'' کا لفظ ''اول'' سے مشتق ہے اور اول کا معنی رد شئی الی الغایته المرادة منه''۔

یعنی: کسی شے کا غایت مقصود یعنی انجام کی طرف لوٹ آنا' اسی کو تاویل کہتے ہیں۔ اسی سے مآل ہے۔ [۲] جس کا معنی ''انجام'' ہے، گویا ''تاویل'' کا مطلب انجام نکالنا، انجام سے باخبر ہونا، غایت سے آگاہ ہونا اور مقصودِ اصلی سے مطلع ہونا ہے جو کسی کلام کی تہہ میں مخفی ہو۔ لہٰذا امام موصوف کا یہ ترجمہ لفظی بھی ہے اور بامحاورہ بھی۔ اس طرح کی اور بھی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں لیکن خوف طوالت دامن گیر ہے۔

اندازِ بیان: قرآن حکیم نہ تو معروف معنوں میں تقریری انداز میں نازل ہوا ہے اور نہ ہی تحریری انداز میں۔ قرآن کا خطاب بے شک کبھی حضور اکرم ﷺ سے ہے، کبھی اہلِ مکہ کبھی اہلِ مدینہ سے اور کبھی تمام عالمِ انسانیت سے ہے۔ لہٰذا قرآن کریم کا اپنا اسلوب یہ ہے کہ وہ کبھی حاضر کے صیغے میں کلام کرتا ہے تو کبھی غائب اور متکلم کے صیغے میں، کبھی جمع کے صیغے لاتا ہے تو کبھی واحد کے، کبھی

استدلالی انداز اختیار کرتا ہے، تو کبھی وعظ و نصیحت کا اسلوب اپناتا ہے، کبھی امر کرتا ہے کبھی نہی، کہیں اس کا لہجہ سخت ہے اور کہیں نرم، اس اسلوب کو نہ مطلق تحریری کہتے ہیں نہ ہی مطلق تقریری بلکہ قرآن کریم کا اپنا منفرد اور جداگانہ اسلوب ہے۔

امام احمد رضا قدس سرہ العزیز نے ترجمے کا جو اسلوب اپنایا ہے بلاشک وشبہ تقریری ہے نہ تحریری بلکہ ان دونوں سے الگ ایسا انداز ہے جس میں کلامِ الٰہی کے حسن و رعنائی کی جھلک بھی موجود ہے اور فصاحت و بلاغت کے ساتھ ساتھ قرآنی اسلوب کی انفرادیت اور چاشنی بھی۔ مثلاً آیت:

"یٰبُنَیَّ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ ... الی آخرہ"۔[۱۳]

ترجمہ: ''اے میرے بیٹے نماز برپا رکھ اور اچھی بات کا حکم دے اور بُری بات سے منع کر اور جو اُفتاد تجھ پر پڑے اس پر صبر کر' بے شک یہ ہمت کے کام ہیں اور کسی سے بات کرنے میں اپنا رخسار کج نہ کر اور زمین پر اتراتا نہ چل' بے شک اللہ کو نہیں بھاتا کوئی اتراتا، فخر کرتا اور میانہ چال چل اور اپنی آواز کچھ پست کر' بے شک سب آوازوں سے بُری آواز گدھے کی ہے۔''

جو ربط و ضبط اور نظم و روانی' بیان اور حسن و خوبی قرآنی الفاظ میں ہیں' ان کی جھلک اس ترجمے میں دکھائی دیتی ہے۔

امام موصوف نے بہت سے الفاظ کا ترجمہ لفظی نہ کرکے اس طور سے کیا ہے کہ مفہوم بھی ادا ہوجائے اور اللہ عزوجل و رسول ﷺ اور دیگر انبیا علیہم الصلوٰۃ والسلام کی شان میں تنقیص بھی نہ ہونے پائے۔

جیسا کہ ''کید'' عربی کا لفظ ہے اور اس کے معانی ہیں: داؤں، فریب، مکر، تدبیر وغیرہ۔ اللہ عزوجل کے لیے داؤں یا داؤ، مکر و فریب وغیرہ الفاظ ہرگز شایانِ شان نہیں۔ جبکہ اکثر ترجمہ نگار نے انھیں لفظوں میں سے کوئی نہ کوئی لفظ لکھا ہے، مگر جہاں کہیں اس لفظ کا اطلاق اللہ سبحانہ تعالیٰ کی طرف ہے' وہاں پر امام موصوف نے ''تدبیر'' لکھا ہے۔ [۱۴]

ایسی ہی سورہ فتح کی آیت نمبر ۲۰ ہے:

"لِیَغْفِرَ لَکَ اللّٰہُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِکَ وَمَا تَاَخَّرَ۔"

کے ترجمے میں عام ترجمہ نگاروں نے ذنب کی نسبت سید المعصومین حضور نبی کریم ﷺ کی طرف کی ہے، یہاں تک کہ ''ذنب'' کا اردو ترجمہ ''گناہ'' کرکے (نعوذ باللہ من ذلک) حضور شفیع المذنبین ﷺ کو گنہگار، خطا کار لکھ دیا ہے۔ جبکہ امام موصوف نے اس مقام پر سیّد عالم ﷺ کے مقام و مرتبہ، عزت و عصمت اور عظمت و طہارت کو ملحوظ رکھتے ہوئے جو ترجمہ کیا ہے اس کو پڑھ کر قاری کا

ایمان تروتازہ ہو جاتا ہے اور امام موصوف کی قرآنی فہمی و دیگر علوم مثلاً علم تفسیر، اصولِ تفسیر، علم حدیث، اصولِ حدیث، علم صرف ونحو ولغت اور عمدہ اسلوبِ نگارش پر اُن کی گہری دسترس کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

ترجمہ ملاحظہ ہو:

''تا کہ اللہ تمہارے سبب سے گناہ بخشے تمہارے اگلوں اور تمہارے پچھلوں کے۔''

قرآن کریم کی تلاوت کرنے والے اس کے اس اعجاز سے بخوبی واقف ہیں کہ جب اس کی تلاوت کی جاتی ہے تو ایسا ترنم پیدا ہو جاتا ہے جیسے آبشار گرتا ہے اور سننے والا جھولے بغیر نہیں رہ پاتا۔

امام موصوف نے بھی اپنے ترجمے میں وہی انداز بھر دیا ہے۔ آپ ترجمہ پڑھیے اور صوتی حسن اور نغمگی کا لطف اٹھایئے۔

''اذالشمس کورت واذالنجوم انکدرت...... واذا لجنة ازلفت علمك نفس ما احضرت۔'' ۱۵

ترجمہ: جب دھوپ لپیٹی جائے اور جب تارے جھڑ پڑیں اور جب پہاڑ چلائے جائیں اور جب تھلکی (گابھن) اونٹیاں چھوٹی پھریں اور جب وحشی جانور جمع کیے جائیں اور جب سمندر سلگائے جائیں اور جب جانوں کے جوڑ بنیں اور جب زندہ دبائی ہوئی سے پوچھا جائے کس خطا پر ماری گئی اور جب نامۂ اعمال کھولے جائیں اور جب آسمان جگہ سے کھینچ لیا جائے اور جب جہنم بھڑکایا جائے اور جب جنت پاس لائی جائے، ہر جان کو معلوم ہو جائے گا جو حاضر لائی۔''

یہاں بھی کیف وسرور اور ترنم کا وہی عالم ہے جو کلامِ الٰہی سے ہوتا ہے۔ دراصل ترجمے میں ترجمہ نگار پر کچھ پابندیاں ہوتی ہیں کہ وہ اصل کتاب یا قرآن مقدس کے ترجمے میں اصل کا پابند رہتا ہے، البتہ خوبی یہ ہے کہ جو کیفیت اصل عبارت یا آیات میں ہو اسے ظاہر کر دیا جائے اور یہی ترجمے کا کمال ہے۔ امام موصوف نے ایسے ہی الفاظ پیش کیے ہیں جو قرآنی مفہوم ادا کرتے ہیں اور اس کے حسن، اندازِ جمال وجلال، صوتی آہنگ، ترنم وتغنم وغیرہ کو ظاہر کر دیتے ہیں۔

امام احمد رضا قدس سرہ کے ترجمۂ قرآن (کنزالایمان) کو پڑھتے جائیں اور جس جہت سے دیکھیں اور پڑھیں ہر جہت حسین وبلیغ اور پُر وقار ہے۔ ایجاز واختصار، روزمرہ کا اہتمام، محاورات کا استعمال، لغات سے الفاظ کا انتخاب، پھر اس کا برمحل استعمال، معنویت، ادبیت، فصاحت وبلاغت، شانِ علویت الٰہی کی پاسداری، عظمتِ نبوت ورسالت کی نگہداری، غرض ہر زاویے سے آپ کے ترجمے میں وہی شان جھلکتی ہے جو قرآنِ مقدس کے متن میں ہے۔ آپ کی ترجمہ نگاری کا کمال اور اسلوبِ نگارش کی بہت بڑی خوبی ہے۔

فتاویٰ رضویہ کا اسلوب نگارش: امام احمد رضا قدس سرہ کے فتوؤں کے مجموعے کا نام ''العطایا النبویہ فی الفتاویٰ الرضویہ'' ہے جو کہ فتاویٰ رضویہ کے نام سے مشہور ہے۔ جس کے صفحات کی مجموعی تعداد بڑے سائز میں تقریباً ۱۲۰۰ ہے، جو ۱۲ جلدوں پر مشتمل ہے۔ جس میں علما و مشائخ کے علاوہ کثیر تعداد میں ملک و بیرون ملک سے وکلا، جج صاحبان، پروفیسر اور دانشور حضرات کے ذریعے کیے گئے دینی، علمی اور فنی ژولیدہ مسائل کا شافی حل موجود ہے۔

امام موصوف کا قلبی رجحان فقہ کی طرف تھا، مگر آپ کو جملہ مروجہ و غیر مروجہ علوم وفنون پر درک حاصل تھا۔ چنانچہ آپ سے فقہ کے علاوہ دیگر علوم وفنون سے متعلق بھی سوالات ہوئے ہیں، جن کا تشفی بخش جواب آپ نے تحریر فرمایا ہے۔ آپ کو فقہ اور دیگر علوم وفنون پر اس قدر عبور حاصل تھا کہ کثرتِ سوالات کی وجہ سے آپ بیک وقت دو، دو، تین، تین ماہرین کو الگ الگ موضوعات کے سوالات کے جوابات املا کراتے، لیکن کیا مجال کہ جملوں میں کہیں بے ربطی ہو یا عبارتوں میں کہیں جھول۔ آپ جیسا قلم برداشتہ لکھنے والا اردو ادب میں کوئی نظر نہیں آتا۔

آپ کے فتاویٰ رضویہ کا اسلوب یقیناً منفرد ہے فقہی مسائل کو ادبی زبان پیش کرنا مشکل ترین امر ہے شرعی مسائل میں فارسی اور عربی الفاظ ناگزیری اور آپ عربی و فارسی کے جید عالم بھی تھے باوجود اس کے آپ بخوبی جانتے تھے کہ کس مقام پر عربی لفظ زیادہ مناسب ہے اور کس جگہ فارسی یا اردو کا اس لیے آپ نے جہاں جس لفظ کو مناسب سمجھا ہے اس کو استعمال میں لیا ہے اور فصاحت کا یہی تقاضہ بھی ہے۔

آپ نے فتاویٰ رضویہ میں توضیحی نثر سے کام لیا ہے جس میں استدلال قطعیت اور ایجاز ہے اور ابہام کے عیب سے پاک ہے۔ آپ نے لفظوں سے کھیل کر انھیں بھول بھلیاں بنا کر اپنی نثر کو معمہ نہیں بنایا ہے بلکہ ہر بات واضح اور صاف ہے اور اچھی نثر کی یہی خوبی ہے اس میں تسلسل ہے روانی ہے جس میں مشکل الفاظ کے علاوہ کوئی چیز تفہیم کی راہ میں رکاوٹ نہیں۔ یہی آپ کے فتاویٰ کا منفرد اسلوب نگارش ہے۔

غسل کے متعلق ایک سوال کے جواب میں رقم طراز ہیں۔

'' آج کل بہت بے علم اس 'مضمضہ'' کے معنی صرف کُلی کے سمجھتے ہیں کچھ پانی منہ میں لے کر اُگل دیتے ہیں کہ زبان کی جڑ اور حلق کے کنارہ تک نہیں پہنچتا یوں غسل نہیں اترتا نہ اس غسل سے نماز ہو سکے نہ مسجد میں جانا جائز ہو، بلکہ فرض ہے کہ داڑھوں کے پیچھے، گالوں کہ تہہ دانتوں کی جڑ، دانتوں کی کھڑکیوں میں، حلق کے کنارے تک ہر پُرزے پر پانی بہے یہاں تک کہ اگر کوئی سخت چیز کہ پانی بہنے کو روکے گی دانتوں کی جڑ یا کھڑکیوں وغیرہ میں حائل ہو تو لازم ہے کہ اسے جدا کر کے کلی

کرے ورنہ غسل نہ ہوگا۔ ہاں اگر اس کے جدا کرنے میں حرج وضرروا ذیت ہو جس طرح پانوں کی کثرت سے جڑوں میں چونا ناجم کر متحجر ہو جاتا ہے کہ جب تک زیادہ ہو کر آپ ہی جگہ نہ چھوڑ دے چھڑانے کے قابل نہیں ہوتا یا عورتوں کے دانتوں میں رسی کی ریخیں جم جاتی ہیں کہ ان کے چھیلنے میں دانتوں یا مسوڑھوں کی مضرت کا اندیشہ ہے تو جب تک یہ حالت رہے گی اس قدر کی معافی ہوگی۔ ۱۶

اس اقتباس میں تفہیم اور ایجاز کا انداز جداگانہ ہے۔

آپ کی فتاویٰ نگاری کا ایک نمایاں اسلوب یہ بھی ہے کہ بغیر کسی پہلو کو تشنہ چھوڑے مسئلے کا حل ابتداہی میں اختصار کے ساتھ فرما دیا ہے۔

مثلاً مزارات اولیا پہ تلاوت قرآن کریم اور مبارک دینی محفلوں کے انعقاد اس کے ایصال ثواب اور عورتوں کے قبور پر جانے کے سلسلے میں بڑے رسوخ کے ساتھ جواب تحریر فرماتے ہیں۔

''اولیاء کرام کے مزارات پر ہر سال مسلمانوں کا جمع ہو کر قرآن مجید کی تلاوت اور مجالس کرنا اور اس کا ثواب ارواح طیبہ کو پہنچانا جائز ہے کہ منکرات شرعیہ مثل رقص ومزامیر وغیر ہا سے خالی ہو عورتوں کو قبور پر ویسے جانا چاہیے نہ کہ مجمع میں بے حجابانہ اور تماشے کا میلا کرنا اور فوٹو وغیرہ بجوانا یہ سب گناہ و ناجائز ہیں جو شخص ایسی باتوں کا مرتکب ہو اسے امام نہ بنایا جائے۔'' واللہ تعالیٰ اعلم۔ ۱۷

مزار کے طواف اور بوسہ کا مسئلہ بیان کرتے ہیں:

''مزار کا طواف کہ محض بہ نیت تعظیم کیا جائے ناجائز ہے کہ تعظیم بالطواف مخصوص بخانہ کعبہ ہے۔ مزار کو بوسہ نہ دینا چاہیے۔ علما اس میں مختلف ہیں اور بہتر بچنا اور اسی میں ادب زیادہ ہے آستانہ بوسی میں حرج نہیں۔ اور آنکھوں سے لگانا بھی جائز کہ اس سے شرع شریف میں ممانعت نہ آئی اور جس چیز کو شرع نے منع نہ فرمایا منع نہیں ہو سکتی قال اللہ تعالیٰ ''ان الحکم الا اللہ'' ہاتھ باندھے الٹے پاؤں آنا ایک طرز ادب ہے اور جس ادب سے شرع نے منع نہ فرمایا اس میں حرج نہیں ہاں !اگر اس میں اپنی یا دوسرے کی ایذا کا اندیشہ ہو تو اس سے احتراز کیا جائے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔ ۱۸

مندرجہ بالا اقتباسات میں فصاحت ایجاز اور قطعیت کے ساتھ ہی زبان و بیان میں سادگی او سلاست موجود ہے معمولی اردو خواں بھی مسائل کو باسانی سمجھ سکتا ہے۔

آپ کے اسلوب نگارش کی ایک خوبی وضاحت ہے مندرجہ ذیل اقتباس ملاحظہ ہو کس قدر پیچیدہ مسئلہ کو ایجاز اختصار کے ساتھ واضح فرما دیا ہے۔

''صورت مسئولہ میں غسل یا وضو کسی کے لیے تیمم جائز نہیں وضو کے لیے تو ناجائز ہونا ظاہر کہ ان کا وضو سے کوئی علاقہ نہیں اور غسل کے لیے یوں کہ ہوا کیا کہ بدن پر پانی ڈال سکتا ہے لہٰذا وضو تو

بلاشبہ تمام و کمال کرے اور غسل کی حاجت ہو تو مضرت اگر صرف ٹھنڈا پانی کرتا ہے گرم نہ کرے گا اور اسے گرم پر قدرت ہے تو بے شک پورا غسل کرے، اتنی جگہ کو گرم پانی سے دھوے باقی بدن گرم یا سرد جیسے سے چاہیے اور اگر ہر طرح کا پانی مضر ہے یا اگر مضر نہ ہوگا مگر اسے اس پر قدرت نہیں تو ضرر کی جگہ بچا کر باقی بدن دھوے اور اس موضع پر مسح کرلے اور اگر وہاں مسح بھی نقصان دے مگر وہ دوا یا پٹی کے حائل سے پانی کی ایک دھار بہا دینی مضر نہ ہوگی تو وہاں اس حائل پر ہی بہادے باقی بدن بدستور دھوے۔ اور اگر حائل پر بھی پانی بہانا مضر ہو تو دوا یا پٹی پر مسح کرے۔ اگر اس سے بھی مضرت تو اتنی جگہ خالی چھوڑ دے۔ جب وہ ضرر دفع ہو تو جتنی بات پر قدرت ملتی جائے بجالاتا جائے۔ ۱۹

ایجاز و اختصار کے ساتھ وضاحت کا کمال آپ کے پورے فتاویٰ رضویہ میں موجود ہے ضروری لفظ کا استعمال اور وغیرہ ضروری سے احتراز آپ کی نگارش کی خوبی ہے ایک اقتباس ملاحظہ ہوا۔

مولانا رشید احمد گنگوہی نے دیوار مسجد سے تیمم کو مکروہ لکھ دیا وہ شاید یہ گمان کرتے تھے کہ تیمم کرنے سے دیوار مسجد میں تصرف ہوجائے گا۔ آپ نے اس گمان کا وضاحت کے ساتھ جائزہ پیش کیا۔

"تیمم جو کچھ تصرف اپنے چہرہ و دست پر ہے۔ دیوار سے صرف چھونے ہاتھ لگانے کا تعلق ہوگا یہ دیوار میں کوئی تصرف نہ کہلائے گا ورنہ مکروہ نہیں بلکہ حرام ہوتا اور نہ صرف دیوار مسجد بلکہ دیوار ہر وقت بلکہ دیوار تیمم بلکہ ہر نابالغ بلکہ بے اذن مالک ہر دیوار مملوک سے تیمم کرنا بلکہ اس پر ہاتھ لگانا یا انگلی سے چھونا یا دیوار مسجد سے پیٹھ لگانا سب حرام ہوتا اور اس کا قائل نہ ہوگا مگر سخت جاہل۔ ہاتھ لگانے سے دیوار کا کچھ خرچ نہیں ہوتا۔ چراغ میں تیل بتی کا خرچ ہے پھر بھی مسجد کے چراغ سے کہ مسجد کے لیے روشن ہے خط پڑھنا یا کتاب دیکھنا یا سبق پڑھنا پڑھانا بلاشبہہ روا ہے۔ ۲۰

امام احمد رضا قدس سرہ نے اپنے فتاویٰ میں سائنس کی باریکیوں کو بھی پیش کیا اس ضمن میں ایک اقتباس میں ملاحظہ ہو! کس قدر سائنسی مضمون کو ادب کا جامہ پہنا دیا ہے۔

"اب برف کے یہ باریک باریک متصل اجزاء کہ شفاف ہیں نظر کی شعاعوں کو انہوں نے واپس دیا۔ پلٹتی شعاعوں کی کرنیں ان پر چمکیں اور دھوپ کی سی حالت پیدا کی جیسے پانی یا آئینے پر چمکے اس کا عکس دیوار پر کیسا سفید براق نظر آتا ہے۔ زمین شور میں دھوپ کی شدت میں دور سے سراب نظر آنے کا بھی یہی باعث ہے۔ خوب چمکتا جنبش کرتا پانی دکھائی دیتا ہے کہ اس زمین میں اجزائے صیقلہ، شفافہ دور تک پھیلے ہوتے ہیں۔ نگاہ کی شعاعیں ان پر پڑ کر واپس ہوئیں اور شعاع کا قاعدہ ہے کہ واپسی میں لرزتی ہے جیسے آئینے پر آفتاب چمکے دیوار پر اس کا عکس جھل جھل کرتا نظر آتا ہے اور شعاعوں کے زاویے یہاں چھوٹے تھے کہ ان ساقیں طویل ہیں کہ سراب دور ہی سے متخیل ہوتا ہے۔ ۲۱

آپ کی اس عبارت میں وضاحت، استدلال، ایجاز اور زبان و بیان میں سادگی کے ساتھ ساتھ سلاست موجود ہے۔ زمین شور، اجزاے صیقلہ، شقامہ، وغیرہ کی ترکیب نے عبارت میں حسن بھر دیا ہے۔

طنز و مزاح: امام احمد رضا قدس سرہ یہاں روانی جدت طبع اور طنز و مزاح کی بھی کمی نہیں۔ آپ ظرافت کی نزاکت سے پوری طرح واقف تھے سنجیدگی کے ساتھ طنز و مزاح کے متعدد گل بوٹے کھلاے ہیں مگر استہزا کے بجاے اصلاح مطلوب ہے۔ آریوں کا عقیدہ ہے کہ ایشور ہر جا رما ہوا ہے اور ہر شخص کے آگے دس انگل کے فاصلے پر موجود ہے۔ اس عقیدہ کی تردید کس انداز میں فرمائی ہے! اقتباس ملاحظہ ہوا۔

''دس انگل کے فاصلے پر ہر آدمی کے آگے بیٹھا ہے تو ہر جگہ کب ہوا؟ پھر دو آدمی آمنے سامنے دس انگل کے فاصلے سے ہوں تو ان میں ہر ایک ایشور کی جگہ میں شریک ہوا اور دو انگل کے فاصلے پر ہوں تو ایشور آٹھ آٹھ انگل ہر ایک کے پیٹ میں گھسا ہوا ٹھہرا...... پھر جب ہر جگہ رما ہوا ہے فرض کرو ایک شخص نے دوسرے کے جوتا مارا تو یہ فضا جس میں جوتا چل کر اس کے بدن تک گیا اس میں بھی ایشور تھا یا نہیں؟ نہ کیونکر ہوگا کہ وہ سب جگہ ہے اور جب یہاں بھی تھا تو جوتا آتے ہوئے دیکھ کر ہٹ گیا یا جوتا اس کے اندر ہوتا ہوا گزر گیا۔ ہٹ تو سکتا نہیں ورنہ ہر جگہ کب رہا یہ جگہ خالی ہو جائے گی ضرور جوتا اس میں ہو کر گزرا۔ عجیب ایشور ہے کہ جوتے سے پھٹ گیا۔۲۲

اس اقتباس میں منطقی انداز و استدلال کے ساتھ ساتھ طنز و مزاح کا عمدہ نمونہ نظر آتا ہے۔

آپ کی فتاویٰ نگاری کا اسلوب بھی جداگانہ ہے عام طور سے توضیحی نثر میں ادبیت دل کشی و رنگینی و شگفتگی وغیرہ فقدان ہوتا ہے مگر آپ نے فقہ و فتوی کے حوالے سے بھی شان ادبیت کو پیش فرمایا ہے جس میں صوتی حسن اور بلاغت موجود ہے۔ آپ نے اپنے فتووں میں بیانیہ اور تاثراتی نثر سے بھی کام لیا ہے رہی بات انانیتی نثر اور اس میں مبالغہ کا تو فقہ فتوی میں اس کی ہرگز گنجائش نہیں تاہم جہاں کہیں افکار و نظریات کی تردید کی ہے وہاں جوش زور آ گیا ہے جس سے انانیت کا اظہار ہوتا ہے۔ اسے تحدیث نعمت کہیں گے۔

چنانچہ آپ فتاویٰ رضویہ میں مختلف قسم کی پانی کے احکام کا ذکر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں۔

''سب سے اعلیٰ سب سے افضل دونوں جہانوں کے سب پانیوں سے افضل زم زم سے افضل کوثر سے افضل وہ مبارک پانی جو بار ہا براہِ اعجاز حضور انور سید عالم ﷺ کی انگشتان مبارک سے دریا کی طرح بہا اور ہزاروں نے پیا اور وضو کیا علماء فرماتے ہیں کہ وہ پانی زم زم و کوثر سے افضل ہے مگر اب کہاں وہ نصیب؟۔۲۳

اس اقتباس میں رنگ خطابت کی جھلک موجود ہے اور ظاہری طور پر مبالغہ بھی جہاں تک خطابت کی بات ہے تو وہ تحریر میں دراصل نہ ہی اچھا عمل ہے اور نہ ہی بُرا بلکہ اسلوب بیان میں قلم کار کامیاب ہے تو یہی خطابت لائق تحسین ہے۔

بیانیہ نثر کی ایک مثال۔

''بقیع و اُحد و قبا کی زیارت سنت ہے مسجد قبا کی دو رکعت کا ثواب ایک عمرہ کے برابر ہے اور چاہو تو یہیں حاضر ہو۔ سیدی ابن ابی حمرہ قدس سرہ جب حضور ہوتے آٹھوں پہر برابر حضوری میں کھڑے رہتے۔ ایک دن بقیع وغیرہ زیارت کا خیال آیا پھر فرمایا یہ ہے اللہ کا دروازہ بھیک مانگنے والوں کے لیے کھلا ہے اس چھوڑ کر کہاں جاؤں۔

سرایں جا، سجدہ ایں جا، بندگی ایں جا قرار یں جا۔''۴۴

اس اقتباس میں شعری فضا کا کتنا خوبصورت اہتمام فرمایا ہے۔

زیارت مدینہ پاک کے آداب بیان فرماتے ہوئے رقم طراز ہیں۔

(۱)'' زیارت اقدس قریب بواجب ہے بہت لوگ دوست بن کر طرح طرح ڈراتے ہیں۔ راہ میں خطرہ ہے۔ وہاں بیماری ہے۔ خبردار کسی کی نہ سنو اور ہرگز محرومی کا داغ لے کر نہ پلٹو۔ جان ایک دن جانی ضرور ہے اس کیا بہتر کہ ان کی راہ میں جائے اور تجربہ ہے کہ جو ان دامن تھام لیتا ہے اسے اپنے سایہ میں بآرام لے جاتے ہیں۔ کیل کا کھٹکا نہیں ہوتا والحمد للہ۔

(۲)'' حاضری میں خاص زیارت اقدس کی نیت کرو یہاں تک کہ امام ابن الہمام فرماتے ہیں اس بار مسجد شریف کی بھی نیت نہ کرے۔

(۳) راستہ بھر درود شریف و ذکر شریف میں ڈوب جاؤ۔

(۴) جب حرم شریف نظر آئے بہتر یہ کہ پیادہ ہولو۔ روتے سر جھکائے آنکھیں نیچی کئے اور ہوسکے تو ننگے پاؤں چلو بلکہ۔

جائے سراست اینکہ تو پای نہی | پائے نہ بینی کہ کجائی نہیں
حرم کی زمین اور قدم رکھ کے چلنا | ارے سر کا موقع ہے او جانے والے

(ب) جب قبہ انور پر نگاہ پڑے درود وسلام کی کثرت کرو۔

(۶) جب شہر اقدس پہنچو جلال و جمال محبوب ﷺ کے تصور میں عرق ہو جاؤ۔

یہ اقتباس بیانیہ نثر کا نمونہ ہے اس میں ادائے مطالب میں تعین و تیقن کا جوہر موجود ہے مقصد ایک مخصوص پیغام کی ترسیل ہے تبلیغ محبت رسول کا عنصر نمایاں ہے وزن وقار اور زور وشور سیل معانی اور

طبیعت کی روانی ہر جگہ عیاں ہے۔ ہر سطر شان دار اور طرح دار ہے۔

امام احمد رضا قدس سرہ نے فتویٰ نگاری کی راہ میں جہاں فقہ وفتوے کے فطری اسلوب کو متانت و دیانت کے ساتھ اختیار فرمایا ہے وہیں وضاحت، قطعیت استدلال ترتیب و تزئین اور بلاغت سے بھرپور توضیحی نثر کے جلوے بھی دکھائے ہیں۔

بہر حال اب تک امام احمد رضا قدس سرہ کا ترجمہ قرآن "کنز الایمان" اور آپ کے فتاویٰ مجموعہ فتاویٰ رضویہ کے حوالے سے بعض اقتباس کی روشنی میں آپ کے اسلوب نگارش کا مختلف جائزہ پیش ہوا مگر ان کے علاوہ بھی، حدیث، تفسیر، عقائد، وکلام، تصوف اور دیگر مذہبی وفنی علوم مثلاً ریاضی، فلسفہ، منطق، عمرانی، تجارتی علوم کے تصانیف میں منفرد اسلوب نگارش کے نمونے موجود ہیں لہٰذا آپ کی بعض تصانیف سے چند اقتباسات پیش ہیں۔

توضیحی اقتباس: " شریعت ہی اصل کار ہے شریعت ہی مناومدار ہے شریعت ہی محک و معیار ہے۔ شریعت راہ کو کہتے ہیں اور شریعت محمدیہ علی صاحبھا افضل الصلوٰۃ والتحیہ کا ترجمہ محمد رسول اللہ ﷺ کی راہ۔ یہ قطعاً عام و مطلق ہے نہ کہ صرف چند احکام جسمانی سے خاص۔ یہی وہ راہ ہے کہ پانچوں وقت بلکہ ہر نماز، بلکہ ہر رکعت میں اس کا مانگنا اس پر ثبات واستقامت کی دعا کرنا ہر مسلمان پر واجب فرمایا کہ "اھدنا الصراط المستقیم"۔ ہم کو محمد ﷺ کی رہ پر چلا۔ ان کی شریعت پر ثابت قدم رکھ۔ قرآن عظیم میں فرمایا۔ ان ربی علی الصراب مستقیم۔ بے شک اس سیدھی راہ پر میرا رب ملتا ہے۔ جس کا مخالف بددین گمراہ ہے۔"[۲۶]

" شریعت منبع ہے اور طریقت اس نکلا ہوا ایک دریا بلکہ شریعت اس مثال سے بھی متعالی ہے۔ منبع سے پانی نکل کر، دریا بن کر جن زمینوں پر گذرے انہیں سیراب کرنے میں اسے منبع کی احتیاج نہیں۔ نہ اس سے نفع لینے والوں کو اصل منبع کی اس وقت حاجت مگر شریعت وہ منبع ہے کہ اس سے نکلے ہوئے دریا یعنی طریقت کو ہر آن اس کی احتیاج ہے۔ منبع سے اس کا تعلق ٹوٹے تو یہی نہیں کہ صرف آئندہ کے لیے مدد موقوف ہوجائے گی۔"[۲۷]

دونوں اقتباسات میں سے ایک میں شریعت کی حقیقت واضح کی ہے اور دوسرے میں دونوں کا موازنہ ہے پہلے قرآن کریم کی روشنی میں شریعت کو اصل ثابت کیا اور پھر شریعت اور طریقت کو موزانہ پیش کرتے ہوئے طریقت کو ہر حال میں شریعت کا محتاج ثابت کیا۔ دنوں اقتباسات وضاحت، استدلال وقطعیت، ایجاز واختصار کے بہتر نمونے ہیں۔

انہی شریعت وطریقت کے موضوع پر ایک اقتباس کی روشنی میں آپ کا اسلوب نگارش ملاحظہ ہو۔

''شریعت مطہرہ ایک ربانی نور کا فانوس ہے کہ دینی عام میں اس کے سوا کوئی روشنی نہیں اس کی روشنی بڑھنے کی کوئی حد نہیں۔ زیادت چاہیے افزائش پانے کے طریقے کا نام طریقت ہے۔ یہ روشنی بڑھ کر صبح اور پھر آفتاب اور پھر اس سے بھی غیر متناہی درجوں زیادہ تک ترقی کرتی ہے جس سے حقائق اشیاء کا انکشاف ہوتا اور نورِ حقیقی تجلی فرماتا ہے۔ یہ مرتبہ علم میں معرفت اور مرتبہ تحقیق میں حقیقت ہے۔ تو حقیقت میں وہی ایک شریعت ہے کہ باختلاف مراتب اس کے مختلف نام رکھے جاتے ہیں۔ جب یہ نور بڑھ کر صبح روشن کے مثل ہوتا ہے۔''

توضیحی نثر کے باب میں طنز وتعریض کے حوالے سے ایک اقتباس پیش ہے۔

''تالشاواے غربت اسلام وانصاف! کیا کوئی ان سے اتنا کہنے والا نہیں کہ ہندوؤں کے بالفعل محاربین سے بھی تمہیں عداوت کا اقرار ہاتھی کے دانت کھانے کے اور دکھانے کے اور کیا تمہیں نہیں ہوا! کہ جب وہ محاربین قاتلین، کافرین گرفتار ہوئے۔ ان پر ثبوت اشد جرائم کے انبار ہوئے، تمہاری چھاتی دھڑکی تمہاری، ممتا پھڑ، گھبرائے، تلملائے، شپٹائے جیسے اکلوتے کی پھانسی سن کر ماں کو درد آئے۔ فوراً گرما گرم، دھواں دھار ریزلیوشن پاس کیا ہے کہ ہے ہے؟ یہ ہمارے پیارے ہیں، یہ ہماری آنکھ کے تارے ہیں، انہوں نے مسلمانوں کو ذبح کیا، جلایا، پھونکا، مسجدیں ڈھائیں، قرآن پھاڑے، یہ ہماری ان کی خانگی شکر رنجی تھی، ہمیں اس کی مطلق پروا نہیں، یہ ہمارے سگے ہیں، کوئی سوتیا ڈاہ نہیں، ماں بیٹی کی لڑائی دودھ کی ملائی، برتن ایک دوسرے سے کھڑک ہی جاتا ہے، ان کے درد سے ہمیں غش غش آتا ہے۔ ان کا بال بیکا ہوا اور ہمارا کلیجہ پھٹا، للہ ان کو معافی دی جائے، فوراً ان سے درگزر کی جائے۔ یہ ہے آیۂ ممتحنہ پر تمہارا عمل یہ ہے ''الذین قاتلو کم فی الدین '' تمہاری جنگ وجدل، یہ ہے واحد قہار کو تمہارا پیٹھ دینا ہے کلام جبار سے تمہارا مچلا لینا۔ ان تمہارے سگوں نے قرآن مجید پھاڑے تم نے اس کے احکام پاؤں تلے مل ڈالے۔ انہوں نے مسجدیں ڈھائیں تم رب المسجد کے ارشاد دولتیوں سے کچل ڈالے، قرآن چھوڑا، ایمان چھوڑا۔ مصطفی ﷺ سے منہ موڑا اور ان کے دشمنوں، ان کے اعداد سے رشتہ جوڑا یہ تمہیں اسلام بدلا ملا، اف لکم بئس للظلمین بدلا' اف ہے تم پر ظالموں نے کیا ہی بُرا عوض پایا۔''۲۹

ایسا اسلوب ابوالکلام آزاد نے اپنی خطابت وصحافت میں اختیار کیا ہے مگر امام احمد رضا قدس سرہ نے اس اسلوب کو جس خوبی کے ساتھ فقہی حل اور فتویٰ نگاری میں برتا ہے یہ انہیں کا منفرد کمال ہے۔ جس میں بیان کا خوش وخروش سلاست، روانی، طنز وتعریض، نشتریت، ارتراکیب ومحاورات کا برمحل استعمال اس عبارت کی خوبیاں ہیں۔ ہم قوافی الفاظ سے صوتی حسن پیدا ہوگیا ہے۔ تراکیب اگرچہ

دق ہیں مگر مضمون کے اعتبار سے بلیغ ہیں۔ محاورات اور ضرب المثل کے استعمال سے وضاحت میں کوئی کمی نظر نہیں آتی جبکہ قرآنی آیات کا اس خوبصورتی سے استعمال ہوا ہے کہ متن کے سیاق و سباق سے وابستہ و پیوستہ نظر آتے ہیں۔

جوش بیان اور طنز و تعریض: امام احمد رضا قدس سرہ کی نگارشات میں دینی مسلکوں اور علم و ادب کے حوالے سے تنقید و تعریض رد و گرفت بھی موجود ہے۔ جن میں خوش و خروش نمایاں سے آپ کی نگارشات میں مناظرانہ ار خطیبانہ رنگ بھی موجود ہے اور طنز و نشتریت بھی البتہ مزاج و ظرافت ہی کم ہیں مگر کہیں کہیں گدگدی سی ضرور محسوس ہوتی ہے۔ اور تبسم کی صورت پیدا ہو ہی جاتی ہے۔

نمونے کے لیے اقتباسات۔

''خدارا انصاف! وہ عقل کے دشمن دین کے رہزن، جہنم کے کودن کہ ایک اور تین میں فرق نہ جانیں ایک خدا کے تین مانیں پھر ان تین کو ایک ہی جانیں۔ بے مثل بے کفو کے لیے جورو بتائیں۔ بیٹا ٹھہرائیں۔ اس کی پاک بندی، ستھری، کنواری، پاکیزہ بتول مریم پر ایک بڑھئی کی جورو ہونے کی تہمت لگائیں۔ پھر خاوند کی حیات، خاوند کی موجودگی میں بی بی کے جو بچہ اسے دوسرے کا گائیں۔ خدا اور خدا کے پیاسے، بوٹیوں کے بھوکے، روٹی کو اس کا گوشت بنا کر در در چبائیں۔
شراب ناپاک کو اس پاک معصوم کا خون ٹھہرا کر غٹ غٹ چڑھائیں۔ دنیا یوں گزری۔ ادھر موت کے بعد کفارے تو اسے بھینٹ کا بکرا بنا کر جہنم بھجوائیں۔ مفتی کہیں، ملعون بتائیں۔ اے سبحان اللہ! اچھا خدا جسے سولی دی جائے۔ عجب خدا جیسے دوزخ جلائے طرفہ خدا جس پر لعنت آئے، جو بکرا بنا کر بھینٹ دیا جائے۔ اے سبحان اللہ! باپ کی جہنم کو بیٹے ہی سے لاگ، سرکشوں کو چھٹی بے گناہ پر آگ امتی ناجی، رسول معلون، معبود پر لعنت بندے مامون، تف تفِ! وہ بندے جو اپنے ہی خدا کا خون چکھیں، اسی کے گوشت پر دانت رکھیں، اُف اُف! وہ گندے جو انبیاء و رُسل پر وہ الزام لگائیں کہ بھنگی چمار بھی جن سے گھن کھائیں۔ سخت فحش بے بودہ کلام گڑھیں اور کلام الٰہی ٹھہرا کر پڑھیں، زہ زہ بندگی! اَخہ آخہ تعظیم! پہ پہ تہذیب۔ قہ قہ تعلیم۔'' [۳۰]

''اللہ اللہ یہ قوم! یہ قوم یہ سراسر موم، یہ لوگ جنہیں عقل سے لاگ، جنہیں جنون کا روگ،
یہ اس قابل ہوئے کہ خدا پر اعتراض کریں اور مسلمان ان لغویات پر کان دھریں۔'' [۳۱]

یہاں بھی جوش و خروش، سلاست و خطابت طنز کا تیز الی اظہار اور نشتر سبھی کچھ موجود ہے ہم قوامی الفاظ اور ضرب المثل کے برمحل استعمال نفس مطلب کی وضاحت کے ساتھ ساتھ بلند آہنگی پیدا کردی ہے پھر، زہ زہ، خہ خہ، پہ پہ، قہ قہ، پشتو اور فارسی کے الفاظ نے آہنگ کو مزید باوقار اور پر جلال بنادیا ہے۔

آپ کی اکثر تصانیف میں آپ کے کچھ تکیہ ہائے کلام بھی موجود ہیں مثلاً: اللہ اللہ سبحان اللہ، خدارا مسلمانو! حاشاللہ وغیرہ ان تکیہ ہائے کلام سے اسلوب نگارش میں مباحت اور ملاحت کا امتزاج عجب حسن بھر دیتا ہے۔ جن کے وسیلے سے آپ اپنے بیان میں زور پیدا کر کے قاری کو قائل کر لینے میں کامیاب ہیں۔ جو ایک بامقصد اور اچھے ادیب کی پہچان ہے۔

امام احمد رضا قدس سرہ کا موقف ہے کہ خلیفۃ المسلمین ہونے کے لیے قریشی ہونا بھی لازمی شرط ہے۔ اور آپ نے اپنے موقف کی تائید میں احادیث متواترہ اجماع صحابہ و تابعین وائمہ امت کے احوال واقوال پیش کئے ہیں۔

جبکہ مولینا ابوالکلام آزاد کا موقف ہے کہ خلیفۃ المسلمین ہونے کے لیے قرشی ہونا لازمی شرط نہیں ہے۔ امام موصوف نے ابوالکلام آزاد کے رسالے "خلافت کے مندرجات پر تنقید و گرفت کرتے ہوئے کس طرح طنز کی ملاحت اور نشتریت کے جلوے دکھائے ہیں اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

"کسی پرچہ کے اخبار کی ایڈیٹری اور چیز ہے اور حدیث وفقہ کا سمجھنا اور۔ وہ من کا ترجمہ "سے" ورالی کا ترجمہ تک" کر لینے سے نہیں آتا اگر ضمیر قریش کی طرف ہوتی تو "اثنان" کی جگہ" احد" فرمایا جاتا یعنی جب تک ایک قریشی بھی ہے۔" ۳۲

"مسٹر نے یوں ہی دوسری حدیث "الائمۃ من قریش سے تشریع اڑانے اور نری خبر بنانے کے لیے کیا کیا ڈوبتے سوار پکڑے ہیں۔" ۳۳

"سبحان اللہ! زہے مسٹری ولیڈری وایڈیٹری۔" ۳۴

ان اقتباسات میں مولانا ابوالکلام آزاد پر جوت ہے مگر ابتذال سے پاک ہے اس لیے کہ بیان مدلل ہے اور جملے میں بلاغت کی فراوانی ہے۔

آئزک نیوٹن کے نظریہ جذب وکشش کا رد تعاقب کرتے ہوئے رقم طراز ہیں۔

"سب کے گرنے اور جاذبیت کا آسیب جاگنے میں علاقہ بھی ایسا ہی لزوم کا تھا کہ وہ گرا اور یہ اچھلا کیونکہ اس کے سوا اس کا کوئی سبب ہوسکتا ہی نہ تھا۔ اس کی پوری بحث کو فصل دوم میں آتی۔ ۱۶۶۵ء تک ہزاروں برس کے عقلا سب اس فہم سے محروم گئے تو گئے تعجب یہ کہ اس سیب سے پہلے نیوٹن نے بھی کوئی چیز زمین پر گرتے نہ دیکھی یا جب تک اس کا کوئی اور سبب خیال میں تھا جسے اس نے گر کر توڑ دیا۔ ۳۵

تلمیحی انداز میں سیب اور آسیب کا وزن، آسیب جاگنا محاورہ اور گرا اور اچھلا، لفظوں کے متضاد بیان نے کلام میں زور پیدا کر دیا ہے۔

فلسفے کے موضوع پر مُلا جونپوری اور طوسی کا تعاقب کرتے ہوئے رقم طراز ہیں۔

''طوسی نے سارے فلسفے کا شہر ڈھادیا تم نے (ملا جونپوری) کون سی اینٹ سلامت رکھی۔ بات وہی ہوئی کہ یہ تخصیص فاعل کی طرف سے ہیں۔ تین بیسی اور ساٹھ ناک کہاں کہ یوں ہائے مجبوری وائے مجبوری اللہ اللہ !اللہ عزوجل کو فاعل مختار ماننا وہ سخت ناگوار ہے کہ ہچکیاں لودم توڑو، ان کہیا بولو، مگر اس پر محال، دل سے مان بھی چکے زبان چبا چبا کر کہہ بھی چکے مگر اقرار ناممکن کہ فلسفے کا سارا شہر جوڑہ جائے حجدو بھا واستیقنتھا انفسھم ظلما وعتوا۔''۳۶

تین بیسی اور ساٹھ ناک، کہاوت، ہائے مجبوری وائے مجبوری میں لفظ مجبوری کی تکرار اور انداز بیان کی طرح اری، اللہ اللہ تکیہ کلام جو امام موصوف کا اپنا اسلوب ہے۔ ہچکیاں لو، دم توڑو، ان کہیاں بولو،صوتی آہنگ میں معاون اور عربی فقرے کے موجودگی میں طنزاور چوٹ میں بھی ملاحت ہے۔

سائنس اور فلسفہ جیسے موضوع پر بھی امام موصوف کی نگارشات میں ادبی رنگ و آہنگ موجود ہے یہ اسلوب شاید ہی کسی نثار یا انشاء پرداز کے یہاں مل سکے۔

تعزیہ داری کی تردید کس قدر صبیح وملیح اور رواں دواں انداز فرماتے ہیں۔ اقتباسات ملاحظہ ہوں:

> '' اب بہار عشرہ کے پھول ،تاشے ، باجے، بجتے چلے ،طرح طرح کے کھیلوں کی دھوم، بازاری عورتوں کا ہر طرف ہجوم، مشہورانی میلوں کی پوری رسوم ،جشن فاسقانہ یہ کچھ اور اس کے ساتھ خیال وہ کچھ گویا ساختہ ڈھانچہ ،بعینھا حضرات شہداء کرام علیہم الرضوان کے پاک جنازے ہیں۔
>
> اے مومنو! اٹھا جنازہ حسین کا پڑھتے ہوئے مصنوعی کربلا پہنچے۔ وہاں کچھ نوچ اتار باقی توڑ تاڑ دفن کردیئے یہ ہر سال اضاعت مال کے جرم وبال جداگانہ ہے۔''۳۷
>
> '' نو چندی کی بلائیں ، مصنوعی کربلائیں ،علم تعزیوں کے کاوے، تخت جریدوں کے دھارے حسین آباد عباسی درگاہ کے بلوے ، ایسے مواقع مردوں کے جانے کے بھی نہیں نہ یہ کہ نازک شیشیاں۔''۳۸

عورتوں کے لیے'' نازک شیشیاں'' کہنا کس قدر نادر اور بلیغ ہے۔

نمایاں نثر میں شعری رنگ و آہنگ: امام موصوف اپنے مقاصد اور افکار ونظر کی ابلاغ و اظہار میں مصروف رہے دوسرے صاحبان قلم کی طرح اپنی نگارشات کو مزین و مرصع کرنے کی کبھی ارادی کوشش نہیں کی تاہم آپ کی نگارشات میں ادب عالیہ کی مثالیں موجود ہیں اقتباس۔

> '' زیر نظر مسئلہ کے متعلق سرائے سخن کے کناروں سے دو چمکتے ستارے لائے ہیں ایک

کالشمس وضحٰھا اور دوسرا کالقمر اذا تلٰھا۔ جو شخص صحت مند آنکھ اور قابل نور علم رکھتا ہے۔ اس کی بصارت و بصیرت کو ان ستاروں کی کاشف ظلمات تجلیات سے اچھی طرح کامیابیاں مہیا و مبارک ہوں۔''۳۹

آپ نے کبھی پر تصنع عبارت آرائی کی کوشش نہیں کی ہے بلکہ فطری انداز بیان کے عادی ہیں مگر کبھی کبھی موضوع کی مناسبت سے بے ساختہ مقفّٰی جملے آپ کے قلم سے ٹپک بڑے ہیں۔ ملاحظہ ہوا:

''نصوص کے دریا میں چھلکتے اور حب مصطفٰے علیہ کے چاند چمکتے اور تعظیم حضور علیہ کے سورج دمکتے اور ہدایت کے بلبل چہکتے اور نجدیت کے کوے سکتے اور وہابیت کے بوم بلکتے اور مذبوح گستاخ پھڑکے۔۴۰

موصوف اپنی نگارشات میں موقع اور موضوع کی مناسبت سے جمالی کیفیت، روانی شگفتگی اور برجستگی کا التزام بڑی کامیابی سے کرتے ہیں۔ اقتباس۔

''تجلی جمال کے آثار سے لطف ونرمی وراحت وسکون ونشاط وانبساط سے جب یہ قلب عارف پر واقع ہوتی ہے دل خود بخود ایسا کھل جاتا ہے جیسے ٹھنڈی نسیم سے تازہ کلیاں یا بہار کے مہینے سے درختوں کی کنچھیاں۔۴۱

جس طرح آپ قرآنی آیات یا عربی کے فقرے وغیرہ اپنی نگارشات میں ضم کردیتے ہیں جن سے نگارش میں برجستگی، دلکشی، اور شگفتگی مزید ابھرنے لگتی ہے۔ اسی طرح آپ جب برمحل مصرع یا شعر وغیرہ لاتے ہیں تو سیاق وسباق سے پیوستہ ہوکر وہی کیفیت پیدا ہوتی۔

'' اللہ اللہ ایک وہ دن تھا کہ مدینہ طیبہ میں حضور پرنور علیہ کی دھوم ہے زمین وآسماں میں خیر مقدم کی صدائیں گونج رہی ہیں۔ خوشی وشادمانی ہے کہ دانہ ہورہا ہے۔ باچھیں کھل جاتی ہیں دل میں کہ سینوں میں نہیں سماتے سینوں میں جائے تنگ، جاموں میں قبائے گل کا رنگ، نور ہے کہ جھما جھم برس رہا ہے فرش سے عرش تک نور کا بقعہ بنا ہے۔ پردہ نشیں کواریاں شوق دیدار محبوب کردگار میں گاتی ہوئی باہر آئی ہیں۔ کہ

طلع البدر علینا من ثنیات الوداع   طوجب الشکر علینا مادعاللاداع ۴۲

اقتباس:

''سرکار نازک مزاجی سے اجازت ملے تو بطریق اس خردار سے چند مشت نمونہ پیش کرے۔

کون کرتا ہے تم سے مکر جانے کا   چھیڑ کر لطف اٹھالیتے ہیں جھنجلانے کا۔''۴۳

یہ تھے آپ کی بعض تصنیفات سے ایک ایک دو دو نگارشات کے نمونے ویسے آپ کی ایک ہزار

سے زائد تصنیفات کے نمونے پیش کرنا محال نہیں تو مشکل ترین بہر حال ہے ان کے علاوہ آپ کے مکتوبات وملفوظات کے مجموعے ہیں جن میں ادب کی وہ جملہ خوبیاں موجود ہیں جنہیں صاحبان زبان و ادب نے تبعین فرمایا ہے۔

الحاصل امام احمد رضا قدس سرہ نے توضیحی، تخلیقی ہر قسم کی نثر لکھی ہے آپ کی توضیحی نثر میں وضاحت، استدلال، قطعیت، ایجاز و اختصار وغیرہ کمال کے ساتھ موجود ہیں۔ توضیحی واستدلالی نثر اور وہ بھی فقہ وفتویٰ نگاری کے حوالے سے عربی، فارسی، الفاظ وتراکیب ومصطلحات اور حسب ضرورت قرآنی آیات احایث کے جملوں یا فقروں کا آنا ناگزیر ہے باوجود اس کے امام موصوف کی نگارشات میں ابہام واشکال او ثقالت کا کوئی گزر نہیں اور ضرورت کے تحت ایسی ہی نگارشات میں بحث و جائزہ کے وقت یا کسی مسئلہ میں اردو گرفت کے موقع پر طنز ونشتریت کاٹ اور بیان کے جوش و زور کا باوقار اور خوبصورت اظہار فرماتے ہیں۔

آپ کی نگارشات میں مبالغہ، جائزہ، تلمیحات، محاورات، تشبیہات و استعارات، وکنایات اور خوبصورت تراکیب کے استعمال سے نثر کو انشاء کا حسن مل گیا ہے۔ آپ کے یہاں شعری رنگ و آہنگ بھی ہے اور نثر میں شعریت بھی آپ نے منظر کشی بھی موجود ہے۔ الفاظ کی تکرار، عکس وتضاد، ہم قوافی الفاظ کے استعمال سے صوتی آہنگ بھی خصوصیت کے ساتھ موجود ہے۔ آپ کے تکیہ ہائے کلام، سبحان اللہ، حاشاللہ، الحمدللہ، اسداللہ، خدارا انصاف! مسلمانو! دیکھنا! سننا وغیرہ آپ کے نگارشات کو موثر بناتے ہیں اور اس طرح آپ اپنے مقصد کو زوردار انداز میں استدلال کے ساتھ واضح کرنے میں کامیاب ہیں۔

آپ کے یہاں جمالیاتی اظہار اور محاکات کے جلوے نظر آتے ہیں۔ کہیں کہیں آپ نے شستہ اردو زبان کا ایسا باوقار و باجمال نمونہ پیش کیا ہے۔ جس سے آپ کا منفرد اسلوب نگارش سامنے آتا ہے۔

الغرض آپ کی نگارشات میں ادب کے تمام اقسام سے منفرد نمونے پائے جاتے ہیں۔ اور آپ کی نگارشات میں وہ چاشنی اور دل نشینی ہے کہ قاری کے دل میں آپ کا اسلوب نگارش رچ بس جاتا ہے اور آپ کے اسلوب نگارش میں مشترکہ طور پر جو بات پائی جاتی ہے خواہ وہ کسی بھی موضوع اور عنوان پر ہوں وہ عشق رسول مقبول ﷺ کی تحریک اور اسلامی اصول کی پاسداری ہے۔

امام موصوف نے مذہبی وتقدیسی تصانیف کے حوالے سے اردو کو جس قدر محاورات ضرب الامثال، فقہ و حدیث، علم کلام، فلسفہ ومنطق اور سائنس و ریاضی کے مصطلحات دیے ہیں وہ زبان اردو میں بیش بہا اضافہ ہے۔

اردو زبان و ادب سے براہ راست منسلک نہیں ہونے کے باوجود امام موصوف نے مذہبی تقدیسی ادب کے ذریعہ زبان و بیان سے جو اسلامی خدمات لی ہیں یہ انھیں کا حصہ ہے۔ اگر امام موصوف دوسرے اصحاب طرز نگارش کی طرح صرف زبان و ادب کے میدان میں آتے تو ایک بے نظیر صاحب طرز انشاء پرداز ہوتے۔ ویسے بھی اردو ان علمائے فقہامیں تو صرف ان کے عہد بلکہ اردو زبان و ادب کی تاریخ میں ان کے جیسا عالم وفقیہ کوئی نظر ہی نہیں آیا اور علما وفقہا کے علاوہ جو اصحاب طرز نگارش صف اول میں شمار ہوتے ہیں۔ ان سے بھی کسی طرح آپ کی نگارش کی کامیابی کم نہیں۔

مآخذ و مراجع

۱۔ دیباچہ کین اینڈ شوپر مین۔ از عبد المغنی۔ مطبوعہ ترقی اردو بورڈ سن اشاعت ۱۹۷۶ء۔

۲۔ Theery of literature ص ۱۷۵،۱۷۴ تیسری اشاعت ۱۹۶۳ء۔

۳۔ جام نور کا رئیس القلم نمبر ۹۱۔

۴۔ ادبی نثر کا ارتقا، ص ۵۹، مطبوعہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی۔

۵۔ اردو کی ابتدائی نشو ونما میں صوفیاء کرام کا کام ص ۹۶، مطبوعہ انجمن ترقی اردو دہلی۔

۶۔ حیات مولانا احمد رضا خان بریلوی از ڈاکٹر مسعود احمد کراچی، ص ۵۵، مطبوعہ کراچی۔

۷۔ امام احمد رضا اور اردو ادب مشمولہ سہ ماہی افکار رضا ممبئی شمارہ دسمبر ۱۹۹۵ء۔

۸۔ امام احمد رضا مکتوب نگاری مشمولہ سہ ماہی افکار رضا ممبئی شمارہ جنوری تا مارچ ۲۰۰۰ء ص ۱۹

۹۔ عظمت کنز الایمان ص ۷، مطبوعہ رضوی کتاب گھر بھیونڈی، تھانہ، مہاراشٹر۔

۱۰۔ کنز الایمان اور اس کی فنی حیثیت ص ۳۲، بحوالہ کنز الایمان اور معروف تراجمہ قرآن ص ۳۳۹، مطبوعہ کراچی۔

۱۱۔ قرآن کریم، سورہ یوسف پ ۱۲ آیت نمبر ۲۔

۱۲۔ مصباح اللغات ص ۴۰، از ابوالفضل مولانا عبد الحفیظ بلیاری، مطبوعہ ایچ۔ ایم سعید کمپنی کراچی

۱۳۔ قرآن کریم، سورہ لقمان، پ ۲۱، آیت ۱۷، ۱۸۔

۱۴۔ قرآن کریم سورہ طارق، پ ۳۰، آیت ۱۶۔

۱۵۔ قرآن کریم سورہ التکویر، پ ۳۰، آیت ۱ تا ۱۴۔

۱۶۔ فتاویٰ رضویہ جلد اول ص ۹۴، مطبوعہ رضا اکیڈمی ممبئی۔

۱۷۔ فتاویٰ رضویہ جلد چہارم ص ۲۱۶، مطبوعہ رضا اکیڈمی ممبئی۔

۱۸۔ فتاویٰ رضویہ جلد چہارم ص ۸، مطبوعہ رضا اکیڈمی ممبئی۔

۱۹۔ فتاویٰ رضویہ جلد اول ص۴۶۱، مطبوعہ رضا اکیڈمی ممبئی۔
۲۰۔ فتاویٰ رضویہ جلد اول ص۳۴، مطبوعہ رضا اکیڈمی ممبئی۔
۲۱۔ فتاویٰ رضویہ جلد اول ص۵۴۹، مطبوعہ رضا اکیڈمی ممبئی۔
۲۲۔ فتاویٰ رضویہ جلد اول ص۷۳۹، مطبوعہ رضا اکیڈمی ممبئی۔
۲۳۔ فتاویٰ رضویہ جلد اول ص۷۳۹، مطبوعہ رضا اکیڈمی ممبئی۔
۲۴۔ فتاویٰ رضویہ جلد چہارم ص۴۲۲، مطبوعہ رضا اکیڈمی ممبئی۔
۲۵۔ فتاویٰ رضویہ جلد چہارم ص۷۲۴، مطبوعہ رضا اکیڈمی ممبئی۔
۲۶۔ مقال عرفا باعزاز شرع وعلماء ص۱، مطبوعہ کتب خانہ سمنانی، میرٹھ۔
۲۷۔ مقال عرفا باعزاز شرع وعلماء ص۳، مطبوعہ کتب خانہ سمنانی، میرٹھ۔
۲۸۔ مقال عرفا باعزاز شرع وعلماء ص۶، مطبوعہ کتب خانہ سمنانی، میرٹھ۔
۲۹۔ الحجۃ المؤتمنہ فی آیۃ الممتحنہ ص۶۶، مطبوعہ رضا اکیڈمی ممبئی۔
۳۰۔ العمصام ص۹۴، ۹۶، مشمولہ پنج رسال کا مجموعہ، مطبوعہ قادری کتاب گھر ممبئی بریلی۔
۳۱۔ العمصام ص۹۹، مشمولہ پنج رسال کا مجموعہ، مطبوعہ قادری کتاب گھر ممبئی بریلی۔
۳۲۔ دوام العیش فی الائمۃ من قریش ص۱۰۱، رضا اکیڈمی ممبئی۔
۳۳۔ دوام العیش فی الائمۃ من قریش ص۱۰۴، رضا اکیڈمی ممبئی۔
۳۴۔ دوام العیش فی الائمۃ من قریش ص۱۰۴، رضا اکیڈمی ممبئی۔
۳۵۔ فوز مبین در رد حرکت زمین ص۱۳۱، مطبوعہ رضا اکیڈمی ممبئی۔
۳۶۔ الکلمۃ الملہمہ در فلسفہ قدیم، ص۲۱، مطبوعہ رضا اکیڈمی ممبئی۔
۳۷۔ بدر الانوار فی آداب الاثار ص۲۶، مطبوعہ رضا اکیڈمی ممبئی۔
۳۸۔ احکام شریعت
۳۹۔ خالص الاعتقاد ص۴۷، مطبوعہ رضا اکیڈمی ممبئی۔
۴۰۔ اعتقاد الاحباب ص۱۱، مطبوعہ تصنیفات بریلی۔
۴۱۔ کشف الحقائق اسرار دقائق ص۴، مطبوعہ رضا اکیڈمی ممبئی۔
۴۲۔ ختم نبوت ص۴۰، مطبوعہ رضا اکیڈمی ممبئی۔
۴۳۔ سیف مصطفیٰ ص۲۳، مطبوعہ مرکز مجلس رضا لاہور۔

امام احمد رضا کا اسلوبِ جرح وتعدیل

حدیث: ''لایحرم الحرام الحلال'' کی روشنی میں

از: مولانا محمد اسلم رضا قادری

مدرسہ اسلامیہ رحمانیہ، صدر بازار باسنی، ناگور شریف (راجستھان)

مجدد اعظم اعلیٰ حضرت الشاہ امام احمد رضا قادری محدث بریلوی سرہ السامی عالم اسلام کی اس نادر الوجود، نابغہ روزگاراور عبقری الشرقِ والغرب شخصیت کا نام ہے جن کے علمی وتحقیقی، فقہی وکلامی، ادبی وتنقیدی، جواہر پارے ان کی تصانیف علیہ میں جا بجا پھیلے ہوئے ایک انصاف پسند قاری کو دعوت فکر ونظر دے رہے ہیں۔

اس امام علم وفن کی تحقیقات انیقہ کو حیطۂ تحریر میں لانا ایک مشکل امر ہے۔ ذیل میں ہم اس کی آیت مثال تصنیفات رضا میں ''جرح وتعدیل'' کا جو عظیم علمی وتحقیقی، فنی ولسانی، سرمایہ مرقوم ہے قارئین کرام کے روبرو رکھتے ہیں۔ تاکہ یہ امر اظہر من الشمس، ہوجائے کہ امام احمد رضا قادری بریلوی نے کیسے کیسے ادق موضوعات پر تحقیقات وتنقیدات فرما کر اُن کی تنقیح فرمائی ہے اور بے دینوں، گمراہوں کی خیانتوں ناانصافیوں سے پردہ ہٹایا ہے۔

جرح وتعدیل کی تعریف اور اس کے الفاظ:

''الجرح بفتح القطع فی الجسم بحدبد ومایقوم مقامه ثم استعمله المحدثون فیما یقابل التعدیل لانه تاثیر فی الدین، والعرض منه ان ینسب الی الشخص ما یخل بالعدالة التی هی شرط قبول الروایة.

(حاشیه نخبته الفکر مع نزهه النظر ص:۱۰۸)

ترجمہ: جرح کا معنی (جیم کے فتح کے ساتھ) جسم میں کسی آلۂ دھاردار اور جواس کے قائم مقام ہواس سے زخم کرنا پھر محدثین نے اس کو ایسے معنی میں استعمال کیا جو تعدیل کا مقابل ہو کیونکہ وہ دین میں موثر ہے اور اس سے مقصد یہ ہے کہ منسوب کیا جائے شخص (راوی حدیث) کی جانب ایسی چیز کو جو قبولیت روایت کی شرط ہے۔

شارح صحیح مسلم شریف محرر مذہب شافعی، امام نووی شافعی علیہ الرحمۃ والرضوان جرح و تعدیل کے الفاظ کی تحقیق کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''الفاظِ تعدیل کے کئی مراتب ہیں:

پہلا مرتبہ: ثقہ متقن، مثبت یا حجت، عدل حافظ، یا ضابط۔

دوسرا مرتبہ: صدوق، لاباس بہ۔

تیسرا مرتبہ: یہ بوڑھا ہے، اس کی حدیث لکھی جائے گی، اور غور کیا جائے گا۔

چوتھا مرتبہ: صالح الحدیث، اس کی حدیث اعتبار کے لیے لکھی جائے گی۔

الفاظ تعدیل کے بھی مراتب ہیں۔ یہ قوی نہیں ہے۔ اس کی حدیث لکھی جائے گی، اور یہ لین سے کم مرتبہ کا ہے، اور جب وہ کہیں ضعیف الحدیث تو ''یہ قوی نہیں ہے'' اس کو پھینکا نہیں جائے گا بلکہ اس کا اعتبار کیا جائے گا'' سے کم مرتبہ کا ہے۔ اور جب وہ کہیں ''متروک الحدیث'' یا راوی کذاب تو یہ ساقط ہے۔ اس کی حدیث نہیں لکھی جائے گی۔ نیز ان کے الفاظ ہیں، فلاں شخص سے لوگ روایت کرتے ہیں۔ وسط ہے، مقارب الحدیث ہے مضطرب ہے اس سے استدلال نہیں کیا جاتا، مجہول ہے، لاشئی ہے، لیس بذلک، لیس بذاک القوی، اس کی حدیث میں ضعف ہے وغیرہ۔ (تقریب النواوی ۱/۳۴۸۔۳۴۲۔ بحوالہ شرح صحیح مسلم ۱/۱۵۸)

''تعدیل' راوی کی عدالت و ضبط کی تحقیق کو کہتے ہیں۔ اور جرح سے مراد وہ امور ہیں جو ان دونوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ جن کی تفصیل تیرہ بیان کی جاتی ہے۔''

(جامع الاحادیث مقدمہ ص:۵۵۸)

عدالت پر اثر انداز: کذب، اتہام کذب، فسق، بدعت، جہالت۔

ضبط پر اثر انداز: زیادۃ غلط، سوء حفظ، فرط غفلت، زیادت وہم، مخالفت ثقات۔

شہرت تساہل، شہرت قبول تلقین، نسیان''۔

(فتاوی رضویہ ۲/۴۳۹) (جامع الاحادیث ص:۵۵۹)

مولانا محمد حنیف صاحب قادری رضوی بریلوی لکھتے ہیں:

''جرح و تعدیل وہی معتبر ہے جو ائمہ فن سے بغیر کسی تعصب یا بے جا حمایت کے ساتھ منقول ہو۔ البتہ تعدیل مبہم کا اعتبار ہوگا کہ وجوہ عدالت بیان کیے بغیر ثقہ وغیرہ کہنا، کیونکہ وجوہ عدالت کثیر ہیں جن کا احاطہ ایک وقت میں ممکن نہیں۔

البتہ جرح مبہم غیر مفسر معتبر نہیں کہ اسباب جرح اتنے زائد نہیں کہ ان کے شمار میں دشواری ہو۔ نیز اسباب جرح میں اختلاف ہے' ہوسکتا ہے کہ ایک سبب کسی کے

نزدیک معتبر ہو اور دوسروں کے یہاں نہ ہو۔" (جامع الاحادیث مقدمہ ص:۵۵۹)

محدث بریلوی اور جرح وتعدیل:

ان تمام تفصیلات کے بعد اب آیئے امام احمد رضا قادری حنفی محدث بریلوی قدس سرہ العلیم کی ان انمول و یکتا اور لاجواب نگارشات، علمی وفنی تحقیقات وتنقیدات، لسانی تعقبات اور جرح وتعدیلات کی ایک جھلک ملاحظہ کیجیے۔ جن میں محدث بریلوی نے اپنی عطائی ذہانت و فطانت، خداداد استعداد و صلاحیت سے حدیث و اصولِ حدیث، علم اسماء رجال حدیث میں مہارت واستحضار کا بھرپور اظہار فرما کر "اعلاء کلمۃ الحق" کا فریضہ احسن طریقے سے سرانجام دیتے ہوئے ان نام نہاد، علم حدیث سے کورے، راویان حدیث کے حالات سے ناواقف و ناآشنا حضرات کی اسلاف بیزاری اور ان کی ناعاقبت اندیشی و کج روی کا ایک "تحقیقی وتنقیدی" جائزہ لیکر ان خبثا وجہلا پر ایسے ایسے ایرادات قائم فرمائے جو آپ کے علم حدیث اور اسماء رجال حدیث پر آگاہی ودسترس کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ پھر بھی اگر کوئی بدباطن ومتعصب یہ کہے "کہ امام احمد رضا علمِ حدیث میں کم درک رکھتے تھے" اور "حدیث میں ان کی معلومات کم تھیں۔" تو اسے صرف ایک بار انصاف و دیانت کی نظر سے "فتاویٰ رضویہ" کا مطالعہ کرنے کی دعوت دی جاتی ہے۔ جب وہ اس امام علوم وفنون کی فن حدیث میں مہارت، اصطلاحات حدیث کی تنقیح اور راویانِ حدیث پر بے جا ضعیف اور متروک کے الزامات کا تحقیقی جواب اور ان پر کیے گئے اعتراضات پر امام احمد رضا کا منفرد اسلوب نیز اسماء الرجال پر "جرح وتعدیل" کے آثار دیکھے گا۔ تو وہ عقیدت وشخصیت پرستی کے ماحول سے باہر آکر "حقائق" اور "شواہد" کا نظارہ کرے گا۔ یقیناً اس کے تمام شکوک وشبہات کافور ہو جائیں گے۔

حدیث "لایحرم الحرام الحلال" پر امام احمد رضا قادری کی جرح:

۱۳۱۵ھ میں امام احمد رضا قادری بریلوی قدس سرہ سے سوال ہوا کہ۔ زید نے اپنی ساس سے زنا کیا اور اس کی بی بی کو اس کا علم تھا۔ زید پر وہ بی بی حرام ہوئی یا نہیں؟ امام احمد رضا قادری بریلوی نے اس کا بہت تحقیقی جواب رقم فرمایا اور یہ ثابت کیا کہ زید کی زوجہ، زید پر ہمیشہ کے لیے حرام ہوگئی۔

محدث بریلوی قدس سرہ کا جواب ملاحظہ ہو:

الجواب: زوجہ زید اس پر حرام ہوگئی، اگرچہ اسے اس واقعہ شنیعہ کا علم بھی نہ ہوتا۔ اقول۔ وباللہ التوفیق اس کی دلیل جلیل قول مولیٰ عزوجل وتبارک وتعالیٰ ہے۔ "وربائبکم التی فی کم حجور من نسا نکم التی دخلتم بھن فلا جناح علیکم"۔ (النساء:۴/۲۳) تم پر حرام کی گئیں تمہاری گود کی پالیاں ان عورتوں کی بیٹیاں جن سے تم نے صحبت کی، پھر اگر تم نے ان سے صحبت نہ کی ہو تو تم پر کچھ

گناہ نہیں۔

اس آیت کریمہ میں زن مدخولہ کی بیٹی حرام فرمائی اور جس طرح وصف "التی فی حجوز لـــم " اس کی گود میں پلنا بالاجماع شرط حرمت نہیں۔ (۲۴۴/۵) مسئلہ دائرہ (حرمتِ مصاہرت) میں اپنے مذہب کو یوں واضح کرتے ہیں "اور اصل آیت کریمہ کہ جس عورت سے تم نے کسی طرح صحبت کی اگرچہ بلا نکاح اگرچہ بروجہ حرام اس کی بیٹی تم پر حرام ہوگئی۔ یہی ہمارے ائمہ کرام کا مذہب اور یہی اکابر صحابہ کرام مثل حضرت امیرالمومنین عمر فاروق اعظم، حضرت علامۂ صحابہ عبداللہ بن مسعود، حضرت عالم القرآن عبداللہ بن عباس، حضرت افرؤ الصحابہ ابی بن کعب و حضرت عمران بن بی حصین، حضرت جابر بن عبداللہ و حضرت مفتیۂ چار خلافت صدیقہ بنت الصدیق محبوبۂ محبوب رب العلمین ﷺ وعلیہم اجمعین و جماہیر ائمہ تابعین مثل حضرت حسن بصری، افضل التابعین سعید بن المسیب، امام اجل ابراہیم نخعی، امام عامر شعبی، امام طاؤس، امام عطا بن ابی رباح، امام مجاھد، امام سلیمان بن یسار، امام حماد اور اکابر مجتہدین مثل امام عبدالرحمٰن اوزاعی، امام احمد بن حنبل، امام اسحٰق بن راہویہ اور ایک روایت میں امام مالک بن انس کا ہے رضی اللہ عنہم اجمعین۔

مزید فرماتے ہیں: "مخالف کے پاس اس کی حلت پر کوئی دلیل نہیں مگر حدیث "لا یحـــرم الحـــرام الحلال " حرام حلال کو حرام نہیں کرتا۔ مگر یہ حدیث جس طرح مخالف کی دلیل ہوسکے سخت ضعیف وساقط و ناقابل احتجاج ہے۔ بیہقی باآنکہ انتصار شافعیت میں اہتمام شدید رکھتے ہیں، اسے حدیث ام المومنین صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کر کے تضعیف کردی، کمافی التسیر شرح الجامع الصغیر۔

اقـــول: دلیل ضعف کو ہی کافی کہ ام المومنین خود قائل حرمت ہیں۔ روایت حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما میں عثمان بن عبدالرحمٰن وقاصی ہے۔ حضرت سیدنا امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قاتل عمرو بن سعد کا پوتا، اما بخاری نے فرمایا "تــر کوہ" محدثین نے اسے متروک کردیا۔ امام ابوداؤد نے فرمایا "لیس بشئی" کوئی چیز نہیں۔ امام علی بن مدینی نے سخت ضعیف بتایا، نسائی و دارقطنی نے کہا متروک" ہے۔ حتی کہ امام یحییٰ بن معین نے فرمایا "یـکـذب" جھوٹ بولتا ہے۔ ابن حبان نے اسے روایت کر کے کہا "عثمـن عبدالرحمٰن ھو الوقاصی یروی عن الثقات الاشیاء الموضوعات لایجوز الاحتجـاج بـہ" یہ عثمان بن عبدالرحمٰن وہی وقاصی ہے، ثقات سے موضوع خبریں روایت کردیتا ہے اس سے سند حلال نہیں" اھ۔ (ج ۵/ص ۲۴۶۔۲۴۷)

"حب الوطن من الایمان" پر امام احمد رضا کی تحقیق:

یہ ایک فطری اور بدیہی بات ہے کہ ہر شخص کو اپنے وطن سے محبت ہوتی ہے اور ہونی بھی چاہیے کیوں کہ وہ اس ملک و وطن میں پیدا ہوا، پروان چڑھا اب وہ جہاں بھی جائے گا، چاہے عارضی اور وقتی طور پر ہی کیوں نہ جائے، وہ اس ملک کا باشندہ کہلائے گا اور اس کی شناخت بھی اسی ملک کی وجہ سے ہوگی۔ بعض آدمی کیا خیال کرتے ہیں کہ وطن کی محبت ایمان سے ہے۔ ایسا نہیں ہے جیسا کہ امام احمد رضا قادری بریلوی قدس سرہ "حب الوطن من ایمان" پر نقد و جرح اور تحقیق محدثین پیش کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں "حب الوطن من الایمان" نہ حدیث سے ثابت، نہ ہرگز اس کے معنیٰ، امام بدرالدین، زرکشی نے اپنے "جزء" اور امام شمس الدین محمد سخاوی نے "مقاصدِ حسنہ" اور امام خاتم الحفاظ جلال الدین سیوطی نے "الدر المنشترہ" میں بالاتفاق اس روایت کو فرمایا "لم اقف علیہ"۔ امام سخاوی نے اس کی اصل ایک اعرابی بدوی اور حکیمانی ہند کے کلام میں بتائی "کما ینظھر بالرجوع الیہ" اللہ عزوجل قرآن عظیم میں اپنے ان بندوں کی کمال مدح فرمائی جو اللہ و رسول جلا وعلا وصلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں اپنا وطن چھوڑیں یا رودبار سے منہ موڑیں اور ان کی سمت مذمت فرمائی جو حبِ وطن لیے بیٹھے رہے اور اللہ و رسول کی طرف مہاجر نہ ہوئے۔" (ج۶ ص۲۰۴۔۲۰۵)

OOOOOO

اسلوبِ رضا کا مختصر جائزہ

از: محمد حسین مصباحی (مدھوبنی)
متعلم درجۂ فضیلت، جامعہ اشرفیہ، مبارک پور، اعظم گڑھ

ادب برائے ادب کے علم بردار ادبا ادب کو ادب کی کوٹھری میں ہی محصور کرنا چاہتے ہیں۔ اس نظریے کے تحت ادب کے افادی پہلوؤں سے قطعاً گریز کیا جاتا ہے۔ خواہ وہ پہلو اصلاحِ معاشرہ کا ہو یا اخلاقیات و مذہبیات سے تعلق رکھتا ہو۔ اس نظریے میں ادب کی تخلیقیت اور ادبیت کو ترجیح دی جاتی ہے۔ لیکن اُس کے برعکس ''ادب برائے زندگی'' کے حامیوں کا کہنا ہے کہ ادب ایک وسیع المفہوم لفظ ہے۔ اس کی وسعت کو ادب کی کوٹھری میں محصور کرنا ظلم کے مرادف ہے۔ ادب کا حق اُس وقت ادا ہوسکتا ہے جب پوری انسانی زندگی پر اسے محیط کیا جائے۔ درحقیقت ادب تو وہی ہے جس میں زندگی کے تمام پہلوؤں کی عکاسی کی جاے۔ اور تخلیقِ ادب یا مطالعۂ ادب سے کسی مسئلے کا حل معلوم کیا جائے۔ اسلامی ادب کے مبلغین صالحیت، مقصدیت اور آفاقی صداقت کی علم برداری کے نام پر اسی نظریے پر عمل پیرا ہیں۔

چودھویں صدی کی عبقری شخصیت، اسلامی ادب کے عظیم مبلغ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قدس سرہٗ (۱۸۵۶ء۔ ۱۹۲۱ء) نے اپنی کثیر تصانیف، تراجم اور فتاویٰ کے ذریعے اردو ادب کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ ادبا کے نزدیک ادب کے لیے ادبیت اور تخلیقیت بنیادی عناصر کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان عناصر کی ترکیب کے بغیر ادب کی تعمیر ممکن نہیں۔ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا نے ادب کی تعلیم کے لیے کسی ادیب کی بارگاہ میں زانوے تلمذ تہہ نہ کیا مگر پھر بھی آپ نے اپنے قلم سے وہ ادبی شہ پارے بکھیرے ہیں کہ بڑے بڑے ادیب جس کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔ امام احمد رضا نے لوح و قلم کو نسلِ انسانی کی فلاح و بہبود کے لیے اُٹھایا تھا اور ظاہر ہے جس نے اپنی تحریر کا ہدف اصلاحی پہلو کو بنایا ہو تو قارئین تک بآسانی اپنی بات پہنچانا ہی اس کا فرضِ منصبی ہوتا ہے۔ اگر اس میں وہ ادبیت کا جوہر دکھانے لگے تو اس کا مقصد ہی فوت ہوجائے گا۔ ہاں البتہ جو حضرات ''ادب برائے ادب'' کے حامی ہیں اگر وہ اپنی تحریروں میں ادبیت کے گُل بوٹے بکھیرتے رہیں تو یہ ان کے مقصد میں ''سدِّ راہ'' نہ ہوں گی۔ امام احمد رضا کے اندر ہر چند کہ ادبی صلاحیت بدرجہ اتم موجود تھی مگر آپ نے اپنے تخلیقی جوہر

کو استعمال کرنے کا التزام نہ کیا۔ پھر بھی آپ کی تحریریں ادبی نوادرات کا ''نمونہ'' ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ ۷۰ ر سے زاید علوم وفنون پر آپ نے ایک ہزار کے قریب کتابیں تصنیف کیں۔ مگر تقریباً ۴۵۰ کتابیں اب تک منظر عام پر آ سکی ہیں۔ پھر بھی اس کثرت سے شاید ہی کسی ادیب یا قلم کار نے کتابیں لکھی ہوں۔ بلاشبہ فروغِ ادب اردو میں تصانیفِ رضا کا ایک بڑا حصہ ہے۔ اعلیٰ حضرت کی اردو تصانیف میں بالعموم فتاویٰ اور تراجم ہیں۔ تراجم میں قرآنِ کریم کا ترجمہ ''کنزالایمان فی ترجمۃ القرآن'' خصوصیت کا حامل ہے۔ یہ قرآن کریم کا بامحاورہ اردو ترجمہ ہے۔ قرآن کریم کا بامحاورہ ترجمہ کرنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ قرآن کے معانی، مفاہیم اور مضامین پر دقّتِ نگاہ رکھنے والا ہی قرآن کا کماحقہ ترجمہ کرسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جہانِ ادب کے تاج وروں کا قلم بھی اس فن میں شکست وریخت سے دوچار ہوگیا ہے۔

ابوالاعلیٰ مودودی جن کو حلقۂ اردو میں انشا پرداز اور شیریں بیان رائٹر مانا جاتا ہے۔ ترجمۂ قرآن میں اُن کا قلم بھی جگہ جگہ لغزشوں سے ہم کنار ہوگیا ہے۔ کنزالایمان اور تفہیم القرآن کا ادبی نقطۂ نظر سے تقابلی مطالعہ کیا جائے تو کنزالایمان کا پلّہ ہی بھاری رہے گا بشرطیکہ قاری اپنی آنکھ پر تعصب وجانب داری کی منحوس عینک نہ چڑھائے ہو۔ قابلِ ذکر ہے کہ اعلیٰ حضرت کا عہد (۱۸۵۶ء۔ ۱۹۲۱ء) اردو کا ابتدائی دور تھا۔ اس وقت اردو گھٹنوں کے بل چل رہی تھی اور ابوالاعلیٰ مودودی (۱۹۰۳ء۔ ۱۹۸۹ء) کے زمانے میں اردو ارتقائی مراحل سے گزر کر بامِ عروج کو پہنچ رہی تھی۔ پھر بھی جو چاشنی اعلیٰ حضرت کے ترجمۂ قرآن میں ہے وہ مودودی کے ترجمۂ قرآن تفہیم القرآن میں کہاں؟؟ کنزالایمان اردو ادب کے تمام لوازمات سے آراستہ ہے۔ چاہے الفاظ وبیان کی چاشنی وشگفتگی ہو یا پُرشکوہ الفاظ اور محاورات وضرب الامثال کا استعمال یا ایجاز واختصار بیانی غرضیکہ ان تمام پہلوؤں کا ''عطر مجموعہ'' ہے کنزالایمان۔ ماہر رضویات ڈاکٹر پروفیسر محمد مسعود احمد صاحب نقش بندی کنزالایمان پر تبصرہ کرتے ہوئے یوں رقم طراز ہیں: ''اردو تراجم کے سارے ذخیرے میں یہ امتیازی شان رکھتا ہے۔ یہ نہ کسی ترجمہ کا ترجمہ ہے نہ ترجموں کی ترجمانی، یہ تو براہ راست قرآن سے قرآن کا ترجمہ ہے۔'' [1]

سلاست وروانی اور عبارات میں ہم آہنگی کنزالایمان کی امتیازی خصوصیت ہے۔ ایک اقتباس دیکھیں: ''اللہ نور ہے آسمانوں اور زمین کا، اس کے نور کی مثال ایسی ہے جیسے ایک طاق کہ اس میں چراغ۔ وہ چراغ ایک فانوس میں ہے۔ وہ فانوس گویا ایک ستارہ ہے موتی سا چمکتا، روشن ہوتا ہے برکت والے پیڑ زیتون سے۔'' [2]

لگے ہاتھوں ایک دو اقتباس اور دیکھ لیں:

''اس عورت کی طرح نہ ہو جس نے اپنا سوت مضبوطی کے بعد ریزہ ریزہ کرکے توڑ دیا۔ اپنی قسمیں آپس میں ایک بے اصل بہانہ بناتے ہو کہ ایک گروہ دوسرے گروہ سے زیادہ نہ ہو۔ اللہ تو اس سے تمہیں آزماتا ہے اور ضرور تم پر صاف ظاہر کرے گا قیامت کے دن جس بات میں جھگڑتے تھے۔'' ۳

ایک سادہ اسلوب کا آسان اقتباس ملاحظہ کریں۔

''اس نے آسمان سے پانی اُتارا تو نالے اپنے اپنے لائق بہہ نکلے تو پانی کی رو اس پر اُبھرے ہوئے جھاگ اُٹھالائی اور جس پر آگ دہکاتے ہیں گہنا یا اور اسباب بنانے کو اس سے بھی ویسے ہی جھاگ اُٹھتے ہیں۔ اللہ بتاتا ہے کہ حق اور باطل کی یہی مثال ہے تو جھاگ تو تھپ کر دور ہو جاتا ہے اور وہ جو لوگوں کے کام آئے زمین میں رہتا ہے۔ اللہ یوں ہی مثالیں بیان فرماتا ہے'' ۴

کنز الایمان میں روزمرّہ الفاظ و بیان کا اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ ثبوت کے لیے چند مختصر اقتباسات کا بوجھ اور برداشت کریں۔

(۱) یہ ان کا بہتان و افترا ہے

(۲) اپنے گھر والوں کی طرف شاد شاد پلٹے گا ۶

(۳) اپنے رب کی نعمت کا خوب خوب چرچا کرو ۷

(۴) تو بہت جلد ہم اسے دشواری مہیا کریں گے ۸

مسلمانوں کے دینی مسائل کے حل کے لیے اعلیٰ حضرت امام احمد رضا کا ۱۲ ر ضخیم جلدوں پر مشتمل فتاویٰ رضویہ جیسا عظیم اسلامی انسائکلو پیڈیا موجود ہے۔ جس سے تاقیام قیامت مسلمان اپنے مذہبی مسائل کا حل معلوم کرکے ان پر عمل کرتے رہیں گے۔ ہر چند کہ فقہ و فتوی کا اسلوبی دائرہ تنگ ہے۔ اس کی مخصوص اصطلاحات ہیں۔ خشک سے خشک موضوع اور مشکل سے مشکل تر عنوان اس کے تحت شامل ہیں۔ اس میں ادبیت اور تخلیقیت کی گنجائش نہیں۔ مگر یہ آپ نے آسان سے آسان موضوع پر بھی ادبی اسلوب میں خامہ فرسائی کی ہے۔ تو پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل کی زلف برہم کو بھی ادبی انداز میں سنوارا ہے اب ہم ذیل میں آپ کی تصانیف سے چند اقتباسات نقل کر رہے ہیں۔ جنہیں پڑھ کر آپ کی تصانیف کا ادبی مقام بھی واضح ہو جائے گا اور اردو ادب کے فروغ میں آپ کی تصانیف کا کردار بھی اجاگر ہو جائے گا۔ زکوۃ دینے والے حضرات کو تنبیہ فرماتے ہیں:

''زکوۃ نہ دینے کی جانکاہ آفتیں وہ نہیں جن کی تاب آسکے۔ نہ دینے والے کو ہزار ہا سال ان سخت عذابوں میں گرفتاری کی امید رکھنی چاہیے کہ ضعیف البنیان انسان کی

کیا جان اگر پہاڑوں پر ڈالے جائیں سرمہ ہوکر خاک میں مل جائیں پھر اس سے بڑکر احمق کون کہ کہ اپنا مال جھوٹے سچے نام کی خیرات میں صرف کردے'' 9

زجر و توبیخ کا کیا نرالا انداز ہے۔ کتنا شگفتہ انداز و اسلوب ہے۔ عبارات میں کس قدر ہم آہنگی ہے۔ سلاست و روانی بھی خوب ہے۔ الفاظ کی نشست و برخاست دیدنی ہے۔ مسجع و مقفی عبارتیں تو آپ کی تحریر کی جان ہیں۔ سجع کی رعایت کافی محنت و مشقت کے بعد ہی ہوپاتی ہے مگر اعلیٰ حضرت کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ سجع بندی آپ کی طبیعت میں رچی بسی ہوئی تھی۔ رعایت سجع اور قافیہ بندی کا ایک اچھوتا اقتباس ملاحظہ کریں:

''محمل لیلی کروڑوں منزل سے کروڑوں منزل خرد خردہ میں دنگ ہے۔ نیا سماں ہے نیا رنگ ہے۔ قرب میں بعد بعد میں قرب وصل میں ہجر، ہجر میں وصل گویر شناور دریا مگر صدق نے وہ پردہ ڈال رکھا ہے نم سے آشنا نہیں، اے جاہل ناداں علم کو علم والے پر چھوڑ اور اس میدان دشوار جولان سے سمند بیان کی عنان موڑ۔ زبان بند ہے پر اتنا کہتے ہیں۔ کہ خلق کے آقا ہیں خالق کے بندے عبادت ان کی کفر اور بے ان کی تعظیم کے حبط۔ ایمان ان کی محبت و عظمت کا نام اور مسلمان وہ جس کا کام ہے، نام خدا کے ساتھ۔ ان کے نام پر تمام **والسلام علی خیر الانام والآل والاصحاب علی الدوام.** '' 10

سجع بندی کے ساتھ ساتھ استعارات و کنایات کا بھی بہترین اندا اختیار کیا گیا ہے۔ اب آل رسول مقبول ﷺ کی شان میں خراج عقیدت پیش کرنے کا انداز ذرا محبت و عقیدت کی نگاہ سے ملاحظہ کریں۔ ''ان کے بعد اصحاب سید المرسلین ﷺ اجمعین ہیں۔ اور انہیں میں حضرت بتول جگر پارۂ رسول، خاتون جہاں بانوی جناب سیدۃ النسا فاطمہ زہرہ اور اس دوجہاں کی آقازادی کے دونوں شاہزادے، عرش کی آنکھ کے تارے، چرخ دسیات کے مہہ پارے، باغ تطہیر کے پیارے پھول، دونوں قرۃ العین رسول، امامین، کریمین، سعیدین، شہیدین، تقیسین، نقیین، نیرین، طاہرین، ابو محمد حسن دابو عبداللہ حسین 11 کوثر و سلسبیل دے دھلی ہوئی یہ تحریر جس کی ہر ہر عبارت میں ادبیت اور تخلیقیت جھلک رہی ہے شوکت الفاظ پر بھی مشتمل ہے۔

ان کی بندش اور مستند تراکیب کا استعمال بھی آپ تحریروں میں خوب ملتا ہے۔ اس اقتباس کو بھی دیکھتے چلیں۔ ''یہ آیت مسلمانوں کو ہوشیار کررہی ہے کہ دیکھو کلمہ گوئی اور زبانی ادعاے مسلمانی پر تمہارا چھٹکارا نہ ہوگا۔ ہاں ہاں سنتے ہو آزمائے جاؤ گے۔ آزمایش میں پورے نکلے تو مسلمان ٹھہرو گے ہر

شے کی آزمائش میں یہی دیکھا جاتا ہے کہ جو باتیں اس کے حقیقی و واقعی ہونے کو درکار ہیں وہ اس میں ہیں یا نہیں۔[۱۲]

بارگاہ رسالت مآب ﷺ میں حاضری کے آداب کیا ہیں ذرا امام عشق و محبت اعلیٰ حضرت کی زبانی سنئے۔ ''اب وہ وقت آیا کہ منہ اس کا مثل دل کے اس شباک پاک کی طرف ہوگیا جو اللہ تعالیٰ کے محبوب عظیم الشان کی آرام گاہ رفیع المکان ہے ﷺ گردن جھکائے آنکھیں نیچی کیے، لرزتا، کانپتا بید کی طرح تھرتھراتا، ندامت نگاہ سے عرق شرم میں ڈوبا قدم بڑھا خضوع و وقار خشوع و انکسار کا کوئی دقیقہ فرد گزاشت نہ کر سوا سجدہ و عبارت کے جوبات ادب واجلال میں اکمل ہو۔ بجالا۔ حضور والا کے پائیں یعنی شرق کی سمت سے آ کہ وہ جناب مزار پر انوار میں روبہ قبلہ جلوہ فرمائیں۔ جب تو اس سمت سے حاضر ہوگا حضور کی نگاہ بیکس پناہ تیری طرف ہوگی اور یہ امر تیرے لیے دو جہاں میں بس ہے......اور زنہار جالی شریف کے بوسہ ومس سے دور رہ کہ خلاف ادب ہے۔''[۱۳]

ایک جگہ علمائے کرام کو وصیت کرتے ہیں کہ دینی خدمات کو کسب معاشی کا ذریعہ بنائیں۔ اعلیٰ حضرت کے الفاظ ملاحظہ فرمائیں۔ ''احباب علمائے شریعت اور برادران طریقت کو ہدایت کی جاتی ہے کہ خدمت دینی کو کسب معیشت کا ذریعہ نہ بنائیں اور سخت تاکید ہے کہ دست سوال دراز کرنا تو درکنار اشاعت دین وحمایت اشاعت دین حماعت سنت میں مالی منفعت کا خیال دل میں نہ لائیں بلکہ ان کی خدمت خالصاً لوجہ اللہ ہو۔ ہاں اگر بے طلب اہل محبت سے کچھ نذر پائیں رد نہ کریں کہ اس کا قبول کرنا سنت ہے۔''[۱۴]

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قدس سرہ کی تصانیف کے مطالعے سے یہ حقیقت واشگاف ہوتی ہے کہ آپ کی تصانیف میں دینی سرمایہ کے ساتھ ساتھ ادبی سرمایہ بھی ہے۔ میں نے آغاز سخن میں کیا تھا اعلیٰ حضرت نے تخلیق کو اپنا مطمح تحریر نہ بنایا اگر انہوں نے تخلیق کو اپنا العین بنالیا ہوتا تو بعید نہیں کہ آسمان ادب کے اس درخشاں آفتاب کے آگے کواکب خمسہ اپنی تابانی کھوچکے ہوتے۔ اردو ادب کے عناصر خمسہ کو میں نے کواکب خمسہ سے تعبیر کیا ہے۔ وہ یہ ہیں۔

ابوالکلام آزاد، شبلی نعمانی، ڈپٹی نذیر احمد، سرسید احمد خاں، الطاف حسین حالی۔ اعلیٰ حضرت کی تصانیف میں ادب کی ساری خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ مسجع ومقفی عبارتوں ضرب الامثال محاورات، روزمرہ کے الفاظ، شیرنی و چاشنی، ندرت و شگفتگی، طنز و مزاح، پرشکوہ الفاظ اور پرکشش عبارات کی آپ کے یہاں بھرمار ہے۔ ادق سے ادق موضوع کو سہل انداز میں بیان کرنے اور خشک سے خشک موضوع میں بھی عبارت آرائی پر آپ کو قدرت تامہ تھی۔

''مشتے نمونہ از خروارے'' کے طور پر میں نے تصانیف رضا سے چند نثری شہ پاروں کو جمع کر دیا ہے مزید اطمینان کے لیے تصانیفِ رضا کا مطالعہ غیر جانب دار آنکھوں سے کریں تو نیم روز کی طرح حقیقت واضح اور روشن ہو جائے گی۔

ا۔ رہبر ورہنما ص۔
۳۔مطبوعہ المجمع الاسلامی ملت نگر مبارک پور۔ اعظم گڑھ۔ یوپی
۲۔سورہ نور رکوع۔۱۰ آیت ۳۵
۳۔سورہ نحل پارہ۔۱۴ آیت۔۹۲
۴۔سورہ رعد۔ آیت۔۱۷
۵۔سورہ احقاف۔آیت۔۲۸
۶۔سورہ عم۔آیت۔۹
۷۔سورہ والضحی۔آیت۔۱۱
۸۔سورہ اللیل۔آیت۔۱۰
۹۔فتاوی رضویہ جلد ۱۰/ص ۱۷۸ مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن جامعہ نظامیہ رضویہ لاہور پاکستان۔
۱۰۔رسالہ اعتقاد الاحباب فی الجمیل والمصطفے والآل والاصحاب ص۲۲۔۲۴۔ مطبوعہ فرید بک سٹال لاہور۔
۱۱۔رسالہ اعتقاد الاحباب فی الجمیل والمصطفے والآل والاصحاب ص۳۱۔۳۲۔ مطبوعہ فرید بک سٹال لاہو۔
۱۲۔تمہید ایمان ص۔۹۱ مطبوعہ رضوی کتاب گھر دہلی۔
۱۳۔ النیرۃ الوضیہ شرح الجوھرۃ المضیہ (حج و زیارت کے مسائل) ص۴۵۔۴۶ مطبوعہ رضا اکیڈمی ممبئی
۱۴۔ امام احمد رضا اور تصوف ص۸۰ بحوالہ ماہنامہ الرضا بریلی شمارہ ربیع الاول جمادی الاول ۱۳۳۸ھ۔

ΘΘΘΘ

شعریات

امام احمد رضا کا شعری سرمایہ نعتیہ ادب کا اتنا عظیم ذخیرہ اور مستند ورثہ ہے جس پر مدحت کے جتنے بھی پھول ٹانکے جائیں کم ہیں۔ ان کی نعتیہ شاعری کی وادی اس سمت پر ہے جہاں سے شہرِ رسول کی مسافت بہت کم باقی رہ جاتی ہے۔ عشقِ مصطفٰی کے ہزاروں دیپ وہاں جگ مگ کرتے ہیں، دنیا میں جہاں کہیں بھی عشقِ مصطفٰی کے متوالے بستے ہیں، امام احمد رضا کے نعتیہ اشعار سے اپنی محافل و مجالس کا رنگ جماتے ہیں۔ اُن کی بعض نعتیں تو شہرت و مقبولیت کے اتنے اونچے مینارے چڑھ چکی ہیں اور زبانِ زد خاص و عام ہوچکی ہیں، جہاں دوسرے اردو شعرا کے لیے پہنچنا غیر ممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ بالخصوص ان کے قصیدۂ سلامیہ اور قصیدۂ درودیہ کی تو بات ہی نرالی ہے۔ گویا اردو کے قریۂ نعت میں امام احمد رضا بریلوی وہ واحد فرد ہے کہ چمنستانِ عشقِ رسول میں صرف آپ ہی کے نام کی کلی پھوٹتی ہے۔ جناب طاہر سلطانی (کراچی) نے امام احمد رضا کی شاعری میں قرآن و حدیث کے مفاہیم و مندرجات اور صحابہ وغیرہ کا تذکرہ تلاشا ہے۔ ہم یہاں اسے نذرِ قارئین کر رہے ہیں۔ جناب ڈاکٹر صابر سنبھلی صاحب نے امام احمد رضا کی شاخِ غزل کے پھول چُن چُن کر قارئین کی میز پر سجادیے ہیں۔ ہر چند کہ اس موضوع پر ڈاکٹر امجد رضا امجد کی کتاب شائع ہوچکی ہے، لیکن دستیاب نہیں ہے۔ ڈاکٹر صابر صاحب کی تمہیدی گفتگو کے بعض مندرجات قصداً حذف کردیے گئے ہیں۔ امام احمد رضا کی شاعری اور قرآن و حدیث کے موضوع پر کئی مضامین موصول ہوئے تھے لیکن غیر معیاری ہونے کی وجہ سے شائع نہیں کیے گئے۔

.... ص۔ ر۔ مصباحی

باب ششم

حضرت رضا بریلوی کی غزل گوئی

(رضویات پر آخری نثری تحریر)

از: ڈاکٹر صابر سنبھلی

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا فاضل بریلوی رضی الرحمان کی شاعری کا جن حضرات نے مطالعہ کیا ہے یا اُن کی نعت گوئی کو سراہتے ہیں، اُن کو صرف نعت کا شاعر سمجھتے ہیں اور اُن کی یہ فہم پچانوے ۹۵ فی صد سے بھی زیادہ درست ہے۔

چونکہ نعت کی کوئی ہیئت مخصوص نہیں ہے اور یہ موضوعی صنفِ ادب ہے۔ اس لیے متذکرہ بالا رائے سے اختلاف کی گنجائش کم ہی ہے۔ عام نعت خواہ شاید اس بارے میں سوچتے بھی نہیں کہ کلامِ امام میں نعت ومنقبت کے سوا کچھ اور بھی ہوسکتا ہے۔

جناب امام نے نعت گوئی کے لیے کثرت سے غزل کی ہیئت کو برتا ہے۔ قطعہ، رباعی، مثنوی اور برائے نام ہی سہی مستزاد کو بھی ذریعۂ اظہار بنایا ہے۔ نعتوں کی زیادہ تعداد غزل کی ہیئت میں ہونے کی وجہ سے انہیں غزل گو شاعر نہیں کہا جاسکتا۔ قصیدہ اور سلام بھی غزل کی ہیئت میں کہے جاتے ہیں مگر اُن کے شاعروں کو (محض ان کی وجہ سے) کوئی غزل گو نہیں کہتا۔ اگر ایسا ہوتا تو میر انیس اور مرزا دبیر کثیر تعداد میں سلام کہنے کی وجہ سے بڑے غزل گو کہے جاتے، مگر ایسا نہیں ہوا۔ مرزا سوداؔ کو عظیم قصیدہ گو سب کہتے ہیں، عظیم غزل گو کوئی نہیں کہتا۔

اتفاق سے اس موضوع پر خامہ فرسائی میں اوّلیت ڈاکٹر مولانا محمد امجد رضا خان امجدؔ صاحب کو حاصل ہوگئی اور مجھ جیسے نہ جانے کتنے اس موضوع پر قلم اُٹھانے کا ارادہ ہی کرتے رہ گئے، بلکہ صرف سوچتے رہ گئے اور امجد صاحب کی کتاب "غزلیاتِ رضا" ۱۹۹۷ء میں ادارہ شرعیہ، بہار پٹنہ سے شائع بھی ہوگئی۔

ڈاکٹر امجد رضا خاں امجد صاحب مدارس کی راہ سے یونی ورسٹی پہنچے۔ مگر وہ ادبیات کی پرکھ میں دانش کدوں اور دانش گاہوں میں جوانیاں بسر کرنے والوں سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔ اُن کا علم مضبوط اور حاضر ہے اور وہ مجھ جیسے ناکارہ نسیاں زدہ بوڑھوں سے بدر جہا بہتر ہیں۔

حدائق بخشش کی دونوں جلدوں میں نعتیہ اشعار کے شانہ بہ شانہ غزل کے اشعار بھی سامعین کو اپنی جانب متوجہ کرتے ہیں اور اُن کی طرف متوجہ ہونے والے یہ بھی چاہتے ہیں کہ حضرت رضا کی غزلیہ شاعری کا ایک مجموعہ الگ سے مرتب ہوکر شائع ہوجائے۔

ڈاکٹر امجد صاحب نے یہ کارنامہ انجام دیا تو خوب کیا۔ مَیں بھی اس سے محظوظ ہوا۔ مگر متعدد مقامات پر اختلاف رہا۔ اپنے ان اختلافات کا ذکر ایک عریضے میں اُن کے درجۂ تحقیق کے اُستادِ محترم حضرت پروفیسر ڈاکٹر سید محمد طلحہ رضوی برق داناپوری مدظلہٗ العالی سے بھی کر دیا۔ موصوف نے جواب عنایت فرمایا کہ موصوف سے ملاقات ہونے پر ان اختلافات کا ذکر کر دیا جائے گا۔ (اُس وقت تک امجد صاحب سے میری نصف یا کامل ملاقات نہیں تھی)

چونکہ غزلیاتِ رضا کا ایک مجموعہ مرتب ہو کر شائع ہو چکا ہے اور مرتبِ مجموعہ نے واقعی اُس میں محنت کی ہے۔ اس لیے اُسی کلام کے (معمولی حذف اضافے کے ساتھ) دوسرے مجموعے کی تیاری فضول ہے۔ زیادہ موشگافیاں بھی مناسب نہیں سمجھتا۔ اس لیے کہ رضویات کے سلسلے میں یہ میرا آخری مضمون ہے اور یہ بھی بڑی بے دلی کے ساتھ لکھ رہا ہوں۔

رضویات پر آیندہ نثر کی شکل میں مزید کچھ نہ لکھنے کا عہد ایک سال پہلے بھی کر چکا تھا۔ مگر چونکہ اس ارادے کا اعلانِ عام نہیں کیا تھا۔ اس لیے بعض احباب کا مزید لکھنے کا اصرار نامناسب نہیں معلوم ہوا۔ یہی سوچ کر ایک خاص فرمایش کو ردّ نہ کر سکا اور یہ آخری مضمون لکھنے پر آمادہ تو ہو گیا مگر رضویات کے نام نہاد ٹھیکے داروں نے دل پر جو تیر کے لگائے ہیں اُن کے زخم بھرنے کا نام نہیں لیتے اور جب دل مجروح ہو تو کسی کام پر کیسے آمادہ ہو گا۔

بے دلی کی خاص وجہ یہ ہے کہ ایک مدّت سے اردو کی ادبی دنیا میں جمے ہوئے تھے (جہاں میرے فاسد حریفوں کے نام سے بھی کوئی واقف نہیں۔ صرف سُنی پرچوں پر اُن کا رعب ہے) عالمی ادب میں بھی داخلہ ہو گیا تھا۔ ایک عالمی ادیب نے بذریعہ خط کچھ موضوعات دے کر زور ڈالا کہ مَیں عالمی ادب میں بڑھ چڑھ کر حصہ لوں۔ مگر اُس وقت تک بعض محبانِ اعلیٰ حضرت مجھے رضویات کی جانب مائل کر چکے تھے۔ عالمی ادیب کی فرمایش کو نظر انداز کر کے اور اُن کو روکھا پھیکا سا جواب دے کر رضویات پر خامہ فرسائی شروع کر دی۔ اللہ رب العزت کے فضل بے پایاں سے جو لکھا وہ اُمید سے زیادہ مقبول ہوا۔

لیکن اب بعض اسباب کی بنا پر رضویات پر لکھنے سے دست برداری کا تہیہ کر لیا۔ اور اب اعلان کر رہا ہوں کہ آیندہ رضویات پر کوئی مضمون نہیں لکھوں گا۔ مجھ سے کوئی صاحب فرمایش نہ کریں۔ اب میں اپنی جانی پہچانی دنیا کی طرف مراجعت کر رہا ہوں۔

مجھے حضرت علامہ ڈاکٹر محمد امجد رضا امجد صاحب کے انتخاب سے جو اختلاف ہے اُس کا اظہار بھی ضروری سمجھتا ہوں۔ اگر چہ جناب پروفیسر سید شاہ محمد طلحہ رضوی برقؔ نے اس کتاب کی ''تقریظ'' اس

جملے سے شروع کی ہے۔

''حضرت رضا بریلوی کی نعتیہ غزلوں کا انتخاب پیش نظر ہے۔''(ص۹)

ایک بالغ نظر نقاد کے ایک جملے نے ہی سارے اعتراضات و اختلافات کو رفع کردیا۔ مرتب نے بھی کتاب کے سرورق اوّل پر انتخاب از حدائق بخشش لکھ کر اختلافات کو پیدا ہونے سے پہلے ہی ختم کرنے کی کوشش کی تھی۔ مگر کتاب کا نام ''غزلیاتِ رضا'' اور صفحہ ۱۳ پر یہ فقرہ ''غزلیاتِ رضا کا یہ انتخاب'' غماز ہیں کہ اس کتاب میں امام احمد رضا کی غزلیہ شاعری کو یکجا کیا گیا ہے۔

مگر مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ یہ غزلوں کا انتخاب ہرگز نہیں ہے۔

غزل اور نعت کے اشعار کی شناخت اُن کے موضوعات سے ہوتی ہے۔ دنیا جانتی ہے کہ ان دونوں کے موضوعات الگ الگ ہوتے ہیں (علاوہ حسن و عشق کے اظہار کے) ''غزلیاتِ رضا'' کی پہلی غزل میں ہی دوسرا شعر یہ ہے:۔

مدد اے جوشش گریہ بہادے کوہ اور صحرا نظر آجائے جلوہ بے حجاب اُس پاک تُربت کا

پاک تُربت کی زیارت کبھی غزل کا مضمون نہیں رہا۔ اسی غزل کے چوتھے شعر میں ''پابوس حضرت'' بھی یہ اشارہ کرتا ہے کہ یہ بھی غزل کا شعر نہیں ہے، بلکہ نعت یا منقبت کا ہے۔ اسی غزل کا ساتواں شعر یوں ہے:

زبانِ خار کس کس درد سے اُن کو سُناتی ہے تڑپنا دشتِ طیبہ میں جگر افگار فرقت کا

مدینے کے صحرا میں کسی فرقت زدہ کا تڑپنا صاف بتاتا ہے کہ یہ شعر بھی نعت پاک کا ہے۔ غزل کا ہرگز نہیں ہے۔

دوسری غزل میں ۶ رشعر ہیں اور سب غزل کے ہیں۔ تیسری غزل کے ابتدائی تین اشعار میں لفظ ''مدینہ'' اور چوتھے شعر میں ''طیبہ'' موجود ہے۔ ساتویں شعر میں دشتِ حرم میں پناہ لینے کا تذکرہ ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ پانچوں شعر نعت پاک کے ہیں۔ ان پر غزل کا لیبل چسپا کرنا کسی طرح مناسب نہیں۔

یہیں تک نہیں بلکہ پورے انتخاب کا حال کم وبیش یہی ہے اور اسی وجہ سے فقیر کو اختلاف ہوا۔ اس دوستانہ اختلاف کے لیے ڈاکٹر صاحب موصوف سے معذرت خواہ ہوں۔

اچھے اور منجھے ہوئے شاعر نعت کہتے وقت کبھی تفنن طبع کی خاطر، کبھی قادر الکلامی کے اظہار کے لیے اور کبھی درد دل کا ماجرا بیان کرنے کی غرض سے غزل کے اشعار بھی کہہ جاتے ہیں، جن کو نعتیہ اشعار کے درمیان ہی رکھ دیتے ہیں۔ یہ قارئین و سامعین کو نعتیہ اشعار کے ساتھ مل کر نعت کا ہی لطف دیتے ہیں عام قاری یا سامع کو اندازہ بھی نہیں ہوتا کہ یہ غزل کے شعر ہے۔ جیسے

یادِ ابرو کرکے تڑپو بلبلو! ٹکڑے ٹکڑے دام ہو ہی جائے گا

بظاہر یہ شعر غزل کا معلوم ہوتا ہے مگر نعت میں ایسا کھپ گیا ہے کہ قاری یا سامع کو غزل کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ وہ اس سے نعت کا ہی لطف حاصل کرتا ہے۔

کچھ ایسے اشعار بھی ہوتے ہیں جو غزل اور نعت کے بین بین معلوم ہوتے ہیں۔ حدائق بخشش حصہ اوّل کی پہلی نعت میں یہ شعر بھی ہیں۔

تیرے قدموں میں جو ہیں غیر کا منھ کیا دیکھیں کون نظروں میں چڑھے دیکھ کے تلوا تیرا

بحرِ سائل کا ہوں سائل نہ کنویں کا پیاسا خود بجھا جائے کلیجہ مرا چھینٹا تیرا

ان شعروں میں نہ تو کہیں سید الانبیاءﷺ یا کسی ولی کا نام آیا ہے نہ کسی مقدس شہر یا زمین کا ذکر ہے، لیکن اتنی سی بات پر ان کو غزل کے شعر نہیں کہا جاسکتا۔ اس لیے کہ پہلے شعر میں تلوے کے حسن کا ذکر ہے اور دوسرے شعر میں محبوب کے فیض کی طرف اشارہ ہے۔ غزل میں ایسے مضامین کی گنجائش عموماً نہیں ہوتی۔ ہونے کو غزل میں ایک آدھ شعر نعت کا بھی آجاتا ہے۔ مگر یہ خال خال ہی ہوتا ہے۔

غزل کی شناخت، ہیئت کے علاوہ اُس کا اندازِ بیان اور لب و لہجہ بھی ہے۔ دل کی تڑپ، جگر کو سوزش، وصل کی اندھی تمنا، رقیبوں سے دو۲ دو۲ ہاتھ کرنے کی آرزو، زاہد پر پھبتی، واعظ کے ساتھ ٹھٹھول اور شوخیاں، ساقی اور شراب کی باتیں اور بدلے ہوئے دور میں غمِ دوراں کی ترجمانی غزل کے خاص موضوعات ہیں۔ ایجاز و اختصار اور رمز و اشاریت جیسی خوبیاں بھی ساتھ میں ہوں تو غزل واقعی غزل ہوتی ہے۔ غزل کے مضامین اور بھی بہت ہیں۔ اس لیے اگر بہتر طور پر کہنا ہو تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ غزل اور نعت کے اشعار کا صحیح فرق ذوقِ سلیم پر منحصر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ غزل کی چاشنی ہی الگ ہوتی ہے۔

دیوان حدائق بخشش اوّل و دوم میں اب سے بہت پہلے (شاید بیسویں صدی کی آٹھویں دہائی میں) ایسے اشعار پر ابتدائی اوراق میں سبز روشنائی سے اور مابعد کے اوراق میں سرخ قلم سے نشان لگا کر رکھ لیے تھے۔ اتفاق سے وہ نسخہ محفوظ ہے اور بہ آسانی دستیاب بھی ہوگیا۔ اب دیکھا تو اُس پر اختصار کے ساتھ (کہیں کہیں) کچھ اشارے اور نوٹس بھی درج ہیں۔ یاد آیا کہ غزلیاتِ رضا پر سیر حاصل بحث کرنے کا ارادہ تھا۔ اس سے حضرت رضؔا بریلوی کی غزل گوئی کی خصوصیات منظر عام پر آتیں، فن کارانہ موشگافیاں بھی ہوتیں۔ لیکن اب صرف اُن کی غزلیہ شاعری سے تعلق رکھنے والے اشعار کو ہی درج کروں گا۔ بددِلی میں یہ بھی بہت ہے۔ اُمید کرتا ہوں کہ اپنی قابلیت کا اظہار کرنے کے لیے اس کمی کو میرے حاسد ضرور پورا کردیں گے۔

حدائق بخشش کے جن نسخوں کے اشعار پرنشان لگے ہوئے ہیں اُن کی تعداد اس طرح ہے۔

☆ جلد اوّل ۱۲۱ اشعار ☆ جلد دوم ۱۴ اشعار ☆ جلد سوم اُس وقت تک دسترس میں نہیں تھی، بہت بعد میں دیکھی تو معلوم ہوا کہ قصائد کی تشبیبوں میں ایسے اشعار بہت ہیں جو نعت کے ہرگز نہیں ہو سکتے۔ مگر ان کو غزل کے اشعار بھی نہیں کہا جا سکتا کیونکہ غزل چیزے دیگر است۔

یہاں یہ بھی عرض کر دوں کہ اس انتخاب میں نشانات زدہ اشعار میں کافی کم و بیشی ہوئی ہے۔ برائے نام چند اشعار کا اضافہ ڈاکٹر امجد رضا امجد صاحب کے انتخاب سے بھی کیا ہے۔ اس کے لیے ڈاکٹر صاحب کا ممنون ہوں۔

تیسرے حصے میں کئی قصیدے بہت زور دار ہیں، جو حضرت رضاؔ بریلوی کی قادر الکلامی کو زبانِ حال سے بیان کر رہے ہیں۔ ان میں سے بعض کی تشبیبیں عشق و محبت کے مضامین سے لبریز ہیں۔ ان کو بھی غزلیات تو نہیں کہہ سکتے؛ مگر ان کے اشعار میں غزل کی چاشنی اور اس کا لطف بڑے بھرپور انداز میں پایا جاتا ہے۔ اشعار غزل کی (پروفیسر گیان چند جین کے الفاظ میں) کھتونی تیار کرنے سے قبل اس تشبیب کو نقل کرنے کی اجازت چاہتا ہوں، جس سے معلوم ہوگا کہ اگر حضرت رضاؔ بریلوی اپنے برادرِ اوسط کی طرح غزل کی طرف توجہ دیتے تو اردو کی غزلیہ شاعری میں ایک اور عظیم شاعر کا نام شامل ہو جاتا۔ تشبیب کے ان اشعار کو آپ بھی پڑھیے اور لطف اُٹھائیے۔ منظر نگاری کا ایسا نمونہ نعت گویوں کے کلام میں مشکل سے ہی ملتا ہے۔

جھومتی آئیں نسیمیں نرم نرم — پتلی پتلی ڈالیاں لچکا چلیں
دل کھلے کانوں میں رس پڑنے لگے — خوشنوا چڑیاں ترانے گا چلیں
تانوں کی جینوں میں پھر لہرا بجا — گیسوؤں کی ناگنیں لہرا چلیں
باغِ دل میں وجد کے جھولے پڑے — آرزوئیں پھر ملادیں، گا چلیں
سُرخ سبز اودی سنہری بدلیاں — دن ڈھلے کیا چنریاں رنگوا چلیں
پھر نظر میں گدگدی ہونے لگی — دھانی دھانی بوٹیاں پھڑکا چلیں
لہلہاتا کھلکھلاتا واہ واہ — پتیاں کلیاں قیامت ڈھا چلیں
اُمڈیں، گرجیں، چمکیں کالی بدلیاں — بالوں نادانوں کا دل دھڑکا چلیں
پھر اُٹھا پودوں کے جوبن میں اُبھار — ننھی ننھی کونپلیں ہریا چلیں
مور کوکے سینۂ پُر داغ کے — یاد گیسو کی گھٹائیں آ چلیں
ڈبرے جھیلیں تال نہریں ندیاں — کچھ کمر تک کچھ گلے تک آ چلیں

پھول مہکے، غنچے چٹکے، گل کھلے — نو بہاریں جابجا اِٹھلا چلیں

(صفحہ ۵۰۔۵۱)

اس قصیدے میں تشبیب کے سوا کچھ دستیاب نہیں ہے۔ ممکن ہے تشبیب بھی مکمل نہ ہو۔ قصیدہ در مدحِ سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی تشبیب سے بھی کچھ اشعار ملاحظہ فرمائیں۔ غزلیت کا رچا ہوا انداز چھپائے نہیں چھپ رہا ہے۔

گرچہ دست ہوس دہر سے دامن ہے بری — مگر آوارۂ ہر جا ہے عروس خاور

روح معشوقہ بے غش تھی پر اب دخل نہیں — بار پائے مزے آغوش بدن میں لے کر

شوخ دیدہ کورکھیں اہلِ چمن آنکھوں میں — نرگس از بس ہے پریشاں نظری کی خوگر

خاک اُڑائی پھری آوارۂ ہر دشت چمن — اب حضوری کی ہوا سر میں ہے اے بادِ سحر

(صفحہ ۳۶)

روشیں آئینہ چرخ آئینہ پرتو کا ہجوم — سرِ اشجار شجر ہیں تہِ اشجار شجر

غم صیاد سے فارغ ہے عنادل کہ یہاں — سب زمیں آئینہ ہے دام چھپے گا کیونکر

عکس باہم سے عجب لطف صفا نے بخشا — سبز ہیں لالہ و گل سبزہ و اوراق احمر

یہ بنا تخت زمرد وہ بنا افسر لعل — واہ کیا سبز و گل نے ہیں دکھائے جوہر

(صفحہ ۳۷)

اب بغیر کسی تبصرے کے حضرت رضاؔ بریلوی کے اشعارِ غزل کی ایک فہرست ملاحظہ فرمایئے اور غزل گوئی میں اُن کا مقام خود متعین کیجیے۔

گیت کلیوں کی چٹک غزلیں ہزاروں کی چہک — باغ کے سازوں میں بجتا ہے ترانہ تیرا

صف ہر شجرہ میں ہوتی ہے سلامی تیری — شاخیں جھک جھک کے بجالاتی ہیں مجرا تیرا

....

سکھایا ہے یہ کس گستاخ نے آئینہ کو یارب — نظارہ روے جاناں کا بہانہ کرکے حیرت کا

یہاں چھڑکا نمک واں مرہمِ کافور ہاتھ آیا — دلِ زخمی نمک پروردہ ہے کس کی ملاحت کا

الٰہی منتظر ہوں وہ خرام ناز فرمائیں — بچھا رکھا ہے فرش آنکھوں نے کمخوابِ بصارت کا

وہ چمکیں بجلیاں یارب تجلی ہاے جاناں کی — کہ چشمِ طور کا سرمہ ہو دل مشتاق رویت کا

لُطف اُن کا عام ہو ہی جائے گا — شاد ہر ناکام ہو ہی جائے گا

بے نشانوں کا نشاں مٹتا نہیں — مٹتے مٹتے نام ہو ہی جائے گا

ایک دن آواز بدلیں گے یہ ساز — چہچہا کہرام ہو ہی جائے گا

یاد ابرو کرکے تڑپو بلبلو! — ٹکڑے ٹکڑے دام ہو ہی جائے گا

بادہ خواری کا سماں بندھنے تو دو — شیخ درد آشام ہو ہی جائے گا

مٹ کے گر یوں ہی رہا قرضِ حیات — جان کا نیلام ہو ہی جائے گا

اے رضا ہر کام کا اک وقت ہے
دل کو بھی آرام ہو ہی جائے گا

....

اَلْقَلْبُ شَجٍ وَّالْهَمُّ شُجُوْن دل زار چناں جاں زیر چنوں
پت اپنی بپت میں کا سے کہوں، مورا کون ہے تیرے سوا جانا
اَلرُّوْحُ فِدَاکَ فَزِدْ حَرْقاً یک شعلہ دگر برزن عشقا
مورا تن من دھن سب پھونک دیا یہ جان بھی پیارے جلا جانا
بس خامۂ خامِ نوائے رضا نہ یہ طرز مری نہ یہ رنگ مرا
ارشادِ احبا ناطق تھا ناچار اِس راہ پڑا جانا

....

ٹپکتا رنگِ جنوں عشقِ شہ میں ہر گُل سے — رگِ بہار کو نشتر رسیدہ ہونا تھا

جو سنگِ در پہ جبیں سائیوں پہ تھا مٹنا — تو میری جان شرارِ جہیدہ ہونا تھا

رضا جو دل کو بنانا تھا جلوہ گاہِ حبیب
تو پیارے قیدِ خودی سے رہیدہ ہونا تھا

....

جب بامِ تجلّی پر وہ نیّرِ جاں آیا — سر تھا جو گرا جھک کر دل تھا جو تپاں آیا

خراب حال کیا دل کو پُر ملال کیا — تمہارے کوچے سے رخصت نے کیا نہال کیا

نہ روئے گل ابھی دیکھا نہ بوئے گل سونگھی — قضا نے لاکے قفس میں شکستہ بال کیا

وہ دل کہ خوں شدہ ارماں تھے جس میں مَل ڈالا — فغاں کہ گورِ شہیداں کو پا ے مال کیا

چمن سے پھینک دیا آشیانۂ بُلبُل	اُجاڑا خانۂ بے کس بڑا کمال کیا
ترا ستم زدہ آنکھوں نے کیا بگاڑا تھا	یہ کیا سمائی کہ دُور اُن سے وہ جمال کیا
جو دل نے مر کے جلایا تھا منتوں کا چراغ	ستم کہ عرضِ رہِ صرصرِ زوال کیا
ابھی ابھی تو چمن میں تھے چہچہے ناگاہ	یہ درد کیسا اُٹھا جس نے جی نڈھال کیا

....

ہائے وہ آنکھ کہ ناکام تمنا ہی رہی	ہائے وہ دل جو ترے در سے پُر ارمان گیا
دل ہے وہ دل جو تری یاد سے معمور رہا	سر ہے وہ سر جو ترے قدموں پہ قربان گیا

....

تیرے بے دام کے بندے ہیں رئیسانِ عجم	تیرے بے دام کے بندی ہیں ہزارانِ عرب

....

جو بنوں پر ہے بہارِ چمن آرائی دوست	خُلد کا نام نہ لے بُلبُلِ شیدائی دوست
تھک کے بیٹھے تو درِ دل پہ تمنائی دوست	کون سے گھر کا اُجالا نہیں زیبائی دوست
مرنے والوں کو یہاں ملتی ہے عمرِ جاوید	زندہ چھوڑے گی کسی کو نہ مسیحائی دوست
حسنِ بے پردہ کے پردے نے مٹا رکھا ہے	ڈھونڈنے جائیں کہاں جلوۂ ہرجائی دوست
شوق روکے نہ رُکے پاؤں اُٹھائے نہ اُٹھے	کیسی مشکل میں ہے اللہ تمنائی دوست

....

یادِ رُخ میں آہیں کرکے بن میں مَیں رویا آئی بہار	جھومیں نسیمیں نیساں برسا کلیاں چٹکیں مہکی شاخ

....

جلوہ فرمائیں رُخِ دل کی سیاہی مٹ جائے	صبح ہوجائے الٰہی شبِ تارِ عارض

....

بلبل گھرا ہے ابرِ ولا مژدہ ہو کہ اب	گرتی ہے آشیانے پہ برقِ جمالِ گُل
یارب ہرا بھرا رہے داغِ جگر کا باغ	ہر مہ مہِ بہار ہو ہر سال سالِ گُل
ہیں عکسِ چہرہ سے لبِ گلگوں میں سُرخیاں	ڈوبا ہے بدرِ گُل سے شفق میں ہلالِ گُل

....

واللہ جو مل جائے مرے گُل کا پسینہ	مانگے نہ کبھی عطر نہ پھر چاہے دولہن پھول

دل اپنا بھی شیدائی ہے اُس ناخنِ پا کا — اتنا بھی مہِ نو پہ نہ اے چرخِ کہن پھول

دل غم تجھے گھیرے ہیں خدا تجھ کو وہ چمکائے — سورج ترے خرمن کو بنے تیری کرن پھول

....

پاٹ وہ کچھ دھار یہ کچھ زار ہم — یا الٰہی کیونکر اُتریں پار ہم

کس بلا کی مے سے ہیں سرشار ہم — دن ڈھلا ہوتے نہیں ہشیار ہم

دشمنوں کی آنکھ میں بھی پھول تم — دوستوں کی بھی نظر میں خار ہم

اپنے کوچے سے نکالا تو نہ دو — ہیں تو حد بھر کے خدائی خوار ہم

ہمت اے ضعف اُن کے در پر گر کے ہوں — بے تکلف سایۂ دیوار ہم

کب سے پھیلائے ہیں دامن تیغ عشق — اب تو پائیں زخمِ دامن دار ہم

ناتوانی کا بھلا ہو بن گئے — نقشِ پائے طالبانِ یار ہم

دل کے ٹکڑے نذر حاضر لائے ہیں — اے سگانِ کوچۂ دلدار ہم

مے کدہ چھٹتا ہے للہ ساقیا! — اب کی ساغر سے نہ ہوں ہشیار ہم

لطفِ از خود رفتگی یارب نصیب — ہوں شہیدِ جلوۂ رفتار ہم

....

بہہ چلی آنکھ بھی اشکوں کی طرح دامن پر — کہ نہیں تار نظر جز دوسہ تارِ دامن

اشک برساؤں چلے کوچۂ جاناں سے نسیم — یاخدا جلد کہیں نکلے بخارِ دامن

تجھ سے اے گُل میں ستم دیدۂ دشتِ حرماں — خلشِ دل کی کہوں یا غمِ خارِ دامن

اشک کہتے ہیں یہ شیدائی کی آنکھیں دھوکر — اے ادب گردِ نظر ہو نہ غبارِ دامن

اے رضاؔ آہ وہ بُلبُل کہ نظر میں جس کی
جلوۂ حبیبِ گُل آئے نہ بہارِ دامن

....

گر آنکھ ہوں تو ابر کی چشمِ پُر آب ہوں — دِل ہوں تو برق کا دلِ پُر اضطراب ہوں

کیوں نالہ سوز لے کروں کیوں خونِ دل دکھاؤں — سیخ کباب ہوں نہ میں جامِ شراب ہوں

دل بستہ بے قرار جگر چاک اشک بار — غنچہ ہوں گُل ہوں برقِ تپاں ہوں سحاب ہوں

مٹ جائے یہ خودی تو وہ جلوہ کہاں نہیں — دردا میں آپ اپنی نظر کا حجاب ہوں

....

مَیں نے کہا کہ جلوۂ اصل میں کس طرح گمیں — صبح نے نورِ مہر میں مٹ کے دکھا دیا کہ یوں

ہائے رے ذوقِ بےخودی دل جو سنبھلنے سا لگا — چھک کے مہک میں پھول کی گرنے لگی صبا کہ یوں

....

پھر کے گلی گلی تباہ ٹھوکریں سب کی کھائے کیوں — دل کو عقل دے خدا تیری گلی سے جائے کیوں

ہم تو ہیں آپ دل فگار غم میں ہنسی ہے ناگوار — چھیڑ کے گُل کو نو بہار خون ہمیں رُلائے کیوں

یا تو یوں ہی تڑپ کے جائیں یا وہی دام سے چھڑائیں — منتِ غیر کیوں اُٹھائیں کوئی ترس جتائے کیوں

گردِ ملال اگر دُھلے دل کی گلی اگر کھلے — برق سے آنکھ کیوں جلے رونے پہ مسکرائے کیوں

جانِ سفر نصیب کو کس نے کہا مزے سے سو — کھٹکا اگر سحر کا ہو شام سے موت آئے کیوں

ہے تو رضا نرا ستم جرم پہ گر لجائیں ہم
کوئی بجائے سوزِ غم سازِ طرب بجائے کیوں

....

دل میں تو چوٹ تھی دبی ہائے غضب اُبھر گئی — پوچھو تو آہِ سرد سے ٹھنڈی ہوا چلائی کیوں

کس کی نگاہ کی حیا پھرتی ہے میری آنکھ میں — نرگسِ مست ناز نے مجھ سے نظر چرائی کیوں

تو نے تو کر دیا طبیب آتشِ سینہ کا علاج — آج کے دُودِ آہ میں بوئے کباب آئی کیوں

فکرِ معاش بد بلا ہولِ معاد جاں گزا — لاکھوں بلا میں پھنسنے کو روح بدن میں آئی کیوں

غفلتِ شیخ و شاب پر ہنستے ہیں طفلِ شیرخوار — کرنے کو گدگدی عبث آنے لگی بہائی کیوں

حسرتِ نو کا سانحہ سُنتے ہی دل بگڑ گیا
ایسے مریض کو رضا مرگِ جواں سنائی کیوں

....

کلکِ رضا ہے خنجرِ خونخوار برق بار — اعدا سے کہہ دو خیر منائیں نہ شر کریں

....

وہ سوئے لالہ زار پھرتے ہیں — تیرے دن اے بہار پھرتے ہیں

جو ترے در سے یار پھرتے ہیں — در بدر یوں ہی خوار پھرتے ہیں

ہائے غافل وہ کیا جگہ ہے جہاں — پانچ جاتے ہیں چار پھرتے ہیں
بائیں رستے نہ جا مسافر سُن — مال ہے راہ مار پھرتے ہیں
جاگ سنسان بن ہے رات آئی — گرگ بہرِ شکار پھرتے ہیں
نفس یہ کوئی چال ہے ظالم — جیسے خاصے بجار پھرتے ہیں

کوئی کیوں پوچھے تیری بات رضاؔ
تجھ سے شیدا ہزار پھرتے ہیں

....

ملکِ سخن کی شاہی تم کو رضاؔ مسلم — جس سمت آگئے ہو سکے بٹھا دیے ہیں

....

ترا قد تو نادرِ دہر ہے کوئی مثل ہو تو مثال دے — نہیں گل کے پودوں میں ڈالیاں کہ چمن میں سروِ چماں نہیں
نہیں جس کے رنگ کا دوسرا نہ تو ہو کوئی نہ کبھی ہوا — کہو اس کو گل کہے کیا بنے کہ گلوں کا ڈھیر کہاں نہیں

کروں مدحِ اہلِ دوَل رضاؔ پڑے اس بلا میں مری بلا
مَیں گدا ہوں اپنے کریم کا مرا دین پارۂ ناں نہیں

....

تیل کی بوندیں ٹپکتی نہیں بالوں سے رضاؔ — صبحِ عارض پہ لٹاتے ہیں ستارے گیسو

....

یاد میں جس کی نہیں ہوشِ تن و جاں ہم کو — پھر دکھا دے وہ رُخ اے مہرِ فروزاں ہم کو
دیر سے آپ میں آنا نہیں ملتا ہم کو — کیا ہی خود رفتہ کیا جلوۂ جاناں ہم کو
جس تبسم نے گلستاں پہ گرائی بجلی — پھر دکھا دے وہ ادائے گلِ خنداں ہم کو
سیرِ گلشن سے اسیرانِ چمن کو کیا کام — نہ دے تکلیفِ چمن بلبلِ بستاں ہم کو
چاک داماں میں نہ تھک جائیو اے دستِ جنوں — پُرزے کرنا ہے ابھی جیب و گریباں ہم کو
پردہ اُس چہرۂ انور سے اُٹھا کر اک بار — اپنا آئینہ بنا اے مہِ تاباں ہم کو

....

مہرِ عالمتاب جھکتا ہے پئے تسلیم روز — پیشِ ذرّاتِ مزارِ بے دلانِ سوختہ
کوچۂ گیسوئے جاناں سے چلے ٹھنڈی نسیم — بال و پر افشاں ہوں یارب بلبلانِ سوختہ

اے رضاؔ مضمونِ سوزِ دل کی رفعت نے کیا
اس زمینِ سوختہ کو آسمانِ سوختہ

بچھڑی ہے گلی کیسی، بگڑی ہے بنی کیسی
پوچھو کوئی یہ صدمہ ارمان بھرے دل سے

بہکا ہے کہاں مجنوں، لے ڈالی بنوں کی خاک
دم بھر نہ کیا خیمہ لیلیٰ نے پرے دل سے

او شہد نمائے زہر در جام
گم جاؤں کدھر تری بدی سے

گہرے پیارے پرانے دِل سوز
گزرا میں تیری دوستی سے

تجھ سے جو اُٹھائے مَیں نے صدمے
ایسے نہ ملے کبھی کسی سے

اُف رے خود کام بے مروّت
پڑتا ہے کام آدمی سے

حد کے ظالم ستم کے کٹر
پتھر شرمائیں تیرے جی سے

ہم خاک میں مل چکے ہیں کب کے
نکلا نہ غبار تیرے جی سے

ہے ظالم مَیں نبھاؤں تجھ سے
اللہ بچائے اُس گھڑی سے

جو تم کو نہ جانتا ہو حضرت
چالیں چلیے اُس اجنبی سے

آنکھیں رو رو کے سُجانے والے
جانے والے نہیں آنے والے

کوئی دَم میں یہ سرا اوجڑ ہے
ارے او چھاؤنی چھانے والے

ذبح ہوتے ہیں وطن سے بچھڑے
دیس کیوں گاتے ہیں گانے والے

ارے بدفال بُری ہوتی ہے
دیس کا جنگلا سُنانے والے

ہوگیا دھک سے کلیجہ میرا
ہائے رخصت کی سنانے والے

کیوں رضاؔ آج گلی سونی ہے
اُٹھ مرے دھوم مچانے والے

کوئی ان تیز رووں سے کہہ دو
کس کے ہو کر رہیں تھکنے والے

دل سُلگتا ہے بھلا ہے اے ضبط
بجھ بھی جاتے ہیں دہکنے والے

ہم بھی کُمھلانے سے غافل تھے کبھی
کیا ہنسا غنچہ چٹکنے والے

جب گرے منہ سوے مے خانہ تھا
ہوش میں ہیں بہکنے والے

دیکھ او زخمِ دل آپے کو سنبھال
پھوٹ بہتے ہیں تپکنے والے

مے کہاں اور کہاں مَیں زاہد
یوں بھی تو چھکتے ہیں چھکنے والے

راہ پُر خار ہے کیا ہونا ہے
پاؤں افگار ہے کیا ہونا ہے

خشک ہے خون کہ دشمن ظالم | سخت خونخوار ہے کیا ہونا ہے
تن کی اب کون خبر لے ہے ہے | دل کا آزار ہے کیا ہونا ہے
پر کٹے، تنگ قفس اور بلبل | نو گرفتار ہے کیا ہونا ہے
تیرے بیمار کو میرے عیسیٰ | غش لگاتار ہے کیا ہونا ہے
نفسِ پُر زور کا وہ زور اور دِل | زیر ہے زار ہے کیا ہونا ہے
ہائے رے نیند مسافر تیری | کوچ تیار ہے کیا ہونا ہے
گھر بھی جانا ہے مسافر کہ نہیں | مت پہ کیا مار ہے کیا ہونا ہے
جان ہلکان ہوئی جاتی ہے | بار سا بار ہے کیا ہونا ہے
پار جانا ہے نہیں ملتی ناؤ | زور پر دھار ہے کیا ہونا ہے
ہائے بگڑی تو کہاں آکر ناؤ | عین منجدھار ہے کیا ہونا ہے
آخری دید ہے آؤ مل لیں | رنج بیکار ہے کیا ہونا ہے
دل ہمیں تم سے لگانا ہی نہ تھا | اب سفر بار ہے کیا ہونا ہے
جانے والوں پہ یہ رونا کیسا | بندہ ناچار ہے کیا ہونا ہے
باتیں کچھ اور بھی تم سے کرتے | پر کہاں وار ہے کیا ہونا ہے

....

سُونا جنگل رات اندھیری چھائی بدلی کالی ہے | سونے والو جاگتے رہیو چوروں کی رکھوالی ہے
آنکھ سے کاجل صاف چرالیں یاں وہ چور بلا کے ہیں | تیری گٹھری تاکی ہے اور تو نے نیند نکالی ہے
سونا پاس ہے، سُونا بن ہے، سونا زہر ہے اُٹھ پیارے | تو کہتا ہے میٹھی نیند ہے تیری مت ہی نرالی ہے
آنکھیں ملنا، جھنجھلا پڑنا، لاکھوں جماہی انگڑائی | نام پہ اُٹھنے کے لڑتا ہے، اُٹھنا بھی کچھ گالی ہے
یہ جو تجھ کو بلاتا ہے یہ ٹھگ ہے مار ہی رکھے گا | ہائے مسافر دم میں نہ آنا مت کیسی متوالی ہے
دنیا کو تو کیا جانے یہ دِس کی گانٹھ ہے حرافہ | صورت دیکھو ظالم کی تو کیسی بھولی بھالی ہے
شہد دکھائے، زہر پلائے، قاتل ڈائن شوہر کُش | اس مُردار پہ کیا للچانا، دنیا دیکھی بھالی ہے
جگنو چمکے پتا کھڑکے مجھ تنہا کا دل دھڑکے | ڈر سمجھائے کون کون ہے یا آگیا بے تالی ہے
بادل گرجے بجلی چمکے دھک سے کلیجہ ہو جائے | بن میں گھٹا کی بھیانک صورت کیسی کالی کالی ہے
پاؤں اُٹھا اور ٹھوکر کھائی کچھ سنبھلا اور اوندھے منہ | مینھ نے پھسلن کردی ہے اور دُھر تک کھائی نالی ہے

....

اُترتے چاند، ڈھلتی چاندنی، جو ہو سکے کرلے | اندھیرا پاکھ آتا ہے یہ دو دن کی اُجالی ہے

ارے یہ بھیڑیوں کا بن ہے اور شام آ گئی سر پر کہاں سویا مسافر ہائے کتنا لا اُبالی ہے
نہ چونکا دِن ہے ڈھلنے پر تری منزل ہوئی کھوٹی ارے او جانے والے نیند یہ کب کی نکالی ہے

....

اے دل یہ سُلگنا کیا، جلنا ہے تو جل بھی اُٹھ دم گھٹنے لگا ظالم کیا دھونی رمائی ہے
مجرم کو نہ شرماؤ احباب کفن ڈھک دو منہ دیکھ کے کیا ہوگا پردے میں بھلائی ہے
ہم دل جلے ہیں کس کے ہٹ فتنوں کے پرکالے کیوں پھونک دوں اک اُف سے کیا آگ لگائی ہے

....

از: حدائق بخشش (حصہ دوم)

صلائے مجلسم در گوش آمد ہیں بیا بشند جرس مستانہ می گوید کہ بر بندید محملہا
رضائے مست جامِ عشق ساغر باز می خواہد
الا یا ایہا الساقی ادر کا ساً و ناولہا

....

اے مرہم زخمِ جگر یاقوت لب والا گہر غیرت دہِ شمس و قمر رشکِ گل و جانِ جہاں
آئینہ ہا حیرانِ تو، شمس و قمر جویانِ تو سیارہا قربان تو، شمعت فدا پروانہ ساں
گل مست شد از بوے تو، بلبل فدائے روے تو سنبل نثارِ موے تو، طوطی بیادت نغمہ خواں
در ہجرِ تو سوزاں دِلم، پارہ جگر از رنج و غم صد داغ سینہ از الم و ز چشم دریاے رواں

....

میرے عیسیٰ ترے صدقے جاؤں طور بے طور ہیں بیماروں کے
تیرے ابرو کے تصدّق پیارے بند کرّے ہیں گرفتاروں کے

....

ارے اے خدا کے بندو! کوئی میرے دل کو ڈھونڈو
مرے پاس تھا ابھی تو ابھی کیا ہوا خدایا ۔ نہ کوئی گیا نہ آیا
کبھی وہ تپک کہ آتش، کبھی وہ ٹپک کہ بارش
کبھی وہ ہجومِ نالش کوئی جانے ابر چھایا ۔ بڑی جوششوں سے آیا
کبھی وہ چہک کہ بلبل، کبھی وہ مہک کہ خود گل
کبھی وہ لہک کہ بالکل، چمنِ جناں کھلایا ۔ گلِ قدس لہلہایا
کبھی زندگی کے ارماں، کبھی مرگِ نو کا خواہاں
وہ جیا کہ مرگ قرباں، وہ مُوا کہ زیست لایا ۔ کہے روح ہاں جلایا

کبھی گم کبھی عیاں ہے، کبھی سرد گہہ تپاں ہے
کبھی زیرِ لب فغاں ہے، کبھی چپ کہ دَم نہ تھا یا۔ رُخ کام جاں دکھایا

....

از حدائق بخشش (حصہ سوم)

مہر ہے مشغلہ افروز شبستاں کس کا ماہ ہے پر توہِ شمسۂ ایواں کس کا
سنبل آشفتہ ہے کس گل کے غمِ گیسو میں دیدۂ نرگسِ بیمار ہے حیراں کس کا
ایک جانب ہے قمر ایک طرف داغ جگر دیکھیے جھکتا ہے اب پلۂ میزاں کس کا
لالہ زارِ دلِ پُر داغ ہوا سنبل زار عکس افگن یہ ہوا گیسوے پیچاں کس کا
غش ہے بُلبُل تو حسینانِ چمن ہیں بے ہوش نظر آیا اُنہیں یارب چمنستان کس کا
خرمنِ دل پہ جو گرتی ہے تڑپ کر بجلی متحیر ہوں کہ چمکا دُرِ دنداں کس کا

....

سر فدائے رہِ جانِ جاں ہوگیا امتحاں امتحاں امتحاں ہوگیا
اُن کے جلوے کا جس دم بیاں ہوگیا گلستاں مجمعِ بُلبلاں ہوگیا
کس کے روے منور کی یاد آگئی دل تپاں دلِ تپاں دل تپاں ہوگیا
طوطیِ اصفہاں سُن کلامِ رضا
بے زباں بے زباں بے زباں ہوگیا

....

دندان ولب کی یاد میں گریاں وخونچکاں دُرِ یمن نہیں ہے کہ لعلِ یمن نہیں

....

یہ زخم دل روشِ گل ہنسائیں گے اک روز خدا کے واسطے ان کو کوئی سِیا نہ کرے
نہیں مَیں روتا ہوں کچھ یادِ باغ وگلشن میں ہمارے رونے پر اے گل کوئی ہنسا نہ کرے
کھلے گا غنچۂ دل گل کی بادِ دامن سے ہزار بار عرق ریزیاں صبا نہ کرے
یہ دل کو بھایا گلِ زخم عشق کا لکھا ہزار پھولے چمن قصدِ انتہا نہ کرے

غزلیات کے یہ اشعار ایک نعت گوشاعر کی تخلیق ہیں۔ ظاہر ہے کہ اشعار کہتے وقت شاعر کے دل میں یادِ رسول ﷺ اور خیال میں عشقِ حبیب کبریا ہی تھا۔ اس لیے بعض اشعار کا رُخ اب بھی سوئے مدینہ گھوما ہوا معلوم ہوتا ہے؛ مگر واضح طور پر نہیں۔ اور ایسے اشعار بھی ہیں جو غزل اور صرف غزل کے ترجمان ہیں۔

یہ بات بھی کم اہم نہیں ہے کہ ان اشعار کی تعداد ۱۷۹ ہے۔ اگر ۷/۷ شعر کی غزلیں تصور کی جائیں تو ۲۵/غزلوں کے اشعار ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ مطلع اور مقطعے اتنی تعداد میں نہیں ہیں۔ پھر بھی ان اشعار میں ۱۵/مطلع اور ۱۵/قطعے موجود ہیں اور پانچ غزلیں تو ایسی بھی ہیں جن میں مطلع بھی ہیں اور مقطعے بھی۔

جس شاعر کا مقصد کبھی غزل کہنا نہیں رہا، اُس سے اتنی توقع بھی نہیں کی جاسکتی تھی۔ مگر حضرت رضؔا بریلوی علیہ الرحمہ کے ذہن و دل میں سمائی ہوئی شعریت و ادبیت کو کیا کہا جائے کہ وہ بغیر قصد ہی ظاہر و باہر ہوگئی۔

♥♥♥♥♥

﴿ڈاکٹر صابر سنبھلی کا ایک اہم مکتوب﴾

جناب عالی گذشتہ ایام میں یہ فقیر حقیر مراسلوں کے ذریعے اس بات کی نشان دہی کر چکا ہے کہ رضا اکیڈمی سے شائع شدہ حدائق بخشش حصہ دوم میں "نظم معطر" سے ایک شعر کسی گہری سازش کے تحت نکال دیا گیا ہے، جس کا دس برس تک کسی کو شبہہ تک نہیں ہوا۔ فقیر یہ سمجھتا تھا کہ حدائق بخشش سے صرف یہی ایک شعر کسی سازش کے تحت کم کیا گیا ہے۔ مگر اس کا یہ خیال غلط نکلا۔ کچھ دن پہلے علم میں آیا کہ اعلیٰ حضرت کا ایک اور شعر بھی اس سازش کا شکار ہوا ہے اور یہ دریافت فقیر کی نہیں، بلکہ اہلِ سُنّت کے ایک عظیم عالم دین نے اس کی نشان دہی فرمائی، جو حدائق بخشش کے ہر نسخے میں شامل رہا ہے، علاوہ رضا اکیڈمی بمبئی کے نسخے کے۔ اس شعر میں بھی کسی طرح کا شرعی یا شعری نقص نہیں ہے بلکہ اس کو ارادتاً (شاید ہمیشہ کے لیے غائب کرنے کے ارادے سے) حدائق بخشش سے خارج کیا گیا ہے۔ دس برس تک نہ تو اس کو دوبارہ حدائق بخشش میں شامل کیا گیا، نہ اس کے اخراج کا ذکر کیا گیا اور نہ اس کی کوئی وجہ بیان کی گئی یہ بڑی تشویش کی بات ہے۔ وہ مشہور و معروف شعر یہ ہے:

اک طرف اعدائے دیں ایک طرف حاسدیں بندہ ہے تنہا شہا، تم پہ کروروں درود

اب یہ کہنا شاید غلط نہ ہو کہ حدائق بخشش کے مذکورہ نسخے سے اور شعر بھی غائب کیے گیے ہوں گے، جن کو تلاش کرنے کے لیے وقت اور سکون کی ضرورت ہے، جو فقیر کے پاس نہیں ہیں۔

پچھلے مراسلے میں مَیں نے یہ بھی عرض کیا تھا کہ اس سازش کے پیچھے جس شخص کا ذہن کارفرما ہے اُس کے بارے میں مجھے صرف شک ہے۔ اب بات یقین کو پہنچ گئی ہے۔ ان شاء المولیٰ اس شخص کا نام جلد ہی ایک طویل مضمون میں ظاہر کروں گا۔ یہاں اتنا عرض کردوں کہ اعلیٰ حضرت عظیم البرکت سے اس شخص کے بغض کی تحریری شہادتیں موجود ہیں۔ الحاج محمد سعید نوری صاحب سے گذارش ہے کہ اگر وہ اس شخص کا نام ظاہر فرمادیں تو زیادہ اچھا ہو، تا کہ کسی ناکردۂ خطا پر الزام آنے کا امکان نہ رہے۔

اگر کسی صاحب کو حدائق بخشش میں کوئی ایسا شعر اور معلوم ہو جو رضا اکیڈمی کے ناقص نسخے میں نہیں ہے، تو براہِ کرم اس احقر کو اُس سے مطلع فرمانے کی زحمت فرمائیں، کرم ہوگا۔ احقر کا پتہ صرف اتنا کافی ہے:

Saif Khan Sarai, Sambhal, Dist. Moradabad, UP- 244302

امام نعت گویانِ اردو مولانا احمد رضا کی نعتیہ شاعری میں

انبیاے کرام، خلفاے راشدین، صحابہ کرام، اولیاے کرام کا تذکرہ

از: طاہر سلطانی (کراچی)

اللہ رب العزت نے انسان کو بے شمار خوبیوں اور نعمتوں سے نوازا ہے۔ ہر اچھا انسان اپنی شناخت رکھتا ہے، خواہ مذہب کے حوالے سے ہو، ادب ہو، سائنس ہو، معاشیات ہو، طب ہو، زرعی شعبہ ہو، سیاست ہو یا شاعری ہو...... ہر شعبے میں اللہ رب العزت نے اپنے پیارے بندوں کو منتخب کر کے اعلیٰ منصب پر فائز کیا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ حضرتِ انسان اپنے فرائض کس حد تک انجام دیتا ہے۔

یہی حال شاعر کا بھی ہے، شاعر تلمیذ الرحمٰن ہوتا ہے۔

''جن کے رتبے ہیں سوا' ان کو سوا مشکل ہے''

آپ میری اس بات سے یقیناً اتفاق کریں گے کہ سب سے عمدہ شاعری وہ ہے جس میں ذکرِ خدا و رسول ہو یا پھر تبلیغ دین و اصلاحی شاعری ہو۔ بلاشبہ ہم ایسی شاعری کو با مقصد شاعری کہہ سکتے ہیں۔

مولانا احمد رضا خان اس حوالے سے انتہائی خوش بخت شاعر ہیں کہ انھوں نے حمدیہ و نعتیہ شاعری کے علاوہ کوئی شاعری نہیں کی۔ یہ بات شعرا کے لیے قابلِ تقلید ہے۔

مولانا احمد رضا کی نعتیہ شاعری میں حمد و مناجات کے حوالے سے ایک مختصر مضمون راقم نے سپرد قلم کیا تھا۔ اُسی دوران خیال آیا کہ مولانا کی نعتیہ شاعری میں، انبیا کرام، خلفاے راشدین، صحابۂ کرام اور اولیاے کرام کا ذکر بھی ملتا ہے۔ کیوں نہ اُن اشعار کو یکجا کر دیا جائے۔ اللہ رب العزت کا کرم ہوا کہ مذکورہ مضمون مکمل ہو۔

مولانا کی اردو نعت گوئی میں بالترتیب حضرت یوسف علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت آدم علیہ السلام، حضرت نوح علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر آیا ہے۔ صحابہ کرام کا ذکر بالترتیب ہے حضرت ابوہریرہ، حضرت صدیق اکبر، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان غنی، حضرت علی حیدر، حضرت فاطمہ زہرا، حضرت امام حسن، حضرت امام حسین اور سید الشہدا حضرت امیر حمزہ، ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ صحابہ کرامِ بدر و اُحد...... امام شافعی، مالک، امام حنبل، امام ابوحنیفہ۔ اور سردارِ اولیا شیخ عبدالقادر جیلانی رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا تذکرہ شامل ہے۔

مولانا احمد رضا خاں قادری برکاتی نے سرورِ انبیا آنحضرت ﷺ کے بعد سب سے زیادہ اشعار سردارِ اولیا شیخ عبدالقادر جیلانی کی شان میں کہے ہیں۔ یہ بات مولانا کی شیخ عبدالقادر جیلانی بغدادی سے غیر معمولی عقیدت کا اظہار بھی ہے۔

ہم اپنے مضمون میں پہلے نعت شریف کا مطلع اور پھر وہ اشعار جن میں انبیا کرام، خلفائے راشدین، صحابہ کرام، خاتونِ جنت حضرت فاطمہ زہرا، ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ اور اولیا اللہ کا ذکر موجود ہے، آپ کے ذوقِ مطالعہ کی نذر کریں گے۔

اشعار کی ترتیب ''حدائق بخشش'' کے مطابق رکھی گئی ہے۔ مذکورہ مجموعہ کی چوتھی نعت کا مطلع دیکھیے:

محمد مظہرِ کامل ہے حق کی شانِ عزت کا — نظر آتا ہے اس کثرت میں کچھ انداز وحدت کا
نہ ہو آقا کو سجدہ آدم و یوسف کا سجدہ ہو — مگر سدّ ذرائع داب ہے اپنی شریعت کا
رضائے خستہ جوشِ بحرِ عصیاں نہ گھبرانا — کبھی تو ہاتھ آجائے گا دامن اُن کی رحمت کا

مطلع میں وحدت الوجود کا بیان اور پھر ذکرِ انبیا کرام کے بعد فرماتے ہیں۔ ہماری بھلائی اسی میں ہے کہ ہم سب دامنِ مصطفیٰ ﷺ کو صدقِ دل سے تھام کر آپ ﷺ کی سیرت پر عمل کریں۔

اب جو مطلع آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں اس میں معراج شریف کی طرف اشارہ ہے:

بندہ ملنے کو قریب حضرت قادر گیا — لمعۂ باطن میں گمنے جلوۂ ظاہر گیا
کیوں جنابِ بوہریرہ تھا وہ کیسا جامِ شیر — جس سے ستر صاحبوں کا دودھ سے منہ بھر گیا
ٹھوکریں کھاتے پھروگے ان کے در پر پڑ رہو — قافلہ تو اے رضاؔ اوّل گیا آخر گیا

یہ شان ہے اللہ کے پیارے محبوب ﷺ کی ...... ایک پیالہ دودھ ہے ستر صحابہ نے نوش فرمایا اور پیالہ پھر بھی بھرا رہا.................. سبحان اللہ سبحان اللہ۔

مقطع میں فرمارہے ہیں کہ در در ٹھوکریں نہ کھاؤ بلکہ درِ مصطفیٰ ﷺ کے خادم بن جاؤ۔

مولانا کی ایک اور خوبصورت نعت کا آغاز اس طرح ہوتا ہے کہ۔

تابِ مراتِ سحر گردِ بیابانِ عرب — غازۂ روئے قمر دودِ چراغانِ عرب
حسنِ یوسف پہ کٹیں مصر میں انگشتِ زناں — سر کٹاتے ہیں ترے نام پہ مردانِ عرب
پائے جبریل نے سرکار سے کیا کیا القاب — خسرو خیل ملک خادم سلطانِ عرب
حور سے کیا کہیں موسیٰ سے مگر عرض کریں — کہ ہے خود حسنِ ازل طالب جانانِ عرب
کرم نعت کے نزدیک تو کچھ دور نہیں — کہ رضائے عجمی ہو سگِ حسانِ عرب

حضرت یوسف علیہ السلام کا وہ واقعہ جس میں مصر کی عورتوں نے اپنی انگلیاں کاٹ لی تھیں۔

مولانا فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کے نام نامی پر مردانِ عرب سروں کے نذرانے پیش کرتے ہیں۔

مجھے یقین ہے کہ مولانا احمد رضا خاں قادری برکاتی کا مقام...... اللہ رب العزت اور رسولِ اکرم ﷺ کی بارگاہ میں ارفع و اعلیٰ ہوگا...... مولانا کی عقیدت دیکھیے کہ کہہ رہے ہیں کہ کاش میں سگِ حسّانِ عرب ہوجاؤں...... بڑے لوگوں کی بڑی باتیں۔

شاخ کی ردیف میں روح پرور نعت کا مطلع اور خلفاے راشدین اور خاتونِ جنت کی مدح سرائی کا انداز دیکھیے ؎

طوبیٰ میں جو سب سے اونچی نازک سیدھی نکلی شاخ
مانگیں نعت نبی لکھنے کو روحِ قدس سے ایسی شاخ
مولیٰ گلبن رحمت زہرا سبطین اس کی کلیاں پھول
صدیق و فاروق و عثمان و حیدر ہر ایک اس کی شاخ
آلِ احمد خذ بیدی یاسید حمزہ کن مددی
وقتِ خزانِ عمرِ رضؔا ہو برگ ہدیٰ سے نہ عاری شاخ

ایک خوبصورت تمنا کے ساتھ ساتھ خلفاے راشدین، خاتونِ جنت، شہیدِ کربلا سے محبت کا اظہار اور پھر ایک خاص دعا فرمائی۔

امام نعت گویانِ اردو، آنحضرت کا سراپا بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

سرتابقدم ہے تنِ سلطانِ زمن پھول لب پھول دہن پھول ذقن پھول بدن پھول
کیا بات رضا اس چمنستان کرم کی زہرا ہے کلی جس میں حسین اور حسن پھول

بے شک اس چمن اور اس کی کلیوں اور پھولوں کی جتنی بھی تعریف کی جائے وہ کم ہے۔

رشکِ قمر ہوں رنگِ رخِ آفتاب ہوں ذرہ ترا اے شہہ گردوں جناب ہوں
حسرت میں خاک بوسی طیبہ کی اے رضؔا ٹپکا جو چشمِ مہر سے وہ خونِ ناب ہوں

سرورِ انبیا ﷺ نے صحراے عرب کے ذرّوں کو قمر و آفتاب بنادیا کہ یہ کرمِ رب تعالیٰ اور نسبتِ رسولِ اکرم کا فیض ہی تو ہے۔

تاجدارِ انبیا آنحضرت ﷺ کے پُرانوار مدینہ طیبہ کے لیے روانگی پر کہی گئی نعت کی ابتدا کچھ اس طرح ہوتی ؎

شکرِ خدا کہ آج گھڑی اس سفر کی ہے جس پر نثار جان فلاح و ظفر کی ہے

ہوتے کہاں خلیل و بنا کعبہ و منیٰ — لولاک والے صاحبی سب تیرے گھر کی ہے

مولیٰ علی نے واری تری نیند پر نماز — اور وہ بھی عصر سب سے جو اعلیٰ خطر کی ہے

صدیق بلکہ غار میں جاں اس پہ دے چکے — اور حفظِ جاں تو جانِ فروضِ غرر کی ہے

مکۂ معظمہ اور مدینۂ طیبہ کا سفر ہر مسلمان کے لیے انتہائی خوشی اور سعادت کا موقع ہوتا ہے اور اس گھڑی زائر کی کیفیت کا عالم وہی جانے ہے۔

آنحضرت ﷺ مقصودِ کائنات ہیں اور یہ کہ

''بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر''

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کے آرام کی خاطر عصر کی نماز قربان کردی اور پھر دنیا نے دیکھا کہ آفتاب نے اپنی چال بدل دی...... حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے غارِ ثور میں بے مثل قربانی دے کر یارِ غار ہونے کا حق ادا کردیا۔ چنانچہ وہ آج بھی پہلوے مصطفےٰ میں آرام فرما ہیں۔

مقصود یہ ہیں آدم و نوح و خلیل سے — تخمِ کرم میں ساری کرامت ثمر کی ہے

آ کر سنادے عشق کے بولوں میں اے رضاؔ — مشتاقِ طبع لذتِ سوزِ جگر کی ہے

اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا کہ اے محبوب یہ ساری کائنات آپ ہی کے صدقے میں بنائی گئی ہے۔ مقطع میں 'بیعت چارہ رہی ہے کہ کوئی ایسا کلام سنائے کہ دردِ جگر میں لذت پیدا ہو۔

محبوبِ ربِ عرش ہے اس سبز قبہ میں — پہلو میں جلوہ گاہ عتیق و عمر کی ہے

ماہ و شما تو کیا کہ خلیلِ جلیل کو — کل دیکھنا کہ اُن سے تمنا نظر کی ہے

سن کی وہ دیکھا بادِ شفاعت کہ دے ہوا — یہ آبرو رضا ترے دامانِ تر کی ہے

صحیح حدیث میں فرمایا کہ روزِ قیامت تمام خلائق میری طرف نیازمند ہوگی، یہاں تک کہ خلیل اللہ ابراہیم علیہ السلام بھی۔

خاتم الانبیاء ﷺ سبز گنبد کے نیچے آرام فرما ہیں۔ ساتھ ہی امیر المؤمنین حضرت ابوبکر صدیق اور امیر المؤمنین حضرت فاروقِ اعظم رضوان اللہ علیہم بھی آپ ﷺ کے پہلو میں آرام فرما ہیں۔ مقطع میں آپ نے فرمایا۔ اے رضاؔ تیرے تر دامن کو ہوا دینے کے لیے وہ دیکھ شفاعت کی نسیم چلی۔

مولانا صاحب کی مقبولِ عام نعت جو ہر خاص و عام میں یکساں پسند کی جاتی ہے۔ مطلع آپ کے ذوقِ مطالعہ کی نذر کررہا ہوں۔

صبح طیبہ میں ہوئی بٹتا ہے باڑا نور کا — صدقہ لینے نور کا آیا ہے تارا نور کا

پشت پر ڈھلکا سرِ انور سے شملہ نور کا — دیکھیں موسیٰ طور سے اترا صحیفہ نور کا

اے رضا یہ احمدِ نوری کا فیضِ نور ہے　　　　ہوگئی میری غزل بڑھ کر قصیدہ نور کا

۱۵۹ اشعار پر مشتمل یہ نعتیہ قصیدہ دنیائے اردو نعت میں بلاشبہ یادگار و بے مثال ہے۔

امامِ نعت گویاں نے اردو میں ایک شاندار اور شاہ کار سلامیہ قصیدہ لکھا ہے۔ یہ شاہ کار نعتیہ قصیدہ زبانِ زد خاص و عام ہے۔ اس قصیدے کے ۱۶۸/اشعار ہیں ہر شعر اپنی تفصیل کا طالب ہے۔ امام احمد رضا کے اس سلامیہ قصیدے پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور لکھا جاتا رہے گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ سب کچھ عملِ صالح اور عشقِ رسول کے بغیر ناممکن ہے۔ مولانا کا آنحضرت ﷺ سے عشقِ کامل، علمی فضیلت اور ربِ کائنات کے خاص کرم کا نتیجہ ہے کہ یہ یادگار، روح پرور، ایمان افروز سلامیہ قصیدہ صفحۂ قرطاس پر منتقل ہوا۔ آج اس سلامیہ قصیدہ کو اردو نعتیہ شاعری میں ممتاز مقام حاصل ہے۔

مصطفیٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام　　　　شمعِ بزمِ ہدایت پہ لاکھوں سلام

ارشادِ خداوندی ہے کہ اے محبوب ہم نے آپ کو تمام عالموں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا۔ آپ ﷺ بزمِ جہاں کی خاطر شمعِ ہدایت لے کر آئے۔ ہم سب کے لیے اس سے بڑی سعادت اور کیا ہوسکتی ہے کہ ہم حبیبِ کبریا آنحضرت ﷺ پر خوب خوب درود و سلام بھیجیں۔

کس کو دیکھا یہ موسیٰ سے پوچھے کوئی　　　　آنکھوں والوں کی ہمت پہ لاکھوں سلام

حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہِ طور پر تجلیاتِ خداوند قدوس کی تاب نہ لاکر بے ہوش ہوگئے جبکہ معراج کی شب سرورِ انبیا ﷺ اللہ رب العزت کے دیدار سے مشرف ہوئے۔

بنتِ صدیق آرامِ جانِ نبی　　　　اُس حریمِ براءت پہ لاکھوں سلام

امیر المؤمنین حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی عالمہ و فاضلہ سعادت مند صاحب زادی ام المؤمنین حضرت عائشہ سے آپ ﷺ کو بہت زیادہ محبت تھی۔ مولانا احمد رضا نے اس شعر میں ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ سے اپنی عقیدت و محبت کا اظہار کیا ہے۔

یعنی ہے سورۂ نور جن کی گواہ　　　　اُن کی پُر نور صورت پہ لاکھوں سلام

امامِ نعت گویانِ اردو فرماتے ہیں کہ حضرت عائشہ کی پاک دامنی کی گواہ سورۂ نور ہے۔

شمعِ تابانِ کاشانہ اجتہاد　　　　مفتیِ چار ملت پہ لاکھوں سلام

امام ابوحنیفہ، امام شافعی، امام مالک، امام حنبل کو شانۂ اجتہاد کی بے مثل قرار دیتے ہوئے ان کی عظمت و ہمت کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔

یاد رہے کہ بدر کے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے درجات دیگر صحابہ کرام سے ارفع و اعلیٰ ہیں۔

جاں نثارانِ بدر و اُحد پہ درود　　　حق گذارانِ بیعت پہ لاکھوں سلام

بدر و اُحد کے جانثار صحابۂ کرام نبی کریم ﷺ کے سچے عاشق تھے جو آپ کے ایک حکم پر پروانہ وار قربان ہونے کو ہمہ وقت تیار رہتے تھے۔ مولانا نے ان بے مثل جانثاروں کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔

وہ دسوں جن کو جنت کا مژدہ ملا　　　اُس مبارک جماعت پہ لاکھوں سلام

عشرہ مبشرہ ان صحابۂ کرام کو کہا جاتا ہے جن کے لیے آنحضرت ﷺ نے جنت کی بشارت دی ہے۔ ان عظیم المرتبت صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں۔ امیر المؤمنین حضرت ابوبکر صدیق، امیر المؤمنین حضرت فاروق اعظم، امیر المؤمنین حضرت عثمان غنی ذوالنورین، امیر المؤمنین حضرت علی شیرِ خدا، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف، حضرت طلحۂ بن عبداللہ، حضرت ابوعبیدہ بن جراح، حضرت سعد بن وقاص، حضرت زبیر بن العوام، حضرت سعید بن زید رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔

یعنی اس افضل الخلق بعد الرسل　　　ثانی اثنین ہجرت پہ لاکھوں سلام

خلق میں رسولِ آخر آنحضرت ﷺ کے بعد افضل ہستی حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی ہے۔ آپ ﷺ کے ہمراہ ہجرت کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔

وہ عمر جس کے اعدا پہ شیدا سقر　　　اس خدا دوست حضرت پہ لاکھوں سلام
ترجمانِ نبی ہم زبانِ نبی　　　جانِ شانِ عدالت پہ لاکھوں سلام

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ جن کے انصاف اور دبدبے کی مثال نہیں ملتی۔ جن کے بارے میں آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا ''میرے بعد اگر کسی نبی کو آنا ہوتا تو وہ عمر ہوتے۔'' حضرت احمد رضا نے امیر المؤمنین فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو خدا دوست کہہ کر اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے۔

درِ منثور قرآن کی سلک بھی　　　زوجِ دونورِ عفت پہ لاکھوں سلام
یعنی عثمان صاحب قمیس ہدیٰ　　　حلہ پوش شہادت پہ لاکھوں سلام

مظلوم شہید امیر المؤمنین حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ آپ جامع قرآن ہیں، آپ کے نکاح میں نبی اکرم ﷺ کی دو صاحب زادیاں آئیں، آپ کی شہادت بلاشبہ عظیم شہادت ہے۔ آپ کی شہادت کے بعد ملتِ مسلمہ انتشار کا شکار ہوگئی۔

مرتضیٰ شیر حق اشجع الاشجعین　　　ساقی شیر و شربت پہ لاکھوں سلام
شیر شمشیر زن شاہِ خیبر شکن　　　پرتوِ دستِ قدرت پہ لاکھوں سلام

امیر المؤمنین حضرت علی شیرِ خدا کرم اللہ وجہہ نے خیبر فتح کیا جو تاریخ اسلام کا یادگار باب

ہے۔ مولانا احمد رضا نے، حضرت علی مرتضٰی بوتراب کو پرتوِ دستِ قدرت قرار دیتے ہوئے آپ کی مدح سرائی کی ہے۔

اور جتنے ہیں شہزادے اُس شاہ کے   ان سب اہلِ مکانت پہ لاکھوں سلام

امام نعت گویانِ اردو نے آنحضرت ﷺ کے تمام شہزادوں کی خدمت میں عقیدت و محبت کا اظہار کیا ہے۔

شافعی مالک احمد امام حنیف   چار باغِ امامت پہ لاکھوں سلام

مسلمانوں کے چار عظیم امام یعنی امام شافعی، امام مالک، امام حنبل، امام ابوحنیفہ رحمہم اللہ تعالیٰ کو باغِ امامت کا خطاب دے کر خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔

غوثِ اعظم امام التقیٰ والنقیٰ   جلوۂ شانِ قدرت پہ لاکھوں سلام

سردارِ اولیا حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی البغدادی رحمۃ اللہ علیہ کو جلوۂ شانِ قدرت اور متقیوں کا سردار کہتے ہوئے حضرت غوث الاعظم سے اپنی غیر معمولی عقیدت و محبت کا اظہار خوبصورت انداز سے کیا ہے۔

شاہِ برکات و برکات پیشینیاں   نو بہارِ طریقت پہ لاکھوں سلام

شاعرِ بے مثل حضرت احمد رضا قادری برکاتی نے اپنے پیر و مرشد حضرت سید آلِ رسول مارہروی رحمۃ اللہ علیہ کو نو بہارِ طریقت کے القاب سے پکارتے ہوئے اپنے خاص تعلق کا اظہار اور عقیدت و محبت بیان کی ہے۔

مجھ سے خدمت کے قدسی کہیں ہاں رضاؔ
مصطفٰے جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام

ایمان افروز، روح پرور، بے مثل سلامیہ قصیدے کے مقطع میں فرماتے ہیں کہ روزِ محشر آپ ﷺ کی خدمت پر معمور فرشتے کہیں کہ اے رضاؔ ''مصطفٰے جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام'' تو سنادو۔ اے عاشقِ رسول اے مجدّدِ دین و ملّت امام اہلِ سُنّت احمد رضا خاں قادری برکاتی آپ کی یہ خواہش ضرور پوری ہوگی (ان شاء اللہ)۔ مجھے امید ہے کہ روزِ محشر آپ اپنا یہ شعر ضرور پڑھیں گے۔

ایک میرا ہی رحمت پہ دعویٰ نہیں
شاہ کی ساری امت پہ لاکھوں سلام

☆☆☆☆☆☆

اثـرات

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا بریلوی قدس سرہ کی عبقریت کی خوشبو جب دنیا میں پھیلی اور اُن کے علم و فضل اور فکر و دانش نے اہلِ جہاں کے لیے حیرت کا تماشہ کیا تو اُن کی مقبولیت کی چاندنی مزید نکھرتی چلی گئی۔ اقلیمِ علم و ادب میں اُن کے نام اور کام کا سکّہ چلنے لگا، عوام و خواص اُن کے گرویدہ ہوگئے لیکن دوسری طرف امام احمد رضا نے مذہب کے ٹھیکے داروں اور ملّت کے غدّاروں کو جب حقیقت کا آئینہ دکھایا اور عوام کو اس سے آگاہ کیا تو بجائے اس کے کہ وہ اعلیٰ حضرت کی شکر گزاری کرتے، وہ تن من دھن سے اُن کے خلاف ہوگئے اور طوفانِ بدتمیزی پر اُتر آئے۔ لیکن امام احمد رضا کی شخصیت کی عمارت کی ایک اینٹ بھی کھسکا نہ سکے۔ زیر نظر باب امام کی حیات و خدمات پر مثبت اور منفی اثرات پر لکھے گئے مضامین کا احاطہ کرتا ہے۔ اہلِ سُنّت کے مستند عالمِ دین و قلم کار حضرت مولانا عبدالمبین نعمانی مصباحی صاحب قبلہ نے "سلامِ رضا کی مقبولیت" پر نہایت اہم مضمون شامل کیا ہے۔ محترمہ شبنم خاتون نے رضا بریلوی کی مقبولیت و شہرت کے اسباب تحریر کیے ہیں۔ باتیں تو وہی پرانی ہیں لیکن چونکہ ان باتوں کا موضوع سے خاصا ربط ہے، اس لیے اسے شامل کیا گیا۔ جناب خلیل رانا صاحب نے انٹرنیٹ پر کیے گئے اعلیٰ حضرت پر تازہ اعتراضات کا جائزہ لیا ہے۔ جناب اسماعیل بدایونی کراچی نے عقل و دانش کی عدالت میں امام احمد رضا کو پیش کیا ہے۔ تخلیقی سراپا ایک دم نیا ہے، اس لیے اسے پسند کیا جائے گا۔ کنزالایمان پر اربابِ علم و دانش کے تأثرات گو خاص اہم مضمون نہیں ہے لیکن ہماری محدود معلومات کی حد تک کنزالایمان پر یکجا تأثرات کہیں شائع نہیں کیے گئے، اس لیے قطع و برید کر کے اسے بھی ہم رکاب کرلیا گیا ہے۔ مولانا ساجد رضا مصباحی نے فتاویٰ رضویہ کی طباعت و اشاعت پر اہم گفتگو کی ہے۔ لیکن اُن سے چوک یہ ہوئی کہ آٹھویں جلد کی اشاعتی تفصیل کا تذکرہ رقم نہیں کیا۔

.... **ص۔ ر۔ مصباحی**

باب ہفتم

سلامِ رضا کی مقبولیت

از: مولانا محمد عبدالمبین نعمانی،
المجمع الاسلامی، مبارک پور، یوپی

گونج گونج اُٹھے ہیں نغماتِ رضا سے بوستاں
کیوں نہ ہو کس پھول کی مدحت میں وا منقار ہے

رضائے خستہ کیا کہنا، عجب جادو بیانی ہے
نمک ہر نغمۂ شیریں میں ہے شورِ عنادل کا

رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ان اللّٰہ یبعث لھٰذہ الامۃ علی رأس کل مائۃ سنۃ من یجدد لھا دینھا۔ (رواہ ابو داؤد عن ابی ھریرہ فی کتاب الملاحم)۔ اللہ تعالیٰ ہر صدی کے خاتمے پر ایک مجدد پیدا فرماتا ہے جو اس کے دین کی تجدید کرتا ہے۔ (ابو داؤد ۲/ ۵۸۹، کتاب الملاحم، باب مایذکر فی قرن المائۃ) یعنی دینِ حق کو گمراہوں کی ریشہ دوانیوں سے پاک فرماتا ہے اور مخلوقِ خدا کو راہِ حق دکھاتا ہے۔

چودھویں صدی میں بریلی کی سرزمین پر اعلیٰ حضرت مجددِ دین وملت امام احمد رضا علیہ الرحمۃ والرضوان پیدا ہوئے، جو باتفاق علمائے اسلام اس منصبِ عظیم پر فائز تھے۔ جنہوں نے مدۃ العمر بدمذہبوں اور بدعقیدوں کا ردّ فرما کر شرعی دینی فریضہ انجام دیا۔ ایک ہزار کے قریب کتب ورسائل وحواشی تصنیف فرمائے۔ فتاویٰ رضویہ کے نام سے آپ کے فتاویٰ کی ۱۲ جلدیں ہیں۔ جو طبع ہو کر اہلِ علم وتحقیق سے خراجِ تحسین وصول کر چکی ہیں۔ ہر جلد بڑے سائز کے ہزار صفحات کے قریب ہے اور اب جدید ترتیب وترجمے اور فہارس کے ساتھ یہ عظیم وجلیل کتاب تینتیس (۳۳) جلدوں میں لاہور سے شائع ہوگئی ہے۔ عربی، فارسی، اردو ہر زبان میں تصنیفیں یادگار ہیں۔ آپ کا ترجمۂ قرآن ''کنزالایمان'' اردو تراجم میں سب سے بہتر اور صحیح ترجمہ ہے۔ جو بلاشبہ آپ کی زندگی کا عظیم کارنامہ اور علمی جاہ وجلال کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ قرآن کا معنی ومفہوم سمجھنے کے لیے کنزالایمان کا مطالعہ ضرور کریں۔

شاعری میں آپ نے جو مقام پایا اس کی مثال پیش نہیں کی جاسکتی۔ ''حدائقِ بخشش'' کے نام

سے آپ کی نعتوں اور منقبتوں کا مجموعہ دو جلدوں میں شائع اور مقبولِ خاص و عام ہے۔ اور ''مصطفیٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام'' ۱۷۱ر اشعار پر مشتمل آپ کا وہ ایمان افروز سلام ہے جو ہند و پاک و بنگلہ دیش ہی نہیں، دنیا کے بیش تر ممالک کی محافلِ ذکر رسول ﷺ میں بڑے ذوق و شوق کے ساتھ پڑھا اور سُنا جاتا ہے۔ اس سے بارگاہِ رسالت میں آپ کی بے پناہ مقبولیت کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اس مضمون کا اصل محور یہی سلام ہے۔

آپ کے بڑے صاحب زادے کا نام حجۃ الاسلام مولانا شاہ حامد رضا خاں ہے اور دوسرے شہزادے حضرت علامہ مولانا محمد مصطفیٰ رضا خان مفتیِ اعظم ہند کے نام سے پوری دنیا میں مشہور ہیں۔ جن کے مریدین و متوسلین کی تعداد کروڑوں ہے۔

امام احمد رضا کی ولادت بمقام بریلی شریف (یوپی) میں ۱۰ر شوال المکرم ۱۲۷۲ھ مطابق ۱۴ر جون ۱۸۵۶ء بروز شنبہ بوقت ظہر ہوئی اور وصال ۲۵ر صفر المظفر ۱۳۴۰ھ مطابق ۲۸ر اکتوبر ۱۹۲۱ء بروز جمعہ دو بج کر اڑتیس منٹ پر ہوا۔

بہت سے دانش وروں نے جن کا براہ راست آپ سے تعلق نہیں، مثلاً مولانا کوثر نیازی، محی الدین الوائی مصر، ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا سعید بن یوسف زئی امیر جمعیت اہلِ حدیث وغیرہ آپ کے مدّاح اور کمالاتِ علمی کے معترف ہیں۔ تفصیل کے لیے ''امام احمد رضا اربابِ علم و دانش کی نظر میں'' از مولانا یٰس اختر مصباحی (دہلی) ملاحظہ کریں۔ آپ نے غلط رسوم و رواج اور بدعات و خرافات کا بھی زبردست ردّ فرمایا ہے۔ اور اصلاحِ معاشرہ کی خاطر بھی بھرپور جد و جہد کی ہے۔ مثلاً مروّجہ تعزیہ داری، سجدۂ قبور، قوالی مع مزامیر، طوافِ قبر، مزارات پر عورتوں کی حاضری اور بدعمل پیروں کے خلاف قلمی جہاد فرما کر قوم کی صحیح رہنمائی کا فریضہ انجام دیا ہے۔ تفصیل کے لیے ''امام احمد رضا اور ردِّ بدعات و منکرات'' از مولانا یٰس اختر مصباحی اور ''فاضلِ بریلوی اور اُمورِ بدعت'' از سیّد محمد فاروق القادری کا مطالعہ کریں۔

آپ کے خلفا نے دینی، علمی اور سیاسی ہر محاذ پر کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ چند مشاہیر خلفا کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

(۱) صدر الشریعہ حضرت مولانا محمد امجد علی اعظمی، مصنف بہارِ شریعت و فتاویٰ امجدیہ

(۲) مفسّرِ قرآن مولانا محمد نعیم الدین مراد آبادی، مصنف تفسیر خزائن العرفان وغیرہ

(۳) مبلغ اسلام سیاحِ یورپ و ایشیا حضرت مولانا عبدالعلیم صدیقی میرٹھی (والد ماجد مولانا شاہ احمد نورانی)

(۴) قطب مدینہ حضرت مولانا ضیاء الدین احمد مدنی

(۵) ملک العلما حضرت مولانا ظفر الدین بہاری، مصنف صحیح البہاری وغیرہ

(۶) برہان الملّۃ حضرت مولانا عبدالباقی محمد برہان الحق جبل پوری مفتیِ اعظم مدھیہ پردیش
(۷) محدّثِ جلیل حضرت مولانا سیّد دیدار علی محدث الوری
(۸) پیرِ طریقت مولانا سیّد احمد اشرف بن مولانا سیّد شاہ علی حسین اعلیٰ حضرت اشرفی کچھوچھوی
(۹) مفتیِ اعظم پاکستان حضرت مولانا ابوالبرکات سیّد احمد قادری، لاہور
(۱۰) حضرت مولانا سیّد سلیمان اشرف بہاری صدر شعبۂ دینیات مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

جب کہ تیس سے اوپر خلفا حرمین شریفین مکّہ و مدینہ اور عالمِ عرب میں تھے، اور خود دونوں صاحب زادگان کو بھی امام احمد رضا سے خلافت و اجازت تھی۔

''خلفائے اعلیٰ حضرت'' کے نام سے جناب محمد صادق قصوری صاحب نے ایک کتاب میں امام احمد رضا کے خلفا کا تعارف پیش کر دیا ہے۔ جسے ادارۂ تحقیقاتِ امام احمد رضا کراچی نے شائع کیا ہے۔

چودہ سال کی عمر سے لے کر آخری وقت تک امام احمد رضا نے جو بے مثال دینی خدمات انجام دی ہیں ہندستان کی تاریخ اس کی مثال مشکل سے پیش کر سکے گی۔ اور یہ اللہ کا فضل ہے وہ جسے چاہے عطا فرمائے۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قدس سرہٗ العزیز کی حیات کا یہ بالکل مختصر اور اجمالی خاکہ ہے۔ تفصیل کے لیے مندرجہ ذیل کتابوں کا مطالعہ مفید ہوگا۔

(۱) حیاتِ اعلیٰ حضرت از ملک العلما مولانا ظفر الدین بہاری
(۲) سوانح اعلیٰ حضرت از مولانا بدرالدین احمد رضوی گورکھپوری
(۳) حیاتِ مولانا احمد رضا خان از پروفیسر محمد مسعود احمد پی ایچ ڈی
(۴) گناہِ بے گناہی از پروفیسر محمد مسعود احمد پی ایچ ڈی
(۵) محدّث بریلوی از پروفیسر محمد مسعود احمد پی ایچ ڈی
(۶) امامِ اہلِ سُنّت از پروفیسر محمد مسعود احمد پی ایچ ڈی
(۷) امام احمد رضا اور عالمی جامعات از پروفیسر محمد مسعود احمد پی ایچ ڈی
(۸) امام احمد رضا اربابِ علم و دانش کی نظر میں از مولانا یٰسین اختر مصباحی
(۹) امام احمد رضا اور ردِّ بدعات و منکرات از مولانا یٰسین اختر مصباحی
(۱۰) فاضل بریلوی اور اُمورِ بدعت از پروفیسر سیّد محمد فاروق القادری
(۱۱) امام احمد رضا اور تصوف از مولانا محمد احمد مصباحی
(۱۲) امام احمد رضا کی فقہی بصیرت از مولانا محمد احمد مصباحی

(۱۳) کلامِ رضا از نظیر حسین لدھیانوی

(۱۴) محاسنِ کنزالایمان از شیر محمد خان اعوان

(۱۵) توضیح البیان از مولانا غلام رسول سعیدی

(۱۶) خلفائے اعلیٰ حضرت از محمد صادق قصوری

(۱۷) امامِ شعر و ادب از مولانا وارث جمال قادری مصباحی

امام احمد رضا کی دیگر نعتوں کی طرح اُن کا سلام بھی جذبوں کی فراوانی، الفاظ کی روانی اور فکر و خیال کی رعنائی قدم قدم پر جھلکتی اور محسوس ہوتی نظر آتی ہے۔ اور سب سے بڑی چیز آپ کا وہ عشقِ رسول ہے جس کی تپش سے آپ عمر بھر سرگرم عمل رہے اور جس نے آپ کو شہرت و مقبولیت کے اس بلند مقام پر پہنچا دیا جہاں تک رسائی شاید و باید ہوا کرتی ہے۔ آپ کی تمام تر نعتیہ شاعری، آپ کے عشقِ رسول کی دین ہے، جو محافل کو گرما رہی ہے' دلوں کو بالیدگی عطا کر رہی ہے اور ایمانی جذبات کو مہمیز کرتی نظر آرہی ہے۔ خالص عشقِ رسول کی بنیاد پر کہا ہوا یہ جاں نواز اور ایمان افروز سلام کتنا مقبول ہوا، اس کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ ایک سو بہتر (۱۷۲) اشعار کے اس ''سلام'' پر متعدد اہلِ علم و ادب نے تضمینیں قلم بند فرمائی ہیں۔ مکمل تضمین کہنے والوں کے اسما جو اَب تک معلوم ہو سکے یہ ہیں:

(۱) بہارِ عقیدت تضمین بر لاکھوں سلام از مولانا اختر الحامدی علیہ الرحمہ (مطبوعہ)

(۲) تضمین بر لاکھوں سلام از سید محفوظ علی صابر القادری مشمولہ ارمغانِ حق

(۳) تضمین بر لاکھوں سلام از طیش صدیقی کان پور

(۴) تضمین بر لاکھوں سلام از عبدالغنی سالک

(۵) ظہورِ قدسی از مولانا عبدالجبار خاں رہبر اعظمی

(۶) تضمین بر سلامِ رضا از محمد عثمان اوجؔ اعظمی چریا کوٹی

(۷) خوانِ رحمت تضمین بر سلامِ رضا از الحاج بشیر حسین ناظم، مرکزی مجلسِ رضا، لاہور

(۸) نوازشاتِ رحمت از ضیاء القادری سنبھلی

(۹) تضمین بر لاکھوں سلام (۱۵۱ اشعار پر) بنام جانِ رحمت از سید ہلال جعفری

(۱۰) تضمین بر لاکھوں سلام (۴۲ اشعار پر) بنام تضمین مبین از عزیز حاصل پوری

(۱۱) تضمین بر لاکھوں سلام از جانشینِ حضور مفتی اعظم حضرت علامہ اختر رضا خان ازہری بریلی

(۱۲) تضمین بر لاکھوں سلام از مفکرِ ملت مولانا بدرالقادری مصباحی (ہالینڈ)

(۱۳) تضمین بر لاکھوں سلام از مولانا محمد اسلم بستوی بلرام پور، گونڈہ

(۱۴) تضمین بر لاکھوں سلام از مولانا شمس الحق شمس بریلوی، کراچی
(۱۵) تضمین بر لاکھوں سلام از صوفی محبوب احمد رہبر چشتی کشمیری
(۱۶) تضمین بر لاکھوں سلام از حبیب احمد محسن مظہری
(۱۷) تضمین بر لاکھوں سلام از عبدالسلام شفیق صاحب

مقامِ سلام بہ بارگاہ مصطفےٰ علیہ الصلاۃ والسلام

نماز جو اہم العبادات ہے، اس وقت تک مکمل نہیں ہوتی جب تک کہ سرکارِ ختمی مرتبت حضور تاج دارِ رسالت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر دُرود وسلام کا نذرانہ نہ پیش کرلیا جائے۔

یوں ہی کوئی محفلِ ذکر اس وقت تک کامل و باعثِ قبولیت نہیں ہوتی جب تک کہ محبوبِ خدا سرکار مصطفےٰ ﷺ پر صلاۃ وسلام کی ڈالی نہ نچھاور کرلی جائے۔

کوئی دعا اس وقت تک قبولیت کا شرف نہیں پاتی جب تک کہ آقائے مدینہ کی بارگاہ میں دُرود وسلام نہ بھیج لیا جائے۔ جیسا کہ حدیث میں آیا، فضالہ بن عبید کہتے ہیں کہ ہم لوگ بیٹھے تھے اور رسولِ پاک ﷺ بھی تشریف فرما تھے کہ ایک آدمی آیا، نماز پڑھی پھر کہا، اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ وَارْحَمْنِیْ (اے اللہ! میرے مغفرت فرما اور مجھ پر رحم کر) تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اے نمازی! تو نے جلدی کردی۔ جب تو نماز پڑھے پھر بیٹھے تو اللہ کی حمد بجالا، جیسا کہ اس کے شایانِ شان ہے اور اس کے بعد مجھ پر دُرود پڑھ، پھر اللہ سے دعا مانگ۔ پھر اس کے بعد ایک اور آدمی آیا۔ اس نے نماز پڑھی اور خدا کی حمد کی اور نبی پاک ﷺ پر دُرود پڑھا تو اُس سے حضور نے فرمایا، اے نمازی! دعا مانگ قبول ہوگی۔
(ترمذی، ابوداؤد، نسائی، مشکوٰۃ ص ۸۶ باب الصلوٰۃ علی النبی)

دوسری روایت حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ہے، وہ فرماتے ہیں: دعا زمین اور آسمان کے درمیان موقوف رہتی ہے۔ اس میں سے کچھ بھی اوپر نہیں جاتی (یعنی قبول نہیں ہوتی) یہاں تک کہ تو اپنے نبی کریم ﷺ پر دُرود بھیجے۔ (ترمذی، مشکوٰۃ ص ۸۷)

اسی طرح کوئی مجموعۂ نعت اس وقت تک مکمل نہیں سمجھا جاتا جب تک کہ درود وسلام کے چند اشعار اس میں نہ شامل ہوں۔

مجددِ اسلام امام احمد رضا قدس سرہٗ تو محض شاعر نہ تھے، بلکہ سچے عاشقِ رسول تھے۔ آپ نے صرف یہی نہیں کہ اپنے نعتیہ اشعار میں جابجا دُرود وسلام کا ہدیہ پیش کیا ہے، بلکہ دُرود وسلام پر مستقل اور علیحدہ علیحدہ دو قصیدے بھی کہے ہیں۔ درود شریف پر قصیدے کے اشعار ۵۹ ہیں، جن میں سات مطلع ہیں۔ ہر شعر کا پہلا مصرع ذوقافیتین ہے، یعنی ہر مصرعے میں دو قافیے ہیں۔ اور ہر قافیے میں

حروفِ تہجی کی ترتیب کا بھی التزام ہے۔ البتہ کسی حرف کے دو شعر ہیں، کسی کے تین، کسی کے اس سے بھی زیادہ۔ اس صنف نے اس قصیدے کو دو آتشہ کر دیا ہے۔ جو روانی، سلاست اور ندرت اس قصیدے میں ہے، اس کی مثال پوری اردو دنیا پیش کرنے سے قاصر ہے۔

اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

کعبے کے بدرالدجیٰ تم پر کروروں دُرود ۔۔۔ طیبہ کے شمس الضحیٰ تم پہ کروروں دُرود

شافعِ روزِ جزا تم پہ کروروں دُرود ۔۔۔ دافعِ جملہ بلا تم پہ کروروں دُرود

اور کوئی غیب کیا تم سے نہاں ہو بھلا ۔۔۔ جب نہ خدا ہی چھپا تم پہ کروروں دُرود

دل کرو ٹھنڈا مِرا وہ کفِ پا چاند سا ۔۔۔ سینے پہ رکھ دو ذرا تم پہ کروروں دُرود

ذات ہوئی انتخاب وصف ہوئے لاجواب ۔۔۔ نام ہوا مصطفیٰ تم پہ کروروں دُرود

وہ شبِ معراج راج وہ صفِ محشر کا تاج ۔۔۔ کوئی بھی ایسا ہوا تم پہ کروروں دُرود

ہم نے خطا میں نہ کی تم نے عطا میں نہ کی ۔۔۔ کوئی کمی سَرورا تم پہ کروروں دُرود

کام وہ لے لیجیے تم کو جو راضی کرے
ٹھیک ہو نامِ رضا تم پہ کروروں دُرود

اِس میں شبہ نہیں کہ خدائے تعالیٰ نے قرآن حکیم میں دُرود و سلام کا صرف حکم ہی نہیں دیا بلکہ پہلے خود اور اپنے فرشتوں کے دُرود پڑھتے رہنے کا بھی ذکر فرمایا، اور دُرود کے ساتھ جب سلام کا حکم دیا ہے تو تسلیما سے مؤکد بھی فرمایا، جس سے سلام کی اہمیت پر مزید روشنی پڑتی ہے۔ ہوسکتا ہے اس نکتے کے پیشِ نظر امام احمد رضا قدس سرہٗ نے دُرود و سلام دونوں پر قصیدے لکھے، لیکن سلام کے اشعار کی تعداد زیادہ رکھی۔ اس سلام میں نعتِ رسول بھی ہے، سراپاے رسول بھی اور صحابہ کرام، اہلِ بیت عظام، ائمہ دین، اولیاے اُمّت بالخصوص سرکارِ غوث اعظم رضی اللہ عنہم پر بھی سلام پیش کیا ہے۔ پھر اُن کے ساتھ ساری اُمّت کو بھی سلام میں شریک فرمایا ہے۔ اور آخر میں یہ آرزو ظاہر کی ہے کہ میدانِ محشر میں جب ملائکہ سرکارِ اقدس میں سلام پیش کریں تو کاش مجھ سے بھی فرشتے فرمائش کریں کہ اے رضا تم بھی اپنا سلامِ محبت ''مصطفیٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام'' پیش کرو۔ اور مَیں عقیدت و محبت میں ڈوب کر آقا کی بارگاہ میں اپنا یہی سلامِ محبت عرض کروں۔ ملاحظہ ہو یہ قطعہ بند، کیا پیاری تمنا ہے اور کیسی عشق آگیں آرزو ہے۔

کاش محشر میں جب اُن کی آمد ہو اور ۔۔۔ بھیجیں سب اُن کی شوکت پہ لاکھوں سلام

مجھ سے خدمت کے قدسی کہیں ہاں رضا ۔۔۔ مصطفیٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام

ایک اعتراض کا جواب: بعض کم فہم اور تعصب پیشہ لوگ یہ لغو اعتراض کرتے ہیں کہ دُرود ایک بار پڑھتے ہیں اور بولتے ہیں کروڑوں دُرود، اور سلام ایک بار پڑھتے ہیں اور کہتے ہیں لاکھوں سلام۔ اگرچہ یہ اعتراض کچھ ایسا نہیں کہ اس کا جواب دیا جائے لیکن ہوسکتا ہے بعض کم پڑھے لکھے لوگ معترضین کے دامِ تزویر میں آ جائیں' اس لیے اس کا مختصر جواب بھی حاضر ہے۔

حدیث پاک میں آیا۔ ایک شخص نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے کہا: اِنِّی طَلَّقْتُ امْرَأتِی مِاۃَ تطلیقۃٍ فَمَاذَا تریٰ عَلَیَّ فَقَالَ ابْنُ عباسٍ طُلِّقَتْ مِنْکَ بثلاثٍ وَسَبْعٌ وَّ تِسْعُوْنَ اتَّخَذْتَ بِھَا آیاتِ اللّٰہِ ھُزُوًا۔ رواہ فی الموطا۔

مَیں نے اپنی بیوی کو سو طلاق دی ہے تو آپ مجھ پر کیا حکم لگاتے ہیں؟ تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا، تین سے تیری بیوی مطلّقہ ہوگئی اور ستانوے سے تو نے اللہ کی آیتوں کے ساتھ مذاق کیا۔ (مشکوٰۃ ص۲۸۴۔ باب المطلّقہ ثلاثاً)

اور معترض خود بتائے کہ کسی نے کہا "مَیں نے اپنی بیوی کو تین طلاق دیا" تو کیا اس پر ایک ہی پڑے گی یا تین طلاق واقع ہوگی؟ اگر معترض غیر مقلّد نہیں تو ضرور کہے گا کہ تین ہی واقع ہوئی۔ اگرچہ ایک بار ہی میں تین کا لفظ بولا، اور غیر مقلّدین کا جواب تین طلاق نامی کتابوں میں ملاحظہ کریں۔

دوسرا جواب ملاحظہ ہو۔ دلائل الخیرات شریف درودوں کا مجموعہ ہے جو معترض کے یہاں بھی مقبول و متداول ہے، اور پوری اُمّت کا اس پر عمل ہے یعنی پوری دنیا کے بہت سے مسلمان اس بابرکت کتاب کو وِرد میں رکھتے ہیں جو علامہ محمد بن سلیمان جزولی علیہ الرحمۃ والرضوان کی جمع فرمودہ ہے، جن کا وصال ۱۶ ربیع الاوّل ۸۷۰ھ میں ہوا۔ وصال سے ستتر (۷۷) سال بعد آپ کا جسدِ پاک سوس سے مراکش منتقل کیا گیا۔ جب آپ کو قبر سے نکالا گیا تو آپ کا جسم بالکل تر و تازہ تھا جیسے آج ہی ان کو دفن کیا گیا ہے۔ یہ بات آپ کے تذکرے کی تمام متداول کتابوں میں لکھی ہوئی اور زبانی بھی مشہور ہے۔ اس کتاب میں درود شریف کے بہت سے صیغے ایسے ہیں کہ ایک بار میں بے شمار یا کثیر تعداد میں درود شریف کا ذکر ہے۔ چند صیغے ملاحظہ کریں:

۱۔ صلی اللّٰہ علیٰ سیّدنا محمد عدد خلقہ = اللہ تعالیٰ درود نازل فرمائے ہمارے سردار محمد ﷺ پر، مخلوق کے عدد کے برابر

۲۔ صلی اللّٰہ علیٰ سیّدنا محمد و مدادِ کلمات = اور اپنے کلمات کی سیاہی کے برابر،

۳۔ صلی اللّٰہ علیٰ سیّدنا محمد و کلّما ذکرہ الذاکرون = اور جب جب ذکر کرنے والے ذکر کریں

۴۔ صلی اللّٰہ علیٰ سیّدنا محمد و غفل عن ذکرہ الغافلون = اور جتنی بار غفلت کریں

غفلت کرنے والے

۵۔ صلی اللّٰہ علیٰ سیّدنا محمد عَدَدَ ما اَمْطَرَتِ السَّمَاءُ = اور ان قطروں کی مقدار کے برابر جو آسمان نے برسائے

۶۔ صلی اللّٰہ علیٰ سیّدنا محمد مُنْذُ بَنَیْتَهَا = جب سے تونے اسے بنایا

۷۔ صلی اللّٰہ علیٰ سیّدنا محمد عَدَدَ النُّجُوْم = ستاروں کی تعداد کے برابر، وغیرہ

پوری کتاب میں اس طرح کے جملے بار بار آتے ہیں۔ اگر یہ طریقۂ درود غلط ہوتا تو ضرور علمائے اُمّت کی طرف سے اس پر انکار ہوتا اور ہرگز یہ مجموعۂ درود عالمِ اسلام میں مقبول نہ ہوتا۔ لہٰذا اس طرح کے اعتراضات کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ یہ محض اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ سے عداوت کی پیداوار ہے جس کی طرف دھیان دینے کی ضرورت نہیں۔

خصوصیاتِ سلامِ رضا:

امام احمد رضا محدّث بریلوی قدس سرہٗ کے سلام کی خصوصیات پر توجہ دی جائے تو بہت سی خصوصیات سامنے آتی ہیں، ان میں چند یہ ہیں:

۱) یہ اردو سلاموں بلاشبہ طویل ترین سلام ہے، جس کے ایک سو اکہتر اشعار ہیں۔

۲) اس میں سرکارِ اقدس ﷺ کی تعریف و توصیف کے ساتھ آپ کے سراپائے باکمال کا بھی تذکرہ ہے۔ ساتھ ہی ایک ایک ادائے جمیل کو بھی لفظوں کا جامہ پہنایا گیا ہے۔

۳) سرکارِ اقدس ﷺ کی ذات کے علاوہ آل و احباب و اکابر ملّت اور جملہ اہلِ ایمان پر بھی سلام ہے۔

۴) اس کے اشعار میں قرآن پاک و احادیث اور اقوالِ بزرگانِ دین کے انوار کو سمو دیا گیا ہے۔

۵) سیرتِ رسول اور دیگر بہت سے تاریخی واقعات کا بھی بیان ہے۔

۶) زبان نہایت اعلیٰ استعمال کی گئی ہے جسے اردوئے معلّا کا درجہ دیا جاسکتا ہے۔

۷) اردو کے بہت سے محاورات کا برمحل استعمال کیا گیا ہے۔

۸) یہ نہایت مقبول اور پوری دنیا میں کثرت سے پڑھا جانے والا سلام ہے۔

۹) اس میں سرکارِ انور و اطہر ﷺ کا جمال و کمال کے ساتھ آپ کے معجزات کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔

۱۰) ہندی، انگریزی، گجراتی اور عربی میں بھی اس کا ترجمہ کیا گیا ہے اور عربی ترجمہ نظم کا نظم میں بھی کیا گیا ہے۔

۱۱) اس سلام کو پڑھنے اور سننے سے محبت و عشقِ رسول میں اضافہ اور عقیدے میں پختگی آتی ہے۔

۱۴) یوں تو یہ سلام ہے لیکن جگہ جگہ اس میں درود کے صیغے بھی مذکور ہیں اور بڑے حسین پیرائے میں۔

یہ چند خصوصیات جو اوّل نظر میں آئیں، ذکر کر دیں۔ باقی اہلِ علم و فکر غور کریں گے تو ایسی بے شمار خصوصیات اور کیفیات اس سلامِ منظوم میں پوشیدہ پائیں گے۔ اور کثرت سے پڑھے جانے کی مناسبت سے اسے اردو کا قصیدہ بردہ بھی کہا جاسکتا ہے۔ کیوں کہ اس وقت اہلِ سُنّت کی اکثر محافل میں یہ بڑے اہتمام اور شوق سے پڑھا جاتا ہے۔ اس سلام کا ایک فیضان یہ بھی ہے کہ اس کی زمین اور وزن پر یا اسی ردیف میں ''لاکھوں سلام'' پر اردو کے بہت سے شعرا نے طبع آزمائی کی ہے اور اس امامِ عشق و محبت کی آواز میں آواز ملانے کی کوشش کی ہے۔

سلامِ رضا کا عربی ترجمہ جو ''المنظومۃ السلامیہ'' کے نام سے شائع ہوچکا ہے اس کا پہلا ایڈیشن کراچی سے چھپا اور دوسرا پور بندر، گجرات (انڈیا) سے۔ اسے سب سے پہلے علامہ حازم محمد احمد محفوظ نے اردو سے عربی میں منتقل کیا۔ پھر اس کو علامہ ڈاکٹر حسین مجیب مصری پروفیسر جامعہ عین الشمس قاہرہ، مصر نے عربی منظوم کیا۔ جس کی وجہ سے یہ سلام عالمِ عرب میں بھی عام ہوگیا اور اہلِ علم اسے پڑھ کر امام احمد رضا کی علمی عظمتوں اور عشقِ رسول میں ان کی رفعتوں کے قائل ہو رہے ہیں۔ اور ساتھ ہی اس کے ذریعے امام احمد رضا پر لگائے گئے جھوٹے الزامات و اتہامات کا بھی قلع قمع ہو رہا ہے، جو ایک خوش گوار امر ہے۔ مرکز برکاتِ رضا، پور بندر، گجرات کا وہ نسخہ جسے مولانا عبدالستار ہمدانی صاحب نے شائع کیا ہے، میرے پیشِ نظر ہے۔ اس کے کُل صفحات مع تقدیم و سلامِ رضا ۱۵۷ ہیں، جو بڑے سائز پر نہایت اہتمام کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔ اس کے آخر میں علامہ شیخ حسین مجیب مصری کی عربی میں ایک منقبت بھی درج ہے جس میں انھوں نے اعلیٰ حضرت امام احمد رضا کی شان میں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ اس کا آخری شعر ہے:

فَیمضِی زَمَانٌ وَ لسنَا نَریٰ ☆ نَظِیْرکَ اَوْ مُشْبِھاً عِندنَا

یعنی زمانہ گزرتا جارہا ہے لیکن ہم آپ جیسا صاحب کمال نہیں دیکھتے

یہ سلامِ رضا کی مقبولیت ہے جو روز افزوں ہے اور بارگاہِ رسالت مآب ﷺ میں اس کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ حج و عمرہ کی غرض سے جو اہلِ ایمان حرمین شریفین حاضری دیتے ہیں اور روضۂ رسولِ پاک کی زیارت کرتے ہیں تو اگر ان کو ''سلامِ رضا'' کے اشعار یاد ہیں تو ضرور اپنے آقا کی بارگاہ میں اس کے چند اشعار پیش کرتے ہیں۔ مجھ سے متعدد زائرین نے اس کو بیان کیا۔ ایسا لگتا ہے کہ اس بارگاہِ قدس میں پہنچنے کے بعد زائر و عاشق بے اختیار ہوجاتا ہے اور امامِ عشق و محبت علیہ الرحمۃ والرضوان کے اشعارِ سلام گنگنانے لگتا ہے۔ بلند آواز سے نہ سہی کہ وہاں کے ادب کا بھی تقاضا ہے اور

نجدی درندوں کا بھی خوف ہے کہ کہیں ذرا آواز بلند ہوئی اور انھوں نے اپنا ڈنڈا چلایا۔ واضح رہے کہ آہستہ آواز میں درود وسلام پڑھنا بلاشبہ سرکار کی بارگاہ میں بھی روا ہے۔ البتہ بہت زور سے چلاّ کر منع ہے۔ جیسا کہ عام محافل میں خوب زور شور سے پڑھنے کا رواج عام ہو چکا ہے۔

آدابِ سلام:

عام حالات اور محافل و مساجد میں درود و سلام کے آداب کا ملحوظ رکھنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ بہت سے لوگ حدِ اعتدال سے تجاوز کر جاتے ہیں۔ اس لیے آدابِ سلام کے تعلق سے یہاں محقق اہلِ سُنّت حضرت علامہ عبدالحکیم شرف قادری نقش بندی علیہ الرحمہ سابق شیخ الحدیث جامعہ نظامیہ رضویہ لاہور کا ایک اقتباس مَیں ہدیۂ ناظرین کر رہا ہوں، ملاحظہ ہو:

''۱۔ انتہائی خلوص و محبت اور ادب و احترام سے باوضو سلام عرض کیا جائے۔

۲۔ عید میلاد النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے جلوس میں بھی یہی اہتمام ہو۔

۳۔ سلام عرض کرتے وقت آواز حدِ اعتدال سے زیادہ بلند نہ ہو۔ حبیب خدا ﷺ، خداداد قوت سے خود بھی اہلِ محبت کا درود و سلام سنتے ہیں اور فرشتے بھی ہم غلاموں کا ہدیۂ درود و سلام بارگاہِ ناز میں پیش کرتے ہیں۔ اس لیے شعوری طور پر کوشش کی جائے کہ آواز چلاّنے کی حد تک بلند نہ ہو۔ بعض لوگ سرے سے بلند آواز سے صلاۃ و سلام پیش کرنے کو ہی پسند نہیں کرتے اور بطور دلیل آیت مبارکہ، لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ پیش کرتے ہیں، حالانکہ اس آیت کا معنی یہ ہے کہ ''تم اپنی آواز نبی کی آواز سے بلند نہ کرو'' ظاہر ہے کہ یہ کلمہ ان حضرات کے لیے ہے جن سے آپ گفتگو فرما رہے ہوں۔ یہ نعمتِ عظیمہ ہم خفتہ بختوں کو کہا میسّر؟

۴۔ تلفظ صحیح ہونا چاہیے اور بہتر ہوگا کہ نعت خواں حضرات کسی صاحب علم کو سُنا کر اطمینان کر لیا کریں۔

۵۔ اشعار کی ترتیب ملحوظ رکھی جائے۔ پہلے بارگاہِ رسالت میں سلام عرض کیا جائے، پھر اہلِ بیت، صحابہ اور اولیا کی بارگاہ میں عرض کیا جائے۔ ایسا نہ ہو کہ اوّل آخر اور درمیان جہاں سے کوئی شعر یاد آیا پڑھ دیا۔

۶۔ معراج شریف، میلاد پاک، اہلِ بیت اور صحابہ کے ایّام ہوں یا گیارھویں شریف کی محفل تو دیگر اشعار کے علاوہ موقع کی مناسبت سے اشعار پڑھے جائیں۔

۷۔ عربی لفظ صلوٰۃ درود شریف کے معنی میں آتا ہے۔ سلام پڑھتے وقت ایسے اشعار بھی پڑھے جائیں جن میں درود کا ذکر ہے تاکہ صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا کی تعمیل میں درود و سلام دونوں پیش کرنے کی سعادت حاصل ہو جائے۔ مثلاً

عرش کی زیب و زینت پہ عرشی درود = فرش کی طیب و نزہت پہ لاکھوں سلام

۸۔ حدیث شریف میں امام کے لیے ہدایت ہے کہ بیمار اور صاحب حاجت کا خیال رکھا جائے اور مقدار مسنون سے زیادہ طویل قرأت نہ کی جائے۔ بہتر ہے کہ یہی ہدایت سلام میں بھی ملحوظ رہے اور (اجتماعی طور سے) زیادہ اشعار نہ پڑھے جائیں تاکہ زیادہ سے زیادہ اہلِ محبت، ذوق و شوق سے شرکت کرسکیں۔ نیز گرہ لگا کر دوسرے اشعار پڑھنے سے بھی گریز کیا جائے (کہ اس میں اکثر غلطی کا امکان ہوتا ہے)۔

۹۔ اکثر مسجدوں کے اجلاس ایک گھنٹے سے زیادہ طویل نہیں ہوتے، تلاوتِ کلام پاک کے بعد ایک نعت اور اس کے بعد ایک تقریر (بس ہے) ہمارے جلسوں میں اس بات کا بھی اہتمام ہونا چاہیے تاکہ سامعین اکتاہٹ محسوس نہ کریں۔"

(نغماتِ رضا، تقدیم سلامِ رضا، ص ٦ تا ٨، فاروقیہ بکڈپو، دہلی)

سلام رضا پر اہل علم و دانش کے تاثرات

امامِ عشق و محبت، تاج دارِ فکر وفن اعلیٰ حضرت محدّث بریلوی قدس سرہٗ کی نعتیہ شاعری پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ یہاں آپ کی شاعری اور عشقِ رسول کے عظیم مظہر "مصطفیٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام" کے تعلق سے اہلِ علم کے تاثرات پیش کیے جارہے ہیں جو اس کا بیّن ثبوت ہیں کہ "سلامِ رضا" واقعی مقبولِ عام و خاص سلام ہے اور جب مقبولِ خاص و عام ہے تو یقیناً خدا و رسول جل و علا ﷺ کی بارگاہ میں بھی مقبول ہے۔ چند وہ تاثرات نذرِ ناظرین ہیں جو بر وقت مطالعے میں آئے ورنہ تلاش و تفحص کے بعد مزید تاثرات کا پتہ لگایا جاسکتا ہے۔

علامہ عبدالحکیم شرف قادری: عالمِ اسلام کی جلیل القدر شخصیت حضرت علامہ عبدالحکیم شرف قادری نقش بندی علیہ الرحمہ سابق شیخ الحدیث جامعہ نظامیہ رضویہ، لاہور سلامِ رضا کی مقبولیت کا ذکر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"ماضی قریب میں کئی دفعہ ایسا ہوا کہ ایک کلام یک دم آسمانِ شہرت پر پہنچ گیا لیکن رفتہ رفتہ اس کی مقبولیت ماند پڑنے لگی۔ جب کہ امام احمد رضا بریلوی کے کلام کی مقبولیت روز افزوں ترقی پر ہے۔ اسے سوائے اس کے کیا کہا جائے کہ یہ سلام وکلام خدا و رسول کی بارگاہ میں مقبول ہوچکا ہے جل وعلا ﷺ۔

سلامِ رضا میں پیکرِ حُسن و جمال، محبوبِ ربِ ذوالجلال ﷺ کے اوصافِ جمیلہ، شمائلِ حمیدہ، جود و عطا اور عظمت جلالت کو اس حسین پیرایے میں ذکر کیا گیا ہے کہ ہر مصرع ایمان کو تازگی بخشتا اور روح کو معطر کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اس کے بعد اہلِ بیت کرام اور صحابہ عظام کی بارگاہ میں عقیدت و محبت میں ڈوب کر سلام عرض کیا گیا ہے۔ پھر ائمۂ مجتہدین اور اولیاے کاملین خصوصاً سیدنا غوث اعظم

کے دربار میں سلام نیاز کی ڈالیاں پیش کی ہیں اور آخر میں بارگاہِ خداوندی میں دعا کی ہے کہ بارالہا، جس طرح ہم دنیا میں تیرے حبیب اکرم صلے اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی شوکت کے ڈنکے بجاتے ہیں، اسی طرح روزِ قیامت بھی ہمیں نعت اور سلام کے نغمے پیش کرنے کی سعادت عطا فرما۔ آمین"

(نغماتِ رضا، تقدیم سلامِ رضا، ص ۶، فاروقیہ بک ڈپو، دہلی)

علامہ ارشد القادری: رئیس القلم حضرت علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ سلامِ رضا اور اس کی مقبولیت کے بارے میں اس طرح اپنے قلم کو ہر رقم کو جنبش دیتے ہیں:

"علم کو بعض صوفیہ کرام نے حجابِ اکبر کہا ہے جب کہ عشق کے بارے میں نظریہ ہے کہ وہ بے حجاب جلووں کا تماشائی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دونوں مشکل ہی سے کسی ایک محل میں جمع ہوتے ہیں۔ لیکن اپنے عہد میں امام احمد رضا کی تنہا مثال ہے کہ وہ بیک وقت علم اور عشق دونوں کا سنگم تھے۔ اُن کے علم کی جلالتِ شان دیکھنی ہو تو فتاویٰ رضویہ کی ضخیم مجلدات کا مطالعہ کیجیے اور اُن کے جذبۂ عشق کی تپش کا اندازہ لگانا ہو تو "حدائق بخشش" پڑھیے اور سر دُھنیے۔

"مصطفیٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام" امامِ عشق و محبت کا وہ مہکتا ہوا نغمۂ شوق ہے جو آج پوری دنیا میں گونج رہا ہے۔ مدرسوں، محفلوں، کانفرنسوں، خانقاہوں اور درگاہوں میں جدھر کان لگائیے مختلف لَے میں یہ نغمہ، عشق و ایمان کی پرورش کرتا ہوا ملتا ہے۔...... اردو زبان میں سلام لکھنے والوں کی کمی نہیں ہے۔ شعر و ادب کی تاریخ میں ایک سے ایک سخن ور ہمیں ملتے ہیں جنھوں نے بارگاہِ رسالت میں منظوم سلام کا نذرانۂ عقیدت پیش کیا ہے۔ الفاظ کی خوب صورت بندشوں، دل آویز ترکیبوں اور مضامین کی ندرت کے اعتبار سے کوئی سلام کسی سے کم نہیں ہے۔...... لیکن بے مثال شانِ دل رُبائی کے ساتھ سارے جہان میں دلوں کے آفاق پر چھا جانے کا شرف سوائے سلامِ رضا کے اب تک کسی کو حاصل نہیں ہوا۔ نصف صدی گزر جانے کے بھی کلیوں کے تبسم میں کوئی فرق نہیں آیا۔ آج بھی گلشنِ عقیدت کے پھولوں میں وہی تازگی ہے جب شاخ سے انھیں توڑا گیا تھا۔ کہنے دیجیے کہ یہ صرف ملکِ سخن کی شاہی نہیں ہے بلکہ عشق کا خونِ جگر بھی اس رنگ میں شامل ہے۔ صرف اپنے عہد کے ایک ماہرِ فن سخن ور کی بات ہوتی تو دیوان کے اوراق میں الماریوں کی زینت بن کر رہ جاتی۔ لیکن اس سوال کا کیا جواب ہے کہ آج سارے جہان میں "مصطفےٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام" کے ہزاروں حفاظ کہاں سے پیدا ہوگئے اور کاغذ پر لکھا ہوا "سلام" عشق و عقیدت کے تلاطم کے ساتھ لاکھوں کروڑوں زبانوں پر کیسے چڑھ گیا۔ تھک ہار کر ماننا پڑے گا کہ اہلِ ایمان کی محفلوں سے لے کر عرصۂ محشر کے لواء الحمد تک اس سلام خوش انجام کی پذیرائی بلاوجہ نہیں ہے۔ یقیناً یہ سکّہ بریلی کا نہیں مدینے کا ہے جو اہلِ دل کی

دنیا میں برسوں سے چل رہا ہے اور جب تک سینوں میں عشقِ رسول کی چنگاری دبی رہے گی، چلتا رہے گا۔ جس سلامِ شوق کو بارگاہِ رسالت سے مقبولیت کی سند مل گئی ہو اب اس کی قدر و قیمت کون گھٹا سکتا ہے۔

یہ بات بھی اس سلام کے عالم گیر مقبولیت ہی کی ہے کہ اس پر تضمین لکھنے والوں کی زرّیں فہرست میں دن بہ دن اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ تضمین لکھنے والے ایک مقبول سلام سے اپنے کلام کا تعلق جوڑ کر دراصل حریم قدس میں باریابی کا راستہ تلاش کر رہے ہیں۔ احمد رضا بننا تو ہر شخص کے بس کی بات نہیں لیکن رشتہ جوڑنا تو آسان ہے۔ اس لیے سوچنے والوں کا یہ رُخ بھی غلط نہیں ہے کہ کلام سے تعلق جوڑ کر ہم دراصل صاحب کلام سے راہ و رسم پیدا کر رہے ہیں۔ اس مفہوم کو ایک شاعر نے کتنی خوب صورتی سے ادا کیا ہے ؎

ہے ان کے عطرِ بوے گریباں سے مست گل   گل سے چمن، چمن سے صبا اور صبا سے ہم

(نوازشاتِ رحمت، (۱۴۱۳ھ) تضمین سلامِ رضا از شکیل احمد ضیاء القادری، ص ۳-۴، فاروقیہ بکڈپو، دہلی ۱۹۹۴ء)

پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعود احمد: ماہر رضویات صاحب طرز ادیب اور شیخ طریقت جناب پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعود احمد نقش بندی (ایم اے، پی ایچ ڈی) شاہزادۂ مفتی محمد مظہر اللہ نقش بندی مجدّدی، ''سلامِ رضا'' کی خصوصیات سے متعلق تحریر کرتے ہیں:

''فاضل بریلوی کا سلام تو پاک و ہند کے گوشے گوشے میں پڑھا جاتا ہے۔ جس کا مطلع ہے:

مصطفیٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام   شمعِ بزمِ ہدایت پہ لاکھوں سلام

بلکہ اب تو براعظم امریکہ، افریقہ، یورپ وغیرہ میں جہاں پاک و ہند کے لوگ بسے ہوئے ہیں، اس کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ نیو کاسل یونی ورسٹی کے پروفیسر غیاث الدین نے اس کا بڑا کام یاب انگریزی میں منظوم ترجمہ کیا ہے۔ جو برطانیہ سے ''اسلامک ٹائمز'' میں قسط وار شائع ہو چکا ہے۔

علامہ سید حسن میاں مارہروی (علیہ الرحمہ) نے لکھا ہے کہ محدّث بریلوی کے ایک ایک شعر پر ڈاکٹریٹ کیا جا سکتا ہے۔ بظاہر یہ مبالغہ معلوم ہوتا ہے مگر جب یہ حقیقت سامنے آئی کہ جامعہ اسلامیہ لاہور کے شیخ الجامعہ مفتی محمد خان قادری نے ''سلامِ رضا'' کی شرح میں ۵۵۰ صفحات کا ایک ضخیم مقالہ قلم بند فرمایا ہے تو یہ بات یقین سے بہت قریب ہوگئی۔''

(محدّث بریلوی، ص ۱۸۵، از ڈاکٹر محمد مسعود احمد، ادارۂ تحقیقاتِ امام احمد رضا، کراچی)

تقدیم ''خوانِ نعمت'' میں مزید ارشاد فرماتے ہیں:

امام احمد رضا نعت گوئی میں اپنی نظیر آپ تھے قصیدہ گوئی میں بھی اُن کا جواب نہ تھا۔ امام احمد رضا نے جناب رسالت مآب صلے اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نعت میں قصاید کہے یا علماے حق اور مشائخ

طریقت کی منقبت میں، ان کے اردو قصاید' قصیدۂ سلامیہ، قصیدۂ معراجیہ، قصیدۂ نوریہ وغیرہ جناب تاج دار دو عالم صلے اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نعت و ثنا میں شہرہ آفاق قصاید ہیں۔

امام احمد رضا کا قصیدہ سلامیہ اتنا مشہور و مقبول ہوا کہ آج دنیا کے گوشے گوشے میں جہاں اردو بولنے والے پہنچ چکے ہیں، یہ پڑھا جاتا ہے اور پاک و ہند کے گلی کوچے اس کی گونج سے گونج رہے ہیں۔ فقیر نے مدینہ منورہ کی محافلِ نعت میں یہ سلام سنا، مسجد نبوی شریف، مواجہ شریف میں سنا اور خود فقیر نے بھی یہی سلام پیش کیا۔ سبحان اللہ! یہ سلام کیف و سرور سے تو معمور ہے ہی مگر مدینہ منورہ میں اس کو سُن کر اور پڑھ کر جو کیف و سرور میسّر آیا وہ کس زبان سے بیان کروں...... اللہ اللہ ۔

کھنچی ہے سامنے تصویرِ یار کیا کہنا

قصیدہ کیا ہے؟ سیرتِ مصطفیٰ ہے صلے اللہ تعالیٰ علیہ وسلم۔ ایک ایک شعر آیات و احادیث کا امین ہے۔ اے کاش کوئی اشعار کے چہرے سے گھونگھٹ اُٹھائے۔

افغانستان کی عبوری حکومت کے چیف جسٹس محدّث جلیل علامہ نصر اللہ خاں صاحب مدظلہ العالی نے اس قصیدے سے متعلق بعض احادیث کی نشان دہی کی ہے۔

(تقدیم خوانِ رحمت تضمین بر سلامِ رضا، از بشیر حسین ناظم، ص ۲۶۵، آئینۂ رضویات، کراچی)

ڈاکٹر محمد مسعود احمد صاحب اور فرماتے ہیں:

''۱۹۹۱ء میں مدینہ منورہ حاضر ہوا۔ مواجہ شریف میں کچھ غلام ہاتھ باندھے امام احمد رضا کا سلام ''مصطفیٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام'' عرض کررہے تھے۔ خود راقم نے بھی امام احمد رضا کا درود ''کعبے کے بدرالدجیٰ تم پہ کروڑوں درود'' اور سلام ''مصطفیٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام'' پیش کیا۔ کیا عرض کروں کہ کیا لطف و سرور آیا، زبان وقلم دونوں عاجز ہیں۔ مدینہ منورہ میں تین محافلِ نعت میں شرکت کی سعادت حاصل ہوئی۔ ہر محفل میں امام احمد رضا کا سلام پڑھا گیا۔ اللہ اللہ کیا مقبولیت و محبوبیت ہے کہ دیارِ حبیب ﷺ کی فضائیں بھی امام احمد رضا کے سلام سے گونج رہی ہیں۔ تاج دارِ دو عالم صلے اللہ علیہ وسلم کے حضور بھی پڑھنے والے یہ سلام پڑھ رہے ہیں، آنسو بہا رہے ہیں، دل بچھا رہے ہیں۔ اللہ اللہ...... وہ تاج دارِ دو عالم صلے اللہ علیہ وسلم کے دربار میں کتنے مقبول ہیں کوئی ان سے محبت کرکے تو دیکھے۔''

(آئینہ رضویات، پروفیسر مسعود احمد، ص ۳۱۰۔۳۱۱، کراچی ۱۹۹۳ء)

نظیرؔ لدھیانوی: اس قصیدہ سلامیہ سے متعلق خوش فکر شاعر و ادیب اور اردو دنیا کے جانے مانے محقق جناب اصغر حسین خاں نظیرؔ لدھیانوی اپنے خیالات اس طرح قلم بند کرتے ہیں:

''ہر نعت گو شاعر جب تک ایک سلام نہ لکھ لے اپنے مجموعۂ نعت کو نامکمل سمجھتا ہے۔ معراج اور درود و سلام، نعت کے ضروری مضامین ہیں۔ ان کے بغیر شاعری نامکمل رہتی ہے۔ مولانا احمد رضا خاں نے جو سلام لکھا ہے وہ اردو اور فارسی کے نعتیہ ادب میں منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ یہ صرف سلام ہی نہیں، اس میں حضور کا سراپا بھی بیان کیا گیا ہے۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے ایک ایک عضوِ مبارک کی مدح و ستایش والہانہ انداز میں کی گئی ہے اور اکثر اشعار میں زبان اور فن کی خوبیاں موتیوں کی طرح بکھری ہوئی ہیں۔ اگر مولانا احمد رضا خاں قصیدۂ شادیٔ اسریٰ اور اس سلام کے سوا نعت میں اور کچھ نہ کہتے تب بھی نعتیہ ادب میں اُن کا پلّہ بھاری تھا۔''

(کلامِ رضا، از نظیر لدھیانوی، ص ۷۷، مطبوعہ المجمع الاسلامی، مبارک پور ۱۴۰۴ھ/۱۹۸۲ء)

پروفیسر سلیم چشتی: اردو کے مشہور محقق اور کلامِ اقبال کے شارح پروفیسر سلیم چشتی، امام احمد رضا کے سلام کی توصیف میں رقم طراز ہیں:

''مولانا احمد رضا خاں بریلوی نے سرکار ابدقرار زُبدۂ کائنات فخر موجودات حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی بارگاہ میں جو منظوم سلام پیش کیا ہے اسے یقیناً شرفِ قبولیت حاصل ہو گیا کیوں کہ ہند و پاک میں شاید ہی کوئی عاشقِ رسول ایسا ہو جس نے اس کے دو چار شعر حفظ نہ کر لیے ہوں۔''

(المیزان، امام احمد رضا نمبر بمبئی، ص ۵۶۲)

ڈاکٹر نسیم قریشی: ڈاکٹر نسیم قریشی، شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے پروفیسر رہ چکے ہیں۔ اردو کے مانے ہوئے ادیب و خطیب تھے، وہ کہتے ہیں:

''ہادیِ برحق مقتدائے انسانیت، شفیعِ محشر کا ذکرِ پاک، روحانی سرخوشی کی ایک جوئے حیات افزا تھی کہ بڑی بہہ رہی تھی۔ اسی عالمِ کیف و مستی میں عرضِ نیاز، سرشار و سپردگی، الفت و عقیدت کا ایک ترانۂ شوق تھا کہ بلند ہوا...... ع مصطفیٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام

طبیعت بے اختیار وجد کر اُٹھی، ذہن کے دریچے بہارِ ابد کی جاں فزا ہواؤں کے لیے کھل گئے۔ وجود کا ذرّہ ذرّہ سحابِ سرمدی کی سرشاریوں میں ڈوب گیا۔ کیا نغمہ، کیا نظم، کیا والہانہ سلام۔ لفظ و بیان کے پیچ و خم ہیں کہ نیاز مندی کی تہہ در تہہ کیفیتوں میں مہک اُٹھے ہیں۔ حسنِ معنی ہے کہ حسنِ عقیدت میں سمو کر زمزمۂ داؤدی کے پیکر میں ڈھل گیا ہے۔ سرورِ کائنات کے حضور شرفِ باریابی حاصل ہے، نوائے شوق نغمۂ والہانہ بن گئی ہے۔ ذوقِ فدائیت شباب پر ہے۔ شیفتگی و نیاز کیشی ہم آواز، ہم سرورِ مستانہ، ہم ارتعاشِ قلب مضطر ہو گئی ہیں۔ روحانی سرمستی کے عالم میں حضرت رضا خلد آشیانی کی زبانِ حقیقت ترجمان سے جو حرف نکلا ہے باغِ کامرانی کا سدا بہار پھول بن گیا ہے۔ نعت گوئی،

ادبیاتِ انسانی کا ایک بے انتہا، بیش قیمت ذخیرہ ہے، نازک خیال شاعروں اور چابک دست ماہرین فن نے سرمایۂ عقیدت کو وہ آب رنگ دیا ہے یہ ایں انداز، چمن طرزیِ فکر و بیاں کی ہے کہ طبیعت جھوم جھوم اُٹھتی ہے۔...... کتنی عظیم سعادت آئی ہے حضرت رضا کے حصے میں کہ وہ مقبولینِ بارگاہِ الٰہی اور نظر کردگان رسالت پناہی کے اس محبوب زمرے میں ایک مقامِ خاص رکھتے ہیں، ایسا بلند مقام کہ اُنھیں حسّان الہند کے مبارک لقب سے یاد کیے بغیر ان کے بے پناہ جذبۂ عشقِ رسول، اُن کی وجد آفریں نعت گوئی کے ساتھ انصاف ہو ہی نہیں سکتا۔

محمدی لوائے عظمت، ابد کی چوٹیوں پر سرمدی شان سے لہرا رہا ہے اور اس کے مقدس سایے میں حضرت رضا بریلوی جاوداں کامرانیوں سے سرفراز و شاد کام ہو رہے ہیں۔ یہ اسی کی دین ہے جسے پروردگار دے۔"

(قاری، امام احمد رضا نمبر، دہلی، ص ۱۷۲۔ اپریل ۱۹۸۹ء)

مقبول جہاں گیر: مشہور کالم نویس، ادیب و مؤرخ جناب مقبول جہاں گیر سلامِ رضا کے قبولِ عام کا اعتراف کرتے ہوئے یوں محو نگارش ہیں:

"نبی کریم صلے اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے حضور بہت سے شعرا نے اپنی اپنی حسنِ نیت اور توفیقِ الٰہی کے باعث سلام لکھ کر ہدیۂ عقیدت پیش کیا ہے۔ مگر اعلیٰ حضرت کے لکھے ہوئے ایک سلام کو ایسا قبولِ عام نصیب ہوا کہ ایک صدی گزر چکی مگر برصغیر پاک و ہند کی فضائیں آج بھی اس سلام کی والہانہ آواز سے گونج رہی ہیں۔ ایک ایک شعر جذب و کیف اور عشق و سرمستی کا مرقع ہے۔"

(اعلیٰ حضرت بریلوی از مقبول جہاں گیر، مطبوعہ مجلسِ رضا، مان چسٹر، انگلینڈ، ص ۱۲)

مولانا کوثر نیازی: معروف ترین شاعر و ادیب اور سیاسی قاید و خطیب مولانا کوثر نیازی جو پاکستان کے وزیر اوقاف رہ چکے ہیں، اور ایک عرصے تک مودودی جماعت سے بھی منسلک رہے ہیں۔ پھر اس سے مستعفی ہو کر الگ ہو گئے۔ امام احمد رضا کے عقیدت مندوں میں بھی نہ تھے۔ لیکن امام موصوف کی عظمت و عبقریت کا سکّہ اُن کے بھی دل پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ بطور خاص "سلامِ رضا" کے حوالے سے اپنے تاثرات اس طرح پیش کرتے ہیں:

"آپ سب جانتے ہیں مَیں ادب کا طالب علم ہوں، بُرا بھلا شعر بھی کہہ لیتا ہوں۔ اردو، فارسی، عربی تینوں زبانوں کا نعتیہ کلام مَیں نے دیکھا ہے۔ مَیں بلاخوف تردید کہتا ہوں کہ تمام زبانوں اور زمانوں کا پورا نعتیہ کلام ایک طرف اور شاہ احمد رضا کا سلام "مصطفیٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام" ایک طرف۔ دونوں کو ایک ترازو میں رکھا جائے تو احمد رضا کے سلام کا پلڑا پھر بھی جھکا رہے گا۔ مَیں

اگر یہ کہوں کہ یہ سلام اردو زبان کا قصیدۂ بردہ ہے، تو اس میں ذرّہ بھر بھی مبالغہ نہ ہوگا۔ جو زبان و بیان، جو سوز و گداز، جو معارف و حقائقِ قرآن و حدیث اور سیرت کے جو اَسرار و رموز، انداز و اسلوب میں جو قدرت و ندرت اس سلام میں ہے وہ کسی زبان کی شاعری کے کسی شہ پارے میں نہیں۔

مجھے افسوس ہے کہ اہلِ قلم نے اس جانب توجہ نہیں دی ورنہ اس کے ایک ایک شعر کی تشریح میں کئی کئی کتابیں لکھی جاسکتی ہیں۔ ایک شعر مَیں پڑھتا ہوں اور دعوے سے کہتا ہوں، آپ نے کسی زبان کی شاعری میں سرکارِ ختمی مرتبت کی ریشِ مبارک کی یہ تعریف نہ سُنی ہوگی۔ ذرا تصوّر کیجیے ایک نہر ہے اس کے اردگرد سبزہ ہے، اس سبزہ سے نہر کا حُسن دوبالا ہوگیا ہے۔ اب نہر کس کو کہا؟ سرکار کے 'دہن مبارک' کو، نہر عربی زبان میں دریا کو کہتے ہیں۔ آپ کے دہن مبارک کو نہرِ رحمت قرار دیا کہ ایک رحمت کا دریا ہے جو اس دہنِ اقدس سے موج زن ہے۔ ایک فارسی شاعر نے کہا ہے، ؎

نہ رفت ''لا'' بزبانِ مبارکش ہرگز = مگر بہ اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه

آپ کی زبان مبارک سے اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه میں جو ''لا'' ہے اس کے علاوہ لا یعنی ''نہیں'' کا لفظ کبھی نہیں فرمایا گیا۔ ...... شاہ رضا کہتے ہیں۔

واہ کیا جود و کرم ہے شہِ بطحا تیرا = ''نہیں'' سُنتا ہی نہیں مانگنے والا تیرا

یہ دہنِ اقدس، یہ نہرِ رحمت کہ سفرِ طائف میں پتھروں کی بارش ہوئی، سرِ مبارک سے خون بہا، نعلین مبارک تک آ گیا۔ مگر ہاتھ دعا کو اُٹھائے، عرض کیا، اَللّٰهُمَّ اهْدِ قَوْمِیْ فَاِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ۔ اے اللہ میری قوم کو ہدایت نصیب فرما، یہ لوگ نہیں جانتے، علم نہیں رکھتے۔ میرے مقام اور پیغام سے بے خبر ہیں۔ ...... تو اس دہنِ اقدس کو نہرِ رحمت کہا اور ریشِ مبارک کیا ہے؟ اس نہرِ رحمت کے گرد لہلہانے والا سبزہ، جس نے نہرِ رحمت کو چار چاند لگا دیے ہیں۔ اب شعر ملاحظہ فرمایئے:

خط کی گردِ دہن وہ دِل آرا پھبن = سبزۂ نہرِ رحمت پہ لاکھوں سلام

حضرت رضا آگے بڑھتے ہیں۔ سرکار کی، آپ کی ازواج مطہرات کی، صحابہ کرام، اہلِ بیت کی، اولیاے کبار کی بالخصوص حضرت غوث اعظم کی، جو امام الاولیا ہیں، تعریف کرنے کے بعد حرفِ مطلب زبان پر لاتے ہیں۔ مگر اس میں بھی کیا امتیاز و اختصاص ہے، اور درخواست، ذاتی نہیں جماعتی ہے' انفرادی نہیں اجتماعی ہے، صرف اپنے لیے نہیں، پوری اُمت کے لیے، کہتے ہیں۔

ایک میرا ہی رحمت میں دعویٰ نہیں = شاہ کی ساری اُمت پہ لاکھوں سلام

اور خود کیا چاہتے ہیں؟ یہ سلام اور نعت لکھنے سے غرض کیا ہے؟ کہتے ہیں مَیں تو صرف اتنا انعام چاہتا ہوں کہ قیامت کے دن جب سب آپ پر سلام بھیج رہے ہوں، وہ فرشتے جو آپ کی

خدمت کے لیے مقرر ہیں، مجھے آواز دے کر کہیں، احمد رضا! تم بھی تو سلام سناؤ، وہی سلام ''مصطفیٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام'' تو میری مزدوری وصول ہو جائے گی۔

کاش محشر میں جب اُن کی آمد ہو اور = بھیجیں سب اُن کی شوکت پہ لاکھوں سلام

مجھ سے خدمت کے قدسی کہیں ہاں رضاؔ = مصطفیٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام

فرمان فتح پوری: اردو کے مشہور محقق اور ادیب ڈاکٹر فرمان فتح پوری، صدر شعبۂ اردو، کراچی یونی ورسٹی بھی اس ایمان افروز و جاں نواز سلام کی توصیف میں لکھتے ہیں:

''مولانا (احمد رضا خاں) صاحب شریعت بھی تھے اور صاحب طریقت بھی۔ صرف نعت و سلام اور منقبت کہتے اور بڑی دل سوزی کے ساتھ کہتے تھے۔ سادہ و بے تکلف زبان اور برجستہ و شگفتہ بیان ان کے کلام کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ ان کے نعتیہ اشعار اور سلام سیرت کے جلسوں میں عام طور پر پڑھے جاتے ہیں۔ اُن کا سلام ''مصطفیٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام = شمع بزم ہدایت پہ لاکھوں سلام'' بہت مقبول ہوا ہے۔

(اردو کی نعتیہ شاعری، ص ۸۶، از ڈاکٹر فرمان فتح پوری، مطبوعہ لاہور بحوالہ آئینۂ رضویات دوّم، از پروفیسر محمد مسعود احمد، ص ۲۶۳، ادارہ تحقیقاتِ امام احمد رضا، کراچی)

یہی ڈاکٹر فرمان فتح پوری دوسری جگہ تحریر کرتے ہیں:

''نعتیہ غزلوں سے قطع نظر، مولانا احمد رضا خاں صاحب کے سلام، جس کا مطلع ہے:

مصطفیٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام = شمع بزم ہدایت پہ لاکھوں سلام

کو بھی غیر معمولی مقبولیت حاصل ہے۔ اس سے انکار نہیں کہ اکبر وارثی میرٹھی کا سلام

یا نبی سلام علیک = یا رسول سلام علیک

یا حبیب سلام علیک = صلوات اللہ علیک

...... بھی حد درجہ شہرت رکھتا ہے۔ عورت، مرد، بچے، جوان سبھی اسے بلند آواز سے پڑھنا پسند کرتے ہیں، لیکن اس کے بعد اگر کسی سلام کو مقبولِ عام کا درجہ ملا ہے تو مولانا احمد رضا صاحب کا سلام ہے۔ حفیظ جالندھری کے شاہ نامے کا ایک ٹکڑا جس میں ولادتِ نبوی کا ذکر ہے اور ماہر القادری کی نظم ''حدیث قدسی'' جس میں آں حضرت صلے اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر درود و سلام بھیجا گیا ہے، کو بھی خاصی مقبولیت حاصل ہوئی۔ بہت دنوں تک وہ ہر محفل اور ہر جلسے میں پڑھے گئے۔ لیکن نہ جانے کیوں جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، ان کی مقبولیت کم ہوتی گئی۔ اب وہ کسی محفل میں شاذ ہی سننے میں آتے ہیں۔ اس کے برعکس مولانا احمد رضا خاں صاحب کا سلام اگرچہ ڈیڑھ سو سے زاید اشعار پر مشتمل ہے، اور حفیظ

جالندھری اور ماہر القادری کے سلاموں سے قدیم تر اور طویل تر ہے، پھر بھی آج تک بڑے اہتمام اور کثرت سے پڑھا جاتا ہے۔ بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس کی مقبولیت روز بروز بڑھتی جارہی ہے اور یہ کہنا پڑتا ہے کہ مولانا احمد رضا خاں صاحب ممتاز ترین نعت گو شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ مقبول ترین نعت گو شاعر بھی ہیں۔"

(جہانِ رضا، مرتبہ مرید احمد چشتی، ص ۲۰۴۔۲۰۶، مرکزی مجلس رضا، لاہور ۱۴۰۱ھ)

عابد نظامی: مشہور صحافی جناب عابد نظامی بھی سلامِ رضا کے بارے میں اپنا تاثر اس طرح پیش کرتے ہیں:

"مولانا کا مشہور و مقبول سلام "مصطفیٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام" ہر شخص نے کئی کئی بار سُنا ہوگا اور بقول پروفیسر یوسف سلیم چشتی "ہند و پاک میں شاید ہی کوئی عاشقِ رسول ایسا ہوگا جس نے اس سلام کے دو چار شعر حفظ نہ کر لیے ہوں۔" ...... بلاشبہ یہ سلام، سلاست، روانی، تسلسل، شاعرانہ حسن کاری اور والہانہ پن کی وجہ سے اردو کا سب سے اچھا سلام ہے۔"

(مقالاتِ یومِ رضا، از عبد النبی کوکب، جلد اوّل، ص ۱۴۲، دائرۃ المصنفین، لاہور، ۱۹۶۸ء)

ڈاکٹر شکیل احمد اعظمی: شناورِ بحرِ سخن، ناقدِ فکر و فن، جناب مولانا ڈاکٹر شکیل احمد اعظمی سلامِ رضا کی تضمینوں کے تعلق سے تحریر فرماتے ہیں:

"سلامِ رضا پر تضمین کا مقدس سلسلہ قصیدۂ سلامیہ کی مقبولیت و عظمت کا بیّن ثبوت ہے۔ سلامِ رضا کے بعض مصرعوں پر عروضی حیثیت سے کچھ اعتراضات بھی وارد کیے گئے ہیں اور بعض مقامات پر بہ غرضِ اصلاح الفاظ بھی تبدیل کیے گئے مگر ماہرینِ فنِ عروض نے ان کو مدلّل اور مسکت جوابات بھی دیے اور ادبی و لسانی اعتبار سے سلامِ رضا کے اصل الفاظ کو برمحل اور درست قرار دینے کے ساتھ ساتھ بدلے ہوئے اصلاحی الفاظ کو بے محل اور نادرست بھی ثابت کیا۔ جس کو اس سلسلے میں تفصیل جاننے کی خواہش ہو وہ "سلامِ رضا۔ تضمین و تفہیم اور تجزیہ" نامی کتاب مصنفہ پروفیسر منیر الحق کعبی صاحب بہل پوری (پاکستان) کا مطالعہ کرے۔"

(پیش لفظ تضمین بر سلامِ رضا، ص ۴، از محمد عثمان اوج اعظمی، رضا اکیڈمی، ممبئی ۳، ۱۴۲۲ھ/ ۲۰۰۱ء)

میاں شفیع محمد، لاہور: روز نامہ نوائے وقت، لاہور کے مشہور کالم نگار میاں محمد شفیع شاہنامہ اسلام پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"برصغیر کے مسلمانوں میں اسلامی شعور ابھارنے اور مسلمانوں کی نئی نسل کو اسلامی اقدار سے آگاہ کرنے میں حفیظ کی شاعری نے ایسا کردار ادا کیا ہے جو کہ اس صدی کے دوسرے اور تیسرے عشرہ

میں امام اہلِ سنّت و جماعت اعلیٰ حضرت احمد رضا خاں بریلوی نے نعتیہ کلام اور تحریکِ رابطہ مسلم عوام کے ذریعہ مسلمانوں کے سینوں میں عشقِ محمد کی آگ روشن کرنے میں ادا کیا تھا۔ جس طرح برصغیر کے دور دراز دیہاتوں میں اعلیٰ حضرت کے سلام کے ایسے فقرے...... ''مصطفیٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام'' گزشتہ نصف صدی سے گونجتے رہے ہیں، اسی طرح حفیظ کے ''شاہنامہ اسلام'' کے اشعار مسجدوں اور جلسوں ان کی خاص طرز میں گزشتہ ربع صدی سے زائد ہم سے لوگوں کے دلوں کی دھڑکن کی صدا بن کر بلند ہوتے رہے ہیں۔''

(شرح سلامِ رضا، از مفتی محمد خان قادری، اسلامک پبلشرز دہلی، ص ۵۳ بحوالہ روزنامہ نوائے وقت، لاہور ۲۲ر نومبر ۱۹۷۳ء)

حافظ یعقوب علی خاں شاہ جہاں پوری: شارح سلامِ رضا عالی جناب حافظ محمد یعقوب علی خاں شاہ جہاں پوری، سلامِ رضا کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''درود و سلام کی ابتدا اور ہدایت ہمیں قرآن حکیم میں واضح طور سے ملتی ہے۔ بالخصوص اولوالعزم پیغمبروں کا نام لے کر خداوند تعالیٰ نے ان پر سلام بھیجا۔ فرمایا سَلٰمٌ عَلٰی نُوحٍ فِی الْعٰلَمِیْنَ...... سَلٰمٌ عَلٰی اِبْرَاهِیْم ...... سَلٰمٌ عَلٰی مُوْسیٰ وَ هَارُوْن ...... سَلٰمٌ عَلٰی اِلْیَاسِین ...... وَسَلٰمٌ عَلَی الْمُرْسَلِیْنَ ۔ ......ایک موقع پر خدا تعالیٰ نے اپنے تمام نیک بندوں کو سلام بھیجا، ارشاد ہوا سَلٰمٌ عَلٰی عِبَادِهِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی

لیکن رسولِ اکرم صلے اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر نہ صرف سلام بھیجا گیا بلکہ اہلِ ایمان پر لازم قرار دیا گیا کہ ذاتِ اقدس صلے اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر درود و سلام بھیجا کریں۔ ارشاد ہوا (اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰئِکَتَهٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْماً) بے شک اللہ اور اس کے فرشتے نبی پر درود بھیجتے ہیں اے ایمان والو! تم بھی ان پر درود اور سلام بھیجو''۔

یہی وجہ ہے کہ دورِ اوّل سے لے آج تک مسلمانوں میں اپنے آقا پر درود و سلام بھیجنے کا شغف باقی ہے۔ بالخصوص علمائے کرام اور سلف صالحین نے اپنے نعتیہ کلام میں تو اس کا خاص خیال رکھا ہے۔

اعلیٰ حضرت کا نذرانہ سلام بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے مگر جس تفصیل سے ذاتِ اقدس صلے اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے جسمِ اطہر کے ایک ایک عضوِ مکرم اور اس کی صفات کو بیان کر کے جس والہانہ انداز میں سلامِ عقیدت پیش کیا ہے وہ درحقیقت انھیں کا حصّہ ہے۔ یہ سلام اپنے موضوع اور مضمون کے اعتبار سے اپنی نوعیت کا جداگانہ سلام ہے۔ جس میں بہ یک وقت ذاتِ اقدس صلے اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا سراپا نعت و توصیف کے ساتھ ساتھ اہلِ بیت و صحابہ کرام اور وابستۂ شمع رسالت تمام پروانوں پر سلام

بھیجا گیا ہے۔ ...... احقر کی ایک عرصے سے خواہش تھی کہ اعلیٰ حضرت کا یہ نذرانۂ سلام دیوان سے الگ کر کے شائع کیا جائے تو اہلِ محبت و عقیدت کو استفادہ کا ایک بہتر موقع فراہم ہو سکے گا۔ ''سلام'' کے اندر جو مشکل الفاظ تھے ان کے معنی، تلمیحات و تشبیہات کی وضاحت اور ان کا پس منظر بھی بیان کر دیے گئے ہیں، تا کہ ہر شخص کماحقہ مستفیض ہو سکے، نیز اس بے نظیر ''سلام'' کی اہمیت سے لوگ واقف ہو سکیں اور پڑھنے کا لطف دوبالا ہو سکے۔''

(سلامِ اعلیٰ حضرت مع تشریح از حافظ محمد یعقوب، السراج پبلی کیشنز، ۱۳۶۸ھ فراش خانہ، دہلی ۶، ص ۴)

مظہر عرفانی: دنیائے ادب کی ایک ممتاز شخصیت جناب مظہر عرفانی صاحب فرماتے ہیں:

''مولانا احمد رضا بڑے خوش گو شاعر تھے۔ یہ وہ دور تھا جب ہندوستان میں اکبر (الہ آبادی)، شبلی، وحشت کلکتوی، داغ اور امیر کا طوطی بول رہا تھا۔ تو ایک سریلی آواز بریلی سے بھی اُبھر رہی تھی جو حضرت رضا بریلوی کی تھی، مگر یہ آواز غزل سرائی سے آشنا نہیں ہوئی۔ اس سے مناجات، نعت، مناقب اولیا اور سلام کے سرمدی نغمے ہی پھوٹتے رہے۔ اس کی گونج ہندوستان کے ہر مذہبی جلسے میں سنائی دی جانے لگی۔ یہ آواز اپنے دامن میں عشقِ رسول (صلے اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) کا سوز رکھتی تھی۔ درد آگیں، جان آفریں اور روح پرور تھی۔ اس نے کتنے ہی بختِ خفتہ بیدار کیے اور مردہ دلوں میں اُمنگیں بھر دیں اور سوتوں کو جگا دیا۔ اپنی نعت گوئی کے متعلق فرماتے ہیں ؎

ہوں اپنے کلام سے نہایت محظوظ   بے جا سے ہے المنۃ للہ محفوظ
قرآن سے مَیں نے نعت گوئی سیکھی   یعنی رہے احکامِ شریعت ملحوظ

آپ نے حضور رسالت مآب میں جو سلام پیش کیا، وہ آج بھی مقبولِ خاص و عام ہے۔

مصطفیٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام   شمع بزمِ ہدایت پہ لاکھوں سلام

(مولانا احمد رضا خاں از مظہر عرفانی، ص ۹۸۔۹۹، اسلامک بک فاؤنڈیشن، نئی دہلی)

حکیم مظفر عزیز، لاہور: ماہ نامہ ''نویدِ بہار'' لاہور کے مدیرِ اعلیٰ جناب حکیم مظفر عزیز ''سلامِ رضا'' کے بارے میں اپنی رائے اس طرح تحریر کرتے ہیں:

''حضرت مولانا احمد رضا خاں بریلوی علیہ الرحمہ کے بعض نعتیہ اشعار کی پُرکاری کا یہ عالم ہے کہ پڑھ کر قلب و روح دونوں مسحور ہو جاتے ہیں۔ ان کے ایک ''سلام'' کو مقبولیت کا درجہ حاصل ہے۔ جس کا مطلع ہے ؎

مصطفیٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام   شمع بزمِ ہدایت پہ لاکھوں سلام

اس سلام کا ایک نہایت پاکیزہ شعر فخرِ موجودات، سرورِ کائنات، نبی آخر الزماں صلے اللہ تعالیٰ

علیہ وسلم کی عزت و توقیر اور آپ کے ذکرِ پیدائش کا آئینہ دار ہے۔ یہ شعر جب پہلی بار میری نگاہ سے گزرا تو میں نے یوں محسوس کیا کہ خلوص و عقیدت میں ڈوبا ہوا یہ نذرانہ عقیدت ساری کائنات کی سرخوشی کا مرقع بن کر میرے سامنے آ گیا ہے۔ مجھے مولانا کا یہ شعر سادگی، صنعائی، حُسن کاری، منظر کشی، واقعہ نگاری، تہذیبی متانت، جذبے کی سچائی اور احساس کی پاکیزگی کے لحاظ سے نہایت بلند پایہ نظر آیا۔ ملاحظہ فرمایئے! کیوں نہ اس ایک شعر پر نعتوں کے ہزاروں دیوان قربان کر دیے جائیں، جی چاہتا ہے کہ اس شعر کو بار بار پڑھتے جائیں۔

جس سہانی گھڑی چمکا طیبہ کا چاند　　اُس دل افروز ساعت پہ لاکھوں سلام

میرے نزدیک حضرت مولانا احمد رضا بریلوی علیہ الرحمہ کا یہ شعر اردو نعت گوئی کی تاریخ کا سب سے روشن ستارہ ہے۔ انھوں نے اپنے اس ایک شعر میں ایک طویل نعتیہ قصیدہ نہایت بلاغت و اختصار کے ساتھ اس طرح کہہ دیا ہے کہ اس سے بہتر کا تصور بھی ناممکن نظر آتا ہے۔ مستانہ اور عاشقانہ فضا میں ڈوبے ہوئے اس شعر کو پڑھتے ہی انسان کا ذہن، حُسنِ کائنات، فخرِ موجودات صلے اللہ علیہ وسلم کے ذکرِ پیدائش اور محبوبیت کی طرف جاتا ہے اور دل درود شریف کا وِرد کرنے لگ جاتا ہے۔ چنانچہ مَیں نے بھی جب پہلی مرتبہ اس شعر کو پڑھا تو میری زبان پر حسبِ ذیل درود شریف جاری ہو گیا:

اَللّٰھُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ عَلٰی سَیِّدِنَا وَ مَوْلَانَا مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی سَیِّدِنَا وَ مَوْلَانَا اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَجِیْدٌ۔ بڑی دیر تک مَیں اس درود کا وِرد کرتا رہا۔ اس وقت مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے مَیں برکتوں والی منزل میں اُتر رہا ہوں، صدق کے مقام میں داخل ہو رہا ہوں اور صاحبِ جلال و اکرام نے، کائنات کے مالک نے اپنے انتہائی رحمت کے دروازے مجھ پر کھول دیے ہیں۔ اسی عالمِ کیف میں بے ساختہ میری زبان پر ذیل کا سلام جاری ہو گیا اور مَیں آج تک اس بات پر فخر محسوس کرتا ہوں کہ مولانا رضا بریلوی کے ایک سادہ اور دل کش شعر نے مجھ سے وہ سلام کیوں لکھوایا جو میری زندگی کا حاصل ہے۔ یَاحَیُّ یَا قَیُّوْمُ بِرَحْمَتِکَ اَسْتَغِیْثُ

سبز گنبد کے مکین تجھ پر سلام　　رحمۃ للعٰلمین تجھ پر سلام
سربراہِ مرسلاں تجھ پر سلام　　ہادیِ ہر دوجہاں تجھ پر سلام
عالمِ عشق و رضا تجھ پر سلام　　مظہرِ نورِ خدا تجھ پر سلام

(یہ کُل چھپن ۵۶ مصرعے سلام کے ہیں۔ بطور نمونہ چھ نقل ہوئے۔ نعمانی)

(جہانِ رضا، مرتبہ مرید احمد چشتی، ص ۱۸۴۔۱۸۶، مرکزی مجلس رضا، لاہور ۱۴۰۱ھ)

حافظ بشیر احمد غازی آبادی: مشہور مورخ و صحافی جناب حافظ بشیر احمد غازی آبادی،

امام احمد رضا کی نعت نگاری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں کہ ہر قائد کا ایک مشن ہوتا ہے اور اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لیے ذریعے اور راستے بھی مختلف ہوتے ہیں۔ حضرت مولانا احمد رضا خاں صاحب نے اپنے مشن کی تکمیل کے لیے مدحتِ مصطفیٰ صلے اللہ علیہ وسلم کو ذریعہ اور وسیلہ بنایا۔ انگریزوں کی سب سے بڑی خواہش یہی تھی کہ مسلمان میرِ حجاز (ﷺ) کو سالارِ کارواں سمجھنا بند کردیں اور ان کا تعلق مدینۃ النبی (ﷺ) سے کم ہوجائے۔ حضرت بریلوی رحمۃ اللہ علیہ نے انگریز کی اس چالاکی کو سمجھا اور نعرہ لگایا کہ

مصطفیٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام شمع بزمِ ہدایت پہ لاکھوں سلام

بات دل سے نکلی تھی اثر کرگئی۔ آج برصغیر پاک و ہند میں ایک بھی مسلمان نہیں ملے گا جو اس نعرۂ رسالت سے ناواقف ہو۔ یہ دعویٰ بالکل حقائق پر مبنی ہے کہ عصرِ جدید میں ان جیسا عاشقِ شہنشاہِ کونین پیدا نہیں ہوا۔

(جہانِ رضا، مرتبہ مرید احمد چشتی، ص ۱۹۵۔۱۹۶، مرکزی مجلس رضا، لاہور ۱۴۰۱ھ)

گوہر ملسیانی: جناب طفیل گوہر ملسیانی، حضرت رضا کے ''سلام'' کی مقبولیت کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''وہ دینی علوم کے جامع ہونے کے علاوہ ایک حساس طبیعت سخن ور بھی تھے۔ ان کے قصیدۂ سلامیہ کے اشعار کس شخص کی زبان پر نہ ہوں گے۔ وہ کون سا صاحب ذوق ہے جس نے انھیں سُن کر کیف و سرور محسوس نہ کیا ہوگا۔

مصطفیٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام شمع بزمِ ہدایت پہ لاکھوں سلام

(جہانِ رضا، مرتبہ مرید احمد چشتی، ص ۲۰۸، مرکزی مجلس رضا، لاہور ۱۴۰۱ھ)

پروفیسر منیر الحق کعبی: پروفیسر منیر الحق کعبی بہل پوری، شعبۂ اردو گورنمنٹ زمیندار پوسٹ گریجویٹ کالج، گجرات (پاکستان) دنیائے ادب و تحقیق کے ایک نام ور شخص کا نام ہے، جنھوں نے اپنی تحقیقی کتاب ''سلامِ رضا۔ تضمین و تفہیم اور تجزیہ'' کے حوالے سے بڑی شہرت پائی۔ مذکورہ کتاب اپنی نوعیت کی واحد کتاب ہے جس کے بعض مندرجات سے اختلاف تو کیا جاسکتا ہے لیکن مجموعی حیثیت سے اس کو معتبریت کا درجہ ضرور حاصل ہے۔ جس کے مطالعے سے کعبی صاحب کی دقتِ نظر، تحقیقی مزاج اور امام احمد رضا محدث بریلوی قدس سرہٗ سے عقیدت و محبت کا پتہ چلتا ہے۔ آپ نے مذکورہ کتاب میں بعض ایسی تضمینوں اور شرحوں کا تنقیدی جائزہ لیا ہے جن میں عقیدت مندانہ تحریفات در آئی تھیں اور کہیں کہیں تشریحات نے اپنی صحیح سمت کو تبدیل کردیا تھا۔ مجھے اس موضوع پر سرِ دست

کچھ نہیں کہنا ہے۔ انھیں کعبی صاحب کے ''سلامِ رضا'' سے متعلق تاثراتی کلمات کو پیش کرنا مقصود ہے، وہ ارقام پذیر ہیں:

''سلامِ رضا ایک عظیم فن پارہ ہے۔ جس میں جلال و جمال اپنے حسین ترین امتزاج کے ساتھ، ارفع ترین صورت میں موجود ہے۔ پورے کا پورا قصیدہ ایک فنی وحدت کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہے۔ سرتا سر انتخاب۔ کسی ایک شعر کو، کسی شعر کے ایک لفظ کو تبدیل نہیں کیا جاسکتا۔ الفاظ و معانی میں ارتباط کی ایک خوب صورت مثال۔ تشبیہات و استعارات سے جو امیجری تخلیق کی گئی ہے، طبیعات سے مابعد الطبیعات تک دونوں کو محیط ہے۔ مجرد تصورات کی تجسیمی صورت گری بھی ہے اور جو پیکر تراشے گئے ہیں، متحرک اور جان دار بھی ہیں۔ ذہن مسلسل ایک طلسماتی کیفیت میں اسیر رہتا ہے۔ اور اس پر تقدس کی ایک فضا تادم آخر مسلط رہتی ہے اور یوں مسحور و مسرور، شاعر کے ساتھ محو سفر رہتا ہے۔

قصیدۂ سلامیہ کو آپ ایک مسلسل غزل کہہ سکتے ہیں۔ مگر سٹینزائی صورت میں، سٹینزائی اس لحاظ سے نہیں کہ ہر سٹینزا مختلف قوافی کا نظام رکھتا ہو۔ بلکہ اس کا انداز غزل میں قطعہ بند کا سا ہے کہ اسی قافیہ اور ردیف میں ہے۔ لیکن کہیں بھی کسی قطعہ بند کی نشان دہی نہیں کی گئی۔ اور اگر بغور نظر کریں تو چار سے آخر لائنوں (مصرعوں) تک کو ایک قطعہ بند محیط ہے۔ گویا باقاعدہ نظام کو عمداً ترک کر دیا گیا ہے۔

''سلامِ رضا'' کا ایک ایک شعر تغزل کی جان ہے۔ قصیدہ کا دامن تنافر اور غرابتِ الفاظ کے عیوب سے پاک ہے۔ اس کی فضا میں ایک پاکیزہ سرمستی ہے، خود سپردگی کا احساس ہے، نفاست و نزاکت ہے، سوز و گداز سے مملو ایک غنائیت ہے۔ اہم تر یہ کہ شاعر کا داخلی جذبۂ تخیل کے اشتراک سے اظہار پاتا ہے Lyrical Poetry کا امتیازی وصف ہے۔ اسی بنا پر پورے سلام میں وہ موسیقیت ہے کہ آج تک اس کی ترنم آفریں فضا، قلب و روح کو اپنی گرفت میں لیے ہوئے ہے۔ مگر اس کی ندرتِ فکر، معنی آفرینی، رفعتِ موضوع، تحیّر فزا تراکیب، پُر شکوہ اسلوب پر منطقی استدلالیت اس کو Odes کا ملبوس عطا کرتی ہے جو Lyrics کی ترقی یافتہ صورت ہے۔

''سلامِ رضا'' ہیئتی اور صنفی لحاظ سے قصیدہ ہے۔ ایک سو اکہتر (۱۷۱) اشعار پر مشتمل قصیدہ کا لفظ ہی اس کی علویت و عظمت اور رفعت و شوکت کی طرف دلالت کرتا ہے۔ الفاظ و تراکیب میں شکوہ و جلال، مضامین میں رفعت و عظمت، طرزِ ادا میں ندرت و جدت، تشبیہات و استعارات میں کثرت، صنائع بدائع کا خصوصی التزام اور زورِ کلام قصیدہ کے خصائص میں شامل ہیں اور ''قصیدہ سلامیہ'' ان صنعات پر پورا اُترتا ہے۔

''سلامِ رضا'' میں خامۂ رضا ابلقِ الفاظ و تراکیب پر سوار، ندرتِ فکر اور جدتِ مضامین کے

اقالیم اپنی قلم رو میں شامل کرتا چلا جاتا ہے۔ تشبیہات و استعارات کے لشکر اس کے آگے دست بستہ ایستادہ رہتے ہیں اور ایک پُرشکوہ اسلوب ظہور میں آتا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ مغلق یا مبتذل الفاظ سے فضا کو بوجھل بنادیا گیا ہے۔ ایک ایک حرف سے فصاحت و بلاغت اور سلاست و روانی ٹپک رہی ہے۔ سادگی، خلوص اور جوشِ ایمانی نکھر کر سامنے آرہا ہے اور ان سب کے پیچھے شاعر کی علمی وجاہت، یقین کی پختگی، جذبۂ محبت کی شدّت اور ایمانی صداقت کام کررہی ہے۔''

(سلامِ رضا تضمین و تفہیم اور تجزیہ، از پروفیسر منیر الحق کعبی، ص ۲۵۔۲۶۔ زجاج پبلی کیشنز، گجرات، پاکستان، ۱۴۱۶ھ/ 1995ء)

جناب کعبی صاحب کے اس ''تجزیہ'' پر ایک تنقیدی تحریر فقیہ اہلِ سُنّت حضرت مولانا مفتی محمد مطیع الرحمٰن رضوی پورنوی کی بھی ہے، جو ''سلامِ رضا۔ تضمین و تفہیم و تجزیہ کا تنقیدی جائزہ'' کے نام سے ادارہ افکارِ حق، پورنیہ سے شائع ہوچکی ہے۔ مفتی صاحب نے کعبی صاحب کی تائید و توثیق بھی کی ہے اور کہیں کہیں ان کے بعض تجاوزات پر لطیف تنقید بھی۔ یہ کتاب بھی شعر و سخن سے دل چسپی رکھنے والے حضرات کے لیے خصوصاً اور ہر اہلِ علم کے لیے عموماً ایک خاصے کی چیز ہے۔ یہ کتاب حضرت مفتی صاحب کی وقتِ نظر اور تنقیدی بصیرت کی ایک منہ بولتی تصویر ہے۔

ڈاکٹر سلام سندیلوی: گورکھپور یونی ورسٹی کے لکچرر ڈاکٹر سلام سندیلوی اردو ادب کی ایک جانی مانی شخصیت ہیں۔ وہ سلامِ رضا پر اپنے تاثرات اس طرح تحریر کرتے ہیں:

''ایک نعت کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے:

مصطفیٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام — شمعِ بزمِ ہدایت پہ لاکھوں سلام
سروِ نازِ قِدم، مغزِ رازِ حِکَم — یکّہ تازِ فضیلت پہ لاکھوں سلام
صاحبِ رجعتِ شمس و شق القمر — نائبِ دستِ قدرت پہ لاکھوں سلام
فتحِ بابِ نبوت پہ لاکھوں درود — ختمِ دورِ رسالت پہ لاکھوں سلام

ان سارے اشعار میں خلوص و عقیدت کی مہک عود و عنبر کی خوشبو کی طرح موجود ہے۔ جن سے ہماری روح وجد میں آجاتی ہے۔ یہ اشعار رسمی طور پر نہیں کہے گئے ہیں بلکہ ان کی فضا میں اصلیت اور حقیقت کی بجلیاں کوندرہی ہیں۔''

(المیزان، امام احمد رضا نمبر، ممبئی، ص ۴۵۰)

پروفیسر سیّد امین اشرف: شعبۂ انگلش مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ کے پروفیسر سیّد امین اشرف، امام احمد رضا کی نعتیہ شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

اعلیٰ حضرت کے چند نعتیہ کلام اسی ذیل میں آتے ہیں (کہ) شہروں، دیہاتوں اور قصبات میں بکثرت پڑھے جاتے ہیں۔ مثلاً

۱) واہ کیا جود و کرم ہے شہ بطحا تیرا
۲) اُن کی مہک نے دل کے غنچے کھلا دیے ہیں
۳) سب سے اعلیٰ و اولیٰ ہمارا نبی (ﷺ)
۴) کعبے کے بدرالدجیٰ تم پہ کروڑوں درود
۵) مصطفیٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام

ان میں اعلیٰ حضرت کے ''سلام'' کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ اسلوبِ بیان کی سادگی، الفاظ کی روانی، لہجے کا دھیما پن، جذبات کی سچائی، زورِ خیالات کی صفائی اس کی خاص خوبیاں ہیں۔ محبتِ رسول کی کیف پرور فضا اس پورے سلامیہ قصیدے پر محیط ہے۔''

(قاری و المیزان، امام احمد رضا نمبر، ص۵۵۸)

پروفیسر مظفر عالم صدیقی: اعلیٰ حضرت بریلوی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سلام بحضور سرورِ کائنات صلے اللہ تعالیٰ علیہ وسلم میں قصیدہ کا سا شکوہ، مثنوی کی سی روانی، ربط و تسلسل اور علمی وجاہت کے ساتھ ساتھ جذبۂ عشق و محبت کی فراوانی نے اسے اردو زبان کا سب سے مقبول قصیدہ سلامیہ بنا دیا ہے۔ یہ ۱۶۷ (بلکہ ۱۷۱) اشعار پر مشتمل ہے۔ محافلِ میلاد و نعت میں اس سلام کو اجتماعی شکل میں پڑھا جاتا ہے۔ اس کے پڑھنے کا ایک خاص انداز ہے جو کیف و وجدان کی تاثیر کا حامل ہے۔ اس ''سلام'' کو اس صدی میں بہت شہرت ملی ہے۔ اس کی تقلید میں کئی شاعروں نے سلام لکھے ہیں۔ اعجاز اشرف انجم نے علامہ اختر الحامدی، ناصر زیدی، مولانا ضیاء القادری، ریاض سہروردی، سید حبیب احمد تلہری اور رفیق احمد رضوی کے اس انداز پر لکھے گئے سلاموں کو (اپنے مجموعے) میں شامل کیا ہے۔ مولانا یوسف سلیم چشتی نے اعلیٰ حضرت رضی اللہ عنہ کے سلام کی شہرت اور مقبولیت کے بارے میں لکھا ہے:

''مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے سلام کو یقیناً شرف قبولیت حاصل ہوگیا۔ کیوں کہ ہند و پاک میں شاید ہی کوئی ایسا عاشقِ رسول ہوگا۔ جس نے اس کے دو چار شعر حفظ نہ کر لیے ہوں۔''

(روزنامہ نوائے وقت، لاہور ۲۲ رنومبر ۱۹۷۳ء، بحوالہ ہفت روزہ مسلم ٹائمز ممبئی ۱۳ اراگست ۲۰۰۷ء بعنوان امام احمد رضا کی اردو نعت نگاری از پروفیسر ڈاکٹر مظفر عالم جاوید صدیقی، صدر شعبۂ اردو، گورنمنٹ اسلامیہ کالج، فیصل آباد)

شیخ یوسف ہاشم رفاعی (کویت): جناب احمد بشیر رضوی مرتب ''گلستانِ اعلیٰ حضرت''

بیان کرتے ہیں:

''پچھلے دنوں کویتی رہنما بین الاقوامی شخصیت شیخ ہاشم رفاعی، کویت سے لاہور تشریف لائے۔ ایک محفل میں شرکت کی۔ فرمانے لگے کہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا کا سلام ''مصطفیٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام'' پڑھا جائے کیوں کہ مجھے اس سلام سے بڑی محبت وعقیدت ہے۔ پھر فرمایا: میں دنیا میں جہاں بھی گیا، وہاں محافلِ میلاد ہوتی ہیں اور اعلیٰ حضرت کا سلام پڑھا جاتا ہے اور اعلیٰ حضرت، اسلام کے مجدّد اور عظیم امام تھے۔ میری نظر میں ان کی کوئی مثال نہیں۔''

(گلستانِ اعلیٰ حضرت، از بشیر احمد رضوی، ص۹، بزمِ رضائے مصطفیٰ، گوجراں والا، پاکستان ۱۴۰۹ھ/ ۱۹۸۹ء)

مفتی مکرم احمد نقش بندی: جامع مسجد فتح پوری، دہلی کے امام اور مفتی محمد مظہر اللہ مفتی اعظم دہلی کے نبیرہ مولانا مفتی محمد مکرم احمد نقش بندی، اپنے یہاں کی محافل میلاد النبی کا تذکرہ کرتے ہوئے ارقام فرماتے ہیں:

''فتح پوری (دہلی) میں جلسۂ عید میلاد النبی صلے اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تقریباً ستر ۷۰ سال سے بھی زیادہ سے گیارہ ربیع الاول شریف کو شب میں ہوتا ہے۔ حضرت مفتی (مظہر اللہ) صاحب، اعلیٰ حضرت کی نعتوں کو ہی پسند فرماتے تھے اور آج بھی جمعہ کے بعد کی محفلوں میں اور جلسۂ عید میلاد النبی، جلسۂ شب برأت وعرس حضرت مفتی محمد مظہر اللہ میں محفل کا اختتام اعلیٰ حضرت کے صلاۃ وسلام پر ہوتا ہے۔''

مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ میرے والد الحاج مولانا محمد احمد رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۹۷۱ء) سابق شاہی امام مسجد فتح پوری بھی اعلیٰ حضرت کا نعتیہ کلام نہ صرف پسند فرماتے تھے بلکہ خود بھی محافل اور تقاریر میں اعلیٰ حضرت کے نعتیہ اشعار کو پڑھا کرتے تھے۔''

(آئینۂ امام احمد رضا، از مولانا غلام جابر شمس مصباحی، ص ۴۵، ادارہ افکارِ حق، پورنیہ، ہفت روزہ ہجوم دہلی کا امام احمد رضا نمبر)

ابو سلیم عبدالحئی رام پوری: جناب ابو سلیم عبدالحئیؒ رام پوری مودودی، ماہ نامہ ''الحسنات'' رام پور کے شخصیات نمبر میں امام احمد رضا کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''احمد رضا خاں فنِ شاعری میں کمال رکھتے تھے۔ ان کا ایک مصرع ہے۔

قرآن سے مَیں نے نعت گوئی سیکھی

ہر صنفِ شاعری میں طبع آزمائی کی لیکن نعت میں خاص مقام پیدا کیا۔ ان کی عام شاعری میں بھی ہر جگہ نعت کی جھلک نظر آتی ہے۔ ان کا دیوان حدائق بخشش کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اردو، فارسی عربی، ہندی وغیرہ زبانوں پر یکساں طور سے اچھے شعر لکھتے تھے۔ ان کا مشہور سلام جس کا مطلع ہے:

مصطفیٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام | شمعِ بزمِ ہدایت پہ لاکھوں سلام

پاک و ہند کے طول وعرض میں پڑھا جاتا ہے۔ ان کی عظمتِ شاعری کے سبھی دل معترف تھے۔ چنانچہ افتخار اعظمی باوجود اختلافِ مسلک، احمد رضا کی نعت گوئی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''آپ کا نعتیہ کلام اس پایے کا ہے کہ انھیں طبقۂ اولیٰ کے نعت گو شعرا میں جگہ دی جانی چاہیے۔''

(ماہ نامہ الحسنات، رام پور، شخصیات نمبر، ماہ جنوری ۱۹۷۹ء، ص ۵۴)

ضرورت ہے کہ:

اس سلامِ رضا کے فنی محاسن اُجاگر کیے جائیں۔ مذکورہ بالا تاثرات صرف خراجِ عقیدت اور اعترافِ حقیقت کا درجہ رکھتے ہیں۔ افسوس کہ اس طرف بھرپور توجہ اب تک کسی نے نہ کی۔ کچھ دنوں قبل جناب مفتی محمد خان قادری نے کوشش کی اور ''شرح سلامِ رضا'' کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی، جو ساڑھے پانچ سو صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ شرح معنوی خوبیوں کو اُجاگر کرتی ہے۔ اور یہی اصل مقصود بھی ہے۔ البتہ فنی محاسن کو آشکارا کرنے کے لیے ابھی میدان خالی ہے۔ کاش کوئی ماہرِ فن فاضل اس طرف بھی توجہ دے تو سونے پر سہاگا کا کام انجام پائے۔ اشعارِ سلام کے مزید معانی نکھر کر سامنے آئیں اور صاحبِ کلام، امامِ فکر و فن اعلیٰ حضرت محدّث بریلوی قدس سرہٗ کے علمی و فنی جاہ و جلال پر بھی روشنی پڑ جائے۔

گذشتہ اوراق میں محسن اہلِ سنت شرفِ ملت علامہ عبدالحکیم شرف قادری کا ایک مفید مشورہ اور قابلِ توجہ ہدایت، توجہ کی طالب ہے کہ مختلف نوعیت کی محافل میں سلامِ رضا سے ان اشعار کا بھی انتخاب کیا جائے جو موقع کے مناسب ہوں مثلاً خلفاے راشد کے ایام منائے جائیں تو ان اشعار کو پڑھا جائے۔

شانِ صدیقِ اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں:

سایہ مصطفیٰ مایۂ اصطفا | عزّ و نازِ خلافت پہ لاکھوں سلام
یعنی اُس افضل الخلق بعد الرسل | ثانی اثنینِ ہجرت پہ لاکھوں سلام
اصدق الصادقین سید المتقین | چشم و گوشِ وزارت پہ لاکھوں سلام

شانِ فاروقِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں:

وہ عمر جس کے اعدا پہ شیدا سقر | اس خدا دوست حضرت پہ لاکھوں سلام
فارقِ حق و باطل امام الہدیٰ | تیغِ مسلولِ شدت پہ لاکھوں سلام
ترجمانِ نبی ہم زبانِ نبی | جانِ شانِ عدالت پہ لاکھوں سلام

شانِ عثمان ذی النورین رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں:

زاہدِ مسجدِ احمدی پر درود — دولتِ جیشِ عسرت پہ لاکھوں سلام
درِّ منثور قرآں کی سلک بہی — زَوجِ دو نورِ عفت پہ لاکھوں سلام
یعنی عثمان صاحب قمیصِ ہدیٰ — حُلّہ پوشِ شہادت پہ لاکھوں سلام

شانِ مرتضیٰ علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ میں:

مرتضیٰ شیرِ حق اشجع الاشجعین — ساقیِ شیر و شربت پہ لاکھوں سلام
شیرِ شمشیر زن شاہِ خیبر شکن — پرتوِ دستِ قدرت پہ لاکھوں سلام
ماحیِ رفض و تفضیل و نصب و خروج — حامیِ دین و سُنّت پہ لاکھوں سلام

ائمہ اربعہ کی شان میں (رضی اللہ تعالیٰ عنہ):

شافعی مالک احمد امام حنیف — چار باغِ امامت پہ لاکھوں سلام
کاملانِ طریقت پہ کامل درود — حاملانِ شریعت پہ لاکھوں سلام

سرکار غوث اعظم محبوب سبحانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شان میں:

غوث اعظم امام التقیٰ و النقیٰ — جلوۂ شانِ قدرت پہ لاکھوں سلام
قطبِ ابدال و ارشاد و رُشد الرّشاد — محیِ دین و ملت پہ لاکھوں سلام
جس کی منبر ہوئی گردنِ اولیا — اس قدم کی کرامت پہ لاکھوں سلام

امام احمد رضا علیہ الرحمہ پر الزامات کا جائزہ

(حصہ اوّل)

ترتیب: خلیل احمد رانا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم الصلوٰۃ والسلام علیک یا رسول اللہ

امام احمد رضا قادری فاضل بریلوی قدس سرہٗ پر کئی ایک جھوٹے، بے بنیاد اور من گھڑت الزام واتہام لگائے جاتے ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ:

"والجدیر بالذکر ان المدرس الذی کان یدرسہ مرزا غلام قادر بیک کان اخاللمرزا غلام احمد المتنبی القادیانی"

(احسان الٰہی ظہیر، البریلویہ (عربی)، مطبوعہ لاہور، ص۲۰)

ترجمہ: یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ان کا استاد مرزا غلام قادر بیگ، مرزا غلام احمد قادیانی کا بھائی تھا۔

(احسان الٰہی ظہیر، البریلویہ (اُردو)، مطبوعہ لاہور، ص۳۱)

عرب کے ایک نجدی قاضی عطیہ محمد سالم نے کتاب "البریلویہ" پر تقدیم لکھی اور قاضی ہونے کے باوجود بغیر تحقیق کے کہا!

"بریلویہ کے بانی کا پہلا استاذ، مرزا غلام قادر بیگ، مرزا غلام احمد قادیانی کا بھائی تھا، لہٰذا یہ کہا جاسکتا ہے کہ قادیانیت اور بریلویت دونوں استعمار کی خدمت میں بھائی بھائی ہیں"۔

(عطیہ محمد سالم، تقدیم البریلویہ، عربی، مطبوعہ لاہور، ص۴)

بغض اور حسد ایسی روحانی مہلک بیماریاں ہیں کہ جب انسانی دل ودماغ پر اثر انداز ہوتی ہیں تو انسان میں حق و انصاف کی صلاحیت ختم ہوجاتی ہے، تحقیق اور حق کی راہیں مسدود ہوجاتی ہیں اور انسان شکوک وشبہات کی عمیق دلدل میں پھنس کر راہِ حق اور صراطِ مستقیم سے کوسوں دور ہوجاتا ہے۔

احسان الٰہی ظہیر غیر مقلد بھی ایسی خطرناک بیماریوں کا شکار ہوا، اور ایک صالح عاشق رسول پر بے جا بہتان لگایا۔ دنیا میں تو تعصب کے اندھے حواری واہ واہ کردیں گے، مگر میدانِ محشر میں احسان الٰہی ظہیر اور اس کے حواریوں کے پاس اس بہتان کا کیا جواب ہوگا؟

قارئین کرام! امام احمد رضا بریلوی علیہ الرحمہ کے ابتدائی کتب کے استاذ مولانا مرزا غلام قادر بیگ بریلوی علیہ الرحمہ اور مرزا غلام قادر بیگ گورداسپوری دو الگ الگ شخصیتیں ہیں۔ فاضل بریلوی علیہ الرحمہ کے استاذ کو مرزا غلام احمد قادیانی کا بھائی کہنا تحقیق و مطالعہ سے یتیم، سراسر ظلم عظیم اور بغض رضا کا سبب ہے۔ یہ دھاندلی اسی وقت تک چلتی ہے جب تک حقیقت سامنے نہ ہو، لیکن جب سحر طلوع ہوتی ہے تو اندھیرے بھاگنا شروع ہو جاتے ہیں۔ یہاں پر اعلیٰ حضرت کے استاذ گرامی مولانا حکیم مرزا غلام قادر بیگ علیہ الرحمہ والرضوان اور فرقۂ قادیانیت کا بانی اور انگریزوں کا ایجنٹ مرزا غلام قادر بیگ دونوں کو سوانحی جھلکیاں پیش کی جارہی ہیں، قارئین اندازہ لگا سکیں گے کہ دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

مولانا حکیم مرزا غلام قادر بیگ بریلوی بن حکیم مرزا حسن جان بیگ علیہ الرحمہ

حضرت مولانا حکیم مرزا غلام قادر بیگ بن حکیم مرزا حسن جان بیگ لکھنوی رحمہم اللہ تعالیٰ علیہ، یکم محرم الحرام ۱۲۴۳ھ/ ۲۵ر جولائی ۱۸۲۷ء کو محلہ جھوائی ٹولہ لکھنؤ (یوپی، ہندستان) میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ماجد نے لکھنؤ سے ترکِ سکونت کر کے بریلی میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ آپ کی رہائش بریلی شہر کے محلہ قلعہ میں جامع مسجد کے مشرقی جانب تھی۔ آپ کا رہائشی مکان بریلی شریف میں اب بھی موجود ہے۔ آپ کے بھائی مولانا مرزا مطیع اللہ بیگ بریلوی علیہ الرحمہ کے صاحبزادے مولانا مرزا محمد جان بیگ رضوی علیہ الرحمہ نے خاندانی تقسیم کے بعد ۱۹۱۴ء میں پرانے شہر بریلی میں سکونت کر لی تھی، مگر مولانا مرزا غلام قادر بیگ علیہ الرحمہ کی سکونت محلہ قلعہ ہی میں رہی۔

آپ کا خاندان نسلاً ایرانی یا ترکستانی مغل نہیں ہے بلکہ مرزا اور بیگ کے خطاباتِ اعزاز، شاہانِ مغلیہ کے عطا کردہ ہیں، اسی مناسبت سے آپ کے خاندان کے ناموں کے ساتھ مرزا اور بیگ کے خطابات لکھے جاتے رہے ہیں۔ آپ کا سلسلۂ نسب حضرت خواجہ عبیداللہ احرار نقشبندی علیہ الرحمہ سے ملتا ہے، حضرت احرار رحمۃ اللہ علیہ نسلاً فاروقی تھے، اس طرح آپ کا سلسلۂ نسب حضرت سیدنا عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جا ملتا ہے۔

مغل بادشاہ ظہیر الدین بابر اور اس کے والد، حضرت خواجہ عبیداللہ احرار سے بیعت تھے۔ اس لیے بابر اور اس کے جانشین، حضرت خواجہ احرار کی اولاد سے فیض روحانی حاصل کرتے رہے۔ لیکن جلال الدین اکبر کے دور میں یہ سلسلہ منقطع ہو گیا اور اس خاندان کے بزرگ واپس وطن لوٹ گئے۔ مغل بادشاہ نورالدین جہانگیر نے اپنے دور میں اپنے خاندانی بزرگوں سے رجوع کیا، لہٰذا اس خاندان کے بزرگ تاجکستان سے پھر ہندستان آ گئے۔

امام احمد رضا خاں بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے اجدادِ کرام بھی شاہانِ مغلیہ سے وابستہ رہے ہیں۔
اسی زمانے سے ان دونوں خاندانوں کے قریبی روابط رہے ہیں۔ مولانا حکیم مرزا غلام قادر بیگ علیہ الرحمہ کے حقیقی بھائی مولانا مرزا مطیع اللہ بیگ علیہ الرحمہ کے پوتے مرزا عبدالوحید بیگ بریلوی کی دو ہمشیرگان، امام احمد رضا خاں علیہ الرحمہ کے خاندان میں بیاہی گئیں، ایک حضرت مفتی تقدس علی خاں رحمۃ اللہ علیہ کے تایا زاد بھائی حافظ ریاست علی خاں مرحوم کو اور دوسری فرحت علی خاں کے فرزند شہزادے علی خاں مرحوم کو۔

مولانا مرزا غلام قادر بیگ علیہ الرحمہ کے بھائی مولانا مرزا مطیع اللہ بیگ جب جامع مسجد بریلی کے متولی مقرر ہوئے تو آپ نے مسجد سے ملحقہ امام باڑے سے عَلم اور جھنڈے وغیرہ اُتروا دیے۔ آپ کے اس فعل سے بعض جاہل شرپسند رافضی لوگ آپ کے خلاف ہوگئے، تو اس وقت امام احمد رضا علیہ الرحمہ کے دادا مولانا رضا علی خاں رحمۃ اللہ علیہ نے فتویٰ دیا تھا کہ متولی مسجد صحیح العقیدہ سُنّی حنفی ہیں اور عمارت مسجد سے امام باڑہ کو ختم کرنا شرعاً جائز ہے۔ یہ فتویٰ کرم خوردہ آج بھی بریلی شریف میں مولانا مرزا مطیع اللہ بیگ علیہ الرحمہ کے پوتے مرزا عبدالوحید بیگ کے پاس موجود ہے۔

مولانا مرزا غلام قادر بیگ علیہ الرحمہ اور امام احمد رضا بریلوی علیہ الرحمہ کے والد ماجد مولانا نقی علی خاں رحمۃ اللہ علیہ کے درمیان محبت و مروت کے پُرخلوص تعلقات تھے، اس لیے مولانا مرزا غلام قادر بیگ علیہ الرحمہ نے امام احمد رضا خاں بریلوی علیہ الرحمہ کی تعلیم اپنے ذمہ لے لی تھی۔ آپ کے دیگر تلامذہ آپ کے مطب واقع محلہ قلعہ متصل جامع مسجد بریلی ہی میں درس لیا کرتے تھے، مگر صغر سنی اور خاندانی وجاہت کی وجہ سے امام احمد رضا علیہ الرحمہ کو ان کے مکان پر ہی درس دیتے تھے۔ [۱]

امام احمد رضا علیہ الرحمہ نے ابتدائی کتابیں، میزان، منشعب وغیرہ مولانا مرزا غلام قادر بیگ علیہ الرحمہ سے پڑھیں۔ [۲]

مولانا عبدالمجتبیٰ رضوی لکھتے ہیں:

''اُردو اور فارسی کی ابتدائی کتب آپ (مولانا احمد رضا علیہ الرحمہ) نے مولانا مرزا غلام قادر بیگ بریلوی علیہ الرحمہ سے پڑھیں''۔ [۳]

پروفیسر محمد ایوب قادری (کراچی)، بریلی کے اسلامی مدارس کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مولانا محمد احسن نے بریلی کے اکابر و عمائد کے مشورے اور معاونت سے ایک مدرسہ باسم تاریخی ''مصباح التہذیب'' ۱۲۸۶ھ/۱۸۷۲ء میں قائم کیا...... اس مدرسہ کے پہلے مہتمم مرزا غلام قادر بیگ تھے''۔ [۴]

مولوی محمد حنیف گنگوہی دیوبندی لکھتے ہیں:

''اس مدرسہ (مصباح التہذیب) کے پہلے مہتمم مرزا غلام قادر بیگ تھے اور مولوی سخاوت حسین، سید کلب علی، مولوی شجاعت، حافظ احمد حسین اور مولوی حافظ حبیب الحسن درس دیتے تھے''۔[۵]

ملک العلما مولانا ظفر الدین بہاری علیہ الرحمہ لکھتے ہیں:

''مَیں نے جناب مرزا صاحب مرحوم ومغفور (مولانا مرزا غلام قادر بیگ) کو دیکھا تھا۔ گورا چٹا رنگ، عمر تقریباً اسی سال، داڑھی سر کے بال ایک ایک کر کے سفید، عمامہ باندھے رہتے۔ جب کبھی اعلیٰ حضرت کے پاس تشریف لاتے، اعلیٰ حضرت بہت ہی عزت وتکریم کے ساتھ پیش آتے، ایک زمانہ میں جناب مرزا صاحب کا قیام کلکتہ امر تلا لین میں تھا، وہاں سے اکثر سوالات کے جواب طلب فرمایا کرتے تھے، فتاویٰ رضویہ میں اکثر استفتا اُن کے ہیں۔ انہیں کے ایک سوال کے جواب میں اعلیٰ حضرت نے رسالہ مبارکہ ''تجلی الیقین بان نبینا سید المرسلین'' (۱۳۰۵ھ/۱۸۸۷ء) تحریر فرمایا ہے''۔[۶]

اس رسالہ کا ایک ایڈیشن مطبوعہ مطبع اہلِ سُنّت وجماعت بریلی، بار دوم ۱۳۳۰ھ راقم الحروف (خلیل احمد) کی نظر سے بھی گذرا ہے، اور ایک ایڈیشن ۱۴۱۵ھ/۱۹۹۴ء میں مرکزی مجلس رضا لاہور نے بھی شائع کیا۔

فتاویٰ رضویہ جلد سوئم، مطبوعہ مبارک پور (ہندستان) کے صفحہ ۸ پر ایک استفتا ہے جو مولانا مرزا غلام قادر بیگ علیہ الرحمہ نے ۲۱ر جمادی الآخر ۱۳۱۴ھ کو ارسال کیا تھا۔

فتاویٰ رضویہ، جلد گیارہ، مطبوعہ بریلی (ہندستان)، بار اوّل کے صفحہ ۴۵ پر ایک استفتا ہے جو مولانا مرزا غلام قادر بیگ علیہ الرحمہ نے کلکتہ دھرم تلا نمبرا سے ۵ر جمادی الآخر ۱۳۱۲ھ کو ارسال کیا تھا۔

مولانا مرزا غلام قادر بیگ علیہ الرحمہ کے دو فرزند اور دو دختران تھیں، دونوں دختران فوت ہوگئیں، بڑی دختر کے ایک پسر اور چھوٹی دختر کی اولاد بریلی شریف میں سکونت پذیر ہے، فرزند اکبر مولانا حکیم مرزا عبدالعزیز بیگ علیہ الرحمہ اور دوسرے فرزند حکیم مرزا عبدالحمید بیگ علیہ الرحمہ تھے۔

مولانا ظفر الدین بہاری علیہ الرحمہ لکھتے ہیں: ''خدا کے فضل سے (مولانا غلام قادر بیگ) صاحب اولاد ہیں۔ ایک صاحبزادہ جن کا نام نامی مرزا عبدالعزیز بیگ ہے، دینیات سے واقف اور طبیب ہیں...... بریلی کی جامع مسجد کے قریب مکان ہے، پنج وقتہ نماز اسی مسجد میں ادا کیا کرتے ہیں''۔[۷]

مولانا حکیم مرزا عبدالعزیز بیگ پہلے رنگون (برما) میں رہے، پھر کلکتہ میں طبابت کی، ایامِ

جوانی میں کلکتہ ہی میں سکونت رکھی، چنانچہ مولانا مرزا غلام قادر بیگ علیہ الرحمہ کبھی کبھی اپنے فرزندِ اکبر کے پاس کلکتہ تشریف لے جاتے تھے، پھر حکیم مرزا عبدالعزیز بیگ آخری ایام میں کلکتہ سے ترکِ سکونت کر کے بریلی شریف آگئے تھے اور وفات تک اپنے آبائی مکان میں سکونت پذیر رہے۔ آپ بڑے ہی علم وفضل والے، عابد، تہجد گزار، متقی اور صاحب کرامت بزرگ تھے۔ [۸]

مولانا حکیم مرزا عبدالعزیز بیگ علیہ الرحمہ کا وصال ۱۴/۱۵ شعبان ۱۳۷۷ھ کی درمیانی شب کو بریلی شریف میں ہوا، [۹] اور آپ لاولد فوت ہوئے۔ [۱۰]

دوسرے صاحبزادے مرزا عبدالحمید بیگ پہلے ریاست بھوپال میں رہے، پھر پیلی بھیت کے اسلامیہ انٹر کالج میں ملازم رہے، وہیں آپ کا وصال ہوا، مجرد تھے۔

مرزا محمد جان بیگ رضوی کی بیاض کے مطابق مولانا حکیم مرزا غلام قادر بیگ بریلوی کا وصال یکم محرم الحرام ۱۳۳۶ھ/ ۱۸/ اکتوبر ۱۹۱۷ء کو نوے سال کی عمر میں ہوا اور محلہ باقر گنج واقع حسین باغ بریلی میں دفن ہوئے۔ آپ کے بھائی مرزا مطیع اللہ بیگ علیہ الرحمہ بھی وہیں دفن ہیں۔ [۱۱]

حضرت پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعود احمد صاحب مدظلہٗ العالی نے ''حیاتِ مولانا احمد رضا خاں بریلوی'' مطبوعہ سیالکوٹ اور ''حیات امام اہلِ سُنّت'' مطبوعہ لاہور میں مولانا مرزا غلام قادر بیگ بریلوی علیہ الرحمہ کا جو سن وفات ۱۸۸۳ء تحریر کیا ہے، وہ درست نہیں ہے۔

مرزا غلام قادر بیگ بن مرزا غلام مرتضیٰ

مرزا بشیر احمد بن غلام احمد قادیانی لکھتا ہے:

> ''مرزا غلام مرتضیٰ بیگ جو ایک مشہور اور ماہر طبیب تھا۔ ۱۸۷۶ء میں فوت ہوا اور اس کا بیٹا غلام قادر اس کا جانشین ہوا۔ مرزا غلام قادر لوکل افسران کی امداد کے واسطے ہمیشہ تیار رہتا تھا اور اس کے پاس ان افسران جن کا انتظامی امور سے تعلق تھا، بہت سے سرٹیفکٹ تھے۔ یہ کچھ عرصہ تک دفتر ضلع گورداسپور میں سپرنٹنڈنٹ رہا، اس کا اکلوتا بیٹا صغر سنی میں فوت ہوگیا اور اس نے اپنے بھتیجے سلطان احمد کو متبنیٰ بنالیا تھا، جو غلام قادر کی وفات یعنی ۱۸۸۳ء/ ۱۳۰۱ھ تقریباً سے خاندان کا بزرگ خیال کیا جاتا تھا......اس جگہ یہ بیان کرنا ضروری ہے کہ مرزا غلام احمد جو مرزا غلام مرتضیٰ کا چھوٹا بیٹا تھا مسلمانوں کے ایک بڑے مشہور مذہبی سلسلہ کا بانی ہوا، جو احمدیہ سلسلہ کے نام سے مشہور ہوا۔'' [۱۲]

مولوی ابوالقاسم رفیق دلاوری دیوبندی لکھتے ہے:

''ان دنوں مرزا غلام احمد قادیانی کے بڑے بھائی غلام قادر دینا نگر (ضلع گورداسپور) کی تھانے داری سے معزول ہوکر عملہ کے پیچھے جوتیاں چٹخاتے پھرتے تھے''۔ [۱۳]

مولوی رفیق دلاوری دوسری جگہ لکھتے ہیں:

''مرزا غلام مرتضٰی نے ۱۸۷۶ء میں اسی سال کی عمر میں دنیائے رفتنی و گزشتنی کو الوداع کہا۔ ان کی سب سے بڑی اولاد مراد بی بی تھیں، جن کی شادی مرزا احمد بیگ ہوشیار پوری کے بھائی محمد بیگ یعنی بیگم طال عمرہا کے حقیقی چچا سے ہوئی تھی۔ ان سے چھوٹے غلام قادر تھے، جنہوں نے اپنی حیاتِ مستعار کے پچپن مرحلے طے کر کے ۱۸۸۳ء میں سفر آخرت کیا، ان سے شاہد جنت نامی ایک لڑکی تھی...... اور سب سے چھوٹے مرزا غلام احمد صاحب تھے۔'' (سیرۃ المہدی) [۱۴]

مرزا غلام قادر بیگ کے نام انگریزی حکومت کا ایک مکتوب:

''دوستانِ مرزا غلام قادر رئیسِ قادیان حفظہٗ، آپ کا خط ۲ ماہ حال کا لکھا ہوا ملاحظہ ایں جانب میں گزرا۔

''مرزا غلام قادر آپ کے والد کی وفات کا ہم کو بہت افسوس ہوا، مرزا غلام مرتضٰی سرکار انگریز کا اچھا خیر خواہ تھا اور وفا دار رئیس تھا۔ ہم خاندانی لحاظ سے آپ کی اسی طرح عزت کریں گے جس طرح تمہارے باپ کی کی جاتی تھی۔ ہم کسی اچھے موقع کے نکلنے پر تمہارے خاندان کی بہتری اور پا بحالی کا خیال رکھیں گے۔

المرقوم ۲۹/ جون ۱۸۷۶ء

الراقم سررابرٹ ایجرٹن صاحب فنانشل کمشنر پنجاب'' [۱۵]

سندِ خیر خواہی مرزا غلام مرتضٰی ساکن قادیان:

''میں (مرزا غلام احمد قادیانی) ایک ایسے خاندان سے ہوں کہ جو اس گورنمنٹ کا پکا خیر خواہ ہے۔ میرا والد مرزا غلام مرتضٰی گورنمنٹ کی نظر میں ایک وفا دار اور خیر خواہ آدمی تھا، جن کو دربارِ گورنری میں کرسی ملتی تھی اور جن کا ذکر مسٹر گریفن کی تاریخ ''رئیسانِ پنجاب'' میں ہے۔ اور ۱۸۵۷ء میں انہوں نے اپنی طاقت سے بڑھ کر سرکارِ انگریزی کی مدد کی تھی، یعنی پچاس سوار اور گھوڑے بہم پہنچا کر عین زمانۂ غدر کے وقت سرکارِ انگریزی کی امداد میں دیئے تھے۔ ان خدمات کی وجہ سے جو چٹھیات خوشنودی حکام ان کو ملی تھیں۔ مجھے افسوس ہے کہ بہت سی ان میں سے گم ہوگئیں مگر تین چٹھیاں جو مدت سے چھپ چکی ہیں ان کی نقلیں حاشیہ میں درج کی گئیں ہیں۔ پھر میرے والد صاحب کی وفات پر میرا بڑا بھائی مرزا غلام قادر، خدماتِ سرکاری میں مصروف رہا۔ الخ

پروفیسر محمد ایوب قادری لکھتے ہیں:

''یہ تحریر مرزا غلام احمد قادیانی کی ہے جس میں دکھایا گیا ہے کہ یہ خاندان سرکارِ برطانیہ کا ہمیشہ وفادار رہا ہے اور ۱۸۵۷ء میں مرزا غلام احمد قادیانی کے والد غلام مرتضیٰ اور بڑے بھائی مرزا غلام قادر نے سرکارِ برطانیہ کی نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیے اشتہار ''واجب الاظہار'' از مرزا غلام احمد قادیانی (قادیان ۱۸۹۷ء) نیز ''کشف الغطاء'' از مرزا غلام احمد قادیانی، (قادیان ۱۹۰۶ء)'' [۱۶]

خلاصۂ کلام

۱۔ مولانا مرزا غلام قادر بیگ بریلوی علیہ الرحمہ ایک صحیح العقیدہ مسلمان، اللہ جل جلالہٗ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے وفادار تھے۔ جب کہ مرزا غلام قادر بیگ قادیانی، انگریزی حکومت کا وفادار اور قادیان کا رئیس تھا۔

۲۔ مولانا مرزا غلام قادر بیگ بریلوی ماہر علوم دینیہ، کامیاب مدرس وطبیب تھے، جب کہ مرزا غلام قادر قادیانی دینا نگر (ضلع گورداسپور، مشرقی پنجاب، ہندستان) کا معزول تھانیدار تھا۔

۳۔ مولانا مرزا غلام قادر بیگ بریلوی کے والد ماجد کا نام مرزا حسن جان بیگ لکھنوی ہے، جب کہ مرزا غلام قادر بیگ قادیانی کے والد کا نام مرزا غلام مرتضیٰ بیگ قادیانی ہے۔

۴۔ مولانا مرزا غلام قادر بیگ کا سن وفات ۱۹۱۷ء ہے جب کہ مرزا غلام قادر قادیانی ۱۸۸۳ء میں فوت ہوا۔

۵۔ مولانا مرزا غلام قادر بیگ کی عمر ۹۰ سال ہوئی، جب کہ مرزا غلام قادر قادیانی کی عمر ۵۵ سال ہوئی۔

۶۔ مولانا مرزا غلام قادر بیگ علیہ الرحمہ کے دو صاحبزادے حکیم مرزا عبدالعزیز بیگ اور مرزا عبدالحمید بیگ تھے جب کہ مرزا غلام قادر بیگ قادیانی کا ایک ہی بیٹا تھا جو صغر سنی میں فوت ہوگیا تھا۔

ان تمام حقایق وشواہد سے ثابت ہوا کہ مولانا مرزا غلام قادر بیگ بریلوی علیہ الرحمہ اور مرزا غلام قادر بیگ قادیانی، دو الگ الگ شخصیتیں ہیں، ان کو ایک شخصیت قرار دینا افترا اور دروغ گوئی کے سوا کچھ نہیں۔ **وما علینا الا البلاغ المبین**

ماخذ و مراجع

[۱] ماہ نامہ ''سنّی دنیا'' بریلی، مضمون ''مولانا حکیم مرزا غلام قادر بیگ بریلوی'' مضمون نگار، مرزا عبدالوحید بیگ، شمارہ جون ۱۹۸۸ء، ص ۳۷

[۲] مولانا ظفر الدین بہاری، حیات اعلیٰ حضرت، مطبوعہ کراچی، ج ۱، ص ۳۲

[۳] مولانا عبدالمجتبیٰ رضوی، تذکرہ مشائخ قادریہ رضویہ، مطبوعہ لاہور ۱۹۸۹ء، ص ۳۹۴

[۴] پروفیسر محمد ایوب قادری، مولانا محمد احسن نانوتوی، مطبوعہ کراچی ۱۹۶۶ء، ص ۸۲

[۵] مولوی محمد حنیف گنگوہی، ظفر المحصلین باحوال المصنفین، مطبوعہ کراچی ۱۹۸۶ء، ص ۲۹۵

[۶] مولانا ظفر الدین بہاری، حیات اعلیٰ حضرت، مطبوعہ کراچی، ج ۱، ص ۳۲

[۷] مولانا ظفر الدین بہاری، حیات اعلیٰ حضرت، مطبوعہ کراچی، جلد اوّل، ص ۳۲

[۸] ماہ نامہ ''سنّی دنیا'' بریلی، شمارہ جون ۱۹۸۸ء، ص ۴۰

[۹] مولوی عبدالعزیز خاں عاصی (متوفی ۱۴/ اپریل ۱۹۶۴ء)، تاریخ روہیل کھنڈ و تاریخ بریلی، مطبوعہ کراچی ۱۹۶۳ء، ص ۲۹۹، ۳۰۰

[۱۰] ماہ نامہ سنّی دنیا، بریلی، شمارہ جون ۱۹۸۸ء، ص ۴۰

[۱۱] ماہ نامہ سنّی دنیا، بریلی، شمارہ جون ۱۹۸۸ء، ص ۴۰

[۱۲] سیرت المہدی، مطبوعہ قادیان ضلع گورداس پور (مشرقی پنجاب، انڈیا) ۱۹۳۵ء، ص ۱۳۵

(نوٹ): ۷/ ستمبر ۱۹۷۴ء کو پاکستان کے وزیر اعظم جناب ذوالفقار علی بھٹو کے دور حکومت میں احمدیہ سلسلہ کو غیر مسلم قرار دے دیا گیا۔

[۱۳] مولوی ابوالقاسم محمد رفیق دلاوری، رئیس قادیان، مطبوعہ مجلس ختم نبوۃ حضوری باغ روڈ ملتان ۱۳۹۷ھ/ ۱۹۷۷ء، جلد اوّل، ص ۱۱

[۱۴] مولوی ابوالقاسم محمد رفیق دلاوری، رئیس قادیان، مطبوعہ ملتان ۱۹۷۷ء، ج ۱، ص ۱۱

[۱۵] مرزا بشیر احمد بن غلام احمد قادیانی، سیرت المہدی، طبع قادیان ۱۹۳۵ء حصہ اول، ص ۱۳۴

ایضاً۔ پروفیسر محمد ایوب قادری، جنگ آزادی ۱۸۵۷ء، مطبوعہ کراچی ۱۹۷۶ء، ص ۵۱۲

[۱۶] پروفیسر محمد ایوب قادری، جنگ آزادی ۱۸۵۷ء، مطبوعہ کراچی ۱۹۷۶ء، ص ۵۰۸، ۵۰۹

OOOOOOOOO

امام احمد رضا علیہ الرحمہ پر الزامات کا جائزہ (حصہ دوم)

اعتــــراض (۱): چند دن ہوئے ایک دوست نے بتایا کہ ایک وھابی ویب سائٹ پر اعلیٰ حضرت بریلوی پر ایک مضمون اور اس پر مختلف لوگوں کے اعتراضات و تاثرات آئے ہیں، میں نے بھی یہ سائٹ وزٹ کی، ایک باذوق نامی غیر مقلد لکھتا ہے:

''مسلکِ بریلویت کے ایک قلم کار اور خلیفہ ظفر الدین بہاری نے اپنے اعلیٰ حضرت کا ایک خط اپنی کتاب میں نقل کیا ہے، جس سے معلوم ہوسکتا ہے کہ بریلویت کے بانی جناب احمد رضا خان کا مبلغ علم کتنا تھا؟

جناب احمد رضا خان اپنے ایک معاصر کو مخاطب کر کے لکھتے ہیں ''تفسیر روح المعانی کون سی کتاب ہے اور یہ آلوسی بغدادی کون ہیں؟ اگر ان کے حالات زندگی آپ کے پاس ہوں تو مجھے ارسال کریں۔'' (بحوالہ حیات اعلیٰ حضرت، ۲۶۶)

جو محترم اعلیٰ حضرت ایک معروف مفسر قرآن محمود آلوسی کے نام سے تک نا واقفیت کا اعلان کرتے ہوں، علم رجال پر آپ جناب کی کیسی دسترس ہوگی، کیا یہ بتانے کی کوئی ضرورت بھی ہے؟''

جواب: عرض ہے کہ پہلی بات تو یہ ہے کہ اس غیر مقلد وہابی نے ''حیات اعلیٰ حضرت'' کتاب دیکھی ہی نہیں ورنہ یہ نہ لکھتا کہ ''اپنے ایک معاصر کو مخاطب کر کے لکھتے ہیں'' اور اس کتاب کا صفحہ بھی غلط نہ لکھتا۔

اس مکتوب میں مخاطب مولانا ظفر الدین بہاری ہی ہیں اور اس کا درست صفحہ نمبر ۲۶۲ ہے۔ ''حیاتِ اعلیٰ حضرت'' حصہ اوّل از مولانا ظفر الدین بہاری علیہ الرحمہ، مطبوعہ مکتبہ رضویہ، آرام باغ کراچی، ص ۲۶۲ پر امام احمد رضا بریلوی علیہ الرحمہ کا ایک مکتوب محررہ ۱۷/ذی الحجہ یوم الخمیس ۱۳۳۳ھ بنام مولانا ظفر الدین بہاری علیہ الرحمہ شائع ہے، جس کے شروع میں درج ذیل عبارت ہے:

''السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، عبارات تفاسیر آئیں، مابقی بھی درکار ہیں، (تفسیر) جمل وجلالین یہاں ہیں، یہ روح المعانی کیا ہے؟ یہ آلوسی بغدادی کون ہے، بظاہر کوئی نیا شخص ہے اور آزادیٔ زمانہ کی ہوا کھائے ہوئے ہے۔ مصنف کا ترجمہ (یعنی حالات) یا کتاب کا سال تالیف لکھا ہو تو اطلاع دیجیے''۔

مولوی قاضی زاہد الحسینی، خلیفہ مجاز مولوی حسین احمد کانگریسی لکھتے ہیں:

''علامہ ابوالثناء شہاب الدین السید محمود آفندی بغدادی بغداد کے قریب کرخ نامی قصبہ میں ۱۲۱۷ھ میں پیدا ہوئے، آپ کے آبا و اجداد کا اصلی وطن آلوس تھا اس لیے آلوسی کہلائے، آپ کی تصانیف میں قرآن مجید کی تفسیر ''روح المعانی'' متداول اور مطبوعہ ہے جو کہ ۴۳ سال کی عمر میں ۱۲۶۷ھ میں اسے مکمل کیا، اس دور ترکی کے وزیر اعظم علی رضا پاشا نے اس کا نام روح المعانی رکھا۔ بروز جمعہ ۲۵/ذی قعدہ

۱۲۷۰ھ میں فوت ہوئے اور شیخ معروف کرخی علیہ الرحمہ کے قبرستان میں دفن ہوئے۔''

(نوٹ: عمر رضا کحالہ نے معجم المؤلفین، مطبوعہ بیروت، لبنان، جلد ۱۲، ص ۱۷۵ پر پیدائش و وفات کے یہی سنین لکھے ہیں۔)

علامہ آلوسی بغدادی ۱۲۷۰ھ میں فوت ہوئے ، ۱۳۰۱ھ میں علامہ محمود آلوسی علیہ الرحمہ کے بیٹے نعمان آلوسی نے تفسیر روح المعانی کو شائع کیا (مشہور غیر مقلد مولوی حافظ صلاح الدین یوسف نے اپنی ''قبر پرستی'' مطبوعہ مکتبہ ضیاء الحدیث لاہور، طبع سوم ۱۹۹۲ء کے صفحہ ۱۶ پر طبع قدیم کا یہی سن طباعت لکھا ہے اوراپنی تائید میں اس کا حوالہ بھی دیا ہے)، امام احمد رضا بریلوی علیہ الرحمہ نے مولانا ظفرالدین بہاری علیہ الرحمہ کو مذکورہ خط ۱۳۲۳ھ میں لکھا، صاف ظاہر ہے کہ یہ تفسیر نئی نئی چھپی تھی اوراس زمانے میں ہندستان میں مصر سے کتابیں فوراً نہیں پہنچتی تھیں، تو ایک جدید تفسیر کے متعلق مولانا احمد رضا نے دریافت کرلیا تو اس سے علم الرجال میں کیا لاعلمی ثابت ہوگئی؟

کیا معترض اوراس کے جید علما کو آج سے تیس سال پہلے کی تمام اہم کتابوں کے متعلق مکمل علم ہے؟ کہ کون کون سی کتاب چھپی تھی اور کہاں چھپی تھی؟ کس موضوع پر ہے، اس کا مصنف کون ہے؟ اور اُس کے حالات زندگی کیا ہیں؟ نہیں ہوگا اور یقیناً نہیں ہوگا، غیر مقلدین وہابی خدا کا خوف کریں، مخالفت کرنے کے لیے کوئی معقول اعتراض لائیں، کیا یہ بھی کوئی طعن کی بات ہے؟

اعتـــراض (۲): مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے نزدیک ''مرتدین مرد یا عورت کا تمام جہان میں جس سے نکاح ہوگا مسلم ہو یا کافر اصلی یا مرتد انسان ہو یا حیوان محض باطل اور زناء خالص ہوگا۔'' (ملفوظاتِ اعلیٰ حضرت بریلوی، حصہ دوم۔ احکامِ شریعت حصہ اوّل) کیا بریلوی حضرات کے نزدیک انسان کا نکاح غیر انسان سے ممکن ہے؟

اس سلسلے میں پہلا جواب تو یہ ہے کہ یہاں لف ونشر مرتب ہے۔ مسلم کو انسان اور غیر مسلم کو حیوان سے تشبیہ دی گئی ہے، اور غیر مسلم کو قرآن میں **کالانعام بل هم اضل** (حیوانوں کی طرح بلکہ اُن سے بھی گئے گزرے) قرار دیا گیا ہے۔ جس طرح قرآن کے اس مقام سے غیر مسلم کو تکلیف ہوتی ہے، اسی طرح مولانا احمد رضا خاں کے اس مقام سے کافر اصلی و مرتد کو تکلیف ہوتی ہے۔

دوسرا جواب برسبیلِ تنزل یہ ہے کہ یہاں مبالغہ بالمحال ہے اور مختلف کاموں کی ترغیب یا ترھیب کے لیے مبالغہ بالمحال کا استعمال جائز ہے۔ مثال کے طور پر ایک حدیث پاک میں ہے کہ جس نے اللہ کی رضا کے لیے مسجد بنائی، اگرچہ وہ تیتر کے گھونسلے جتنی ہو تو اللہ تعالیٰ اُس کا گھر جنت میں بنائے گا۔ (سنن ابن ماجہ، کتاب المساجد والجماعات، ج۱، ص۲۴۴، حدیث ۷۳۸۔ مسند امام احمد بن

حنبل، ج۱، ص ۲۴۱۔ صحیح ابن حبان، ج۴، ص ۴۹۰، حدیث ۱۶۱۰۔ صحیح ابن خزیمہ، ج۲، ص ۲۶۹، حدیث ۱۲۹۲۔ المسند الطیالسی، ج۱، ص۶۲، حدیث۴۶۱۔ البیہقی شعب الایمان، ج۳، ص۸۱، حدیث ۲۹۴۲۔ التاریخ الکبیر البخاری، ج۱، ص۳۳۱، حدیث۱۰۴۶۔ جمع الفوائد، حدیث ۱۱۸۱، ۱۱۸۲۔ کنزالعمال، حدیث ۲۰۷۲۷، ۲۰۷۲۸، ۲۰۷۵۳)

مخالفین امام احمد رضا میں سے کون سا معترض ایسا ہے جو گھونسلے جتنی مسجد میں دو رکعت نماز شکرانہ ادا کر سکے؟ مبالغہ بالمحال سے جس طرح ترغیب جائز ہے تو ترھیب بھی جائز ہے۔

کلکِ رضا ہے خنجر خونخوار برق بار
اعدا سے کہہ دو خیر منائیں، نہ شر کریں

اعتراض (۳): معترض کا یہ کہنا کہ مولانا احمد رضا خاں نے آیت کریمہ **اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُم** کا ترجمہ کرتے ہوئے ''ظاہر صورت بشری'' کے الفاظ استعمال کر کے تحریف کی ہے۔

تو اس کا جواب یہ کہ مولانا احمد رضا خاں علیہ الرحمہ کا ترجمہ قرآن محض لفظی ترجمہ نہیں ہے (اور محض لفظی ترجمہ قرآن مجید میں ہر جگہ کرنا شرعاً ممکن بھی نہیں)۔ مولانا احمد رضا خاں کا ترجمہ تفسیری ترجمہ ہے، جو دیگر آیات واحادیث کی روشنی میں کیا گیا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں آیا ہے **قُلْ لَّوْ کَانَ فِی الْاَرْضِ مَلٰٓئِکَۃٌ یَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّیْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَیْھِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَکًا رَّسُوْلًا** (سورۃ بنی اسرائیل، آیت ۹۵) ''کہ اگر زمین میں فرشتے ہوتے جو اطمینان سے چلتے پھرتے تو پھر ہم اُن پر آسمان سے فرشتہ رسول بھیجتے''۔ اس آیت سے دو باتیں معلوم ہوئیں، پہلی بات تو یہ معلوم ہوئی کہ زمین پر چونکہ بشر رہتے ہیں لہٰذا اُن کی طرف بشر رسول بھیجے گئے ہیں، اور دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ مَلک رسول جن پر نازل ہوتے ہیں (یعنی انبیا کرام) تو اُن کا باطن مَلکی (یعنی فرشتوں والا نوری) ہوتا ہے، اور اس کے نتیجے کی تائید میں وہ روایات ہیں جن میں آیا ہے کہ انبیا کے جسموں کی نشوونما اہلِ جنت کی روحوں (ملائکہ) کی طرز پر ہوتی ہے۔ (کنزالعمال، حدیث ۳۲۲۵۱، ۳۲۲۵۲، ۳۵۵۶۰) اور بخاری ومسلم میں حضرت ابوسعید رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ''انی لست کھیئتکم'' (بخاری، حدیث ۱۹۶۳، مسلم کتاب الصیام، حدیث ۵۵) ''یعنی مَیں حقیقت کے لحاظ سے تم جیسا نہیں ہوں''، اگر انبیا کرام کی حقیقت وہیئت اور باطن مَلکی (نوری) نہ تھا تو اُن پر مَلک رسول کا نزول کیونکر درست ہوا؟ اس صورت میں تو نزولِ ملائکہ، نزولِ وحی وکتاب ہی مذکورہ آیت کی رو سے سرے سے درست نہیں رہتا۔ ان شرعی دلائل کی روشنی میں مولانا احمد رضا خاں نے ترجمہ کیا تھا کہ مَیں ظاہری صورتِ بشری میں تم جیسا ہوں۔ اگرچہ اس میں بھی تواضع وانکساری موجود ہے۔ اس

لیے ''تم جیسا'' فرمایا گیا، تمہارے برابر نہیں فرمایا گیا۔ مولانا احمد رضا خاں کے ترجمے میں اس مقام پر اعتراض کرنا دیگر نصوص سے آنکھیں بند کرنے کا نتیجہ ہے، جو کھلی آنکھ والوں کو زیب نہیں دیتا۔

اعتراض (۴): وَالنَّجْمِ إِذَا هَوَىٰ (سورۃ النجم، آیت ۱) کے ترجمے کے سلسلے میں بھی مولانا احمد رضا خاں علیہ الرحمہ پر اعتراض کیا ہے اور یہ پوچھا گیا ہے کہ کسی غیر بریلوی نے یہ معنی مراد لیا ہے؟

اس سلسلے میں عرض ہے کہ امام جعفر صادق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہی منقول ہے کہ یہاں نجم سے مراد نبی کریم ﷺ ہیں۔ چنانچہ قاضی عیاض مالکی رحمۃ اللہ علیہ کتاب ''الشفاء'' میں، ملا علی قاری اور علامہ شہاب الدین خفاجی اپنی اپنی شرح شفاء میں، امام رازی تفسیر کبیر میں، تفسیر خازن و معالم التنزیل میں، تفسیر سراج المنیر میں، تفسیر بحر المحیط میں تفسیر الجامع لاحکام البیان لقرطبی میں، تفسیر روح المعانی میں یہ معنی دیگر معانی کے ساتھ ساتھ موجود ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ قرآن ذو وجوہ ہے اور اسے احسن الوجوہ پر محمول کرنا چاہیے۔ یعنی یہ کثیر المعانی ہے اور حسین ترین معنی لینا چاہیے۔ مولانا احمد رضا خاں کو اس مقام پر امام جعفر صادق والا معنی زیادہ اچھا لگا، انہوں نے وہ معنی پیش کر دیا۔ نبی کریم ﷺ مشبہ ہیں اور ستارہ مشبہ بہ ہے اور وجہ تشبیہ دونوں کا نورانی ہونا اور پیارا لگنا ہے۔ اسی لیے مولانا احمد رضا خاں نے پوری تشریح کے ساتھ اس تشبیہ کو بیان کرتے ہوئے لکھا ''اس پیارے چمکتے تارے محمد (ﷺ) کی قسم جب یہ معراج سے اُترے''، رہ گئی ''صلی اللہ علیہ وسلم'' کے الفاظ ترجمے میں داخل نہ کرنے کی بات کہ مولانا احمد رضا نے اس آیت کے ترجمے میں لفظ ''محمد'' کے ساتھ ''صلی اللہ علیہ وسلم'' نہیں لکھا، تو کیا ہمارے مخالفین کے یہاں ترجموں میں جہاں جہاں بھی نبی کریم ﷺ کا نامِ مبارک یا ذکر مبارک یا ضمیر آئی ہے، وہاں اُن کے مترجمین نے ہر جگہ صلی اللہ علیہ وسلم استعمال کیا ہے؟ پہلے اپنے گھر کی تو خبر لو، ابھی ہم نے یہ بھی نہیں پوچھا کہ نبی کریم ﷺ نے ''صلی اللہ علیہ وسلم'' کے الفاظ کے ساتھ درود سکھایا ہے یا نہیں؟ البتہ لگے ہاتھوں یہ بتاتے چلیں کہ مولوی ثناء اللہ امرتسری غیر مقلد کے ترجمۂ قرآن کے غیر بریلوی حاشیے میں بھی یہ لکھا ہے کہ نجم سے نبی پاک ﷺ بھی مراد لیے گئے ہیں (حاشیہ ترجمہ ثنائی، ص ۶۳۰)، اور مولوی محمد بن بارک اللہ لکھوی غیر مقلد بھی اپنی پنجابی منظوم تفسیر محمدی میں یہ معنی تسلیم کر چکے ہیں۔

جعفر صادق کہے مراد محمد نجموں آیا
جاں شب معراج آسانوں لتھا طرف زمین سدھایا

(تفسیر محمدی، جلد ۷، ص ۳۸)

وللناس فی مایعشقون مذاهب

اعتراض (۵): شجرۂ رضویہ میں ہر بزرگ کے نام کے ساتھ جو درود شریف کے الفاظ ملتے ہیں، تو ان لفظوں میں پہلے نبی کریم ﷺ پر، پھر باقی بزرگانِ سلسلہ اور پھر اُس نام والے بزرگ پر درود پڑھا جاتا ہے۔ یہ اس طرح تبعاً درود شریف پڑھنا ہے، جو جائز ہے۔ اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے دُرودِ صدقہ کے الفاظ یوں سکھائے ہیں: ''**اللّٰھم صل علی محمد عبدک ورسولک وصل علی المؤمنین والمؤمنات والمسلمین والمسلمات.**''

(صحیح ابن حبان، ج۳، ص۷۶. الادب المفرد، حدیث ۶۴۰ . مسند ابویعلیٰ، ج ۲، حدیث ۱۲۹۷ . مجمع الزوائد، ج ۱۰، ص ۱۶۷ . احسن الکلام، ص۲۶، مطبوعہ سیالکوٹ، از مولوی عبدالغفور اثری غیر مقلد)

جب مسلمین ومسلمات اور مومنین ومؤمنات پر تبعاً دُرود بھیجنا جائز ہے، تو سلسلۂ قادریہ کے اولیا کرام نے کیا قصور کیا ہے؟ جب کہ اس شجرے میں بھی پہلی سطر میں نبی کریم ﷺ پر ہی درود بھیجا گیا ہے، اگر یہاں اعتراض جائز ہے تو پھر کیا دُرودِ صدقہ پر بھی معاذ اللہ جائز ہوگا؟

اعتراض (۶): اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خاں کے نام کے ساتھ رضی اللہ عنہ کہنے پر بھی اعتراض کیا گیا ہے، حالانکہ قرآن پاک میں رضی اللہ عنہم کے الفاظ صرف مہاجرین وانصار کے ساتھ خاص نہیں ہیں بلکہ مہاجرین وانصار کی اتباع کرنے والے تمام افراد کے لیے یہ الفاظ ہیں۔ اسی لیے مولوی ثناء اللہ امرتسری غیر مقلد نے ترجمہ کیا ''مہاجرین وانصار اور جو اُن کی نیک روش کے تابع ہوئے (آج سے قیامت تک) خدا اُن سب سے راضی ہے اور وہ خدا سے راضی'' (ترجمہ ثنائی، ص۲۴۳، سورۃ توبہ، آیت نمبر ۱۰۰، مطبوعہ فاروقی کتب خانہ ملتان)۔ لیجیے اب تو قیامت تک کے تمام نیک روش والے لوگ رضی اللہ عنہم قرار پائے ہیں۔ سورۃ البینۃ میں ایمان، اعمالِ صالحہ اور خشیتِ الٰہی کے جامع افراد کو رضی اللہ عنہم کے الفاظ سے یاد کیا گیا اور سورۃ توبہ میں اتباعِ صحابہ اور حالتِ احسان کو اپنانے والوں کو رضی اللہ عنہم کی خبر سے نوازا گیا۔ (سورۃ فاطر، آیت ۲۸ میں خشیتِ الٰہیہ والوں کو علمائے حق مانا گیا)، ان آیات کی روشنی میں ایمان، اعمالِ صالحہ، اتباعِ صحابہ، خشیتِ الٰہی اور حالتِ احسان کے ساتھ عبادت کرنے والوں کو رضی اللہ عنہم کے الفاظ کا حق دار ماننا پڑتا ہے۔ اگر مخالفین میں ان صفات کے جامع افراد موجود نہ ہوں تو اس میں ہمارا کیا قصور ہے؟ حیرانی کی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تو رضی اللہ عنہم کے الفاظ بطورِ خبر بولے، کیا اُن الفاظ کو ہم بطورِ دُعا کسی کے لیے بھی نہیں بول سکتے؟ اور دریافت طلب یہ امر ہے کہ ہمارے مخالف جب کسی صحابی کا نام لے کر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں تو وہ رضی اللہ عنہ کے الفاظ بطورِ خبر بولتے ہیں یا بطورِ دُعا؟ اگر بطورِ دعا بولتے ہیں تو کس

آیت یا حدیث میں آیا ہے کہ جب صحابی کا نام لو تو رضی اللہ عنہ کے لفظوں سے اُسے دعا دیا کرو اور بعد والوں کے لیے کسی کو بھی یوں نہ کہو کہ "اللہ تجھ سے راضی ہو"۔

اعتراض (۷): وقعات السنان کی زبان پر اعتراض کا جواب

نبی کریم ﷺ کے مخالفین کی توہین کرنے کے لیے صریح یا پہلودار کلمات کا استعمال ہرگز گناہ نہیں۔ قرآن وحدیث میں اُن کے لیے ملعون، خبیث، کتا، گدھا، جانور، جانوروں سے بدتر، شرّ البریہ وغیرہ کے کلمات ملتے ہیں۔ گستاخ رسول کے لیے سورۃ القلم میں زنیم (بداصل، حرام زادہ) کا لفظ ملتا ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عروہ بن مسعود کو ایک ایسے ہی موقع پر فرمایا تھا امصص بظر اللات، یعنی لات کی بظر کو چوس (Suck the Clitoris of Laat) (بخاری، کتاب الشروط، باب الجہاد والمصالحہ...... حدیث نمبر ۳۲۔۲۷۳۱)۔ (لغات الحدیث، جلد۱، ص۷۵، از نواب وحید الزماں)

(ظلم و ظالم کے خلاف) مظلوم کی زبان سے نکلے ہوئے سخت الفاظ (جھر بالسوء من القول) بھی اللہ کو محبوب ہیں۔ (سورۃ نساء، آیت ۱۴۸)

اعلیٰ حضرت نے اپنی تصنیف "وقعات السنان" میں توہین کا پہلو رکھنے والی عبارات اس لیے لائی گئیں کیونکہ مخالف اپنی گستاخانہ عبارات کے بزعم خویش غیر توہینی پہلو پیش کرتے تھے۔ تو جواب میں ایسی زبان اُن کے اکابر کے بارے میں بولی گئی، جس میں ایک پہلو گستاخی کا بھی تھا۔ پہلو دار گستاخانہ زبان سے اُنہیں یہ جتلانا مقصود تھا کہ درست معنی ملنے کے باوجود بھی گستاخانہ پہلو غالب رہتا ہے اور آج تک وقعات السنان کی زبان کے اس پہلو کو دکھا کر وہ چیخ رہے ہیں اور یہی وقعات السنان کا مقصود تھا کہ واضح ہوجائے کہ پہلو دار زبان اور احتمال دار عبارت کے عرف میں گستاخانہ مفہوم کو غالب مانا جائے گا اور دوسرے پہلو مسترد کردیے جائیں گے۔

اعتراض (۸): مولانا احمد رضا خاں کی کتاب "سبحان السبوح" کی عبارات پر بھی اعتراض کیا جاتا ہے۔ تو عرض ہے کہ سبحان السبوح اور فتاویٰ رضویہ میں وہابیہ کے اُس معروف قاعدے کی حقیقت کھولی گئی ہے کہ جب تم کہتے ہو کہ "اگر خدا جھوٹ نہ بول سکے تو بندے کی قدرت خدا سے بڑھ جائے گی اور جیسی برائی بندہ کرسکتا ہے ویسی خدا بھی کرسکتا ہے۔" (مفہوم رسالہ "یک روزی" وغیرہ)

وہابیہ کے اس عقیدہ کی رو سے دنیا جہان میں جو بھی بندہ جس قسم کی بھی برائی کررہا ہے، وہ خدا بھی کرسکتا ہے۔ ان برائیوں کو خدا کے لیے ممکن و مقدور ماننا خدا کی گستاخی ہے۔ اس موقف کی قباحتوں کو مولانا احمد رضا خان اس قدر کھول کر بیان فرماتے ہیں کہ تمام مخالفین کو بھی اعتراف کرنا پڑا کہ یہ

نظریات تو اللہ تعالیٰ کی توہین ہیں، اور یہی کچھ مولانا احمد رضا خان آپ سے منوانا چاہتے تھے، جو آج آپ بھی مان رہے ہیں۔

اعتراض (۹): ''علمائے اہلِ سنّت سے روحِ اعلیٰ حضرت کی فریاد'' نامی کتابچہ دیوبندیوں نے تقیہ کے طور پر لکھا ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کئی شیعہ ماضی میں بظاہر سُنّی بن کر کتابیں لکھتے رہے۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو کتاب ''میزان الکتب'' از مولانا محمد علی، جامعہ رسولیہ شیرازیہ، بلال گنج لاہور)۔ اسی طرح وہابیوں نے شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی علیہ الرحمہ کے نام سے ''البلاغ المبین'' اور ''تحفۃ الموحدین'' جیسی کتابیں لکھیں۔ یہ بدمذہبوں کا ایک پرانا حربہ ہے اور یہ منافقانہ حرکتیں منافقانہ مذاہب کو ہی زیب دیتی ہیں۔ ایسی کتابوں پر اُن کو فخر کرنا بھی سجتا ہے اور اس کتابچے میں تقریباً وہی مواد ہے جو کتاب ''رضا خانی مذہب'' میں مولانا احمد سعید قادری نے لکھا۔ اور یہ سب کچھ اور بہت کچھ لکھنے کے بعد کتاب رضا خانی مذہب کا مصنف اپنی باطل حرکتوں سے توبہ تائب ہوا اور حق قبول کر کے مولانا احمد رضا خاں فاضل بریلوی کے مسلک پر آگیا ہے، یہ چھوٹے موٹے پمفلٹ اُسی کتاب کے بغل بچے ہیں، ان کی کوئی حیثیت نہیں۔

امام احمد رضا بریلوی پر الزامات کا جائزہ (حصہ سوم)

(یہ مضمون انٹرنیٹ پر ''نورِ مدینہ ڈاٹ نیٹ'' سائٹ کے فورم میں ایک دیوبندی کے کیے گئے اعتراضات کا جواب ہے۔)

اعتراض: ''مولوی احمد رضا خاں صاحب شیعہ خاندان سے تھے، جیسا کہ ان کے نسب نامے سے ظاہر ہے: ''احمد رضا ولد نقی علی ولد رضا علی ولد کاظم علی''۔

نسب نامے سے کیا شیعت ظاہر ہو رہی ہے، کچھ پتا نہیں، بس جی نام شیعوں والے ہیں، کیا امام موسیٰ کاظم، امام علی رضا، امام نقی رحمہم اللہ تعالیٰ علیہ شیعہ تھے؟، لاحول ولا قوۃ الا باللہ

یہ ہے تحقیقِ دیوبند، ان جہلائے دیوبند کو اتنی شرم بھی نہیں آتی کہ اہلِ علم ہمارے اس استدلال کو پڑھ کر کیا کہیں گے۔ اب آیئے جہلائے دیوبند کے نسب ناموں کی طرف، رشید احمد گنگوہی کا نسب نامہ:

''رشید احمد بن ہدایت احمد بن پیر بخش بن غلام حسن بن غلام علی بن علی اکبر''

(تذکرۃ الرشید، مطبوعہ ادارہ اسلامیات، انارکلی لاہور، ص ۱۳)

قاسم نانوتوی کا نسب نامہ:

''محمد قاسم بن اسد علی بن غلام شاہ۔'' (سوانح قاسمی، جلد اوّل، ص ۱۱۳)

جہلائے دیوبند کے شیعوں والے نام: اشرف علی تھانوی، محمود حسن دیوبندی، حسین احمد

کانگریسی، اصغر حسین دیوبندی، مفتی مہدی حسن دیوبندی، ذوالفقار علی دیوبندی وغیرہ۔ ان تمام ناموں سے ثابت ہوا کہ جہلاے دیوبند شیعہ خاندان سے تھے، جیسا کہ اُن کے نام اور نسب ناموں سے ظاہر ہے۔

اعتراض: مولوی احمد رضا صاحب ''ملفوظات، حصہ اوّل ص ۱۰۲ میں لکھتے ہیں:

''حضرت امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے درجہ بدرجہ امام حسن عسکری تک یہ سب حضرات مستقل غوث ہوئے۔

یعنی حضرت علی، امام حسن، امام حسین، امام زین العابدین، امام باقر، امام جعفر صادق، امام موسیٰ کاظم، امام رضا، امام تقی، امام نقی، امام حسن عسکری۔ اور ''بغیر غوث کے زمین وآسمان قائم نہیں رہ سکتے۔''

(ملفوظات: احمد رضا اوّل، ص ۱۰۱)

قارئین! پہلی بات تو یہ ہے کہ ان جہلاے دیوبند کو اتنا بھی علم نہیں کہ ملفوظات، مولانا احمد رضا خاں علیہ الرحمہ کی تصنیف نہیں۔ ملفوظات، صاحبِ ملفوظ کی تصنیف نہیں ہوتے، یہ ملفوظات، مفتی اعظم ہند مولانا مصطفیٰ رضا خاں علیہ الرحمہ کے جمع کردہ اور مرتبہ ہیں۔ جاہلِ دیوبند نے اپنی جہالت کا مظاہرہ کرتے ہوئے لکھا کہ ''مولوی احمد رضا صاحب...... لکھتے ہیں''۔ ناطقہ سر بہ گریباں ہے اسے کیا کہیے

دوسری خیانت یہ کی کہ ملفوظات کی مکمل عبارت نہ لکھی بلکہ پورے صفحہ کے درمیان سے ایک سطر لے کر لکھ دی، اور لکھنے کا بھی فایدہ نہ ہوا، کیونکہ اس سے کوئی اعتراض نہیں بنتا۔ اگر ان بزرگوں کو غوث کہہ دیا تو کیا اعتراض ہے۔ مکمل عبارت میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو غوث اکبر و غوث ہر غوث کہا پھر سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو غوث کہا، پھر سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو غوث کہا، اسی طرح درجہ بدرجہ غوث کہتے ہوئے سیدنا عبدالقادر جیلانی رضی اللہ عنہ کو آخر میں سیدنا امام مہدی رضی اللہ عنہ کے متعلق فرمایا کہ انہیں غوثیتِ کبریٰ عطا ہوگی۔

ہماری سمجھ سے بالاتر ہے کہ اس عبارت میں کیا شیعیت ہے۔ اگر انہیں غوث کہنے پر اعتراض ہے تو مولوی محمود حسن دیوبندی نے رشید احمد گنگوہی کو بھی تو غوث اعظم کہا ہے۔

اگر اس بات پر اعتراض ہے کہ ''بغیر غوث کے زمین وآسمان قائم نہیں رہ سکتے'' تو توحید کے علم بردار مولوی اسماعیل دہلوی کی اس عبارت کے متعلق کیا کہیں گے، جو اولیا اللہ کے متعلق لکھتے ہیں:

''پس حکیم مطلق ان کو تصرفاتِ کونیہ میں واسطہ بناتا ہے، مثلاً نزول بارش و پرورش اشجار، سرسبزیٔ نباتات و بقائے انواع حیوانات و آبادیٔ قریہ وامصار، تقلب احوال و ادوار وتحویل افعال و ادبارِ سلاطین و انقلابِ حالات اغنیاء و مساکین اور ترقی وتنزل

صغار و کبار، اجتماع وتفرق جنود وعساکر و رفع بلاء و دفع وباء وغیرہ"۔

(منصب امامت، از مولوی اسماعیل دہلوی، مطبوعہ لاہور، ص ۱۱۰)

اگر جہلاے دیوبند کو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے حضرت حسن عسکری رضی اللہ عنہ تک کی سند سے دشمنی ہے تو سنیے اس سندِ مبارک کے متعلق محدثین نے کیا کہا: محدث احمد بن حجر الہیتمی المکی علیہ الرحمہ (متوفی ۹۷۴ھ) اپنی شہرہ آفاق کتاب "الصواعق المحرقة في الرد على اهل البدع والزندقة" میں لکھتے ہیں:

"حدثني ابو موسىٰ الكاظم عن ابيه جعفر الصادق عن ابيه محمد الباقر عن ابيه زين العابدين عن ابيه الحسين عن ابيه علي ابن ابي طالب رضي الله عنهم"

یہ سند بیان کر کے لکھتے ہیں: قال احمد: لو قرأت هذا الاسناد على مجنون لبرىء من جنته یعنی امام احمد بن حنبل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اگر یہ سند کسی مجنون پر پڑھ دی جائے تو اُس کا پاگل پن دور ہو جاتا ہے۔"

(الصواعق المحرقۃ (عربی)، مطبوعہ ترکی، ص ۲۰۵)

یہی سند سنن ابن ماجہ کے مقدمے میں حدیث نمبر ۶۵ کے تحت درج ہے:

"حدثنا علىّ بن موسىٰ الرضا عن ابيه عن جعفر ابن محمد عن ابيه عن علي ابن الحسين عن ابيه عن ابي طالب " ابن ماجہ کے دادا اُستاد ابوصلت نے کہا: لو قرىء هذا الاسناد على مجنون لبرا یعنی اس سند کو اگر مجنون پر پڑھا جائے تو اس کا جنون دور ہو جائے۔"

(کتب ستہ (ابن ماجہ)، مطبوعہ دارالسلام، ریاض، سعودی عرب)

لیکن کیا کیجیے، جہلاے دیوبند کی بدبختی کا کہ وہ اس بابرکت سند کو دیکھیں تو ان کا پاگل پن اور زیادہ ہو جاتا ہے۔

اعتراض: پھر اعتراض کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "الامن والعلیٰ" میں مولوی احمد رضا لکھتے ہیں:

"جواہر خمسہ کی سیفی میں وہ جواہر دار سیف خونخوار جسے دیکھ کر وہابیت بے چاری اپنا جوہر کرنے کو تیار، وہ نادِ علی ناد علياً مظهر العجائب تجده عونا لك في النوائب كل هم وغم سينجلي بولايتك يا علي يا علي يا علي، پکار علی مرتضیٰ کو کہ مظہر عجائب ہیں، تو انہیں اپنا مددگار پائے گا مصیبتوں میں، سب پریشانی و غم دور

ہوتے چلے جاتے ہیں حضور کی ولایت سے یا علی یا علی۔

مولوی احمد رضا اس نادِ علی سے وہابیت کا گوبر نکالتے ہیں اور ''الامن والعلیٰ'' میں حضرت علی کی دہائی دیتے ہیں (یا علی مشکل کشا مشکل کشا) اور لکھتے ہیں

''کاروبارِ عالم مولیٰ علی کے دامن سے وابستہ ہے۔'' (الامن والعلی ص ۱۱)

جب کہ مشہور محدث حضرت ملا علی قاری نے نادِ علی کو شیعوں کی نہایت بُری بات اور من گھڑت بتلایا ہے۔''

جہلاے دیوبند مولانا احمد رضا خاں رحمۃ اللہ علیہ پر تو خواہ مخواہ ناراض ہو رہے ہیں اور اصل بات کو چھپا رہے ہیں۔ ''الامن والعلیٰ'' اُٹھا کر دیکھیے مولانا احمد رضا علیہ الرحمہ تو حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی علیہ الرحمہ کی کتاب ''انتباہ فی سلاسل اولیا'' کا حوالہ دے کر ان ہی جہلاے دیوبند و وہابیہ سے پوچھ رہے ہیں کہ شاہ ولی اللہ کی کتاب ''انتباہ فی سلاسل اولیا'' سے تو ثابت ہے کہ اس دعاے سیفی کی سند ان کو ملی، جس میں یہی ''نادِ علی'' ہے تو کیا شاہ ولی اللہ مشرک بدعتی ہوئے یا نہیں؟ اور کیا شاہ ولی اللہ محدث دہلوی جیسے عالم کو یہ علم نہیں تھا کہ یہ نادِ علی شیعوں کی بُری بات اور من گھڑت ہے؟ لیکن خوفِ آخرت سے بے خوف یہ فراڈیے آنکھوں میں دھول جھونک کر اسے مولانا احمد رضا خاں علیہ الرحمہ کے ذمے لگا رہے ہیں۔

رہا یہ اعتراض کہ مولانا احمد رضا خاں علیہ الرحمہ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کو مشکل کشا کہا۔ تو جناب حضرت مولا علی کو مشکل کشا کہنے میں کچھ اور لوگ بھی شامل ہیں۔ وہ ہیں حاجی امداد اللہ مہاجر مکی اور مولوی حسین احمد کانگریسی، بلکہ سارے دیوبندی کیونکہ انہوں نے اپنے شجرۂ طریقت میں جہاں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نام آیا ہے، وہاں لکھا:

''ہادیِ عالم علی مشکل کشا کے واسطے''

(سلاسلِ طیبہ، از مولوی حسین احمد، مطبوعہ لاہور، ص ۱۴۔ ارشادِ مرشد، مطبوعہ کانپور، ص ۲۳)

دیوبندیوں کے پیر و مرشد اور دیوبندیوں کے شیخ الاسلام، اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور کو بھی مشکل کشا کہہ رہے ہیں، ان کے متعلق کیا خیال ہے؟

پھر اعتراض کرتے ہیں کہ مولانا احمد رضا خاں علیہ الرحمہ نے لکھا کہ ''کاروبارِ عالم، مولیٰ علی کے دامن سے وابستہ ہے''۔

مولانا احمد رضا خاں علیہ الرحمہ نے تو یہ سرخی جما کر شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی علیہ الرحمہ کی کتاب ''تحفۂ اثنا عشریہ'' کی عبارت ثبوت میں پیش کی ہے اور وہابیہ سے سوال کیا ہے کہ ان شرکیات

پر شاہ عبدالعزیز دہلوی اجماعِ اُمت بتارہے ہیں، لیکن بد دیانت جہلاے دیوبند نے شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی عبارت کا جواب دینے کی بجائے صرف سرخی نقل کر کے مولانا احمد رضا خاں علیہ الرحمہ کو شیعہ لکھ دیا، کیا کہنے ہیں دیوبندی جہلا کی دیانت کے۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی علیہ الرحمہ کی عبارت بھی سُن لیں:

''حضرت امیر و ذریۂ طاہرہ ورا تمام امت بر مثال پیران و مرشدان می پرستند و امور تکوینیہ را بایشان وابستہ می دانند و فاتحہ و درود و صدقات و نذر و منت بنام ایشاں رائج و معمول گردیدہ چنانچہ با جمیع اولیاء اللہ ہمیں معاملہ است۔''

(تحفۂ اثناعشریہ (فارسی)، مطبوعہ سہیل اکیڈمی لاہور ۱۳۹۵ھ/ ۱۹۷۵ء، ص ۲۱۴)

ترجمہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کی اولاد پاک کو تمام افرادِ اُمت پیروں اور مرشدوں کی طرح مانتے ہیں، اور اُمورِ تکوینیہ کو ان حضرات کے ساتھ وابستہ جانتے ہیں اور فاتحہ و درود و صدقات اور نذر و نیاز ان کے نام کی ہمیشہ کرتے ہیں جیسا کہ تمام اولیا اللہ کا یہی طریقہ اور معمول ہے۔

اب بد دیانت جہلاے دیوبند کے مشہور ناشر نور محمد کارخانہ کتب کراچی نے ''تحفۂ اثناعشریہ'' کا جو اُردو ترجمہ شائع کیا ہے، اُس میں اس عبارت کا ترجمہ ہی غائب کر دیا ہے۔

اعتراض: یہ اعتراض بھی کیا ہے کہ مولوی احمد رضا پنجتن کا وظیفہ پڑھتے ہیں:

"لی خمسة اطفیٰ بها حر الوبا الحاطمه : المصطفیٰ والمرتضیٰ وابنا هما الفاطمة."

میرے لیے پانچ ہستیاں ایسی ہیں جن کے وسیلے سے جلانے والی آفتوں کو بجھاتا ہوں، وہ پانچ یہ ہیں، حضور، حضرت علی، حضرت فاطمہ اور حسن اور حسین''۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **انما یرید اللہ لیذهب عنکم الرجس اهل البیت ویطهرکم تطهیرا.** (سورۃ احزاب، آیت ۳۳)

ترجمہ: اللہ یہی ارادہ فرماتا ہے کہ اے رسول کے گھر والو تم سے ہر قسم کی ناپاکی کو دور فرمادے اور تمہیں اچھی طرح پاک کر کے خوب پاکیزہ کر دے۔ (ترجمہ قرآن، البیان از علامہ کاظمی)

علامہ ابو جعفر محمد بن جریر الطبری علیہ الرحمہ (متوفی ۳۱۰ھ) جامع البیان فی تفسیر القرآن، مطبوعہ بیروت (لبنان) ۱۳۹۸ھ/ ۱۹۷۸ء، ج ۲۲، ص ۵ پر حدیث نقل کرتے ہیں:

"محمد بن المثنی قال ثنا بکر بن یحییٰ بن زبان العنزی قال ثنا مندل عن الاعمش عن عطية عن ابی سعید الخدری قال قال رسول الله ﷺ نزلت هذه الاية فی خمسة فیّ و فی علی رضی الله عنه و حسن رضی الله عنه و

حسین رضی اللہ عنہ و فاطمہ رضی اللہ عنہا انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت ویطھر کم تطھیرا ‘‘

ترجمہ: رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ یہ آیت ’’پنجتن‘‘ کی شان میں نازل ہوئی ہے۔ میری شان میں اور علی رضی اللہ عنہ کی اور حسن اور حسین رضی اللہ عنہما اور حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی شان میں کہ جزیں نیست، اللہ تعالیٰ ارادہ کرتا ہے اے اہلِ بیت کہ تم سے ناپاکی دور کردے اور تمہیں پاک کردے، خوب پاک کردے۔

پنجتن کے معنی ہیں پانچ افراد، اور ان سے مراد حضرت محمد رسول اللہ ﷺ، حسنین کریمین، سیدہ فاطمہ زہرا، حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین ہیں۔ اور آیتِ تطہیر ان پانچوں مقدس حضرات کے بارے میں نازل ہوئی، جس میں ویطھرکم تطھیرا موجود ہے، یعنی اللہ تعالیٰ تمہیں پاک کردے۔ پاک کرنا، جو اس بات کی روشن دلیل ہے کہ یہ پنجتن واقعی پاک ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے جب خود اپنی زبان مبارک سے ’’خمسۃ‘‘ کا لفظ فرمادیا اور خمسہ سے اپنی مراد کو ظاہر فرمانے کے لیے تفصیل ارشاد فرمادی اور صاف صاف ارشاد فرمادیا کہ آیۂ تطہیر کی شانِ نزول یہ پانچ عظیم ہستیاں ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ نے پاک قرار دیا، تو اب اس کے بعد کسی شقی القلب کا یہ کہنا کہ معاذ اللہ پنجتن کو پاک کہنا جائز نہیں اور پنجتن آیۂ تطہیر میں داخل نہیں۔ بارگاہِ رسالت سے بغاوت اور اللہ کے رسول کی تکذیب نہیں تو اور کیا ہے؟ نعوذ باللہ من ذلک

اس کا مقصد یہ نہیں کہ معاذ اللہ ان پانچ کے سوا ہم کسی کو پاک نہیں مانتے۔ ہمارے نزدیک حضور ﷺ کی ازواجِ مطہرات بھی آیۂ تطہیر میں شامل ہیں۔ اسی لیے ہم ان کے ساتھ مطہرات کا لفظ لازمی طور پر استعمال کرتے ہیں اور ان کے علاوہ اللہ تعالیٰ کے بے شمار مقدس محبوب بندے اور بندیاں یقیناً پاک ہیں اور ہم ان کی پاکی کا اعتقاد رکھتے ہیں، لیکن پنجتن پاک بولنے کی وجہ صرف یہ ہے کہ حدیثِ منقولہ بالا میں خود حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زبانِ مبارک سے خمسۃ کا کلمہ مقدسہ ادا ہوا۔ پھر ان کی تفصیل بھی خود حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمائی اور ان کی شان میں آیۂ تطہیر کے نزول کا ذکر فرمایا۔

اب کچھ بعید نہیں کہ جہلاے دیوبند پنجتن کا لفظ بولنے اور ان کے افراد کا نام ذکر کرنے پر حضور نبی کریم ﷺ پر بھی شیعہ ہونے کا فتویٰ نہ لگادیں۔ دیوبندی جہلا بتائیں کہ پنجتن کون ہیں؟ ایک حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہیں، تین صحابی ہیں ایک صحابیہ ہیں۔ اہلِ سُنّت ان صحابہ کا نام لیں تو شیعہ لیکن دیوبندی رات دن صحابہ صحابہ کا وظیفہ جپیں، اپنے جلسوں میں صحابہ کے نام کے نعرے لگائیں، صحابہ کے نام کی تنظیمیں بنائیں تو دیوبندی شیعہ نہیں بنتے، آخر کیوں؟

اعتراض: ''فاضلِ بریلوی، امام رضا کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''اے اہلِ بیت میں اپنے اور مشکلات کے حل کے لیے آپ کو خدا کے حضور سفارش بنا کر پیش کرتا ہوں اور آلِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں سے برأت کا اظہار کرتا ہوں۔'' (فتاویٰ رضویہ، جلد ۴، ص ۲۹۶)

صرف اہلِ بیت سے سفارش اور اہلِ بیت کے دشمنوں سے برأت، یہ کون دشمن ہیں، یہ کن سے برأت؟ یہ رضا علی قبلہ کے پوتے مولوی احمد رضا صاحب ہی بتلا سکتے ہیں''۔

فتاویٰ رضویہ اس وقت راقم کے پیش نظر نہیں، واللہ اعلم یہ عبارت بھی فتاویٰ رضویہ میں کس طرح لکھی ہے اور اس کا سیاق وسباق کیا ہے۔ چلیے دیوبندی خود ہی بتا دیں کہ اس میں مولانا احمد رضا خاں علیہ الرحمہ پر اعتراض والی کون سی بات ہے۔ اہلِ بیت کرام کو اپنی مشکلات کے حل کے لیے اللہ تعالیٰ کے حضور سفارشی بنانا اور اُن کے دشمنوں سے برأت کا اظہار کرنا کون سا گناہِ کبیرہ ہے؟ اُن کے دشمن کون ہیں؟ دیوبندی خود غور کرلیں۔ جو اہلِ بیت کرام سے خواہ مخواہ چڑ رکھتا ہے اور اُن کے نام کو بھی پسند نہیں کرتا اور اُن کے مبارک ناموں کو بھی شیعہ والے نام کہتا ہے، وہی تو دشمنِ اہلِ بیت ہے، اور کیا دشمنوں کے سر پر سینگ ہوتے ہیں؟

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سورۃ انشقت، پارہ ۳۰ کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

''بعضے از خواص اولیاء اللہ را کہ آلہ جارحہ تکمیل و ارشاد بنی نوع خود گردانیدہ اند دریں حالت ہم تصرف در دنیا دادہ و استغراق آنہا بہ جہت کمال وسعت تدارک آنہا مانع توجہ بایں سمت نمے گردد و اویسیاں تحصیل کمالات باطنی از آنہاے نمائندہ و ارباب حاجات و مطالب حل مشکلات خود از آنہا ے طلبند و می پابند و زبان حال دراں وقت ہم مترنم بایں مقالات است ع من آیم بجاں گر تو آئی بہ تن''۔

(تفسیر عزیزی، پارہ عم (فارسی) طبع مجتبائی دہلی ۱۳۴۸ھ، ص ۵)

ترجمہ: بعض خاص اولیا اللہ جنہیں اللہ تعالیٰ نے محض اپنے بندوں کی ہدایت و ارشاد کے لیے پیدا کیا، ان کو اس حالت میں بھی اس عالم کے تصرف کا حکم ہوا ہے اور اس طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ ان کا استغراق بوجۂ کمالِ وسعت تدارک انہیں روکتا ہے اور اویسی سلسلے کے لوگ باطنی کمالات انہی سے حاصل کرتے ہیں، حاجت مند اور اہلِ غرض لوگ اپنی مشکلات کا حل انہی سے چاہتے ہیں اور جو چاہتے ہیں وہ پاتے بھی ہیں اور زبانِ حال سے یہ ترنم سے پڑھتے ہیں ''اگر تم میری طرف بدن سے آؤ گے تو

مَیں تمہاری طرف جان سے آؤں گا۔''

جب اہلِ غرض لوگ اپنی مشکلات کا حل اولیا اللہ سے چاہتے ہیں اور جو چاہتے ہیں وہ پاتے ہیں تو اہلِ بیت کرام نے کیا قصور کیا ہے، جو اُن سے مشکلات کا حل چاہنے والا شیعہ ہو جائے۔

مولوی سرفراز خاں صفدر گکھڑوی دیوبندی (گوجرانوالہ، پاکستان) لکھتے ہیں:

''بلاشبہ مسلکِ دیوبند سے وابستہ جملہ حضرات شاہ عبدالعزیز صاحب کو اپنا روحانی پیشوا تسلیم کرتے ہیں اور اس پر فخر بھی کرتے ہیں، بلاشبہہ دیوبندی حضرات کے لیے حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کا فیصلہ حکم آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔''

(اتمام البرہان، حصہ اوّل، مطبوعہ گوجرانوالہ ۱۹۸۱ء، ص ۱۳۸)

اگلا اعتراض یہ کیا ہے کہ ''الامن والعلیٰ'' کے صفحہ ۲۴۴ پر مولوی احمد رضا صاحب لکھتے ہیں:

''ایک فریادی مصری امیر المومنین فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا ...... عرض کرتا ہے کہ مَیں نے عمرو بن العاص کے صاحبزادے کے ساتھ دوڑ کی، مَیں آگے نکل گیا، صاحبزادے نے مجھے کوڑے مارے اور کہا، میں دو معزز کریم کا بیٹا ہوں۔ اس فریاد پر امیر المومنین نے فرمان نافذ فرمایا کہ عمرو بن العاص مع اپنے بیٹے کے حاضر ہوں۔ حاضر ہوئے، امیر المومنین نے مصری کو حکم دیا، کوڑا لے اور مار دو لئیموں کے بیٹے کو۔ جب مصری فارغ ہوا، امیر المومنین نے فرمایا، اب یہ کوڑا عمرو بن العاص کی چندیا پر رکھ ...... عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے عرض کی یا امیر المومنین نہ مجھے خبر ہوئی نہ یہ شخص میرے پاس آیا۔'

اس جعلی و فرضی داستان سے مولوی احمد رضا نے نہ صرف فاتح مصر حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی شان میں گستاخی کی، بلکہ عدلِ فاروقی کو بھی داغ دار کیا۔ عمرو بن العاص کہتے ہیں کہ یا امیر المومنین نہ مجھے خبر ہوئی، نہ یہ شخص میرے پاس آیا۔ صرف ایک شخص کے کہنے پر امیر المومنین نے کوڑے برسوا دیے۔ یہ داستان قطعاً فرضی ہے۔ بلاشبہہ کسی شیعہ کی گڑھی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اس شیعی داستان سے فاضلِ بریلوی کے حضرت عمر فاروق اور حضرت عمرو بن العاص کے خلاف جذبۂ شیعیت کا اظہار ہوتا ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ امیر المومنین کوئی انکوائری نہ کریں اور صحابیِ رسول کی چندیا پہ کوڑا رکھ دیں۔ اللہ کی پناہ! اسے لکھنے کے لیے مولوی احمد رضا خاں کا کلیجہ چاہیے۔''

اب امام احمد رضا خاں علیہ الرحمہ کی کتاب ''الامن والعلیٰ'' کی اصل عبارت ملاحظہ فرمائیں:

''ایک مصری امیر المومنین فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوا، عرض کی یا امیر المومنین عائذ بک من الظلم امیر المومنین میں حضور کی پناہ لیتا ہوں ظلم سے۔ امیر المومنین نے فرمایا عذت معاذاً تو نے سچی جائے پناہ لی۔ ہمارا مطلب تو حدیث کے اتنے ہی لفظوں سے ہوگیا۔ پناہ لینے والے نے امیر المومنین کی دہائی دی اور امیر المومنین نے اپنی بارگاہ کو سچی جائے پناہ فرمایا۔ مگر تتمۂ حدیث بھی ذکر کریں کہ اُس میں امیر المومنین کے کمالِ عدل کا ذکر ہے۔ عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ مصر پر امیر المومنین کے صوبہ دار تھے، یہ فریادی مصری عرض کرتا ہے کہ مَیں نے اُن کے صاحب زادے کے ساتھ دوڑ کی، مَیں آگے نکل گیا صاحب زادے نے مجھے کوڑے مارے اور کہا میں دو معزز کریم والدین کا بیٹا ہوں۔ اس فریاد پر امیر المومنین نے فرمان نافذ فرمایا کہ عمرابن العاص مع اپنے بیٹے کے حاضر ہوں۔ حاضر ہوئے، امیر المومنین نے مصری کو حکم دیا کوڑا لے اور مار۔ اُس نے بدلہ لینا شروع کیا اور امیر المومنین فرماتے جاتے ہیں مار دو لئیموں کے بیٹے کو۔ انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں خدا کی قسم! جب اُس فریادی نے مارنا شروع کیا ہے، ہمارا جی چاہتا تھا کہ یہ مارے اور اپنا عوض لے۔ اُس نے یہاں تک مارا کہ ہم تمنا کرنے لگے کاش اب ہاتھ اُٹھالے۔ جب مصری فارغ ہوا، امیر المومنین نے فرمایا، اب یہ کوڑا عمرو بن العاص کی چندیا پر رکھ (یعنی وہاں کے حاکم تھے، انہوں نے کیوں نہ دادرسی کی، بیٹے کا کیوں لحاظ پاس کیا) مصری نے عرض کی یا امیر المومنین ان کے بیٹے ہی نے مجھے مارا تھا، اُس سے مَیں عوض لے چکا۔ امیر المومنین نے عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا مذکم تعبد تما الناس وولدتھم امھاتھم احراراً تم لوگوں نے بندگانِ خدا کو کب سے اپنا غلام بنالیا، حالانکہ وہ ماں کے پیٹ سے آزاد پیدا ہوئے تھے۔ عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کی یا امیر المومنین نہ مجھے خبر ہوئی، نہ یہ شخص میرے پاس فریادی آیا ابن عبدالحکم عن انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ''۔

جہلائے دیوبند نے اس پر اعتراض یہ کیا ہے کہ یہ داستان جعلی اور فرضی ہے۔ تو جناب یہ حدیث جعلی اور فرضی داستان نہیں بلکہ امام جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ اور شیخ علی متقی ہندی رحمۃ اللہ

علیہ نے ''کنز العمال'' جلد ۱۲، ص ۶۶۰، حدیث نمبر ۳۶۰۵ کے تحت یہ حدیث درج کی ہے۔ کیا یہ دونوں بزرگ شیعہ تھے؟ اگر یہ یک طرفہ کاروائی ہوتی تو حضرت عمرو بن العاص پہلے بول پڑتے، یہ تو عدلِ فاروقی کی زبردست مثال ہے۔ حضرت عمر فاروق کا یہ فقرہ کہ ''تم لوگوں نے بندگانِ خدا کو کب سے غلام بنا لیا حالانکہ وہ ماں کے پیٹ سے آزاد پیدا ہوئے تھے'' سونے کے پانی سے لکھنے کے قابل ہے۔ اگر امام احمد رضا خاں بریلوی علیہ الرحمہ شیعہ تھے تو کیا شیعہ عدلِ فاروقی مانتے ہیں؟ اس حدیث میں یہ فقرہ بھی آیا ہے کہ ''حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے مصری کو حکم دیا کوڑا لے اور مار دو لئیموں کے بیٹے کو'' ''لئیم'' کا معنی ہے بخیل، کنجوس (جدید نسیم اللغات، ص ۸۴۵) یعنی جن دونوں نے اولاد کی تربیت میں کنجوسی کا مظاہرہ کیا۔

اس سے **اگلا اعتراض** یہ کیا کہ ایک شیعہ مصنف لکھتا ہے:

''مولوی احمد رضا نے وہ عظیم کام کیا جو کسی مجتہد سے ممکن نہ تھا، ہندوستان میں جو مجالسِ محرم قائم ہیں، اس کے وجود کی بقا کے سلسلے میں مولانا احمد رضا کی بے لوث خدمات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔'' (المیزان، احمد رضا نمبر، ص ۵۵۰)

جب کہ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان میں اہلِ سُنّت میں محرم، تعزیے، علم، تاشے ہیں تو صرف احمد رضا کے دم سے، ڈھول ہے تو اعلیٰ حضرت کے دم سے، مزاروں پر عرس، اس عرس میں طوائفیں، کمپنی تھیٹر، سینما ہے تو ان کے قلم سے۔''

یہ کھلا بہتان ہے کہ ماتم، علم، تاشے اور تعزیے وغیرہ امام احمد رضا کے دم سے ہیں۔ امام احمد رضا علیہ الرحمہ نے تو ان کے خلاف قلم چلایا اور رسالے لکھے۔ آپ کی تصانیف کا مطالعہ کریں، لوگوں کو جھوٹ بول کر گمراہ نہ کریں۔ ماتم، تعزیے اور روایاتِ باطلہ و بے سرو پا سے مملو اور اکاذیب موضوعہ پر مشتمل شہادت ناموں کے ردّ میں آپ کا رسالہ ''تعزیہ داری'' کو پڑھ لیں۔ کیا آپ اس کا ثبوت دے سکتے ہیں کہ طوائفوں، تھیٹروں اور سینما کے جواز میں امام احمد رضا نے قلم چلایا ہے۔ اگر نہیں تو لعنۃ اللہ علی الکاذبین عرس، اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی علیہ الرحمہ کی ایجاد نہیں۔ عرس کے متعلق حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''حضرت خواجہ قدس سرہ کے عرس کے زمانے میں دہلی پہنچ کر یہ خیال تھا کہ آپ کی خدمتِ عالی میں بھی حاضر ہوں۔'' (مکتوباتِ امام ربانی، دفتر اوّل، مکتوب ۲۳۳)

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

''عرس کا دن اگر اس [illegible] ہو وہ یاد رہیں

اور اس وقت اُن کے حق میں دعا کی جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔"

(فتاویٰ عزیزی، مطبوعہ ایچ، ایم سعید کمپنی، ادب منزل، پاکستان چوک، کراچی ۱۹۷۳ء، ص ۱۵۱)

اس مسئلے میں بھی حضرت شاہ صاحب علیہ الرحمہ اہلِ سُنّت کی حمایت میں ہیں، جب کہ وہابی دیوبندی اس مسئلے میں حضرت شاہ کے سخت مخالف ہیں۔ بلکہ وہ تو عرس کے ہی مخالف ہیں، دن مقرر کرنا تو بعد کی بات ہے۔

محرم الحرام میں ذکرِ حسین کی مجالس قائم کرنے پر اعتراض والی کیا بات ہے۔ محرم الحرام میں مجالس قائم کر کے آج بھی اہلِ سُنّت دس دن تک بلکہ محرم کا پورا مہینہ صحیح روایات سے شہادتِ امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور خانوادۂ اہلِ بیت کی شہادت کا ذکر کرتے ہیں۔ اہلِ بیت پر صرف شیعہ کا تو حق نہیں اور صرف ان کی ہی اجارہ داری نہیں۔ اصل حق تو اہلِ سُنّت کا ہی ہے۔ اہلِ بیت کا ذکر خارجیوں اور ناصبیوں کو ہی بُرا لگتا ہے۔

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی علیہ الرحمہ فرماتے ہی:

"سال میں دو مجلسیں فقیر کے مکان پر منعقد ہوا کرتی ہیں۔ مجلس ذکرِ وفات شریف اور مجلس شہادتِ حسین۔ اور یہ مجلس بروز عاشورہ یا اس سے دو ایک دن قبل ہوتی ہے۔ چار پانچ سو آدمی بلکہ ہزار آدمی جمع ہوتے ہیں اور درود شریف پڑھتے ہیں۔ اس کے بعد جب فقیر آتا ہے تو لوگ بیٹھتے ہیں اور فضائلِ حسنین رضی اللہ عنہما کا ذکر جو حدیث شریف میں وارد ہے، بیان کیا جاتا ہے اور پنج آیات پڑھ کر کھانے کی جو چیز موجود رہتی ہے، اس پر فاتحہ کیا جاتا ہے۔ اور اس اثنا میں اگر کوئی شخص خوش الحان سلام پڑھتا ہے یا شرعی طور پر مرثیہ پڑھنے کا اتفاق ہوتا ہے تو اکثر حضار مجلس اور اس فقیر کو بھی حالتِ رقت اور گریہ طاری ہو جاتی ہے۔ اس قدر عمل میں آتا ہے، اگر یہ سب فقیر کے نزدیک اس طریقہ سے جس کا ذکر کیا گیا ہے، جائز نہ ہوتا تو ہرگز فقیر ان چیزوں پر اقدام نہ کرتا۔"

(فتاویٰ عزیزی، مطبوعہ ایچ، ایم سعید کمپنی، ادب منزل، پاکستان چوک، کراچی ۱۹۷۳ء، ص ۱۷۷)

کیا وہابی دیوبندی اسی طرح مجالس منعقد کرتے ہیں؟ یا ان میں شامل ہوتے ہیں؟ اگر نہیں تو شاہ عبدالعزیز علیہ الرحمہ کے متعلق کیا فتویٰ ہے؟

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

"جس کھانے کا ثواب حضرات امامین رضی اللہ عنہم کو پہنچایا جائے اور اس پر فاتحہ د

قل پڑھا جائے، وہ کھانا تبرک ہو جاتا ہے، اس کا کھانا بہت خوب ہے''۔

(فتاویٰ عزیزی، مطبوعہ ایچ، ایم سعید کمپنی، ادب منزل، پاکستان چوک، کراچی ۱۹۷۳ء، ص ۱۶۷)

کیا وہابی دیوبندی، شاہ صاحب علیہ الرحمہ کے اس فتویٰ پر عمل کرتے ہیں؟

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے درس میں ایک روہیلہ پٹھان آفتاب نامی شریک ہوا کرتا تھا۔ ایک دن شاہ صاحب نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے فضائل و مناقب بیان فرمائے تو اس کو اس قدر غصہ آیا کہ (خود شاہ عبدالعزیز علیہ الرحمہ کا بیان ہے)

''بندہ را شیعہ فہمیدہ، آمدن درس موقوف کرد۔''

ترجمہ: بندہ کو شیعہ سمجھ کر درس میں شریک ہونا بند کر دیا۔''

(پروفیسر خلیق احمد نظامی، تاریخ مشائخ چشت: اسلام آباد، دارالمصنفین، جلد ۵: ص ۷۰)

جہلاے دیوبند نے پندرھویں صدی کا یہ عظیم ترین جھوٹ بولتے ہوئے یہ نہیں سوچا کہ کیا ساری دنیا اندھی ہوگئی ہے۔ جسے امام احمد رضا کی تصانیف کا مطالعہ کرنے کا موقع ملے گا، جو شخص فتاویٰ رضویہ اور دیگر بلند پایہ علمی تصانیف کا مطالعہ کرے گا، وہ جہلاے دیوبند کے بارے میں کیا رائے قائم کرے گا؟

ردّ شیعہ کے بارے میں ''مجموعہ رسائل ردِ روافض'' از امام احمد رضا قادری علیہ الرحمہ، مطبوعہ مرکزی مجلس رضا لاہور ۱۴۰۶ھ/ ۱۹۸۶ء مطالعہ فرمائیں۔

شیعہ: اکابر دیوبند کی نظر میں

''سوال نمبر ۱: کیا علماے دیوبند کے نزدیک شیعہ کافر ہیں یا نہیں؟

جواب (۱) جو شخص صحابہ کرام میں سے کسی کی تکفیر کرے۔ وہ اپنے اس گناہِ کبیرہ کے سبب سُنّت جماعت سے خارج نہ ہوگا۔ (فتاویٰ رشدیہ، ص ۲۴۸)

(۲) جو لوگ شیعہ کو کافر کہتے ہیں...... اور جو لوگ فاسق کہتے ہیں، اُن کے نزدیک اُن کی تجہیز و تکفین حسب قاعدہ ہونا چاہیے، اور بندہ بھی اُن کی تکفیر نہیں کرتا۔ (فتاویٰ رشیدیہ، ص ۲۶۴)

(۳) روافض و خوارج کو بھی اکثر علما کافر نہیں کہتے، حالانکہ وہ شیخین و صحابہ کو اور (خوارج) حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کو کافر کہتے ہیں۔''

(فتاویٰ رشیدیہ، ص ۱۶۵، مطبوعہ کتب خانہ مجیدیہ، بیرون بوہڑ گیٹ ملتان)

''سوال نمبر ۲: کیا دیوبندی لڑکی، شیعہ مرد کے نکاح میں دینی جائز ہے؟

فتویٰ (۱) سوال: کیا [illegible] سنی المذھب

عورت بالغہ کا نکاح زید شیعی مذہب کے ساتھ برضائے شرعی باپ کی تولیت میں ہوگیا، دریافت طلب یہ امر ہے کہ سنّی و شیعہ کا تفرقِ مذہب، نکاح جیسا کہ ہندوستان میں شائع ہے، عند الشرح صحیح ہوتا ہے یا نہیں؟

جواب: نکاح منعقد ہوگیا، لہٰذا سب اولاد ثابت النسب ہے اور صحبت حلال ہے۔"

(اشرف علی تھانوی، امداد الفتاویٰ، جلد۲، ص ۲۸۔۲۹)

(۲) رافضی کے کفر میں اختلاف ہے...... جو ان (شیعہ) کو فاسق کہتے ہیں، ان کے نزدیک (رشتہ لینا اور دینا) ہر طرح درست ہے۔"

(فتاویٰ رشیدیہ، مطبوعہ کراچی، ص ۱۷۰)

سوال نمبر۳: کیا علمائے دیوبند کے نزدیک شیعہ کا ذبیحہ حلال ہے یا حرام؟

سوال: ذبیحہ رافضی کے ہاتھ کا جائز ہے یا نہیں؟

جواب: شیعہ کے ذبیحہ میں علمائے اہلِ سُنّت کا اختلاف ہے، راجح اور صحیح یہ ہے کہ حلال ہے۔" (امداد الفتاویٰ، جلد۲، ص ۱۲۳)

شیعہ کی نمازِ جنازہ

"مشہور شیعہ عالم اور وکیل مظہر علی اظہر انتقال فرما گئے...... نمازِ جنازہ دیال سنگھ گراؤنڈ میں ۳/نومبر ۱۹۷۴ء بروز اتوار ادا کی گئی۔ نمازِ جنازہ صبح دس بجے حضرت مولانا عبیداللہ انور (دیوبندی) نے پڑھائی۔"

(ہفت روزہ خدام الدین، لاہور، شمارہ ۸/نومبر ۱۹۷۴ء، ص ۳)

"شیعہ لیڈر مظفر علی شمسی کی نمازِ جنازہ کے فرائض ملک مہدی حسن علوی (شیعہ) نے ادا کیے۔ نمازِ جنازہ میں مولانا عبدالقادر آزاد، مولانا تاج محمود، مولانا ضیاء القاسمی، ڈاکٹر مناظر، میاں طفیل محمد، چوہدری غلام جیلانی کے علاوہ ہزاروں مداحوں نے شرکت کی۔" (روز نامہ نوائے وقت لاہور، شمارہ ۲۱/جون ۱۹۷۶ء)

علمائے دیوبند اور تعزیہ داری

"اجمیر میں مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے اہل تعزیہ کی نصرت کا فتویٰ دیا تھا۔"

(الافاضات الیومیہ، مطبوعہ کراچی، جلد۴، ص ۱۳۸، ۱۳۹)

اگلا **اعتراض** یہ کیا کہ مولانا احمد رضا خاں نے سرورِ انبیا سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے مثال بیان کرتے ہوئے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے حضور کو یاد فرما کر اس طرح ندا فرمائی:

''بلا تشبیہ جس طرح سچا چاہنے والا اپنے پیارے محبوب کو پکارے، او بانکی ٹوپی والے او دھانی دوپٹے والے۔'' (تجلی الیقین، احمد رضا، ص ۲۰)

اب ''تجلی الیقین'' کی اصل عبارت سنیے:

''حضور ﷺ کو خصوصی القابات سے پکارا گیا: قال جلت عظمته یا دم اسکن انت و زوجک الجنة وقال تعالیٰ یا نوح اهبط بسلم منا وقال تعالیٰ یابراهیم قد صدقت الرویا وقال تعالیٰ یموسیٰ انی انی انا اللہ وقال تعالیٰ یعیسیٰ انی متوفیک وقال تعالیٰ یاداؤد انا جعلنک خلیفة وقال تعالیٰ یا زکریا انا نبشرک وقال تعالیٰ یا یحییٰ خذ الکتب بقوة غرض قرآن عظیم کا عام محاورہ ہے کہ تمام انبیاے کرام کو نام لے کر پکارتا ہے مگر جہاں محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے خطاب فرمایا ہے حضور کے اوصافِ جلیلہ و القابِ جمیلہ ہی سے یاد کیا ہے۔ یا ایها النبی انا ارسلنک (اے نبی ہم نے تجھے رسول کیا) یا ایها الرسول بلغ ما اُنزل الیک (اے رسول پہنچا جو تیری طرف اُترا) یا ایها المدثر ۰ قم فانذر (اے جھرمٹ مارنے والے کھڑا ہو لوگوں کو ڈرسنا) یٰسٓ ۰ والقران الحکیم ۰ انک لمن المرسلین ۰ (اے یٰسین یا اے سردار مجھے قسم ہے حکمت والے قرآن کی بے شک تو مرسلون سے ہے، طٰهٰ ۰ ما انزلنا علیک القران لتشقٰی (اے طٰہٰ یا اے پاکیزہ رہنما ہم نے تجھ پر قرآن اس لیے نہیں اُتارا کہ تو مشقت میں پڑے) ہر ذی عقل جانتا ہے کہ جو ان نداؤں اور ان خطابوں کو سنے گا بالبداہۃ حضور سید المرسلین و انبیاے سابقین کا فرق جان لے گا۔

یا آدم ست با پدر انبیاء خطاب یا ''ایها النبی'' خطاب محمد ست

صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم

امام عزالدین بن عبدالسلام (مصری شافعی، متوفی ۶۶۰ھ) وغیرہ علماے کرام فرماتے ہیں، بادشاہ جب اپنے تمام امرا کو نام لے کر پکارے اور ان میں خاص ایک مقرب کو یوں ندا فرمایا کرے، اے مقرب حضرت! اے نائب سلطنت! اے صاحب عزت! اے سردارِ مملکت! تو کیا کسی طرح محلِ ریب و شک باقی رہے گا کہ یہ بندہ بارگاہِ سلطانی میں سب سے زیادہ عزت و وجاہت والا اور سرکار سلطانی کو تمام عمائد و اراکین سے بڑھ کر

فقیر کہتا ہے (غفر اللہ تعالیٰ لہ) خصوصاً یا ایہا المزمل ویا ایہا المدثر ،تو وہ پیارے خطاب ہیں، جن کا مزہ اہلِ محبت ہی جانتے ہیں۔ ان آیتوں کے نزول کے وقت سیّدِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بالا پوش اوڑھے جھرمٹ مارے لیٹے تھے۔ اسی وضع و حالت سے حضور کو یاد فرما کر ندا کی گئی۔ بلاتشبیہ جس طرح سچا چاہنے والا اپنے پیارے محبوب کو پکارے او بانکی ٹوپی والے! او دھانی دوپٹے والے! او دامن اُٹھا کے جانے والے!

فسبحن اللہ والحمد للہ والصلوٰۃ الزهراء علی الحبیب ذی الجاہِ ۔

(تجلی الیقین بان نبینا سید المرسلین، مطبوعہ مرکزی مجلس رضا لاہور ۱۹۹۴ء، ص ۳۴، ۳۵)

امام احمد رضا خاں بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی عبارت قارئین کے سامنے ہے۔ اس میں کیا توہین ہے؟ اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خاں بریلوی علیہ الرحمہ نے لکھا "بلاتشبیہ جس طرح سچا چاہنے والا اپنے پیارے محبوب کو پکارے او بانکی ٹوپی والے، او دھانی دوپٹے والے" امام احمد رضا لکھ رہے ہیں "بلاتشبیہ" کیا دیوبندی بتائیں گے کہ "بلاتشبیہ" کے کیا معنی ہیں؟ اب آیئے دیوبندی مولوی عطاء اللہ بخاری احراری کی اس عبارت کے بارے میں ایم رانا دیوبندی صاحب کیا کہیں گے جس میں بلاتشبیہ کے الفاظ بھی نہیں ہیں، مولوی بخاری کی تشبیہ ملاحظہ فرمایئے:

"ایک ٹھیٹھ پنجابی گاؤں میں معراج النبی پر تقریر کر رہے تھے، فرمایا، حضور معراج کو چلے تو کائنات رُک گئی، سوچا کہ دیہاتی سمجھ نہیں سکے کہ کائنات رُک گئی کے معنی کیا ہیں، پوچھا! کچھ سمجھے؟ مجمع نے کہا جی نہیں۔

بہت سمجھایا، لیکن اردو اور پنجابی کے متبادل فقروں سے بات نہ بن سکی۔ کروٹ لی، "کہ سوہنا اپنے عاشق دل چلیاتے زمین و آسمان ٹھہر گئے"، کیوں؟ آواز کا رس گھلاتے ہوئے بہ لحن۔ (پنجابی زبان میں)

"تیرے لونگ دا پیا لشکارا تے ہالیاں نے ہل ڈک لیے"

مجمع پھڑک اُٹھا، آوازیں آئیں، شاہ جی سمجھ گئے اور یہ تھا خطاب کا اعجاز۔"

(شورش کاشمیری، سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مطبوعہ لاہور ۱۹۷۳ء، ص ۲۸۹)

یعنی اے محبوب تیرے لونگ (عورتوں کے ناک میں پہننے کا زیور) کی چمک دیکھ کر زمین میں ہل چلانے والوں نے اپنے ہل روک لیے۔ (وہ بلاتشبیہ ہے اور یہ اپنے امیر شریعت کی تشبیہ بھی دیکھ لیں)

اگلا اعتراض یہ ہے کہ مولوی احمد یار خاں لکھتے ہیں:

"اُن کی چتون کیا پھری سارا زمانہ پھر گیا۔" (شانِ حبیب الرحمٰن، مولوی احمد یار خاں، ص۴۰) مولوی احمد یار خاں اور مولوی احمد رضا کا یہ بیان بلاشبہ ان کے ذوق کی پستی اور گندی ذہنیت اور گھناونے پن کا اظہار ہے۔"

امام احمد رضا خان بریلوی علیہ الرحمۃ کی تشبیہ کا بیان آپ اوپر پڑھ آئیں ہیں کہ اس میں کیا گندی ذہنیت ہے۔ مولانا مفتی احمد یار خاں نعیمی علیہ الرحمہ اپنی کتاب "شانِ حبیب الرحمٰن" میں لکھتے ہیں:

"حضور علیہ السلام کی خواہش یہ تھی کہ ہمارا قبلہ پھر کعبہ معظمہ ہی بن جائے، سترہ مہینے ہو چکے تھے بیت المقدس کی طرف نماز پڑھتے پڑھتے، ایک دن حضرت جبریل علیہ السلام سے فرمایا کہ جبریل ہمارا دل چاہتا ہے کہ ہم کعبہ شریف ہی کی طرف نماز پڑھا کریں۔ حضرت جبریل نے عرض کیا کہ یا حبیب اللہ میں بندۂ الٰہی ہوں بغیر حکم کے کچھ بھی نہیں عرض کرسکتا۔ ہاں حضور حبیب اللہ ہیں آپ کی دعا کبھی بھی رد نہیں ہوتی۔ حضور دعا فرمائیں۔ یہ عرض کر کے حضرت جبریل علیہ السلام چلے گئے۔ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی کے انتظار میں سر مبارک آسمان کی طرف اُٹھا اُٹھا کر دیکھنا شروع کیا کہ شاید اب وحی آتی ہو قبلہ بدلنے کے لیے، پروردگارِ عالم نے یہ محبوبانہ انداز نہایت ہی پسند فرمائی اور اس آیت (سورۃ بقرہ پارہ۲) میں ارشاد فرمایا کہ اے محبوب آپ کی اس پیاری ادا کو ہم دیکھ رہے ہیں کہ آپ بار بار اپنا سر مبارک آسمان کی طرف اٹھا رہے ہیں۔ اچھا ہم اس کو آپ کا قبلہ بنائے دیتے ہیں جسے کہ محبوب تم چاہو (روح البیان یہی آیت)، ان کی چتون کیا پھری سارا زمانہ پھر گیا۔"

احقر نے اس سوال میں کئی جگہ دیوبندیوں کو جہلاے دیوبند اسی لیے لکھا ہے کہ یہ بیچارے تو امام احمد رضا قادری بریلوی قدس سرہ کی کسی کتاب کا نام بھی نہیں پڑھ سکتے۔ احقر نے ایک مرتبہ ایک دیوبندی سے امام احمد رضا علیہ الرحمہ کی کتاب "**کفل الفقیہ الفاھم فی احکام قرطاس الدراھم**" کا نام پڑھنے کے لیے کہا تو اس کے جواب میں جو اُس نے پڑھا، اب آپ سے کیا کہوں۔ علمائے اہلِ سُنّت کی عبارات کو یہ جہلاے دیوبند کیا سمجھیں گے؟ "چتون" ہندی لفظ ہے اور مؤنث ہے۔ اس کے معنی نظر، تیوری، نگاہ کے ہیں۔ دیوبندی بتائیں کہ اس میں کیا گندی ذہنیت ہے؟ جہلاے دیوبند کا اس عبارت پر اعتراض جہالتِ لسانی ہے۔

اگلا اعتراض یہ لکھا کہ "خاں صاحب بریلوی نے خود اللہ تعالیٰ کی شان میں بڑے نازیبا مکروہ نجس الفاظ لکھے ہیں" (فتاویٰ رضویہ جلد اوّل)

اس کا جواب یہ ہے کہ وہ آپ لوگوں کے مکروہ نجس عقاید کی کراہت نجاست واضح کرنے کے لیے لکھے گئے ہیں۔ یعنی امام احمد رضا بریلوی نے فرمایا کہ اگر تمہارا خدا جھوٹ بول سکتا ہے تو تمہارا خدا چوری بھی کرسکتا ہے، شراب بھی پی سکتا ہے وغیرہ۔ چنانچہ الحمدللہ دیوبندیو آپ پر بھی اُن کا مکروہ ونجس ہونا ظاہر ہوگیا۔

اگلا آخری اعتراض یہ کیا ہے کہ مولانا احمد رضا خاں نے ایک نئے مذہب کی بنیاد ڈالی۔ موصوف نے وصیت کی تھی ''میرا دین و مذہب جو میری کتب سے ظاہر ہے، اس پر مضبوطی سے قائم رہنا۔''

امام احمد رضا بریلوی علیہ الرحمہ کی وصیت کا مقصد یہی ہے کہ جو گندے کفریہ عقاید دیوبندی، وہابی، شیعہ، مرزائی، نیچری وغیرہ کی کتب سے ظاہر ہیں۔ اُن سے پرے رہنا اور جو اہلِ سُنّت کے صحیح اور عشق رسول ﷺ پر مبنی عقاید ہیں جو کہ میری کتب سے ظاہر ہیں، ان پر مضبوطی سے قائم رہنا، اس میں کیا اعتراض والی بات ہے؟

> ''مولوی الیاس بانی تبلیغی جماعت کہتے ہیں کہ مولوی اشرف علی تھانوی نے بڑا کام کیا، بس میرا دل چاہتا ہے کہ تعلیم تو ان کی ہو اور طریقہ تبلیغ میرا ہو کہ ان کی تعلیم عام ہوجائے گی۔''

(ملفوظات مولوی الیاس، مرتبہ منظور نعمانی، مطبوعہ ایچ ایم سعید کمپنی کراچی، ص۵۲)

مولوی الیاس نے نہ تو قرآن و حدیث کا نام لیا، نہ دینِ اسلام کا نام لیا ''ان (تھانوی) کی تعلیم'' کہا ہے۔

مولوی انور شاہ کشمیری نے کتاب ''المہند'' عقاید علمائے دیوبند، مطبوعہ ادارہ اسلامیات، انار کلی، لاہور کے صفحہ ۱۷۹ پر کہا: ''عقاید (دین) میں امام نانوتوی، فروع (مذہب) میں امام گنگوہی'' نانوتوی کا دین کہا ہے، دین اسلام نہیں کہا۔ مولوی محمد سہول دیوبندی لکھتے ہیں المہند کو مذہب قرار دیا جائے۔'' (المہند، ص۹۶)

مولوی محمد شفیع دیوبندی لکھتے ہیں: ''عقائد علماء دیوبند کے نام سے کتاب لکھنا طبعاً پسند نہیں، شبہ ہوتا ہے کہ ان کے کچھ مخصوص عقاید ہیں۔'' (المہند، ص۱۷۵)

وماعلینا الاالبلاغ المبین

احمد رضا بریلوی کی شہرت کے اسباب

از: شبنم خاتون (ریسرچ اسکالر)،
بنارس یونی ورسٹی، بنارس

اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی بیک وقت ایک جید عالم، صاحب نظر فقیہہ، مسکت مناظر، محتاط محدث، عربی، فارسی اور اردو کے قادر الکلام شاعر، زبردست صوفی اور ستر مجرد نقلی و عقلی علوم وفنون پر ید طولیٰ رکھتے تھے، جس کی شاہد عدل ان کی تقریباً ہزار سے بھی متجاوز شاہ کار تصانیف ہیں۔

آج نہ صرف عرب وعجم بلکہ یورپ کی یونی ورسٹیوں میں بھی آپ کے علمی و دینی کارناموں پر ریسرچ ہو رہی ہے۔ یہی نہیں بلکہ آپ کی عربی شاعری اور عربی نثر نگاری سے عربی یونی ورسٹی جامعہ ازہر، مصر کے اساتذہ اس قدر متاثر ہوئے کہ علامہ بریلوی پر خود بھی تحقیقی مقالات لکھے اور تلامیذ کو بھی ان پر ریسرچ کروائی۔ جامعہ ازہر نے احمد رضا بریلوی کی عربی انشا پردازی اور شاعری کے محاسن پر خاص توجہ دی۔ پاکستان کے محقق ممتاز احمد سدیدی نے جامعہ ازہر سے فاضل بریلوی کی عربی شاعری پر ایم۔فل (M.Phil) کیا بعنوان ''الشیخ احمد رضا خان البریلوی الهندی۔ شاعراً عربیاً''۔ جامعہ ازہر کے ہی استاد حازم محمد احمد عبدالرحیم المحفوظ نے احمد رضا بریلوی کی مختلف تصانیف سے سو (۱۰۰) عربی اشعار جمع کر کے اس کو ''بساتین الغفران'' کے نام سے مرتب کیا۔ اور ساتھ ہی ''حدائق بخشش'' حصہ اوّل و دوم کا منثور ترجمہ بھی کیا ہے۔ انہوں نے ایک تحقیقی مقالہ ''الامام الاکبر المجدد محمد احمد رضا خان والعالم العربی'' قلم بند کیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے احمد رضا خاں بریلوی کے ۸۰ ویں عرس پر جامعہ ازہر، قاهرہ سے ایک مجلہ شائع کیا جس کا عنوان ہے ''الکتاب التذکاری...... مولدالامام احمد رضا خاں'' (قاہرہ ۱۴۲۰ھ/۱۹۹۹ء) اس مجلے میں عربی اور اردو میں مقالات ہیں۔ ڈاکٹر حازم المحفوظ نے محدث بریلوی کے مشہور سلام کو عربی میں منثور کیا۔ اسی عظیم اور قدیم یونی ورسٹی کے ایک اور فاضل استاد ڈاکٹر حسین مجیب المصری [1] جو مصر کے جلیل القدر استاد اور فاضل ہیں، انہوں نے اس سلام کو عربی میں منظوم کیا اور یہ عربی سلام ''المنظومة السلامیة فی مدح خیر البریة'' کے عنوان سے منظر عام پر آیا۔ یہ سلام منظوم ۱۵۷ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں ایک فاضلانہ تقدیم ۷۔۷۷ صفحات پر مشتمل ہے۔ پھر سلام پر گفتگو ہے ۷۸ سے ۱۰۵ صفحات پر مشتمل۔ اس کے بعد عربی منظوم سلام ہے ۱۰۷۔۱۳۶ صفحات پر مشتمل اور آخر میں سلام کا اردو متن ہے ۱۳۷ تا

۱۵۰ صفحات پر۔ پھر مراجع ہیں ۱۵۰ تا ۱۵۴ صفحات پر مشتمل۔ ۲؎ ڈاکٹر حسین مجیب مصری نے دیوان ''حدائق بخشش'' کے اردو کلام کا منظوم عربی ترجمہ کیا ہے جو مصر سے ''صفوۃ المدیح'' (۲۰۰۱ء) کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ جلال الدین چاٹگامی، بنگلہ دیش نے قاہرہ یونی ورسٹی سے ''امام احمد رضا القادری وجهوده فى مجال العقيدة الاسلامية في شبه القارة الهندية'' کے عنوان سے ایم۔ فل (M.Phil) کیا۔ مولانا شاہ مشتاق شاہ الازہری نے جامعہ ازہر سے ہی محدث بریلوی کی فقہی خدمات کے حوالے سے ایم۔فل کیا۔ ڈاکٹر مسز اوشا سانیال نے کولمبیا یونی ورسٹی نیو یارک سے بعنوان:

"Devotional Islam and Politics in British India (Ahmad Reza Khan Bareilivi and his Movement 1920-1970)"

پر پی ایچ ڈی کیا اور اس میں انہوں نے یہ ثابت کیا کہ علامہ بریلوی، انگریزوں کے ہم درد نہیں تھے، بلکہ ان کے سخت مخالف تھے۔ اس طرح بیرونی ممالک کے علاوہ پاکستان کی بیش تر یونی ورسٹی (جامعات) میں بھی فاضل بریلوی کے مختلف پہلوؤں پر کام ہو چکا ہے اور اب بھی ہو رہا ہے۔ اب تک مولانا بریلوی پر تقریباً ۸۰۰ کتابیں منظرِ عام پر آچکی ہیں۔ اور اب تک کی معلومات کے مطابق ۴۱ پی۔ ایچ۔ڈی (Ph.D) اور ایم۔فل (M.Phil) رجسٹرڈ ہوئی ہیں۔ جن میں بیش تر مکمل ہو کر شائع ہو چکی ہیں اور کچھ کی تھیسس اپنے آخری مرحلے پر ہیں۔

کسی بھی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر اتنی تعداد میں کتابیں لکھی جانا، اس کی شہرت کا سب سے بڑا سبب اور اس کی عبقری شخصیت کی دلیل ہے۔ واقعی میں احمد رضا نے اپنے دینی اور علمی کارناموں کی وجہ سے طرۂ امتیاز پر پہنچ کر وہ شہرت اور مقبولیت حاصل کی جس کی وجہ سے علم کے شائقین کو ان کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔

آپ کی شہرت کا سبب نہ صرف علمی، ادبی، سیاسی اور سماجی کارنامہ ہے بلکہ آپ کے مدوحین اور مخالفین کی لمبی فہرست بھی ہے۔ بعض اربابِ علم و دانش جو خود بھی آپ کے بعض نظریات سے اتفاق نہیں رکھتے تھے لیکن باوجود اس کے محدث بریلوی کے علمی و ادبی کارناموں اور مختلف علوم وفنون پر بے پناہ صلاحیتوں کے معترف تھے۔ اور کہیں نہ کہیں اہلِ علم و دانش نے مولانا بریلوی کی صلاحیتوں کا اعتراف بھی کیا ہے۔ جیسے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا عبدالحیٔ رائے بریلوی، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا محمد الیاس، مولانا علی میاں ندوی، مولانا ابوالکلام آزاد، علامہ اقبال، مولانا شاہ معین الدین ندوی، ڈاکٹر ضیاء الدین (وائس چانسلر مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ)، پروفیسر حاکم علی، کلیم محمد سعید ندوی وغیرہ۔

پنجاب یونی ورسٹی (لاہور) سے ایک ادبی و ثقافتی انسائیکلو پیڈیا شائع ہوا۔ اس انسائیکلو پیڈیا کی دوسری جلد کے ساتویں باب میں پروفیسر عبدالقیوم نے امام احمد رضا کا ذکر اس طرح کیا ہے:

"آپ ایک بہت بڑے مناظر تھے۔ ۱۸۵۶ء/۱۲۷۲ھ میں پیدا ہوئے۔ معقولات و منقولات میں یکساں درک رکھتے تھے۔ علوم متداولہ اپنے والد مولانا نقی علی خاں سے اور حدیث کی سند سید دحلان مکی اور عبدالرحمٰن سراج مکی سے لی۔ ۱۹۲۱ء/۱۳۴۰ھ میں فوت ہوئے"۔ ۳

علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی، اسلام آباد (پاکستان) کے شعبۂ بنیادی سائنس کے پروفیسر ابرار حسین صاحب نے "فوزِ مبین در ردِّ حرکت زمین" پر کام کر کے مغربی دنیا میں محدّث بریلوی کے اس علمی کارنامے کو متعارف کرایا۔

احمد رضا بریلوی عبقری شخصیت کے حامل تھے۔ عالمِ اسلام میں ان کی شہرت اور مقبولیت کے سبب اہلِ علم و دانش نے ان پر خامہ فرسائی کی، چاہے وہ محدّث بریلوی کے معترف ہوں یا معترضین۔
علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے ڈاکٹر حامد علی خاں نے آپ کی شخصیت اور علمی و ادبی کارناموں سے متاثر ہو کر کہا:

"آپ ہی جیسے ستودہ صفات سے متصف انسان کے لیے بجا طور پر شاعرِ مشرق علامہ اقبال کا یہ شعر پڑھا جاسکتا ہے۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پر روتی ہے بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

آپ اپنی متنوع حیثیات سے منفرد تھے۔ اور آپ کی ہستی کو صفاتِ حسنہ کی جامع شخصیت کہا جاسکتا ہے۔ لہٰذا آپ کے بارے میں خامہ فرسائی کرنے کا ارادہ کوئی معمولی کام نہیں۔ اگر آپ کے حالاتِ زندگی، مشاغلِ حیات اور عملی کارناموں وغیرہ پر کوئی اکیڈمی لگن کے ساتھ کام کرے تو تحقیق کا کچھ حق ادا ہوسکتا ہے۔" ۴

ہندستان سے لے کر انگلستان تک مولانا بریلوی کی شہرت کا پرچم لہرا رہا ہے۔ لندن یونی ورسٹی کے شعبۂ ابلاغیات کے صدر پروفیسر حنیف اختر فاطمی نے ۱۹۷۷ء میں احمد رضا کے اردو ترجمۂ قرآن کو انگریزی میں منتقل کیا۔ پروفیسر فاطمی ۱۹۸۰ء میں پاکستان آئے اور کراچی میں ماہر رضویات پروفیسر مسعود احمد سے ملاقات کی۔ پروفیسر فاطمی نے دورانِ گفتگو فرمایا کہ جب میں ترجمہ مکمل کر چکا تو ایک عیسائی فاضل سے ملاقات ہوئی، اُس نے کہا کہ میں اسلام کا مطالعہ کر رہا ہوں، قرآن کریم کے بہت سے انگریزی ترجمے دیکھے مگر دل کو اطمینان نہیں ہوا۔ میں نے جواباً فرمایا کہ میں نے بھی ایک ترجمہ کیا ہے اس کو بھی پڑھ لیں۔ چنانچہ مسودہ اُس کو دے دیا۔ جب وہ عیسائی فاضل یہ ترجمہ پڑھ چکا تو اتنا متاثر ہوا کہ مشرف با اسلام ہوگیا۔ ۵

یہ ترجمہ انگلستان اور لاہور سے شائع ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر فاطمی آپ کی عربی تصانیف پر بھی کام کر رہے تھے کہ زندگی نے وفا نہ کی۔ انگریزی ادب کے پروفیسر غیاث الدین قریشی (نیو کاسل یونی ورسٹی، نیو کاسل۔ انگلستان) نے احمد رضا کے مشہور سلام ''قصیدۂ سلامیہ'' کے ۶۹ اشعار کا انگریزی میں منظوم ترجمہ کیا اور یہ ترجمہ لاہور سے شائع ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ پروفیسر قریشی نے ''ملفوظاتِ اعلیٰ حضرت'' کو انگریزی میں منتقل کیا۔ آپ نے احمد رضا خاں بریلوی کی شاعری پر ایک مضمون لکھا تھا، جو ماہنامہ دی میسیج انٹرنیشنل (The Message International) میں شائع ہوا۔ اپنے اس مضمون میں وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

> (ترجمہ انگریزی): ''شریعتِ اسلامیہ کے صرف حنفی مکتب فکر کے مسائل میں انہوں نے جس ذہن رسا کا ثبوت دیا ہے اس سے وہ اس بات کے مستحق ہیں کہ ان کو فضل و کمال کی بلند ترین مسند پر بٹھایا جائے۔ وہ جودتِ طبع او وسعتِ علم کے مالک تھے۔ ان کی نگاہ کی تیزی اور صفائی ایک عظیم ذہن کی خاص علامت ہے''۔ ۶

پروفیسر غیاث الدین قریشی نے محدث بریلوی کی کتاب ''تمہید ایمان بآیات قرآن'' کا بھی انگریزی میں ترجمہ کیا اور اس کے علاوہ ''حدائق بخشش'' کی بہت سی نعتوں کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ کیمرج یونی ورسٹی برطانیہ کے نومسلم انگریز اسکالر ڈاکٹر محمد ہارون نے احمد رضا کے حوالے سے کئی تحقیقی مقالات قلم بند کیے۔ ۱۹۸۸ء میں احمد رضا کے ترجمۂ قرآن ''کنزالایمان'' اور دیگر کتب کے مطالعہ سے متاثر ہوکر اسلام قبول کیا۔ موصوف ''کنزالایمان'' کی بنیاد پر قرآن کریم کا سلیس انگریزی ترجمہ اور تفسیر لکھ رہے تھے، کہ اللہ کو پیارے ہوگئے۔ ۷

اس طرح دیکھا جائے تو یورپ کے ملکوں میں بھی نہ صرف آپ کی تصانیف کو پڑھا اور سمجھا جارہا ہے بلکہ اس پر انگریزی میں کام بھی کیا جارہا ہے۔

ڈاکٹر خلیل عبدالحمید ازہر یونی ورسٹی ''کلیۃ اللغات والترجمہ'' میں شعبۂ فارسی کے استاد ہیں۔ انہوں نے احمد رضا کے فارسی کلام کا انتخاب ''ارمغانِ رضا'' کا عربی نثر میں ترجمہ کیا۔ جبکہ اس نثری ترجمے کو عربی نظم میں کرنے کا بیڑا بین الاقوامی شہرت کے حامل ڈاکٹر حسین مجیب المصری نے اٹھایا ہے۔

عربی زبان میں غالباً سب سے پہلے پروفیسر محی الدین الوائی (ازھر یونی ورسٹی، قاہرہ) جو مسلکا اہلِ حدیث تھے، نے محدث بریلوی پر ایک وقیع مقالہ لکھا جو قاہرہ کے مشہور جریدہ ''صوت الشرق'' میں ۱۹۷۵ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ ان کے بعد فاضل بریلوی پر عربی زبان میں لکھنے والوں کی فہرست لمبی ہوتی چلی گئی۔

پاکستان کے سابق وزیر تعلیم خان محمد خاں نے ۱۹۸۰ء میں ''یومِ رضا'' کے موقع پر راولپنڈی کے ایک جلسے میں خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

''اعلیٰ حضرت کی دینی اور ملی خدمات کو دیکھ کر حرم پاک کے عظیم عالم سید خلیل مکی نے انہیں ''چودھویں صدی کا مجدد'' کہا اور یہ نعرہ اہلِ سُنّت کا نعرہ بن گیا۔ لبنان کے شہرۂ آفاق مفکر علامہ یوسف نبہانی نے انہیں ''امام کبیر'' کے لقب سے نوازا......

جن حضرات نے اعلیٰ حضرت کی گراں مایہ کتب کا مطالعہ کیا ہے اور ان کی وسیع المطالعہ شخصیت کو ملاحظہ کیا ہے اور ان کے وسعتِ علمی کے سمندر میں غوطہ زنی کی کوشش کی...... وہ یقیناً علامہ مکی اور علامہ نبہانی کی آرا کی تائید کرتے ہیں۔

''ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ انسان اربعہ عناصر سے مرکب ہے، مگر اعلیٰ حضرت کا خمیر تین عناصر سے اُٹھا تھا اور وہ ہیں۔ ۱۔علم، ۲۔عمل، ۳۔محبتِ حبیبِ خدا ﷺ۔'' ۸

آپ کے علم و فضل کی شہرت نہ صرف ہند و پاک کی سرزمین تک محدود رہی بلکہ عرب و عجم تک جا پہنچی۔ چنانچہ رحمٰن علی اپنی فارسی تصنیف ''تذکرہ علمائے ہند'' میں لکھتے ہیں:

''در سال نو دو پنجم صدی مذکور (۱۲۹۵ھ) بہ معیت والد ماجد خود بہ زیارت حرمین شریفین زاد ہما اللہ شرفاً، مشرف شدہ از اکابر علمائے آں دیار آں آعنی سید احمد دحلان مفتی شافعیہ و عبدالرحمٰن سراج مفتی حنفیہ، سند حدیث و فقہ و اصول و تفسیر و دیگر علوم یافتہ۔ روز نماز مغرب بمقام ابراہیم علیہ السلام خواند، بعد نماز امام شافعیہ حسین بن صالح جمل اللیل بلا تعارف سابق، دستِ صاحب ترجمہ گرفتہ بخانۂ خود بُرد و تا دیر پیشانی وے گرفتہ فرمود۔ انی لا اجد نور اللّٰہ من ھذا الجبین.

پس سندِ صحاح ستہ و اجازتِ سلسلۂ قادریہ بہ دستخطِ خاص دادہ فرمودند کہ نام تو ضیاء الدین احمد است و سندِ مذکور تا امام بخاری علیہ الرحمہ یازدہ وسائط واند و ہم در مکہ معظمہ بہ اسمائے شیخ جمل اللیل موصوف شرح رسالہ جوہرۂ مضیہ در بیانِ مناسکِ حج مذہب شافعیہ کہ از تصانیف شیخ سابق الوصف است، اندر دو یوم نوشتہ و نامِ آں النیرة الوضیة فی شرح الجوهرة المضیة مقرر کردہ پیشِ شیخ بُرد، شیخ بہ تحسین و آفرین وے لب کشاد، در مدینہ طیبہ مفتی شافعیہ یعنی صاحبزادہ مولانا محمد بن محمد عرب ضیافتِ صاحب ترجمہ کرد، بعد نماز عشاء صاحب ترجمہ در مسجدِ خیف تنہا توقف نمود، در آں جا بشارت مغفرت یافتہ۔'' ۹

ترجمہ: ۱۲۹۵ھ میں اپنے والد ماجد کے ہمراہ حرمین شریفین حاضر ہوئے اور وہاں کے اکابر علما

مفتی شافعیہ سید احمد دحلان، مفتی حنفیہ عبدالرحمٰن سراج سے حدیث و فقہ و اصول و تفسیر اور دوسرے علوم میں سند لی۔

ایک روز نمازِ مغرب مقام ابراہیم علیہ السلام پر ادا کی۔ نماز کے بعد امام شافعیہ حسین بن صالح جمل اللیل نے سابقہ تعارف کے بغیر مولانا احمد رضا خاں کا ہاتھ پکڑا اور اپنے گھر لے گئے۔ وہاں دیر تک آپ کی پیشانی تھامے رہے اور فرمایا: ''مَیں اس پیشانی میں اللہ کا نور پاتا ہوں۔''

اس کے بعد امام شافعیہ نے آپ کو صحاح ستہ میں اور سلسلۂ قادریہ میں اپنے دستخطِ خاص سے اجازت مرحمت فرمائی اور فرمایا کہ تمہارا نام ضیاء الدین رکھا، سندِ مذکور میں امام بخاری علیہ الرحمۃ تک گیارہ واسطے ہیں۔

مکہ معظمہ میں شیخ جمل اللیل موصوف کے ایما پر مذہب شافعیہ میں مناسکِ حج پر اُن کے رسالے جوہرۂ مضیہ کی دو روز میں شرح لکھی اور اس کا نام ''النیرۃ الوضیہ فی شرح الجوھرۃ المضیۃ'' رکھا۔ جب یہ شرح شیخ موصوف کے پاس لے گئے تو شیخ نے تحسین و آفرین کہا۔

مدینہ طیبہ میں مفتی شافعیہ صاحب زادۂ مولانا محمد بن محمد عرب نے آپ کی دعوت کی۔ اسی روز نمازِ عشاء کے بعد مسجدِ خیف میں تنہا قیام کیا، یہاں آپ کو مغفرت کی بشارت ملی''۔

دوسرے سفرِ حج کے دوران احمد رضا خاں بریلوی سے حرمین شریفین میں جو سوالات کیے گئے، جو مناظرے ہوئے اور ان کے جواب میں جو کتابیں لکھیں اور ان کتابوں کی جو پذیرائی ہوئی اور حرمین شریفین کے بیش تر علما نے ان کتابوں پر جو تقاریظ اور تصدیقات ثبت کیں وہ عالمِ اسلام میں مولانا کی شہرت کے اہم اسباب ہیں۔

مولانا کی وہ تصانیف جس سے علمائے عرب نے فیض اٹھایا اور اپنے اپنے تاثرات قلم بند کیے اور مولانا کی شہرت و مقبولیت کو چار چاند لگادیے، وہ تصانیف قابلِ ذکر ہیں:

۱۔ فتاویٰ الحرمین برجف ندوۃ المین۔ (۱۲۹۴ھ/۱۸۷۷ء)

۲۔ المستند المعتمد فی نجاۃ الابد۔ (۱۳۲۰ھ/۱۹۰۲ء)

۳۔ الدولۃ المکیہ بالمادۃ الغیبیہ۔ (۱۳۲۳ھ/۱۹۰۵ء)

۴۔ الاجازۃ الرضویہ لمبجل البھیۃ۔ (۱۳۲۳ھ/۱۹۰۵ء)

۵۔ الاجازۃ المتینہ لعلماء بکہ والمدینہ۔ (۱۳۲۴ھ/۱۹۰۶ء)

۶۔ کفل الفقیہ الفاھم فی احکام قرطاس الدراھم۔ (۱۳۲۴ھ/۱۹۰۶ء)

۷۔ الفیوض المکیہ لمحب الدولۃ المکیہ۔ (۱۳۲۵ھ/۱۹۰۷ء)

ان میں بعض کتابوں کی وجہ تالیف کو لکھنا ضروری سمجھتی ہوں۔ اس سے یہ اندازہ ہو جائے گا کہ یہ کتابیں کیوں لکھی گئیں اور ان کتابوں پر علمائے حرمین کے کیا تاثرات تھے۔

۱) فتاویٰ الحرمین: یہ استفتا و فتویٰ تقریباً چالیس صفحات پر مبنی ہے۔ یہ ندوۃ العلما کے بارے میں محدّث بریلوی کے ۲۸ سوالات کے جوابات پر مشتمل ہے۔ مولانا بریلوی اپنے عربی اشعار میں اس کی تفصیل اس طرح بیان کرتے ہیں:

''فما هو الا شغل عشرين ساعة | وعنها الى السجدات والاكل يفرد

فما كان ذا الا بتوفيق ربنا | له الحمد حمدا دائما يتأبه''۔ ۱۰

بقول احمد رضا یہ کتاب ۲۰ گھنٹے کی محنت کا ثمرہ ہے۔ ۱۶رشوال ۱۳۱۷ھ کو بعد نمازِ صبح سے لے کر ۱۷رشوال ۱۳۱۷ھ طلوعِ فجر سے پہلے مسودہ مکمل کرلیا۔ جب یہ ۲۸ سوالات کے جوابات پر مشتمل مسودہ علمائے حرمین شریفین کے پاس پہنچا، تو انہوں نے ان جوابات کی تصدیق کی۔ چنانچہ مکہ معظمہ کے سولہ اور مدینہ منورہ کے سات علمائے کرام نے اس کی تصدیق و توثیق فرمائی۔ تصدیقات پیش کرنے والے علما میں حافظ کتب الحرم شیخ اسماعیل بن خلیل مکّی کی تصدیق ۲۲ صفحات پر مشتمل ہے، جس میں سوالات پر بحث اور جوابات کی تصدیق کے علاوہ احمد رضا کے علم و فضل کا اعتراف کیا ہے اور ساتھ ہی آپ کو بلند القاب و آداب سے بھی نوازا گیا ہے۔

۲) المستند المعتمد بناء نجاة الابد: احمد رضا بریلوی نے شاہ فضلِ رسول بدایونی کی عربی تصنیف ''المعتقد المنتقد'' (۱۲۷۰ھ/۱۸۵۳ء) پر ''المعتمد المستند'' کے نام سے عربی میں تعلیقات و حواشی کا اضافہ کیا۔ ۱۱ مولانا کی یہ تصنیف ۱۳۲۴ھ/۱۹۰۶ء میں علمائے حرمین کے سامنے پیش کی گئی۔ اس پر ۳۷ علما نے اپنی اپنی تقاریظ اور تصدیقات ثبت کیں۔ ۱۲ محدّث بریلوی نے اپنی اس تصنیف میں بعض معاصرین کی قابلِ اعتراض نگارشات کے مطالعے کے بعد اُن کا تعاقب کرتے ہوئے اپنا خیال ظاہر کیا ہے۔

۳) الدولة المكيه بالمادة الغيبيه: مسئلۂ علمِ غیب پر محدّث بریلوی کی یہ تصنیف دوسرے حج بیت اللہ کے دوران ۱۳۲۳ھ/۱۹۰۵ء میں منظرِ عام پر آئی۔ یہ وہ تصنیف ہے جس نے احمد رضا کو عرب و عجم، معترضین و ممدوحین اور ہر خاص و عام میں مقبول بنایا۔ آپ حج بیت اللہ کے لیے مکہ معظمہ حاضر ہوئے تو وہاں مخالفین نے آپ پر یہ الزام لگایا کہ مولانا بریلوی علمِ مصطفےٰ کو علمِ الٰہی کے مثل قرار دیتے ہیں۔ شریفِ مکہ کی طرف سے محدّث بریلوی سے اس مسئلے پر چند سوالات کیے گئے۔ فاضل بریلوی نے اس استفتا کے جواب میں مسئلۂ علمِ غیب پر ایک تحقیقی مقالہ قلم بند کیا، جس کا تاریخی نام ''الدولة المكيه''

ہے۔ اس میں علمِ ریاضی، فلسفہ اور منطق سے متعلق بعض مباحث موجود ہیں۔ اس مقالے کے مباحثِ علمیہ سے شریف مکّہ اور علمائے حرمین شریفین بہت متاثر ہوئے اور تقریباً ۵۰ علمائے حرمین اور ۱۵ دیگر بلادِ اسلامیہ کے علما نے اس پر تقاریظ لکھیں۔ ان تقاریظ کا تذکرہ آگے آرہا ہے۔

اب ان تقاریظ میں سے بعض تقریظ کا اردو ترجمہ پیش کیا جارہا ہے جس سے بخوبی یہ اندازہ ہوجائے گا کہ علمائے حرمین شریفین، کتاب اور صاحب کتاب کے بارے میں کیا رائے رکھتے تھے۔ ان جلیل القدر علما وفضلا کی تقاریظ کو بھی امام احمد رضا کی شہرت و مقبولیت کا ایک عظیم سبب قرار دیا جاسکتا ہے۔

عربی تقریظ کا ترجمہ وتلخیص:

احمد الحسنی الجزائری بن السعید احمد المدنی

(مفتی مالکیہ، مکہ معظمہ)

''علامۂ زماں، یکتائے روزگار، منظور انظار، سید عدنان، منبع عرفان، حضرت مولانا شیخ احمد رضا خان کا رسالہ ''الدولة المکیه بالمادة الغیبیه'' کا مطالعہ کیا۔ یہ ایسی تالیف ہے جس سے ہر صاحب توفیق سمجھ دار انسان نفع حاصل کرے گا۔ مصنف پر یہ الزام کہ علمِ الٰہی اور علمِ مصطفےٰ (ﷺ) میں مساوات کے قائل ہیں، اس رسالے کے مطالعے سے غلط ثابت ہوتا ہے۔ رسالے میں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ اس کے مؤلف کو اپنے افضال سے نوازے اور مسلمانوں میں اُن جیسے بہت سے علما پیدا کرے۔ آمین'' (۱۹ربیع الاول ۱۳۳۱ھ/۱۹۱۳ء)

محمود بن علی عبدالرحمٰن الشوبل

(مدرّس حرمِ نبوی، مدینہ منورہ)

''بندۂ حقیر، مدرّسِ حرم نبوی محمود بن شیخ عبدالرحمٰن شوبل عرض کرتا ہے کہ حضرت عالم النحریر، دراکۃ الشہیر، امام، مرشد، شیخ احمد رضا خان ہندی کی تالیف (الدولة المکیه) مَیں نے مطالعہ کی۔ اس کے مضامین امام الانبیا سید الاصفیا صلی اللہ علیہ وسلم پر عجیب انداز سے لکھے گئے ہیں۔ اس کو آنکھوں کے پانی سے دلوں پر لکھنا چاہیے۔'' (یکم ربیع الاول ۱۳۳۱ھ/۱۹۱۳ء)

یوسف بن اسماعیل النبهانی

(بیروت)

''اس سال ۱۳۳۱ھ میں مدینہ منورہ میں بعض افاضل علما خصوصاً سید عبدالباری بن علامہ سید امین رضوان نے خواہش ظاہر کی کہ مَیں علامہ امام احمد رضا خان کی تالیف 'الدولة المکیه بالمادة الغیبیه' پر تقریظ لکھوں، ان سے قبل عالمِ باعمل، شیخ فاضل شیخ کریم اللہ ہندی نے بیروت کے پتے پر

مجھ سے خط و کتابت کی تھی۔ جب اس دفعہ سید عبدالباری نے کتاب میرے پاس بھیجی تو میں نے اس کو شروع سے آخر تک پڑھا اور تمام دینی کتابوں میں زیادہ نفع بخش اور مفید پایا۔ اس کی دلیلیں بڑی مستحکم ہیں جو ایک امامِ کبیر، علامہ اجل ہی کی طرف سے ظاہر ہوسکتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس کے مصنف سے راضی رہے اور اپنی عنایتوں سے ان کو راضی کرے۔ آمین!" (صفر ۱۳۳۱ھ/۱۹۱۳ء)

محمد یسین بن سعید

(مدرّس حرمِ نبوی، مدینہ منورہ)

"ادیب لبیب شیخ احمد رضا خان کی تالیف 'الدولة المکیه بالمادة الغیبیه' مطالعہ کی اور اس کو قابلِ قبول پایا کیونکہ یہ ان باتوں سے پاک ہے، جو اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق نہیں۔ اور اس میں ہمارے سردار حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر جمیل ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے مصنف کو آپ کے طفیل مقبولیت و سعادت عطا فرمائے اور ان کی تمام امیدیں و آرزوئیں برلائے۔ آمین"

(رمضان المبارک ۱۳۲۹ھ/ ۱۹۱۱ء)

عبدالقادر حلمی الحسنی الخطیب

(مدینہ منورہ)

"جب میں مدینہ منورہ میں زیارتِ روضۂ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مشرف ہوا تو بعض احباب نے علامۃ الدہر حضرت مولانا شیخ احمد رضا صاحب کی تالیف 'الدولة المکیه' کو دیکھنے کے لیے اصرار کیا۔ چونکہ وطن واپسی کا وقت قریب آچکا تھا، اس لیے جلدی جلدی رسالۂ مذکورہ کو پڑھا، میں نے اسے سرچشمۂ تحقیق پایا۔ اس سے واضح ہوگیا کہ مؤلف علامہ کے بارے میں جو یہ مشہور کیا گیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے علم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علم کے برابر سمجھتے ہیں، سراسر جھوٹ بہتان ہے۔ اس الزام کے خلاف یہ کتاب ایک روشن ثبوت ہے۔" (۲۲ ربیع الاوّل ۱۳۳۱ھ/۱۹۱۳ء)

سید عمر بن سید مصطفیٰ غیطہ

(مدینہ منورہ)

"سعادتِ ابدیہ کا امیدوار سید عمر بن مصطفیٰ غیطہ، خادمِ حدیث حرمِ نبوی عرض کرتا ہے کہ حضرتِ علامہ عارفِ ربانی، استادِ کبیر، عالمِ بے نظیر، حضرت شیخ احمد رضا خان کی تالیف 'الدولة المکیه بالمادة الغیبیه' مسجدِ نبوی میں مجھے سُنائی گئی۔ میں نے اس کو مختصر مگر جامع و صحیح پایا۔ یہ وہم کی تاریکی سے نکال کر فہم کی روشنی کی طرف لے جاتی ہے۔ میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ اس کو مفید بنائے۔ آمین"

(۲۲ ربیع الاوّل ۱۳۳۱ھ/۱۹۱۳ء)

حسین بن محمد

(مدرّسِ حرمِ نبوی، مکہ معظمہ)

''عالم و عامل، سُنّی کامل شیخ احمد رضا خاں بریلوی کی تالیف 'الدولة المکیه بالمادة الغیبیه' مَیں نے مطالعہ کی۔ اس میں ایسی قوی دلیلیں ہیں جو مخالفین کو خاموش کر دیتی ہیں۔ جو شخص بھی اس کتاب کے مقابلے پر کوئی نظریہ پیش کرے گا، مغلوب ہوگا۔'' (صفر ۱۳۳۲ھ/۱۹۱۴ء)

عبدالکریم ابن التارزی بن عزور التونسی

(مدرّسِ حرمِ نبوی، مدینہ منورہ)

''استاذِ کامل فریدِ عصر، یگانۂ دہر حضرتِ علامہ شیخ احمد رضا خاں کی تالیف 'الدولة المکیه' دیکھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ اس کے مضامین قابلِ اتباع ہیں۔ جو حقیقت میں الہاماتِ ربانیہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ مؤلف علامہ کو جزائے خیر عطا فرمائے اور ان جیسے افراد بکثرت پیدا فرمائے۔ آمین''

شیخ علی بن علی الرحملنی

(مدرّسِ حرمِ نبوی، مدینہ منورہ)

''یہ رسالہ عالمِ علامہ، بحرِ فہامہ، معدنِ فصاحت و براعت، اجل علما اہلِ سُنّت و جماعت، مولانا و استاذنا شیخ احمد رضا خاں کی تالیف ہے۔ مَیں نے اس رسالے کو شافی و کافی اور جامع و وافی پایا جو مؤلفِ بزرگ کے کمالِ علم پر دلالت کرتا ہے۔ بے شک وہ اکابر علمائے اہلِ سُنّت میں سے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان کی ذات اور اُن کی تصانیف سے نفع پہنچائے اور اُن کے برکات و نفعات ہم پر اور تمام مسلمانوں پر لوٹا رہے، آمین۔ مَیں نے اس بزرگ اور بلند مرتبہ تالیف کے مطالعے کی تاریخ لکھی ہے۔''

محمد توفیق الایوبی الانصاری

(مدینہ منورہ)

''رسالہ 'الدولة المکیه بالمادة الغیبیه' جو حجم میں چھوٹا ہے، معلومات کے لحاظ سے بڑا ہے۔ فاضل مصنف سے میری التجا ہے کہ اپنی دعاؤں میں مجھے شامل رکھیں۔ ان کی دعائیں قبولیت کے شایانِ شان ہیں کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مخلصانہ محبت رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ مصنف کو بہتر بدلہ عطا فرمائے اور آخرت میں اپنی کامل نعمتوں سے سرفراز فرمائے، آمین!

بے شک مصنف پاکیزہ بیان والے ہیں۔ انھوں نے اپنے پاکیزہ دلائل بیان کر کے مخلوق و خالق کے علم میں فرق کر دیا ہے اور اپنے بے خطا تیر سے حقیقت کے جگر کا شکار کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان جیسی ہستیاں زیادہ سے زیادہ پیدا فرمائے اور اپنے جود و سخا کی بارشیں کرے، آمین!''

مصطفیٰ ابن التارزی بن عزوز التونسی

(مدرّسِ حرمِ نبوی، مدینہ منورہ)

''میں نے رسالہ الدولة المکیہ کے مطالعہ کا شرف حاصل کیا ہے، اس کے مؤلف رہبر و رہنما، علامہ اکبر اور عمدۃ الفہامۃ ہیں۔ اپنے علم و کمال کی وجہ سے مشہور ہیں۔ عارف باللہ ہیں اور ہر حال و مقام میں اللہ ہی کی طرف بلاتے ہیں۔ یعنی ہمارے سردار احمد رضا خاں صاحب ان کی مساعی مقبول و محمود ہو۔ ان کی عنایات بلند اور لطف و کرم ہمیشہ ہمیشہ جاری رہیں۔ میں نے اس رسالے کی اصولی باتوں کے لفظی جواہر کی طرف توجہ اور اس کے باغ معنی کے پھولوں میں فکر کو جولاں کیا تو میں نے اس کے بے مثال موتیوں کو خوش بیان اور خوب مضبوط پایا۔ اس کے روشن فائدوں سے ذہنوں کے باغوں میں روشنیاں پھیل گئیں۔ اس کی شاخیں اور جڑیں فیصلہ کن اور واضح قرآنی آیتوں صحیح و مشہور حدیثوں اور اعلیٰ قسم کے عقلی روشن دلیلوں سے لدی ہوئی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کمالاتِ علیہ کی پاسبان ہے اور عقایدِ اہلِ سُنّت و جماعت کے عین مطابق، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فضل و کمال کی حقیقت کا علم اللہ ہی کو ہے جس نے آپ کو یہ علوم عطا فرمائے۔ اس سے انکار ایک جاہل ہی کرسکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ مؤلف کو خوب خوب نوازے۔ وہ استادِ کامل اور جامع (معقول و منقول) ہیں، وہ ابر باراں کی طرح فیض رساں ہیں۔ انہوں نے بندگانِ خدا کو فائدے پہنچائے اور ان کو راہ دکھائی۔ انھوں نے شہروں کو روشن کیا۔ یہ اُن کی شرف و بزرگی اور حسنِ سیرت کی دلیل ہے اور ان کے اخلاص، پاکیزگی، طبعی ذکاوت اور آگہی کا روشن ثبوت، وہ معقول و منقول اور اصول و فروع کے میدانوں میں گوئے سبقت لے گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں میں ان جیسے اور بہت سے پیدا کرے۔ آمین!

(۱۰/۱۳۳۰ھ/۱۹۱۲ء)

ہدایۃ اللہ بن محمود بن محمد سعید السندی البکری

(مدینہ منورہ)

بندۂ ضعیف جب ۹ رمحرم ۱۳۳۰ھ کو چھٹی مرتبہ زیارتِ روضۂ مبارکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لیے حاضر ہوا تو زیارت کے بعد مواجۂ شریفہ میں جامع الفضائل والخصائل مولانا محمد کریم اللہ سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے مجدد مائۃ حاضرہ حضرت علامہ عبدالمصطفیٰ شیخ احمد رضا خان حنفی کی تالیفِ جلیل ''الدولة المکیة'' کا ذکر کیا۔ میں عرصۂ دراز سے اس رسالے کا مشتاق تھا، یہ میری دیرینہ آرزو مولانائے مذکور کی وساطت سے پوری ہوئی۔ میں نے کتاب کا مطالعہ کیا اور محظوظ ہوا۔ اس قدر مسرور

ہوا کہ زبان وقلم دونوں اس کے بیان سے عاجز ہیں۔ مَیں نے تحقیق و تدقیق میں اس رسالے کو خوب سے خوب پایا اور مجھے یقین ہوگیا کہ شنید دید کی مانند نہیں۔ جو کچھ حضرت مؤلف علامہ کے مخالفین نے پروپیگنڈہ کیا تھا کہ مؤلف علامہ، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے علم کو اللہ تعالیٰ کے علم کے برابر سمجھتے ہیں، یہ الزام سراسر جھوٹ ہے، جو مخالفین کے حسد و بغاوت کی پیداوار ہے۔ بلکہ ان کے جہل مرکب اور کند ذہنی کی دلیل ہے۔ کاش ان کو معلوم ہوتا کہ حسد صرف جسم کو ہلاک کرتا ہے اور حاسد کبھی رہبر نہیں بن سکتا۔ اللہ تعالیٰ کے حضور ایسی جھوٹی قوم سے شکایت ہے جو افترا پر فخر کرتے ہوئے اس آیۂ کریمہ سے روگرداں ہے: ''انما یفتری الکذب الّذین لا یؤمنون'' ان لوگوں کی گھٹیا درجے کی حرکتوں میں یہ ہے کہ اپنی گڑھی ہوئی باتوں کو مشہور کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ کی اس آیۂ کریمہ کو بھول جاتے ہیں: ''انّ الّذین یؤذون المؤمنین والمؤمنات بغیر ما اکتسبوا قد احتملوا بھتاناً واثماً مبیناً،، کاش ان لوگوں کی آنکھوں پر حسد و بغض کے پردے نہ ہوتے تو مذکورہ رسالے کے کئی مقامات پر مؤلف علامہ کی تحریر کی روشنی میں اپنے باطل دعوؤں کو پادر ہوا پاتے۔ مثلاً نظر اوّل میں مؤلف فرماتے ہیں: ''علمِ ذاتی اللہ تعالیٰ کے لیے خاص ہے۔ جو بھی علمِ ذاتی میں سے ادنیٰ سے ادنیٰ بھی کسی کے لیے ثابت کرے تو وہ کافر ومشرک ہے۔'' اور فرماتے ہیں: ''علمِ غیر متناہی کمی اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص ہے۔'' اور فرماتے ہیں: ''کوئی بھی شخص اللہ تعالیٰ کے علم کو تفصیلاً، شرعاً اور عقلاً احاطہ نہیں کرسکتا بلکہ تمامی جہانوں کے علوم جمع کیے جائیں تو ان کی نسبت اللہ تعالیٰ کے علوم کے سامنے ایک قطرے کے ہزارویں حصے میں سے کسی ایک حصے کی ہزارہا سمندروں کی طرف نسبت کی مانند ہے۔''

نظر ثانی میں فرماتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ کے علم کے ساتھ کائنات کے علم کی مساوات کا خیال بھی کسی مسلمان کے دل میں نہیں آسکتا۔''

نظرِ ثالث میں فرماتے ہیں: ''علمِ ذاتی مطلق محیط تفصیلی اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے، مخلوقات کو صرف علمِ عطائی حاصل ہے۔''

نظرِ خامس میں فرماتے ہیں: ''ہم کسی مخلوق کا علم اللہ کے علم کے برابر اور مستقل نہیں مانتے بلکہ بعض عطائی فرماتے ہیں۔ پس مخالفین مساوات کا ڈھنڈورا کیسے پیٹتے ہیں، کیسے حق سے ہٹ جاتے ہیں۔''

(۱۴ ربیع الاوّل ۱۳۳۰ھ/۱۹۱۲ء)

محمد آفندی الحکیم

(دمشق)

''باغ و بہار، بے مثل کتاب، ''الدولۃ المکیۃ'' کے مطالعے سے محظوظ ہوا۔ میری معرفت

میں اضافہ اور میرے قلب میں پختگی پیدا ہوئی۔ یہ کتاب مؤلف علامہ کے معارفِ نقلیہ و عقلیہ اور شریعتِ محمدیہ کے لیے ان کی غیرت پر گواہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اسلام میں ان جیسے علما بکثرت پیدا کرے جو ہدایت و ارشاد کے لیے آفتاب بن کر چمکیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ حضرت علامہ احمد رضا خاں کو اپنی عنایت اور حضور علیہ الصلوٰۃ و السلام کے طفیل رہتی دنیا تک سچائی پر قائم رکھے اور یہ باطل کو مٹاتے رہیں اور حق کو ثبت کرتے رہیں، آمین۔'' (۱۷ر صفر المظفر ۱۳۳۲ھ/۱۹۱۴ء)

محمد امین سوید

(دمشق)

علامہ کبیر، فہامہ شہیر، محقق و مدقق کامل، شیخ احمد رضا خاں کی تالیف ''الدولۃ المکیۃ بالمادۃ الغیبیۃ'' مطالعہ کیا۔ مَیں نے اسے ایک ایسا عظیم الشان سایہ دار درخت پایا جو اپنے دامن میں مذہبِ اسلام کا جوہر سمیٹے ہوئے ہے اور ایک چمن جو عقایدِ اہلِ ایمان کا نچوڑ ہے۔

بے شک علمِ ذاتی محیط اللہ تعالیٰ کے لیے خاص ہے لیکن اللہ تعالیٰ اپنے مخصوصین کو ایسے علم سے آگاہ کرتا ہے جس سے وہ پہلے ناآشنا تھے۔ یہ ایسی بات ہے جس کے جائز اور واقع ہونے میں کوئی شک نہیں۔ یہ علم ذاتی نہیں بلکہ اللہ کی تعلیم پر موقوف ہے تو بلاشبہہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم کو ایسے علوم سے مطلع کیا جو آپ کے لیے خاص ہیں اور آپ کے سوا تمام مخلوقات ان سے ناآشنا ہے۔ (۱۶ر ربیع الآخر ۱۳۳۱ھ/۱۹۱۳ء)

محمد عارف بن محی الدین بن احمد السہیر بالمحملجی

(دمشق)

''علامہ شہیر شیخ احمد رضا خاں کی تالیف کردہ کتاب ''الدولۃ المکیۃ'' کی بعض عبارات کو دیکھا، یہ اپنے موضوع پر کافی اور جامع ہے۔ اس میں اہلِ حق کے مطابق عقاید کا بیان ہے۔ اللہ تعالیٰ مؤلف کو بہتر بدلہ عطا فرمائے۔ ان کا کلام اُن کے کمالِ علم پر دلالت کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے علوم سے ہمیں متنفع فرمائے۔ آمین!'' (رمضان المبارک ۱۳۲۹ھ/۱۹۱۰ء)

محمد تاج الدین بن محمد بدر الدین

(دمشق)

۱۳۳۱ھ میں جب دمشق سے مدینہ منورہ حاضر ہوا اور سیّد عالم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی چوکھٹ کی زیارت سے شرف یاب ہوا تو مجھے ''الدولۃ المکیۃ'' کے مطالعہ کے لیے کہا گیا۔ چنانچہ مَیں نے اس کتاب کو اس طرح مضطربانہ دیکھا جس طرح دوست کو جدائی کے وقت دیکھتا ہے۔ مَیں نے

اسے بے مثل پایا، اس کی صداقت بیانی اور استقامت نشانی روشن ہے۔ ایسا کیوں نہ ہو کہ اس کتاب کے مؤلف بڑے صاحب فضل مولانا شیخ احمد رضا خاں ہیں۔ جو اپنے ہم مثلوں میں بہترین اور قدر و منزلت والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں بہترین جزا عطا فرمائے اور ہم سب کو قیامت کے دن حضور سیّد الانبیاء صلّی اللہ علیہ وسلّم کے جھنڈے تلے جمع فرمائے، آمین!

مَیں نے چند جوہات کی وجہ سے تقریظ میں اختصار کو پیش نظر رکھا، پہلی بات تو یہ ہے کہ مؤلف کے اوصاف تفصیل وتطویل سے بے نیاز ہیں، دوسری بات یہ کہ مَیں دیارِ حبیب صلّی اللہ علیہ وسلّم سے جُدا ہو رہا ہوں، آنکھیں اشک بار ہیں اور یہ تقریظ لکھ رہا ہوں۔'' (۹ ربیع الآخر ۱۳۳۱ھ/۱۹۱۳ء)

محمد یحییٰ المکتبی الحسینی

(دمشق)

''مجاور مدینۃ النبی استاد ومحترم مولوی شیخ کریم اللہ کی وساطت سے علامہ محقق شیخ احمد رضا خاں کی تالیف ''الدولۃ المکیۃ'' کے مطالعہ سے مشرف ہوا۔ میں نے اس رسالے کو عقایدِ سلف کے مطابق پایا۔ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کا غیوب کے متعلق خبر دینا، آپ کی دوسری تمام نشانیوں اور معجزات کی طرح ہے۔ ابن تیمیہ نے بھی ''ابواب الصحیح'' میں اس کا ذکر کیا ہے۔ کوئی اس بات سے انکار نہیں کرسکتا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیوں اور ولیوں کو غیب پر مطلع نہیں کیا ہے کیوں کہ قرآن کریم ایسے واقعات سے بھرا ہوا ہے۔ مثلاً حضرت موسیٰ وحضرت خضر کا واقعہ، اور تو اور حضرت صدّیق اکبر اور حضرت عمر کے واقعات، اور ہمارے زمانے میں استاد شیخ محمد بدرالدّین محدّث سے بھی ایسے واقعات ظہور پذیر ہوئے ہیں جو اخبارِ غیبیہ سے متعلق ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہمارے اور مسلمانوں کے قلوب کو منور فرمائے اور ہم تمام لوگوں کو ان باتوں کی توفیق عطا فرمائے جن میں اُس کی اور اُس کے نبی مکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی رضا ہو، آمین!''

(۷ صفر ۱۳۲۷ھ/۱۹۰۹ء)

محمد القاسمی

(دمشق)

''عالم و عامل، فاضل و کامل، حضرت شیخ احمد رضا خاں کی تالیف ''الدولۃ المکیۃ بالمادۃ الغیبیہ'' مطالعہ کیا، یہ اپنے موضوع پر فیصلہ کن بات ہے اور حکمت سے معمور ہے۔ مؤلف قابلِ مبارک باد ہیں کہ ان مباحث میں غور وفکر کے بعد گروہِ باطل کے جمع کردہ دلائل کو پارہ پارہ کردیا۔ یہ عین حق ہے کیونکہ مؤلفِ کتاب، فضائل وکمالات کے ایسے جامع ہیں جن کے سامنے بڑے سے بڑا ہیچ

ہے۔ وہ فضل کے باپ اور بیٹے ہیں۔ ان کی فضیلت کا یقین، دشمن و دوست دونوں کو ہے۔ ان کا علمی مقام بہت بلند ہے۔ ان کی مثال لوگوں میں بہت کم ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی حیات سے مسلمانوں کو فایدہ پہنچائے اور ہم کو ان کی برکات سے سرفراز فرمائے، آمین!'' (۲ر رمضان المبارک ۱۳۲۹ھ/۱۹۱۱ء)

محمد عطاء اللہ العتم

(دمشق)

کتاب ''الدولۃ المکیۃ'' مطالعہ کیا۔ یہ سیدھی راہ دکھانے والی ہے اور قرآن و حدیث و اقوالِ صحیحہ پر مشتمل ہے۔ مؤلف علامہ حضرت شیخ احمد رضا خاں کو اللہ تعالیٰ خوب خوب نوازے اور ان کا فیض عوام و خواص پر ہمیشہ جاری رہے۔ انہوں نے اچھی تحقیق کر کے عوام کو فایدہ پہنچایا ہے۔ اللہ تعالیٰ حضور علیہ الصلاۃ والسلام کے طفیل ہماری اور ان کی مدد فرمائے اور حسن خاتمہ فرمائے، آمین!''

(ربیع الاول ۱۳۳۳ھ/۱۹۱۵ء)

ابراھیم عبدالمعطی

(قاہرہ)

''یہ رسالہ نہایت ہی منزلت والا ایک بلند مینار ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے مؤلف کو دینِ حق اور مشرب صحیح کی طرف سے بہترین جزا عطا فرمائے اور اس کے پڑھنے والے کو نفع بخشے، آمین!''

عبدالرحمٰن المدخنن المصری

(قاہرہ)

''ماہ رمضان المعظم ۱۳۲۹ھ میں اللہ تعالیٰ نے کرم فرمایا اور ہم زیارتِ قبر شریف سیّد الموجود صلّی اللہ علیہ وسلّم سے مشرف ہوئے۔ یہاں مدینہ منورہ کے بعض افاضل نے رسالہ ہذا ''الدولۃالمکیۃ'' کی خبر دی۔ میری زندگی کی قسم! مصنف نے اس میں اختصار کے ساتھ کافی و وافی دلائل جمع کر دیے ہیں۔ تطویل سے کوئی فایدہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ علمائے اہلِ سُنّت و جماعت کی مدد فرمائے اور ہم کو ان لوگوں میں کر دے جو نیک بات سُنتے بھی ہیں اور اس پر عمل بھی کرتے ہیں، والحمد للہ ربّ العٰلمین!''

محمد سعید بن عبد القادر قادری نقشبندی

(بغداد شریف)

''میں نے اس رسالے پر پوری نگاہ ڈالی، جو کچھ فاضل امام، فخرِ انام مولانا مولوی احمد رضا خاں نے تحریر فرمایا ہے وہ مستحکم دلائل اور بلند براہین پر مبنی ہے اور یہی اہلِ ایمان کا قول ہے۔ بلا شبہ جو ان کلمات و اقوال کی مخالفت کرے وہ اہلِ کفر و طغیان میں سے ہے اور یہ بات کسی دلیل کی محتاج نہیں،

دینِ اسلام میں واضح ہے۔"

موسٰی علی الشافی الازہری الاحمدی الدردیری

(مدینہ منورہ)

"میں نے رسالہ "الدولة المکیة" کا مطالعہ کیا، اس کو شفا پایا اور اہلِ حق یعنی اہلِ سُنّت و جماعت کے دلوں کی دوا۔ اللہ تعالیٰ اس رسالے کے مصنف کو اسلام اور اہلِ اسلام کی طرف سے جزائے خیر عطا فرمائے اور سیّد الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام کے صدقے میں دونوں جہاں میں اپنی عنایات نازل فرمائے۔ اس لیے کہ وہ حضور اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے معجزۂ علمِ غیب کی تائید کے لیے کھڑے ہوگئے، جس سے کتاب اللہ اور حدیثیں بھری ہوئی ہیں۔ یہاں تک کہ یہ مسئلہ آفتابِ نصف النہار طرح روشن ہوگیا۔

مصنفِ کتاب اماموں کے امام، اس اُمّت کے دین کے مجدّد ہیں۔ یقین کے نور اور قلوب کے انوار کی تائید سے آراستہ ہیں ......کون؟...... شیخ احمد رضا خاں! اللہ تعالیٰ ان کو دونوں جہاں میں قبول و رضوان عطا فرمائے۔ آمین!" (کیم ربیع الاوّل ۱۳۳۰ھ/۱۹۱۲ء)

۴۔ الاجازت الرضویہ لمبجل بکة البهیه اور ۵۔ الاجازت المتنیه لعلماء بکة والمدینه:

یہ دونوں کتابیں ان سندات پر مشتمل ہیں جو احمد رضا خاں محدّث بریلوی نے علمائے اسلام کو عنایت فرمائیں۔ اس کے علاوہ اس میں وہ خطوط بھی شامل ہیں جو علمائے اسلام نے امام احمد رضا خاں کو ارسال فرمائے تھے۔

مدینہ منورہ میں بھی محدّث بریلوی سے بیش تر علما نے اجازات حاصل کیں۔ علامہ نے بہت سے علما کو زبانی اجازت مرحمت فرمائی اور بعض علما سے یہ وعدہ کیا کہ وطن واپسی کے بعد سندات ارسال کردی جائیں گی۔ جیسے شیخ عمر بن حمدان المرسی، سید مامون البری، شیخ الدلائل شیخ محمد سعید وغیرہ۔ فاضل بریلوی کی وطن واپسی کے بعد جب سندات کی ترسیل میں تاخیر ہوئی تو ان حضرات نے مولانا بریلوی کے پاس خط لکھے۔ سیّد اسمٰعیل خلیل (۱۳۲۱ھ/۱۹۲۰ء) نے سندات کی ترسیل کی یاد دہانی کے لیے خط لکھا۔ چنانچہ اپنے مکتوب محررہ (۱۶/ذی الحجہ ۱۳۲۵ھ/۱۹۰۷ء) میں لکھتے ہیں: "وعدتم الحقیر واخاہ بارسال الاجازت بمرویاتکم فلم نات، فکان اقرب الناس الیکم ابعدهم او کنا نسیاً منسیاً" [۱۴]

ترجمہ: "آپ نے حقیر اور اس کے بھائی سے اپنی مرویات کی اجازت بھیجنے کا وعدہ فرمایا تھا لیکن ابھی تک اجازت موصول نہیں ہوئی، جو آپ سے زیادہ قریب تھا وہ بہت دور ہوگیا یا ہمیں بالکل

ہی بھلا دیا گیا؟''

اسی طرح سیّد مامون البری مدنی اپنے مکتوب (محررہ محرم الحرام ۱۳۲۶ھ/۱۹۰۸ء) میں سندات کی ترسیل کی یاد دہانی کراتے ہوئے لکھتے ہیں: ''**وقد وقع منکم الوعد عند وصولکم الی المدینة الطیبة بان تمنحوا من فضلکم الاجازة فی علوم الحدیث والتفسیر وغیرھا للفقیر، والفقیر منتظر انجاز ذالک الوعد و کتابته وارساله الخیر فبرما وعد**'' ۱۵

تلخیص: ''مدینہ منورہ کے زمانۂ قیام میں آپ نے وعدہ فرمایا تھا کہ علومِ حدیث وتفسیر وغیرہ میں حقیر کو سند واجازت تحریر فرما کر ارسال کریں گے۔ فقیر ایفائے وعدہ کا منتظر ہے۔''

وطن واپسی کے بعد علامہ بریلوی کے پاس علمائے حرمین شریفین کے بہت سے خطوط پہنچے۔ ان خطوط کو پڑھ کر اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ علمائے حرمین شریفین کے دلوں میں علامہ بریلوی کے لیے کس قدر محبت وعقیدت تھی۔ سیّد اسماعیل خلیل (حافظ کتب الحرام) اپنے ایک مکتوب محررہ ۱۲ر رجب المرجب ۱۳۲۴ھ/۱۹۰۴ء میں محدّث بریلوی کے مکتوب موصول ہونے پر اپنی خوشی کا اظہار فرماتے ہیں۔

''**وصلنا عزیز مشرفکم علی طراز لقار علماء المدینة المنورہ علی صاحبھا افضل الصلوٰة والسلام فقرأناہ والسرور والحبور متزایدات و تلوناہ والدموع والزافرات متتابعات. فما علمنا ھل ذالک لشدة الاشتیاق ام لعدم حصول الوصال والتلاق۔**'' ۱۶

ترجمہ وتلخیص: ہمیں آپ کا گرامی نامہ ملا۔ اس کو پڑھا تو خوشی پر خوشی میسّر آئی اور آگے پڑھا تو آنسو بہنے لگے اور آہوں سے ہچکیاں بندھ گئیں۔ نہ معلوم یہ کیفیت شدتِ اشتیاق کی وجہ سے پیدا ہوئی یا وصل وملاقات سے حرماں نصیبی کی وجہ سے۔

۶۔ <u>کفل الفقیه الفاھم فی احکام القرطاس والدراھم</u>: امام احمد رضا محدث بریلوی کی یہ کتاب ان کی شہرت ومقبولیت کے سلسلے کی ایک مضبوط کڑی ہے۔ ''کفل الفقیه'' کیوں لکھی گئی؟ کتنے دنوں میں لکھی گئی؟ یہ کتاب کن علما کے سوال کے جواب میں ہے اور اس کتاب کو علمائے حرمین شریفین میں کیا شہرت ومقبولیت حاصل ہوئی؟ اس کا تفصیلی ذکر خود مصنف کتاب مولانا احمد رضا خاں بریلوی نے کیا ہے۔

ترجمۂ عربی: ''۱۱ر محرم ۱۳۲۴ھ میں مکہ معظمہ کے دو علمائے کرام مولانا عبداللہ میرداد امام مسجد الحرام اور ان کے استاد مولانا حامد احمد محمد جدوری نے نوٹ کے متعلق جملہ مسائل فقہ کا سوال اس فقیر سے کیا، جس کے جواب میں بفضلِ وہاب عزّ جلالہ ڈیڑھ دن سے کم میں رسالہ ''کفل الفقیه'' وہیں لکھ دیا۔'' ۱۷

جب یہ رسالہ مکمل ہو کر علمائے حرمین شریفین کے سامنے پہنچا تو علمائے حرمین شریفین نے تسلی بخش جواب اور دلائل و براہین سے بھری ہوئی کتاب کو دیکھ کر کتاب اور صاحب کتاب دونوں کو قدر و

منزلت کی نگاہ سے دیکھا۔ خود فاضل بریلوی فرماتے ہیں:

ترجمۂ عربی: ''مکہ مکرمہ کے اجل علمائے کرام وفقیہانِ عظام نے ''کفل الفقیہ الفاھم'' کو ملاحظہ فرمایا، پڑھ کر سُنایا، اس کی نقلیں لیں اور بحمد اللہ تعالیٰ سب نے ایک زبان مدحیں کیں۔ جیسے حضرت شیخ الائمہ والخطبا کبیر العلما مولانا احمد ابوالخیر میرداد حنفی، حضرت عالم العلما مفتی سابق و قاضی حال علامہ مولانا شیخ صالح کمال حنفی، حضرت مولانا حافظ کتب الحرام، فاضل سید اسماعیل خلیل حنفی، حضرت مفتی حنفیہ عبداللہ صدیقی، رحمہم اللہ تعالیٰ۔'' ۱۸

اگرچہ نوٹ کے بارے میں مولانا بریلوی سے پہلے مفتی مکہ معظمہ شیخ جمال بن عبداللہ بن عمر حنفی سے سوال کیا جا چکا تھا لیکن انہوں نے جواب دینے سے اعراض کیا اور صرف یہ تحریر فرمایا۔ ''العلم امانة فی اعناق العلماء واللہ تعالیٰ اعلم'' ۱۹

ترجمہ: ''علم علما کی گردنوں میں امانت ہے۔ واللہ تعالی اعلم''

مفتی حنفیہ عبداللہ بن صدیق کے علم میں یہ بات تھی کہ مفتی مکہ سے نوٹ کے بارے میں سوال کیا گیا تھا لیکن اس کا جواب نہ دے سکے۔ چنانچہ جب انہوں نے ''کفل الفقیہ الفاہم'' کا مطالعہ کیا تو جواب پڑھ کر بے ساختہ کہہ اُٹھے:

''این کان شیخ جمال بن عبداللہ من ھذا النص الصریح۔'' ۲۰

یعنی: ''شیخ جمال بن عبداللہ اس نص صریح سے کہاں غافل رہے؟''

جس عبارت پر مفتی حنفیہ بے ساختہ بول پڑے وہ فتح القدیر کی یہ عبارت ہے: ''لو باع کاغذة بالف یجوز ولا یکرہ''۔ ۲۱

''کوئی شخص اپنے کاغذ کا ٹکڑا ہزار روپے میں بیچتا ہے تو بلا کراہت جائز ہے۔''

''کفل الفقیہ الفاھم'' کی وجہ سے مولانا کو علمائے حرمین شریفین میں جو شہرت و مقبولیت ملی وہ اظہر من الشمس ہے۔ علما جوق در جوق آپ سے ملاقات کرنے آتے اور آپ سے شرفِ تلمذ بھی حاصل کرتے۔

سابق قاضی مکہ شیخ صالح کمال مولانا کی فقیہانہ بصیرت سے اس قدر متاثر تھے کہ آپ اپنے دورِ قضاۃ کے ایک ایک فیصلہ سناتے اور اگر مولانا بریلوی ان فیصلوں کی توثیق فرماتے تو آپ خوش ہو جاتے اور اگر ردّ فرماتے تو افسوس کرتے کہ غلط فیصلہ کیوں کر دیا۔ ۲۲

احمد رضا خاں محدث بریلوی کی شہرت و مقبولیت علمائے حرمین شریفین میں نہ صرف اُن کے وقت میں تھی بلکہ عہدِ جدید میں بھی اپنے علم و فضل اور فقہی بصیرت کی وجہ سے قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ چنانچہ ۱۳۷۹ھ / ۱۹۵۹ء میں غلام مصطفیٰ (شاگردِ امجد علی علیہ الرحمہ، مدرّس مدرسہ عربیہ

اشرف العلوم، گھوڑا مارا، راج شاہی، مشرقی پاکستان) زیارتِ حرمین شریفین کے لیے تشریف لے گئے۔ مولانا موصوف نے اپنے اس سفرِ مبارک کے حالات و واقعات کو ایک سفر نامے کی شکل میں ۱۹۶۰ء میں شائع کیا۔ اس سفرنامے میں مولانا غلام مصطفیٰ صاحب لکھتے ہیں کہ ''مولانا مفتی سعد اللہ مکی فرماتے تھے کہ بلادِ عرب میں عموماً اور حرمین طیبین میں خصوصاً علمائے کرام جس قدر فاضل بریلوی سے واقف ہیں خود ہندستان کے لوگ نہیں۔ چنانچہ مولانا مفتی سعد اللہ مکی نے بطور آزمائش مولانا غلام مصطفیٰ کو ان کے رفقا کے ساتھ مولانا سیّد محمد علوی مالکی کی خدمت میں بھیجا، جو اس وقت مکہ معظمہ میں قاضی القضاۃ تھے۔ اور آپ کے والد فاضل بریلوی کے ہم عصر تھے۔ مولانا غلام مصطفیٰ اور ان کے رفقا سیّد محمد علوی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنا تعارف پیش کیا۔ ''**نحن تلامیذ تلامیذ اعلیٰ حضرت مولینا احمد رضا خان الفاضل البریلوی رحمة الله علیه**'' ۲۳

اتنا سن کر سیّد علوی صاحب کھڑے ہو گئے اور ہر ایک سے معانقہ فرمایا اور کہا ''**نحن نعرفه بتصنیفاته و تالیفاته حبه علامة السنة و بغضه علامة البدعة**'' ترجمہ: ہم اُن کو اُن کی تصنیفات و تالیفات سے پہچانتے ہیں۔ ان سے محبت سُنّت کی نشانی ہے اور ان سے عداوت، بدعتی کی نشانی ہے۔''

مولانا غلام مصطفیٰ نے اپنے سفر نامے میں ایک اور شخص مولانا عبدالرحمٰن درویش کا ذکر کیا ہے جو تقریباً اسّی سال کے تھے۔ آپ مولانا بریلوی کے قیامِ حجاز کے زمانے میں جوان العمر تھے۔ مولانا موصوف فرماتے تھے:

> ''مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ علمائے حرم شریف جب اعلیٰ حضرت سے ملتے تو ان کی دست بوسی کرتے، اور اتنا احترام فرماتے کہ مَیں نے اتنا احترام کسی ہندستانی عالم کا نہیں دیکھا۔'' ۲۴

محدّث بریلوی کی بے پناہ علمی صلاحیتوں کی بنا پر علمائے عرب نے آپ سے سندات و اجازات لیں اور زانوئے تلمذ بھی تہہ کیے۔ نہ صرف قیامِ حرمین طیبین کے درمیان ہی آپ سے استفادہ کیا، بلکہ وطن واپسی کے بعد آپ کے شہر بریلی آ کر بھی استفادہ کیا۔ مولانا عبدالقادر مدنی کے صاحب زادے مولوی سیّد حسین مدنی علمِ ادفاق اور علمِ تکسیر کی تحصیل کے لیے بریلی آئے اور چودہ ماہ یہاں قیام فرمایا۔ فاضل بریلوی نے مولانا سیّد حسین مدنی کے لیے اس فن میں **اطائب الاکسیر فی علم الیکسر** ۲۵ نام کا یہ رسالہ تحریر فرمایا۔

جس شخصیت کی جتنی ہی مخالفت کی جاتی ہے وہ اتنی ہی شہرت کا سبب بنتی ہے۔ کیونکہ لوگ

مخالفت کی وجہ سے اس شخصیت کو پڑھنا اور سمجھنا چاہتے ہیں۔ اور ہر شخص اپنے اپنے انداز سے اس شخصیت کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ ہر شخص یہ جاننا چاہتا ہے کہ آخر کیوں اس شخص کی اتنی مخالفت ہورہی ہے۔ اس حقیقت کو جاننے کا جب تجسس پیدا ہوتا ہے تو قاری بغض و عناد کا چشمہ اُتار کر غیر جانب داری کے ساتھ دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ تو اس کو اس شخصیت میں کچھ متاثر کردینے والی چیزیں نظر آتی ہیں۔ اس طرح دیکھا جائے تو مخالفت بھی قاری اور مداحوں کی تعداد کو بڑھانے میں ایک اہم کردار ادا کرتی ہے۔ چنانچہ جلیل القدر عالم اور زبردست فقیہہ مولانا سراج احمد (متوفی ۱۳۹۳ھ/ ۱۹۷۳ء) جو ستر سال تک درس دیتے رہے اور نصف صدی تک فتویٰ نویسی کے کام کو انجام دیا۔ مولانا سراج احمد خود فرماتے تھے کہ طالب علمی کے زمانے میں یہ بات ذہن نشین کردی گئی تھی کہ مولوی احمد رضا کی کتابیں پڑھنا ناجائز ہے اور ان کی تصنیفات تحقیقی نہیں ہیں۔ یہاں تک کہ اُن کے تبحر علمی کو غلو سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ آپ آگے فرماتے ہیں کہ اتفاق سے رسالہ میراث کی تالیف کے وقت ایک مسئلے میں اُلجھن پیدا ہوگئی تھی۔ اس مسئلے کے بارے میں علمائے دہلی، علمائے سہارنپور اور علمائے دیوبند سے استفتا طلب کیا گیا۔ علامہ نے بڑا مدلل اور تسلی بخش جواب دیا۔ اس جواب سے مولانا سراج احمد صاحب پر جو اثر ہوا، اس کا بیان خود ان کے الفاظ میں دیکھیے:

> ''اس جواب کو دیکھنے کے بعد مولانا احمد رضا خاں قدس سرہٗ کے متعلق میرا اندازِ فکر یکسر تبدیل ہوگیا اور ان کے متعلق ذہن میں جمائے ہوئے تمام خیالات کے تار و پود بکھر گئے۔ ان کے رسائل اور دیگر تصانیف منگوا کر پڑھے تو مجھے یوں محسوس ہوا کہ میرے سامنے سے غلط عقاید و نظریات کے بارے میں حجابات آہستہ آہستہ اُٹھ رہے ہیں۔'' ۲۶

مولانا سراج احمد اپنے مکتوب (بنام حکیم محمد موسیٰ امرتسری) میں مولوی نظام الدین احمد پوری (مسلکاً وہابی) کا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مسئلے کے سلسلے میں جب مَیں نے فاضل بریلوی کا رسالہ ''**الفضل الموهبي في معنى اذا صح الحديث فهو مذهبي**'' کے چند اوراق پڑھ کر سنائے تو آپ حیرت و تعجب میں پڑگئے اور فرمایا: ''یہ سب منازلِ فہمِ حدیث مولانا کو حاصل تھے! افسوس مَیں اُن کے زمانے میں رہ کر بے خبر و بے فیض رہا۔''

پھر جب چند مسائلِ فقہ کے جوابات رسائلِ رضویہ سے سنائے گئے تو فرمایا:

> ''علامہ شامی اور صاحبِ فتح القدیر مولانا کے شاگرد ہیں۔ یہ تو امام اعظم ثانی معلوم ہوتے ہیں۔'' ۲۷

مولوی نظام الدین احمد پوری (وہابی) اپنے معاصرین میں علما میں سے کسی کو ہم پلہ نہیں سمجھتے تھے۔ لیکن انھوں نے فاضل بریلوی کے تبحر علمی کا اعتراف فراخ دلی کے ساتھ کیا ہے:

''مولانا احمد رضا خان بریلوی کے فتوے عالم اسلام کی توجہ کا مرکز بنے۔ آپ کے فتوؤں کو دیکھ کر آپ کی فقیہانہ شان کا اعتراف حافظ کتب حرم شیخ اسماعیل بن خلیل نے ان الفاظ میں کیا: ''واللہ اقول والحق اقول انہ لورر اھا ابوحنیفہ النعمان لاقرت عینہ ولجعل مؤلفا من جملۃ الاصحاب۔'' ۲۸

ترجمہ: قسم بخدا بالکل سچ کہتا ہوں کہ اگر ابوحنیفہ نعمان آپ کا فتاویٰ ملاحظہ فرماتے تو ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوتیں اوراس کے مؤلف کو اپنے خاص شاگردوں میں شامل فرماتے۔''

احمد رضا بریلوی نے عقلی علوم وفنون خصوصا سائنس اور ریاضی کو علومِ دینیہ بالخصوص فقہ کے لیے لازم وملزوم سمجھا۔ فتاویٰ رضویہ کی بارہ جلدوں میں یہ حقیقت سامنے آتی ہے۔ محدث بریلوی نے فقہی مسائل کی تشریح وتوضیح میں لوگارثم (Logarthim)، اکسپونشیل سیریز (Exponential Series)، علمِ کیمیا (Chemistry)، الجبرا، ٹرگنومیٹری (Trignometry)، مثلث کروی (Spherical Trignometry)، علمِ طبیعات (Physics) میں روشنی (Light) اور صوت (Sound) نیز ارضیات (Geology)، علم الحیوانات (Zoology)، علمِ نباتات (Botany) اور میڈیکل سائنس (Medical Science) کا وغیرہ کا استعمال کیا ہے۔

احمد رضا بریلوی کے فتاویٰ سے آج بھی لوگ استفادہ کرتے ہیں۔ نہ صرف ہند و پاک بلکہ عرب ممالک کے لوگ آج بھی فاضل بریلوی کے فتاویٰ کو دیکھ کر ان کو خراجِ تحسین پیش کرتے اور اس کو پڑھنے کا اشتیاق رکھتے ہیں۔ مولانا کے فتاویٰ سے متعلق ایک واقعہ ندوہ (لکھنؤ) کے پچاسی سالہ جشن کے موقع پر دیکھنے کو ملا۔

بقول مولانا یٰسین اختر مصباحی ۲۵ تا ۲۸ر شوال ۱۳۹۵ھ کو ندوۃ العلما لکھنؤ نے بڑی دھوم دھام سے اپنا پچاسی سالہ جشنِ تعلیمی منایا۔ اس میں ملکی اور غیر ملکی مہمان شریک ہوئے تھے۔ عباسیہ ہال (کتب خانہ ندوہ) میں کتابوں کی نمائش کا انتظام تھا۔ بڑے بڑے طغروں میں ہندستان کی عبقری اور یگانۂ روزگار شخصیتوں کے نام اور اُن کی اعلیٰ وممتاز ترین تصنیفات فن وار مندرج تھیں۔ فاضل بریلوی کی بھی کتاب عقاید وکلام کے نقشے میں ''خالص الاعتقاد'' اور فقہ کے طغرے میں ''النیرۃ الوضیہ'' تھی۔ چنانچہ ایک مشہور شامی عالم شیخ عبدالفتاح ابوغدہ (پروفیسر کلیۃ الشریعہ محمد بن سعود یونی ورسٹی، ریاض، سعودی عرب) جو عربی زبان کی پچیسوں کتابوں کے مصنف تھے، ان کی نگاہ جب احمد رضا خاں بریلوی

کی کتاب ''خالص الاعتقاد'' پر پڑی تو فوراً بول اُٹھے ''این مجموعة فتاویٰ الشیخ احمد رضا خان البریلوی؟'' حاضرین نے ان کی بات سُنی ان سُنی کردی۔ لیکن جب اس کی اطلاع مولانا یٰسین اختر مصباحی کو ملی تو آپ ملاقات کی غرض سے ان کی قیام گاہ روم نمبر ۱۴۰، کلارک اودھ ہوٹل (لکھنؤ) ڈھائی بجے دن میں پہنچے۔ اس وقت پروفیسر عبدالفتاح ابو غدہ کو صدر جمہوریہ ہند جناب فخر الدین علی احمد مرحوم کے یہاں دعوت میں جانا تھا، اس لیے آپ تیاریوں میں مصروف تھے۔ مولانا کہتے ہیں دورانِ گفتگو مَیں نے پوچھا ''سمعت انت تشتاق الی مطالعة مجموعة فتاویٰ الشیخ الامام احمد رضا'' (مَیں نے سُنا ہے کہ آپ فتاویٰ رضویہ کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں اور اس کے بہت مشتاق ہیں) فتاویٰ رضویہ کا نام سُنتے ہی شیخ کا چہرہ دمک اُٹھا اور بڑے مشتاقانہ انداز میں کہا، ہاں! کیا آپ کے پاس موجود ہے؟ مَیں نے کہا، اس وقت تو نہ مل سکے گی مگر ان شاء اللہ بہت جلد بذریعہ ڈاک ارسال کردوں گا۔ میرا دوسرا سوال تھا ''کیف عرفت علمه و فضله'' (آپ اُن کے علم وفضل سے کیسے متعارف ہوئے؟) اس سوال سے اُن کے چہرے پر تبسم کی لہر دوڑ گئی۔ فرمایا، عطر بہرحال عطر ہی ہے۔ کتنا بھی اسے بند شیشی میں رکھا جائے، اس کی بھینی بھینی خوشبو اہلِ ذوق تک پہنچ ہی جاتی ہے۔ اس کے بعد شیخ نے جواباً عرض کیا:

> ''میرے ایک دوست کہیں سفر پر جارہے تھے۔ ان کے پاس فتاویٰ رضویہ کی ایک جلد موجود تھی میں نے جلدی جلدی میں ایک عربی فتویٰ کا مطالعہ کیا۔ عبارت کی روانی اور کتاب و سُنّت و اقوالِ سلف سے دلائل کے انبار دیکھ کر مَیں حیران و ششدر رہ گیا۔ اور اس ایک ہی فتویٰ کے مطالعہ کے بعد مَیں نے یہ رائے قائم کرلی کہ یہ شخص کوئی بڑا عالم اور اپنے وقت کا زبردست فقیہ ہے۔'' [۲۹]

علمائے عرب کو مولانا کی عربی تصانیف پڑھنے کا بے حد شوق تھا۔ حافظِ کتب حرم سید اسمٰعیل بن خلیل نے علامہ بریلوی کا ردالمحتار پر ان کا حاشیہ طلب فرماتے ہوئے لکھا: ''تحوا تکم التی علی حاشیة ابن عابدین لا یخفا خبابکم اننی من المحتاجین الیها جعلکم اللّٰه من المحسنین۔'' [۳۰]

اور اسی طرح مولانا سید مامون البری مدنی، محدث بریلوی کی عربی تصنیفات کے مطالعے کا اشتیاق ظاہر کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''نرجو ایضا من حضرتکم ان ترسلوا لنا بعضاً من تالیفکم العربیه'' [۳۱] آپ کی بارگاہ سے اُمید ہے کہ اپنی بعض تالیفات عربیہ ارسال فرمائیں گے۔

مولانا کی شہرت ومقبولیت اور بے پناہ علمی صلاحیتوں کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ کوئی انہیں ''مجدّد'' کہتا ہے تو کوئی ''اماموں کا امام''۔ جیسے حافظ کتب الحرم شیخ اسمٰعیل بن سید خلیل

فرماتے ہیں: ''بل اقول لو قیل فی حقه انه مجدد هذا القرن لکان حقاً وصدقاً'' ۳۲؎ ''بلکہ میں کہتا ہوں کہ اگر اس کے حق میں یہ کہا جائے کہ وہ اس صدی کا مجدد ہے تو بے شک یہ بات سچی وصحیح ہے۔''

شیخ موسیٰ علی شامی ازہری احمدی دردیروی مدنی نے محدث بریلوی کے علم کا اعتراف کرتے ہوئے کہا ''امام الائمه المجدد لهذه الامة'' ۳۳؎ ''اماموں کے امام اور اس امت مسلمہ کے مجدد۔''

مولانا سید مامون البری مدنی نے محدث بریلوی کی شخصیت کو اس طرح دیکھا ''فهو الحقیق بان یقال انه فی عصره او حد کیف وفضله اشهر من نار علیٰ علم'' ۳۴؎ ''وہ اس لائق ہیں کہ کہا جائے کہ ان جیسا ان کے زمانے میں کوئی نہیں کیونکہ ان کا فضل وکمال اس آگ سے زیادہ مشہور ہے جو پہاڑ پر جلائی جاتی ہے۔''

علمائے حرمین شریفین میں احمد رضا خاں بریلوی کی جو قدر ومنزلت تھی اس کا اندازہ اس واقعے سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ مکہ معظمہ میں شیخ الخطبا مولانا شیخ ابوالخیر میر داد ضعیفی کی وجہ سے احمد رضا خاں کے پاس ملاقات کی غرض سے نہ آسکے تو انہوں نے مولانا بریلوی کو بلایا اور انہیں کی زبانی ان کا تالیف کردہ رسالہ ''الدولة المکیه'' جو علمائے حرمین شریفین میں محدث بریلوی کی شہرت کا سبب بنی، سماعت فرمائی۔ جب مولانا بریلوی، شیخ کے پاس سے رخصت ہونے لگے تو شیخ میر داد کے زانوے مبارک کو ہاتھ لگایا تو آپ نے بے ساختہ ارشاد فرمایا ''انا اقبل ارجلکم انا اقبل نعلکم'' ۳۵؎ ''ہم آپ کے پیروں کو بوسہ دیں، ہم آپ کی جوتیوں کو چومیں''۔

احمد رضا محدث بریلوی نے نہ صرف مشرقی دنیا میں بلکہ مغربی دنیا میں بھی اپنے علم وفضل کا لوہا منوا کر اپنی شہرت کا پرچم لہرایا۔ مولانا بریلوی نے ایک امریکی ہیئت داں پروفیسر البرٹ ایف پورٹا کی پیشین گوئی کے رد میں ایک مختصر مگر جامع رسالہ ''معین مبین بهر دور شمس و سکون زمین'' لکھا۔ اس پیشین گوئی کی تفصیل یہ ہے کہ ۱۹۱۹ء میں پروفیسر البرٹ نے جو مشی گن یونی ورسٹی (امریکہ) اور لیڈن یونی ورسٹی (اٹلی) سے وابستہ تھے، نے ایک پیشین گوئی کی کہ ۱۷ دسمبر ۱۹۱۹ء کو آفتاب کے سامنے بیک وقت کئی ستاروں کے جمع ہونے سے جذب وکشش کی وجہ سے ممالک متحدہ میں زبردست تباہی مچے گی۔ یہ خبر اخبار ''ایکسپریس'' (بانکی پور، بھارت) میں شائع ہوئی۔ جب پروفیسر البرٹ کی اس پیشین گوئی کی خبر محدث بریلوی کو ہوئی تو انہوں نے پیشین گوئی کو لغو قرار دیا اور اس کے رد میں ایک علمی اور تحقیقی مقالہ ''معین مبین'' کے عنوان سے لکھا جو ''الرضا'' (بریلی) میں شائع ہوا۔ ۳۶؎

مولانا بریلوی نے سترہ دلائل سے اس پیشین گوئی کا رد کیا۔ اکتوبر ۱۹۱۹ء کو یہ پیشین گوئی کی گئی جو ۱۷ دسمبر ۱۹۱۹ء کو واقع ہونی تھی۔ دنیا کے تمام ہیئت داں ۱۷ دسمبر ۱۹۱۹ء کو دوربین لیے دیکھتے

رہے ۳۷ مگر وہ تباہی نہ مچی جس کی پروفیسر البرٹ نے پیشین گوئی کی تھی۔ بلکہ فاضل بریلوی کی پیشین گوئی سچ ثابت ہوئی۔ علامہ بریلوی نے جن مغربی سائنس دانوں کا تعاقب کیا ان میں گیلی لیو، ہرشل، کپلر، کوپرنیکس، آئزک نیوٹن، البرٹ الیف پوٹا اور البرٹ آئن اسٹائن کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ مغربی سائنس دانوں میں نیوٹن اور آئن سٹائن کی ریاضیاتی اور سائنسی خدمات بہت اہم ہیں۔ احمد رضا بریلوی نے ان دونوں میں نیوٹن کا بالخصوص تعاقب کیا ہے۔

اپنی تصنیف ''فوزِ مبین در ردّ حرکتِ زمین'' میں اعلیٰ حضرت نے نیوٹن کے نظریات کا ردّ کیا اور زبردست تعاقب کیا۔ احمد رضا خاں بریلوی کے ردّ و تعاقب کی خوبی یہ ہے کہ مخالف اپنے دعوے میں جس علم و فن کی کتب سے دلیلیں دیتا ہے وہ اسی علم و فن سے اس کا ردّ فرماتے ہیں۔ ۳۸

احمد رضا بریلوی نے قرآن، تفسیر و حدیث کے علوم کی روشنی میں غیر اسلامی سائنسی نظریات کا ردّ کیا اور تعاقب فرمایا۔ اس سے بھی مولانا احمد رضا شہرت و مقبولیت کے بامِ عروج پر شہ نشین ہوئے۔

مولانا کی عبقری شخصیت کا اندازاہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ آج دنیا بھر میں بہت سے ادارے آپ پر کام کر رہے ہیں جس سے اُن کے نام اور کام کا آوازہ دنیا کے گوشے گوشے تک پہنچ رہا ہے۔ (۱) رضا اکیڈمی، ممبئی (۲) ادارۂ تحقیقات امام احمد رضا، کراچی (۳) رضا اکیڈمی۔ لاہور (۴) رضا اکیڈمی، ساؤتھ افریقہ (۵) رضا اکیڈمی، برطانیہ (۶) المجمع الاسلامی، مبارک پور (۷) تحریک فکرِ رضا، ممبئی وغیرہ۔

رضا اکیڈمی، ممبئی: یہ اکیڈمی ۱۹۷۸ء میں قائم ہوئی۔ اس کے بانی الحاج محمد سعید نوری ہیں۔ اس اکیڈمی نے اب تک مختلف عناوین پر ایک ہزار سے زاید کتابیں شائع کی ہیں۔ جن میں ڈھائی سو سے زاید احمد رضا بریلوی کی کتب و رسائل ہیں۔

ادارۂ تحقیقات امام احمد رضا، کراچی: یہ کراچی، پاکستان کا مشہور ادارہ ہے، جس نے احمد رضا بریلوی پر کثیر تعداد میں عربی، اردو اور انگریزی زبانوں میں لٹریچر شائع کر کے دنیا بھر میں پھیلایا۔

رضا اکیڈمی، لاہور: اس اکیڈمی نے بھی ۱۹۹۴ء تک سو (۱۰۰) سے زاید کتابیں شائع کی ہیں، جس میں اکثر کتابیں رضویات سے متعلق ہیں۔ ۳۹

امام احمد رضا اکیڈمی، ساؤتھ افریقہ: یہ ادارہ ڈربن، ساؤتھ افریقہ میں قائم ہے۔ اس کے بانی مولانا عبدالہادی برکاتی ہیں۔ مولانا نے فاضل بریلوی کی کئی تصانیف کے انگریزی تراجم کر کے شائع کیے۔ نیز انگریزی لٹریچر شائع کر کے افریقہ، انگلستان، فرانس بلکہ تمام یورپ میں پھیلایا۔

رضا اکیڈمی، برطانیہ: اس ادارے کے بانی حاجی محمد الیاس کشمیری ہیں۔ انہوں نے اپنے

انگریزی رسالے ''اسلامک ٹائمز'' کے ذریعے پیغامِ رضا کو مغربی ممالک کے انگریزی داں طبقے تک پہنچایا ہے۔ مزید برآں اس اکیڈمی نے احمد رضا بریلوی اور دوسرے علما کی تصنیفات کے انگریزی تراجم بھی شائع کیے ہیں۔

احمد رضا بریلوی پر بہت سے مضامین اور تاثرات کا اظہار ہمیں اس وقت کے اخبار و رسائل ''دبدبۂ سکندری'' رام پور اور ''تحفۂ حنفیہ'' پٹنہ وغیرہ میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ ان اخبار و رسائل میں کہیں آپ کے کلام پر تبصرہ ملتا ہے تو کہیں فتاویٰ پر، کبھی خود آپ کی شخصیت سے متعلق مضامین دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ''دبدبۂ سکندری'' شمارہ ۱۲/ ربیع الاوّل ۱۳۳۰ھ مطابق یکم اپریل ۱۹۱۲ء بروز دوشنبہ جلد نمبر ۴۸ کے صفحہ نمبر ۳ پر شاہ محمد افضل حسن صابری نائب ایڈیٹر (دبدبۂ سکندری) لکھتے ہیں:

''اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی مدظلہم الاقدس کا جو رتبہ ہے اسے آنکھوں والوں سے پوچھیے، نابینا ہرگز کسی بات کو نہیں دیکھ سکتا اور نہ یہ بتا سکتا ہے کہ کسی قصرِ فضل وکمال کا کون سا درجہ، کس صنعت و دست کاری سے بن سنور کر مرتب ہوا ہے۔ بلکہ وہ تو ساری دنیا کو اپنی ہی مثل جانتا اور سمجھتا ہے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ چند چشمانِ عقل کے اندھے اس ملائک صفت بشر کے علوِ مرتبت میں چہ می گوئیاں کر رہے ہیں۔ مگر ان کو یاد رکھنا چاہیے کہ اعلیٰ حضرت مدظلہم الاقدس کی اس میں معاذاللہ کسی طرح کمی مرتبت واقع نہیں ہوتی۔......'' [۴۰]

بیش تر علوم وفنون پر مہارت، ہزار کتب و رسائل، ترجمۂ قرآن پاک اور بارہ ضخیم جلدوں پر مشتمل ''فتاویٰ رضویہ'' علامہ بریلوی کی شخصیت کو زندہ رکھنے کے لیے ایک مضبوط حصار ہے۔

کچھوچھہ شریف کے صوفی، صحافی مولانا سیّد محمد جیلانی اشرفی احمد رضا بریلوی کی شخصیت کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''امام احمد رضا نے تقریباً ۶۵ علوم وفنون پر ایک ہزار کتب و رسائل تصنیف فرمائیں۔ عشق و ایمان سے بھر پور ترجمۂ قرآن دیا۔ بارہ ہزار صفحات پر مشتمل فقہی مسائل کا خزانہ ''فتاویٰ رضویہ'' کی شکل میں عطا کیا۔ اگر ہم ان علمی اور تحقیقی خدمات کو ان کی ۶۵ سالہ زندگی کے حساب سے جوڑیں تو ہر پانچ گھنٹے میں امام احمد رضا ہمیں ایک کتاب دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ایک متحرک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کا جو کام تھا، امام احمد رضا تن تنہا انجام دیکر اپنی جامع و ہمہ صفت شخصیت کے زندہ نقوش چھوڑے۔ [۴۱]

محدث بریلوی کے وہ تمام کارنامے جو دنیا کے سامنے آئے آپ کی شہرت و مقبولیت کا سبب

ہیں اس کی ہلکی سی جھلک پیش کی گئی جس سے آپ کی عبقری شخصیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

OOOOOOOO

حوالہ جات

1) ۱۹۱۶ء میں قاہرہ میں پیدا ہوئے۔ جامعہ ازہر (قاہرہ)، جامعہ عین الشمس (قاہرہ)، جامعہ بغداد، جامعہ حلوان وغیرہ میں درس دیتے رہے۔ شمالی امریکہ، جنوبی امریکہ، یورپ، ترکی، ایران وغیرہ کی ۲۶/جامعات آپ کے علمی فیض سے مستفیض ہوچکی ہیں۔ آپ نے گیارہ زبان میں پڑھایا۔ تصانیف میں ۶۸ کتابیں اور اردو، عربی، فارسی میں ۶/رو دواوین بھی ہیں۔ آپ مختلف ممالک سے اعزازات بھی حاصل کر چکے ہیں۔ (امام احمد رضا اور عالم اسلام، پروفیسر محمد مسعود احمد، مطبوعہ کراچی ۱۴۲۰ھ/۲۰۰۰ء، ص ۲۸)

۲) امام احمد رضا اور عالم اسلام، پروفیسر محمد مسعود احمد، مطبوعہ کراچی ۱۴۲۰ھ/۲۰۰۰ء ص ۲۸

۳) تاریخ ادبیاتِ مسلمانِ پاکستان و ہند، جلد دوم، مطبوعہ لاہور ۱۹۷۲ء، ص ۴۰۲

۴) المیزان (بمبئی) امام احمد رضا نمبر۔ مارچ ۱۹۷۶ء۔ ص ۴۴۵

۵) امام احمد رضا اور عالمی جامعات، پروفیسر محمد مسعود احمد۔ ادارہ مسعودیہ، کراچی ۱۹۹۰ء ص ۵۲

۶) دی میسیج انٹرنیشنل، کراچی، شمارہ مئی ۱۹۸۱ء، ص ۴۳۔۴۴

۷) امام احمد رضا اور عالمی جامعات، پروفیسر محمد مسعود احمد، ادارۂ مسعودیہ کراچی ۱۹۹۰ء، ص ۹۰

۸) ہفت روز افق، کراچی۔ شمارہ ۶/فروری ۱۹۸۰ء ص ۳۱

۹) تذکرہ علمائے ہند (فارسی)، رحمٰن علی، مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۱۴ء، ص ۱۵۔۱۶

۱۰) رسائل رضویہ، عبدالحکیم اختر شاہجہان پوری، جلد اول، مطبوعہ لاہور ۱۹۶۴ء، ص ۴۰

۱۱) یہ متن اور حواشی لاہور اور استنبول سے شائع ہوچکے ہیں۔

۱۲) تفصیل کے لیے دیکھیے: حسام الحرمین، مطبوعہ لاہور، ۱۹۷۵ء

۱۳) ترجمہ و تلخیص، پروفیسر محمد مسعود احمد، کراچی، پاکستان

۱۴) الاجازات المتینہ۔ حامد رضا خان، ص ۹۔۱۰

۱۵) الاجازات المتینہ۔ حامد رضا خان، ص ۱۳۔۱۴

۱۶) الاجازات المتینہ۔ حامد رضا خان، ص ۱۱

۱۷) کفل الفقیہ الفاہم فی احکام قرطاس الدراہم، مطبوعہ، لاہور، ص ۱۶۶

۱۸) کفل الفقیہ الفاہم فی احکام قرطاس الدراہم، مطبوعہ، لاہور، ص ۶۶

۱۹) الملفوظ، احمد رضا خان، مطبوعہ لاہور، ۱۳۹۹ھ، ص ۱۳۷۔۱۳۸

۲۰) الملفوظ، احمد رضا خان، مطبوعہ لاہور، ۱۳۹۹ھ، ص ۱۹

۲۱) سوانح اعلیٰ حضرت، بدرالدین احمد، مطبوعہ لاہور، ص ۲۸۲

۲۲) الملفوظ، احمد رضا خان، مطبوعہ لاہور، ۱۳۹۹ھ، ص ۲۱ (ملخصاً)

۲۳) تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں۔ معمولات الابرار بمعانی الآثار، مألفہ عبدالمصطفیٰ اعظمی، لکھنؤ، ۱۳۸۴ھ/۱۹۶۴ء، ص ۲۰۰،

۲۴) معمولات الابرار بمعانی الآثار، مألفہ عبدالمصطفیٰ اعظمی، لکھنؤ، ۱۳۸۴ھ/۱۹۶۴ء، ص ۳۰۲

۲۵) سوانح اعلیٰ حضرت، بدرالدین احمد، مطبوعہ لاہور، ص ۲۸۶ اور الملفوظ، حصہ دوم، احمد رضا خان، مطبوعہ لاہور، ۱۳۹۹ھ، ص ۳۸

۲۶) سوانح سراج الفقہا، محمد عبدالحکیم شرف قادری، مطبوعہ لاہور، ۱۳۹۲ھ، ص ۳۳

۲۷) سوانح سراج الفقہا، محمد عبدالحکیم شرف قادری، مطبوعہ لاہور، ۱۳۹۲ھ، ص ۳۴

۲۸) رسائل رضویہ، جلد ۲، احمد رضا خان، ص ۲۵۸ (مکتوب سید اسماعیل بن خلیل محررہ ۲۶ رذی الحجہ ۱۳۲۵ھ بنام امام احمد رضا)

۲۹) امام احمد رضا ارباب علم و دانش کی نظر میں، یٰسین اختر مصباحی، مطبوعہ المجمع الاسلامی، مبارک پور، ۱۹۷۷ء، ص ۱۵۲۔۱۵۴

۳۰) مکتوب سید اسماعیل بن خلیل، محررہ ۱۶ رذی الحجہ ۱۳۲۵ھ بنام امام احمد رضا

۳۱) مکتوب سید مامون البری مدنی، محررہ محرم الحرام ۱۳۲۶ھ بنام امام احمد رضا

۳۲) حسام الحرمین، احمد رضا خان، مطبوعہ لاہور، ۱۳۹۵ھ، ص ۵۱

۳۳) الدولۃ المکیہ، احمد رضا خان، مطبوعہ کراچی، ص ۲۶۲

۳۴) مکتوب سید مامون البری مدنی، رسائل رضویہ، جلد اوّل، ص ۱۳۶

۳۵) الملفوظ، جلد اوّل، احمد رضا خان، مطبوعہ کراچی ۱۳۹۹ھ، ص

۳۶) الرضا (بریلی)، شمارہ صفر ۱۳۳۸ھ/۱۹۱۹ء و ربیع الاوّل ۱۳۳۸ھ/۱۹۱۹ء

۳۷) نیویارک ٹائمز (نیویارک)، شمارہ ۱۶ و ۱۸ ردسمبر ۱۹۱۹ء

۳۸) افکار رضا ممبئی (سہ ماہی)، اپریل تا جون ۱۹۹۸ء، ص ۱۷۔۲۳

۳۹) افکار رضا ممبئی (سہ ماہی)، ۲۰۰۷ء، ص ۴۷

۴۰) دبدبۂ سکندری، رامپور، یکم اپریل ۱۹۱۲ء، جلد ۴۸، ص ۳

۴۱) ماہ نامہ قاری، دہلی۔ امام احمد رضا نمبر، ۱۹۸۹ء، ص ۲۸

امام احمد رضا عقل و دانش کی عدالت میں

از: محمد اسماعیل احمد بدایونی
شعبہ قرآن وسنۃ کراچی یونی ورسٹی
ismailromi@yahoo.com

پہلا مقدمہ

جج: دانشوروں، اہلِ علم، اہلِ عدل اور عقل وفہم کے حامل، عصبیت سے پاک، اسلام کے مخلص لوگ
وکیلِ استغاثہ: مخالفینِ اہلِ سنّت
وکیلِ صفائی: اہلِ حق

استغاثہ: مولانا احمد رضا انگریزوں کے دوست اور ایجنٹ تھے۔

وکیلِ استغاثہ: تاریخ کے صفحات گواہ ہیں کہ ہر دور میں حق و باطل کی جنگ ہوتی رہی۔ اہلِ حق' دار و دفا پر شجاعتوں کی داستان رقم کرتے رہے تو اہلِ باطل مراعات کے حصول اور جاہ وحشمت کے لیے باطل کے تلوے چاٹتے رہے اور قوم کی غیرت وحمیت کا سودا کرتے رہے...... قوم لُٹتی رہی ...... خون بہتا رہا ...... لیکن یہ دولت وثروت کے حصول کے لیے گونگے ہوگئے، ان کے کان بہرے ہوگئے، ان کی آنکھیں اندھی ہوگئیں اور تو اور ان کے دماغ معطل اور ان کی فکریں صلب ہوگئیں۔

جناب جج صاحب! انگریز نے جب برصغیر میں قدم رکھا تو اس نے اپنے گرد و پیش پر نظر دوڑائی اور اسے اپنے مطلب کے لیے میر جعفر و میر صادق جیسے ننگِ دین اور ننگِ وطن ملے تو فکرِ مسلم پر شب خون کے لیے ان کی نگاہ مولانا احمد رضا خاں پر پڑی اور مولانا نے اپنی تمام تر صلاحیتیں اپنے بیرونی آقاؤں کے اشارۂ ابرو پر قربان کردیں۔ خود بھی تاعمر انگریزوں کے وفادار رہے اور اپنے مریدوں کو بھی اس کی تلقین کرتے رہے۔ اور ہمیشہ مسلمانوں کی راہ سے جُدا راہ چلے، خواہ تحریکِ خلافت ہو یا تحریکِ ترکِ موالات' انہوں نے ہمیشہ انگریزوں کا ساتھ دیا۔

وکیلِ صفائی: (وکیل استغاثہ کی جانب دیکھتے ہوئے)

جنابِ محترم جج صاحب! اگر الفاظ کا جادو جگانا کوئی فن ہے تو میں وکیلِ استغاثہ کو سب سے بڑا فن کار تسلیم کرتا ہوں، لیکن یہ بات بھی ان کے گوش گزار کرتا چلوں کہ الفاظ کی کاری گری سے حقایق

تبدیل نہیں ہوا کرتے، تاریخ تبدیل نہیں ہوا کرتی اور وقت کی گھڑی اُلٹی نہیں چلا کرتی۔

جناب جج صاحب! وکیلِ استغاثہ نے جس طرح تاریخ سے روگردانی کرتے ہوئے حقایق کا منہ چڑایا ہے مَیں ان سے اتنا ہی کہوں گا، چاند کا تھوکا منہ کو آتا ہے۔

محترم جج صاحب! یہ سچ ہے کہ معرکۂ حق و باطل روزِ اوّل ہی سے جاری و ساری ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ باطل ہمیشہ حق کا لبادہ اوڑھ کر حق کی مذمت کرتا رہا ہے۔

جناب جج صاحب! اس معزز عدالت کا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ صرف دو تین مثالیں عرض کروں گا:

عہدِ موسوی میں فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر کیا الزام نہیں لگایا کہ یہ ہماری تہذیب و ثقافت کے دشمن ہیں۔ کیا انبیاے کرام کو باطل کی مخالفت کا سامنا نہیں کرنا پڑا؟

اور دور نہیں جایئے۔...... یہ مشرکینِ مکہ ہیں اور معلمِ کائنات رحمت العالمین ﷺ کی مخالفت کو انہوں نے اپنا شعار بنا رکھا ہے۔

یہ مشرکینِ مکہ کہہ رہے ہیں کہ انہوں نے بھائی کو بھائی سے جدا کردیا ہے۔ اپنے آبا و اجداد کے دین کو ترک کردیا ہے۔ غرض یہ کہ الزامات کی بوچھاڑ باطل کا نصب العین رہا ہے۔

لہٰذا آج کی اس معزز عدالت میں وکیلِ استغاثہ نے مولانا احمد رضا پر الزامات عائد کرکے یہ ثابت کردیا ہے کہ ان کا نصب العین اور باطل کا نصب العین ایک ہی ہے۔

وکیلِ استغاثہ (جج سے مخاطب ہوتے ہوئے): محترم جج صاحب! وکیلِ صفائی الزامات کا دفاع کرنے کے بجائے الزامات عائد کررہے ہیں کہ ہمارا اور باطل کا نصب العین ایک ہے تو دلائل پیش کریں، نہ کہ صرف الزامات۔

وکیلِ صفائی: ؎ پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

جی ہاں جج صاحب! مَیں وکیلِ استغاثہ کو اسی مقام پر لانا چاہتا تھا۔ دلائل سے تو مَیں ثابت کرچکا کہ وکیلِ استغاثہ اور باطل کا نصب العین ایک ہی رہا ہے لیکن وکیل (استغاثہ) صاحب کی تسلی و تشفی کے لیے دوبارہ بتاتا چلوں کہ باطل ہمیشہ الزامات عائد کرتا ہے لیکن کبھی الزامات ثابت نہیں کرپاتا۔ اگر وکیلِ استغاثہ اپنے مقدمے میں سچے ہیں اور ان کا مقصد مولانا احمد رضا کی مخالفت برائے مخالفت نہیں تو اس عدالت کے سامنے دلائل پیش کریں۔

جج (مسکراتے ہوئے) وکیلِ استغاثہ سے: کیا آپ دلائل کے ذریعے مولانا احمد رضا کو انگریز دوست ثابت کرسکتے ہیں؟

وکیلِ استغاثہ: یہ اتنی بچی بات ہے کہ اس پر تو کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔ وکیلِ صفائی کی تسلی کے لیے میں صرف اتنا کہوں گا کہ پھر تحریکِ خلافت اور تحریکِ ترکِ موالات کی مخالفت کیوں کی گئی؟ اس سے

صاف ظاہر ہوتا ہے کہ انگریزوں سے کچھ ساز باز تھی۔

وکیلِ صفائی: جنابِ والا! یہ سچ ہے کہ باطل کو کبھی بھی الزام لگانے کے لیے دلیل کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اور جنابِ والا! عدالت میں دلائل پیش کیے جاتے ہیں، محض اندازے اور تخمینوں کے بل بوتے پر کسی پر جرم ثابت نہیں کیا جاتا۔

وکیلِ استغاثہ نے اپنے ناقص مطالعے کی روشنی میں تحریکِ خلافت اور تحریکِ ترکِ موالات کی مخالفت پر انگریز دوستی کا فتویٰ صادر کر کے نہ صرف ملتِ اسلامیہ کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی ناکام کوشش کی ہے، بلکہ بہتان طرازی کے گناہ کے بھی مرتکب ہوئے ہیں۔

محترم جج صاحب! قوم گیند نہیں ہوتی، اور ملّت عطر دان نہیں ہوا کرتی، جسے سیاسی مداری جب چاہیں مخالف کے کورٹ میں ڈال دیں اور جب چاہیں اپنے گھر کی زینت بنالیں۔

قیادت کے لیے جس دور اندیشی اور عاقبت اندیشی کی ضرورت ہوتی ہے، کیا وہ اس دور کے ان قائدین اور لیڈروں میں تھی جو تحریکِ خلافت اور تحریکِ ترکِ موالات چلا رہے تھے۔ جنابِ جج صاحب! نہیں ہرگز نہیں۔ مسلمانوں کو ہندوؤں کی بھٹی کے لیے سیاسی ایندھن بنایا جارہا ہے اور تاریخ شاہد ہے کہ وقت نے ثابت کیا کہ ان کانگریسی لیڈروں کا فیصلہ غلط تھا۔ بعد میں علی برادران نے مولانا کی سیاسی بصیرت کا اعتراف کرتے ہوئے اپنی غلطی کو تسلیم کیا۔

جنابِ جج صاحب! مولانا صرف انگریزوں کے دشمن نہیں تھے، وہ ہندوؤں کے بھی بیک وقت مخالف تھے، جبھی انہوں نے ترکِ موالات کے موقع پر کہا تھا کہ:

"مسلمانوں کی ابھی ایک آنکھ کھلی ہے اور دوسری تا ہنوز بند ہے۔"

وکیلِ صفائی: جنابِ والا! آج کی اس معزز عدالت میں وکیلِ استغاثہ تو کوئی ثبوت پیش نہیں کر سکے مگر اس بطلِ حریت کی انگریز دشمنی میں مَیں چند دلائل گوش گزار کرتا چلوں۔

جنابِ والا! جس قوم سے محبت ہوتی ہے اس کی ہر چیز سے محبت ہوتی ہے اور محبت کرنے والا اس قوم کی ہر چیز کو اپنانے میں فخر محسوس کرتا ہے۔

لیکن امام احمد رضا کے سینے میں انگریزوں کے خلاف ایک ابھرتا ہوا طوفان نظر آتا ہے۔ لکھتے ہیں:

"اللہ اللہ! ...... یہ قوم ...... یہ قوم! ...... سراسر لوم یہ لوگ ...... یہ لوگ جنہیں عقل سے لاگ نہیں جنہیں جنوں کا روگ، یہ اس قابل ہوئے کہ خدا پر اعتراض کریں اور مسلمان ان کی لغویات پر کان دھریں؟ انا للہ وانا الیہ راجعون۔"

(الصمصام علیٰ مشکک فی آیۃ علوم الارحام ص ۱۹،۲۰)

کیا دوستوں کا تذکرہ اس طرح ہوتا ہے یا اس طرح دشمنوں سے بات کی جاتی ہے۔ اس عدالت کے سامنے ایک اور دلیل پیش کرتا ہوں۔

سید الطاف بریلوی لکھتے ہیں: ''سیاسی نظریئے کے اعتبار سے حضرت مولانا احمد رضا خاں صاحب بلاشبہ حریت پسند تھے، انگریز اور انگریزی حکومت سے دلی نفرت تھی، شمس العلما قسم کے کسی خطاب وغیرہ کو حاصل کرنے کا ان کا یا ان کے صاحبزادگان مولانا حامد رضا خاں، مصطفیٰ رضا خاں صاحب کو کبھی تصور بھی نہ ہوا والیانِ ریاست اور حکامِ وقت سے بھی قطعاً راہ و رسم نہ تھی۔''

(روزنامہ جنگ کراچی ۲۵ر جنوری ۱۹۷۹ء)

محترم جج صاحب! آج تاریخ ثابت کرچکی ہے کہ امام احمد رضا جس سیاسی بصیرت کے حامل تھے، ان کے ہم عصر سیاسی رہنماؤں کو اس کا عشر عشیر بھی حاصل نہ تھا۔ اور معزز عدالت کی خدمت میں دستاویزی ثبوت اور انگریزوں کے وفادار ایجنٹوں کی عملی تصویر کے لیے میں دو تاریخی کتب پیش کر رہا ہوں جو اس ضمن میں ایک مستند تحقیقی کتب کا درجہ رکھتی ہیں۔

(۱) مشعلِ راہ۔ از علامہ عبدالحکیم اختر شاہ جہاں پوری

(۲) گناہِ بے گناہی۔ پروفیسر ڈاکٹر مسعود احمد

وکیلِ استغاثہ: جنابِ والا! کتنے الزام دھوسکیں گی یہ دو کتابیں۔

وکیلِ صفائی: جنابِ اعلیٰ یہ تو الزامات کے بودے پن پر ہے اور الزام اتنا بودہ ہے کہ وکیلِ استغاثہ تو وکیلِ استغاثہ، انگریزوں کے وفادار مسلمانوں کے غدار مُلّا بھی باوجود مولانا احمد رضا سے ہزار دشمنی کے کوئی ثبوت پیش نہیں کرسکے اور نہ تا قیامت پیش کرسکیں گے۔

جناب جج صاحب! آج کی اس عدالت میں ایک مفصل تحریری بیان بھی داخلِ عدالت کرنا چاہوں گا تاکہ اہلِ دانش کی اس عدالت میں ان لوگوں کا کردار بھی سامنے آسکے جنھوں نے رہبر کی قبائیں پہن کر ملتِ اسلامیہ کو جی بھر کر لوٹا اور جن کے لگائے ہوئے زخموں سے آج بھی ٹیسیں اُٹھ رہی ہیں۔

جج صاحب: اجازت ہے۔

جنگِ آزادی کی خونی داستان کا آغاز کہاں سے کروں؟ حکمرانوں کی عیاشیوں کو دوش دوں یا غداروں کو کٹہرے میں لاکھڑا کروں، علمائے حق کی سرفروشیوں کے تابناک واقعات کو بیان کروں یا علمائے سوء کی ضلالت کی پُر فریب قبا کو چاک کروں۔ یہ خون رُلاتی داستان ...... جب ملتِ اسلامیہ کی بیٹیاں اپنے ناموس کی حفاظت کے لیے کنوؤں میں چھلانگیں لگا رہی تھیں ...... جب ماؤں کے پھٹے آنچل آنسوؤں سے تر تھے اور آہ و فغاں سے کلیجے شق ہو رہے تھے ...... اور اُمتِ مصطفیٰ کے سپوت

فرنگیوں کے ظلم و ستم کا نشانہ بن رہے تھے۔

آج تاریخ کا طالب علم یہ سوال کرتا ہے کہ چند ہزار سپاہیوں نے تخت دہلی کو کس طرح تاراج کر ڈالا۔ ہندستان کی سپاہ کہاں سو رہی تھی ...... کیا یہ اسی قوم کی داستان ہے جس نے پہلی صدی ہجری میں دنیا کے بڑے بڑے بادشاہوں کے تاج اُچھالے تھے؟...... کیا اسی قوم کی کتھا ہے جس نے بڑے بڑے جابروں کے تخت گرا دیئے تھے؟...... کیا یہ اسی قوم کی تاریخ ہے جس نے اپنے دور کے فرعونیوں کو روند ڈالا تھا؟

وقت کرتا ہے پرورش برسوں حادثہ ایک دم نہیں ہوتا

آج سے ڈیڑھ سو سال قبل جب ایک انقلاب آیا ...... ایک تاریک انقلاب ...... شاید اسلام کے چراغ نے جس تاریکی کا کئی صدیوں تعاقب کیا تھا، چاروں طرف سے سمٹ کر ایسٹ انڈیا کمپنی کی صورت میں ابھر رہی تھی اور اس انتظار میں تھیں کہ خرمنِ اسلام کے محافظ کب سوئیں اور کب ہمیں ڈیرے ڈالنے کا موقع ملے۔ حقیقت یہ ہے کہ خرمنِ اسلام کے محافظ ایک مدت سے اونگھ رہے تھے اور کفر کی آگ اس لیے دبی رہی کہ قرونِ اولیٰ کے مسلمان مجاہدین کی داستانیں اس کے لیے پانی کے چھینٹوں کا کام دیتی رہیں۔ تن کے گوروں اور من کے کالوں کو مغلیہ سلطنت کے کھوکھلے محل بھی اس قوم کے ناقابلِ تسخیر قلعے دکھائی دیتے۔

دوستو! تاریخ کا یہ موڑ نہ تو حیرت انگیز ہے اور نہ ہی اجنبی، تاریخ کے طالب علم کا سوال اپنی جگہ بجا ہے مگر

وقت کرتا ہے پرورش برسوں حادثہ ایک دم نہیں ہوتا

غداروں کی ایک فصل بہت پہلے سے پک رہی تھی اور ۱۸۵۷ء وہ معرکہ ہے جب اس پکی ہوئی فصل کو انگریزوں نے کاٹا۔

جنگ آزادی کے اسباب

علامہ فضل حق خیر آبادی نے جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے درج ذیل اسباب لکھے ہیں:

"۱۔ انگریز اپنے اقتدار کے استحکام اور دوام کے لیے تمام اہلِ ہندستان کو نصرانی بنانے کا عزائم رکھتے تھے۔ ان عزائم کی تکمیل کے لیے انہوں نے تمام ہندستان میں عیسائی مبلغین کو پھیلا دیا اور جدید نظامِ تعلیم رائج کیا۔

۲۔ وہ عوام کو مجبور اور اپنا دست نگر بنانے کے لیے ہندستان کی تمام اجناس و غلہ خرید لیتے یوں معاش کے تمام ذرائع مفقود ہو جاتے۔

۳۔ انگریزوں نے مسلمانوں کو ختنہ کرانے سے روکا اور شریف پردہ نشین عورتوں کو پردہ سے روکا۔''

(علامہ محمد فضل حق خیرآبادی، از: سلمہ سہول، صفحہ ۱۹۳، مطبوعہ الممتاز پبلی کیشنز لاہور)

جناب جج صاحب! ایک ایسا وقت جب انگریز مسلمانوں پر شب خون مارنے کے لیے اپنے لشکر کے بھیڑیوں کو دودھ پلا رہا تھا، وہیں ملّتِ اسلامیہ کے سینے کو داغ دار اور گھائل کرنے کے لیے غداروں کو بوٹ کی نوک بھی چٹوا رہا تھا۔ کیونکہ مکار انگریز جانتا تھا کہ جس خون سے وہ نبرد آزما ہونے جارہا ہے، اس کے خون کا ایک ہی چھینٹا اس کی پوری فوج کو خون میں نہلا دینے کے لیے کافی ہوگا۔

اور یہ ہی وہ وقت تھا جب علمائے اہلِ سُنّت داستانِ وفا، اپنے لہو سے تحریر کر رہے تھے اپنی آنکھوں کی قیمت پر نئے افق پر خوابِ مستقبل تعبیر کر رہے تھے۔ اور یہ وہ سے تھا جب علمائے اہلِ سُنّت دارورسن سجائے مقتل کو گھر بنا رہے تھے ...... اور یہی وہ لمحات تھے جب علمائے اہلِ سُنّت اپنے لہو سے برصغیر کی غلامی کی تاریک رات میں چراغاں کر رہے تھے...... وفا کی مشعلیں جلا رہے تھے...... ظلم وستم کی دہکتی ہوئی آتش کو اپنے خون سے بجھا رہے تھے...... اور آزادی کے لیے صلیب ومقتل سجا رہے تھے۔

ہاں یہی تھے جنہوں نے انگریزوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر للکارا۔ ان کی صدائے تکبیر جب برصغیر کے طول وعرض میں گونجتی تو مکّار انگریز کا کلیجہ کانپ کر رہ جاتا، ان کی تلواروں کی برق آن کی آن میں انگریزوں کی صفوں کا قلع قمع کر دیتی اور ہر طرف سے یہ صدا بلند ہوتی

تم بھی جاگو کہ اُفق پر کہیں مہتاب نہیں   تم بھی جاگو کہ اعلانِ سحر خواب نہیں

انگریز کی شکست قریب ہی تھی، حریتِ خورشید طلوع ہی ہوا جاتا تھا کہ پانسہ پلٹ گیا۔

غداروں کی فصل پک کر تیار ہو چکی تھی۔ لیکن یہ غدار بغداد کا ایک ابن علقمی نہ تھا اور نہ ہی اُندلس کا ابو داؤد بلکہ یہاں تو معاملہ یہ تھا کہ غداروں کی پوری فورس موجود تھی جس نے نسلاً بعد نسلٍ غداری کے تمغوں کو اپنے سینوں پر سجائے رکھا اور باپ کی غدّاری کا اجر سات نسلوں تک وصول کرنے کے حق دار قرار پائے۔

جناب جج صاحب! دہلی میں مسلمانوں کے گھر اُجڑ رہے تھے، مسلمانوں کی املاک شعلوں کی نذر ہو رہی تھیں، ہندستان جنگ کا جوار بھاٹا بنا ہوا تھا، انگریز کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کو للکارنے والے علمائے اہلِ سُنّت ہی تھے۔ اس لیے انگریزوں نے سب سے زیادہ جسمانی اور روحانی اذیتیں بھی انہی کو پہنچائیں۔ اور ان میں نامور علما علامہ فضل حق خیرآبادی، فضل امام خیرآبادی، مفتی صدر الدین خاں آزردہ، مفتی عنایت احمد کاکوروی، منصف صدر امین، مولانا فضل رسول بدایونی، مفتی عنایت اللہ، مولانا مفتی لطیف اللہ، مفتی انعام اللہ، قاضی فیض اللہ کاشمیری، مولانا عبد الجلیل، سید احمد اللہ شاہ

شہید، مولانا فیض احمد بدایونی، منشی رسول بخش کاکوروی، مولانا وہاج الدین، اس وقت کے نامور علمائے کرام میں سے تھے اور حکومت کی باگ ڈور بھی انہی کے ہاتھوں میں تھی۔ مسلمانوں کی سلطنت کی بربادی ان کے لیے ناقابلِ برداشت تھی، موقع کا انتظار تھا اور جب ۱۸۵۷ء کا وقت آیا تو سب میں پیش پیش یہی حضرات تھے۔ والیانِ ریاست میں ناقوس پھونکنے والے یہی لوگ تھے۔ یہی تھے جنہوں نے اپنے تن من دھن کی بازی لگادی۔ علامہ فضل حق خیرآبادی کو انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ دینے کی ایما پر کالے پانی کی سزا سنائی گئی، جہاں آپ نے اپنی جان جانِ آفریں کے سپرد کردی۔ علمائے اہلِ سُنّت کو درختوں سے باندھ کرنشانے باندھے گئے، ان کی لاشوں کو درختوں پر لٹکایا گیا۔

اور یہ سب کچھ ملتِ اسلامیہ کے ساتھ انگریزوں کے پالتو وفاداروں کے بل بوتے پر ہوا ......۔ ملتِ اسلامیہ کی بیٹیوں کے سہاگ انہی غداروں کی ایما پر لٹے ......۔ قوم کی بیٹیوں کی عفت و عصمت کو بھی تاراج ان علمائے سوء نے کیا۔

یہ علمائے سوء کون تھے؟ ...... ان کی تاریخ اور ان کی حقیقت کیا ہے؟ ...... ان کی تاریخ انہی کی زبانی ملاحظہ کیجیے۔

جناب جج صاحب! یہ عین وہی زمانہ تھا جب علامہ فضل حق خیرآبادی کے فتویٰ جہاد پر عمل درآمد شروع ہو چکا تھا۔ انگریز کے قدم اُکھڑ چکے تھے اور انگریز فرار ہونے کے لیے پر تول رہا تھا۔ عین اسی زمانے میں انگریزوں کے دست راست سید احمد بریلوی اور اسماعیل دہلوی، مسلمانوں کے خلاف جہاد کر کے انگریزوں کے ہاتھ مضبوط کر رہے تھے اور ان کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ انگریز کے خلاف جہاد کا فتویٰ کسی طرح درست نہیں۔

داستان ایمان فروشوں کی:

سید احمد بریلوی کے معتقد جعفر تھانیسری لکھتے ہیں: ''یہ بھی ایک صحیح روایت ہے کہ جب آپ سکھوں سے جہاد کرنے کے لیے تشریف لے جارہے تھے تو کسی شخص نے آپ سے پوچھا کہ آپ اتنی دور سکھوں سے جہاد کرنے کو کیوں جاتے ہیں؟ انگریز جو اس ملک پر حاکم اور دین اسلام سے کیا منکر نہیں ہے؟ گھر کے گھر میں ان سے جہاد کر کے ملک ملک ہندستان لے لو یہاں لاکھوں آدمی آپ کے شریک و مددگار ہو جائیں گے، کیوں کہ سیکڑوں کوس سفر کر کے، سکھوں کے ملک سے پار ہو کر افغانستان میں جانا اور وہاں برسوں رہ کر سکھوں سے لڑنا، یہ ایک ایسا امر محال ہے جس کو ہم لوگ نہیں کر سکتے۔

سید صاحب نے جواب دیا کہ کسی کا ملک چھین کر ہم بادشاہت نہیں کرنا چاہتے اور نہ ہی انگریزوں اور سکھوں کا ملک لوٹ لینا ہمارا مقصد ہے۔ بلکہ سکھوں سے جہاد کرنے کی صرف یہی وجہ

ہے کہ وہ ہمارے برادرانِ اسلام پر ظلم کرتے اور اذان وغیرہ فرائضِ منصبی ادا کرنے میں مزاحم ہوتے ہیں۔ اگر سکھ اب یا ہمارے غلبہ کے بعد ان حرکاتِ مستوجبِ جہاد سے باز آجائیں تو ہم کو ان سے لڑنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔

اور انگریزی سرکار گو منکر اسلام ہے مگر مسلمانوں پر کوئی ظلم و تعدی نہیں کرتی اور نہ ان کو فرائض مذہبی اور عبادت لازمی سے روکتی ہے۔ ہم ان کے ملک میں اعلانیہ وعظ کہتے ہیں اور ترویج مذہب کرتے ہیں۔ وہ کبھی مانع و مزاحم نہیں ہوتی، بلکہ اگر ہم پر کوئی زیادتی کرتا ہے تو اس کو سزا دینے کو تیار ہے۔ ہمارا اصل کام اشاعتِ توحیدِ الٰہی اور احیائے سنن سید المرسلین ہے۔ سو ہم بلا روک ٹوک اس ملک میں کرتے ہیں۔ پھر ہم سرکار انگریزی پر کس سبب سے جہاد کریں اور اصولِ مذہب کے خلاف بلا وجہ طرفین کا خون گرادیں۔"

(محمد جعفر تھانیسری، حیاتِ سید احمد شہید، صفحہ ۱۷۱، مطبوعہ کراچی ۱۹۶۸ء)

انگریزوں کے ہاتھ کس طرح مضبوط کیے سید احمد نے، اس کو بیان کرتے ہوئے تھانیسری صاحب لکھتے ہیں: "اس سوانح اور مکتوبات کے مطالعہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ سید صاحب کا انگریزی سرکار سے جہاد کرنے کا ہرگز ارادہ نہ تھا۔ وہ اس آزاد علمداری کو اپنی ہی علمداری سمجھتے تھے اور اس میں شک نہیں کہ اگر انگریزی سرکار اس وقت سید صاحب کے خلاف ہوتی تو ہندستان سے سید صاحب کو کچھ مدد نہ پہنچتی مگر سرکار انگریز دل سے چاہتی تھی کہ سکھوں کا زور کم ہو۔"

(محمد جعفر تھانیسری، حیات سید احمد شہید صفحہ ۱۷۱ مطبوعہ کراچی ۱۹۶۸ء)

مولوی منظور احمد نعمانی لکھتے ہیں: "مشہور یہ ہے کہ آپ (سید صاحب اینڈ کمپنی) نے انگریزوں سے مخالفت کا کوئی اعلان نہیں کیا بلکہ کلکتہ یا پٹنہ میں ان کے ساتھ تعاون کا اظہار کیا اور یہ بھی مشہور ہے کہ انگریزوں نے بعض بعض موقعوں پر آپ کی امداد بھی کی۔"

(ماہنامہ الفرقان، لکھنؤ شہید نمبر ۱۳۵۵ھ صفحہ ۷۶)

عزیزانِ گرامی! یہ صرف ایک چہرہ نہیں بلکہ ایک پورا ٹولہ ہے، جنہوں نے عبائیں پہن کر قوم کو بھڑکتی ہوئی آتش میں دھکیل دیا۔ برصغیر میں وہابیت (انگریزوں کا خود کاشتہ پودا) کے سرخیل مولوی اسمٰعیل دہلوی انگریزوں کی حمایت میں یوں بیان دیتے ہیں۔

مرزا حیرت دہلوی لکھتے ہیں: "کلکتہ میں جب مولانا اسمٰعیل صاحب نے جہاد کا وعظ فرمانا شروع کیا ہے اور سکھوں کے مظالم کی کیفیت پیش کی تو ایک شخص نے دریافت کیا، آپ انگریزوں پر جہاد کا فتویٰ کیوں نہیں دیتے؟ آپ نے جواب دیا، ان پر جہاد کسی طرح واجب نہیں ہے ایک تو ان کی

رعیت ہیں، دوسرے ہمارے مذہبی ارکان ادا کرنے میں وہ ذرا بھی دست اندازی نہیں کرتے ہمیں ان کی حکومت میں ہر طرح کی آزادی ہے بلکہ اگر ان پر کوئی (مسلم یا غیر مسلم) حملہ آور ہو تو مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ اس سے لڑیں اور اپنی گورنمنٹ پر آنچ نہ آنے دیں۔"

(حیرت دہلوی، حیاتِ طیبہ، صفحہ ۳۶۴، مطبوعہ لاہور ۱۹۷۲ء)

انگریزوں کو خود بھی ان پالتو وفاداروں سے اتنی امید نہ ہوگی۔ شاہ سے بڑھ کر شاہ کی وفاداری کی مثال ان پالتو وفاداروں سے بڑھ کر کہیں نہیں ملے گی۔

جنابِ جج صاحب! ۱۵۰ سال کو اگرچہ کافی عرصہ گزر چکا ہے مگر ابھی بھی غور کریں تو شکستہ آنچلوں سے آنسو خشک نہیں ہوئے، عفت و عصمت کے نگینوں کو پہنچنے والی ٹھیس آج بھی ملتِ اسلامیہ کے کلیجوں کو سوختہ کر رہی ہے۔

ملّتِ وہابیہ کے سرخیل اسماعیل دہلوی کی اپنی انگریز گورنمنٹ نے ملت اسلامیہ کو کس طرح جھنجھوڑا، درندگی کے کیسے نقوش چھوڑے، تاریخ کے اوراق اس کی شہادت دے رہے ہیں۔

میاں محمد افضل لکھتے ہیں: "انقلابی جدوجہد کے بعد گوروں نے شاہی خاندان، مسلمان عمائدین، علما، امرا اور عامۃ المسلمین پر مظالم کے جو پہاڑ توڑے انہیں دیکھتے ہوئے ہلاکو، چنگیز، ہلاکو، تیمور اور نادر شاہ رحم دل قصاب معلوم ہوتے تھے، جو اپنے مذبوح کو زیادہ تڑپاتے نہ تھے۔ انگریزوں کے اپنے مورخوں نے تسلیم کیا ہے کہ جذبۂ انتقام میں وہ بہیمیت کی حد تک چلے گئے تھے۔"

(سقوطِ بغداد سے سقوطِ ڈھاکہ تک، صفحہ ۳۶۸ مطبوعہ الفیصل لاہور ۲۰۰۳ء)

۱۸۵۷ء کے ہنگاموں نے شہر دہلی کو جس طرح برباد کیا اس کو بیان کرتے ہوئے قلم کانپتا ہے۔ بقول شاعر ؎

تذکرہ دہلی مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز

مولانا غلام رسول مہر لکھتے ہیں: "فتح دہلی کے بعد شہر پر عموماً اور مسلمانوں پر خصوصاً جو قیامت گزری اس کی سرسری کیفیت بھی پیش کرنا کم از کم اتنا دردانگیز اور زہرہ گداز ضرور ہے جیسا کہ دل کو پہلو سے نکال کر دہکتے ہوئے انگاروں پر ڈال دیا جائے۔ اگر کسی شخص میں اتنی ہمت ہو کہ قلم کا کام برق تپاں سے لے سکے اور سیاہی کی جگہ خون جگر استعمال کرے تو ممکن ہے وہ اس آتش کدۂ ظلم و تعدی کی دھندلی سی تصویر تیار کرے، جو ۱۶ ستمبر ۱۸۵۷ء سے دہلی میں انگریزوں نے بھڑکایا اور مہینوں تک شہر کا سرمایۂ جان و مال و آبرو خس و خاشاک کی طرح جل کر خاکستر بنتا رہا۔ شہر دہلی نے صدیوں تک یگانہ جاہ و جلال کی بہاریں دیکھیں اور آتش و خون کے طوفانوں میں بھی غوطے کھائے، نادر و تیمور کی خوں

ریزیوں کے بارے میں عام تاثر کیا ہے؟ یہ کہ ان بے درد فاتحین نے جو دورِ وحشت کی یادگار تھے نمائشِ اقتدار کے جنون میں انسانی خون کے دریا تاریخ کے صفحات پر بہادیئے، لیکن انگریز نے فتح کے بعد جو کچھ کیا، اس کے لیے تیمور و نادر کی مثالیں پیش کرنا بالکل لاحاصل و بے سود ہے۔ اس لیے کہ نہ ویسا خونچکاں مرقع دہلی کے آسمان نے پہلے کبھی دیکھا تھا اور نہ اس کے بعد نظر آیا۔ اگر خاکِ دہلی کے ذرّوں کو قدرت تھوڑی دیر کے لیے......تو شاید یہ داستان سنائی جاسکے۔"

(سقوطِ بغداد سے سقوطِ ڈھاکہ تک، صفحہ ۳۷۵ مطبوعہ الفیصل لاہور ۲۰۰۳ء)

سید کمال الدین حیدر "قیصر التواریخ" میں لکھتے ہیں: "ستائیس ہزار اہلِ اسلام نے پھانسی پائی، سات دن برابر قتلِ عام رہا، اس کا حساب نہیں۔ اپنے نزدیک گویا نسلِ تیمور کو نہ رکھا، مٹا دیا، بچوں تک کو مار ڈالا، عورت سے جو سلوک کیا بیان سے باہر ہے، جس کے تصور سے دل دہل جاتا ہے۔"

(قیصر التواریخ جلد دوم صفحہ ۴۵۴)

علامہ عبدالحکیم اختر شاہ جہاں پوری لکھتے ہیں: "عبادت گاہیں ہر مذہب و ملت کے نزدیک قابلِ احترام ہیں اور مساجد تو پھر مساجد ہیں۔ لیکن انگریزوں نے اوراخلاقی ضابطوں کو مدنظر رکھا اور نہ ہی اپنے عیسائی ہونے کا لحاظ کیا۔ مسلم کشی کے جذبے نے انہیں اتنا اندھا کر دیا تھا کہ دہلی کی مشہور و معروف جامع مسجد کو سکھ فوج کا ہیڈ کوارٹر مقرر کر دیا گیا تھا۔" (مشعلِ راہ، صفحہ ۱۰۸)

عزیزانِ گرامی! انگریز مظالم کے چند حوالے آپ نے ملاحظہ کیے جن سے اسمٰعیل دہلوی اور سید احمد بریلوی انگریزوں سے جہاد واجب قرار نہیں دیتے بلکہ وفاداری کا اعلان کرتے ہوئے کہتے ہیں: "بلکہ اگر ان پر کوئی (مسلم یا غیر مسلم) حملہ آور ہو تو مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ اس سے لڑیں اور اپنی گورنمنٹ پر آنچ نہ آنے دیں۔" (حیرت دہلوی، حیات طیبہ صفحہ ۳۶۴ مطبوعہ لاہور ۱۹۷۲ء)

انگریزوں سے وفاداری ملتِ اسلامیہ سے غداری ہی کے مترادف ہے۔ آیئے چند اور ایمان فروشوں کا حال ملاحظہ کیجیے۔ سر سید احمد خان کو قوم کا ہیرو بنا کر کے پیش کرنے کی گھناؤنی سازش رچائی گئی۔ یہ کون تھے؟ اور کیا تھے؟

مولوی عبدالحق حقانی دہلوی سر سید کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں: "اس کنبے میں ایک شخص سید احمد............" (مشعلِ راہ، صفحہ ۴۴۷)

الطاف حسین، سر سید احمد خان کے بارے میں لکھتے ہیں:

"جو شخص............مقرر کی۔" (مشعل راہ، صفحہ ۴۴۷)

سر سید احمد خان کی انگریزوں سے وفاداری کے مذکورہ بالا اقتباسات من وعن پیش کر دیے اور

مندرجہ بالا اقتباسات بلاتبصرہ عام آدمی کے ذہن کو حقیقت کے بند دریچوں تک لے جا سکتے ہیں۔

سر سید احمد خان قوم کے محسن کے روپ میں قوم کے سامنے پیش کیے گئے۔ انگریزی تعلیم تو محض بہانہ تھی، اس بہانے انگریزوں نے مسلم قوم کو اپنا ذہنی غلام بنالیا۔

مولانا ابو الکلام آزاد لکھتے ہیں: ''کچھ اوپر سو برس ہوئے ہندستان میں انگریزی حکومت آئی اور جدید علوم وفنون کو اپنے ساتھ لائی، اسکول بنائے، کالج قائم کیے، تربیت گاہ (ہاسٹل) واقامت گاہ (بورڈنگ ہاؤس) کی بنیاد ڈالی، وظیفے دیئے، ملازمتوں کا دروازہ کھولا، سررشتہ تعلیم کی رسی دراز کی، یہ سب کچھ ہوا لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ تعلیم کا نظام اور اس کا طرز وطریق ہی ایسا ناقص تھا کہ تعلیم یافتہ گروہ نہ ذہنیات ہی میں ترقی کر سکا نہ دماغ ہی آراستہ ہوئے، نہ عملی طریق پر ملک کی ثروت بڑھانے کی ضرورت محسوس ہوئی اور نہ ایجاد واختراع ہی کی جانب توجہ پیدا ہوئی۔ اس تمام تعلیمی تگ ودو اور غوغائے علم کا نتیجہ صرف اسی قدر نکلا کہ سرکاری دفتروں میں محرومی نظامت کے لیے کم معاوضہ پر فرنگی کارکن نہیں مل سکتے تھے، ہندستانیوں کو انگریزی زبان میں بہرہ نہ تھا، انگریزی افسر ہندستانی محرروں کے حاجت مند بھی تھے اور ان کے ہاتھوں زحمت بھی اُٹھاتے تھے۔ پس سرکاری یونی ورسٹیوں نے یہ زحمت رفع کردی۔ کلرکی کے لیے اس تعلیمی ترقی کے دور میں ہر قسم کے ہندستانی گریجویٹ ملنے لگے، جن کی زندگی کا ماحصل یہی ہوتا ہے کہ کمائیں اور کھائیں اور گورنمنٹ کی غلامی میں عمریں گزاریں۔''

(ابوالکلام آزاد کے علمی شہ پارے، صفحہ ۳۳۸ مطبوعہ دارالاشاعت ۲۰۰۲ء)

علامہ اقبال نے اس تعلیمی نظام کو اپنی بصیرت افروز آنکھ سے بہت پہلے ہی دیکھ لیا تھا۔

دیکھیے چلتی ہے مشرق کی تجارت کب تک — شیشہ دیں کے عوض جام وسبو لیتا ہے
ہے مداوائے جنوں نشتر تعلیم جدید — مرا سرجن رگ ملت سے لہو لیتا ہے

اور کبھی اس طرح اس کے نتائج کو بیان کرتے ہیں۔

خوش تو ہیں ہم بھی جوانوں کی ترقی سے مگر — لب خنداں سے نکل جاتی ہے فریاد بھی ساتھ
ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم — کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ

جناب جج صاحب! نہ جانے کتنے چہرے نقابوں میں چھپے رہے، غداری قباؤں اور عماموں کے پیچوں میں چھپی رہی اور آستین کے سانپ بن کر قوم کو ڈستے رہے۔ انہی میں ایک انگریزوں کے لقب یافتہ شمس العلما علامہ شبلی نعمانی بھی تھے:

شبلی نعمانی رقم طراز ہیں: ''میں (شبلی) مدت العمر کبھی انگریز کا بدخواہ نہیں رہا ہوں۔ میری ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ مشرق ومغرب کے درمیان یگانگت بڑھے اور ایک دوسرے کی طرف سے

(یعنی ہندستان کے رہنے والوں اور انگریزوں کی طرف سے) جو غلط فہمیاں مدت دراز سے چلی آرہی ہیں، دور ہوں۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ ۱۹۰۸ء میں میں نے الندوہ میں ایک مستقل مضمون کے ذریعے یہ ثابت کیا کہ مسلمانوں پر انگریزی حکومت کی اطاعت و وفاداری مذہبا فرض ہے۔''

(محمد اکرم شیخ، شبلی نامہ صفحہ ۲۴۵)

یہ تھی شبلی نعمانی کی انگریزوں سے وفاداری شبلی نعمانی کی زبانی۔

ان ہی وفاداروں میں ایک نام الطاف حسین حالی کا بھی ہے جنہوں نے اپنی شاعری کے ذریعے انگریزوں کی حمایت کی۔ قوم کی بدقسمتی کہ جو انگریزوں کے وفادار رہے ایک سازش کے تحت انہیں ہی قوم کا ہیرو بنا کر پیش کیا گیا تاکہ نئی نسل جب شعور کی منزلوں پر قدم رکھے تو ذہنی غلامی کی بیڑیاں انہیں ہمیشہ انگریزوں کا غلام رکھے اور ایسا ہی ہوا۔

انگریزوں کے صف اوّل کے وفادار دوستوں میں ایک نام ہے مولوی رشید احمد گنگوہی صاحب کا ہے۔ جنہوں نے اپنے پیر و مرشد حضرت امداد اللہ مہاجر مکی کی تصنیف لطیف ''فیصلہ ہفت مسئلہ'' کو اپنے شاگرد خواجہ حسن نظامی کو جلانے کا حکم دیا اور نئے نظریات کی بنیاد رکھ کر مسلمانوں میں انتشار و افتراق کی نئی فصل بوئی۔ خود فرماتے ہیں: ''میں (رشید احمد گنگوہی) حقیقت میں سرکار کا فرماں بردار ہوں تو جھوٹے الزام سے میرا بال بیکا نہ ہوگا اور اگر مارا بھی گیا تو سرکار مالک ہے، اسے اختیار ہے جو چاہے کرے۔''

(عاشق الٰہی میرٹھی، تذکرۃ الرشید، جلد اوّل صفحہ ۸۰)

چلیے جان چھوٹی شرک و بدعت کے مسئلہ سے انگریز سرکار کے تخت پر عقیدہ و ایمان کی آتما چڑھا دی اور اللہ کے بجائے انگریز کو مالک قرار دے دیا۔

انگریزوں سے وفاداریوں کی داستانیں بہت طویل ہیں قوم سے غدار اور انگریزوں سے وفاداری کی ایک اور داستان ملاحظہ فرمایئے۔

یہ ہیں مولانا اشرف علی تھانوی صاحب! قوم کے اتحاد و اتفاق کے قاتل، انتشار و افتراق کے نقیب شبیر احمد عثمانی کہتے ہیں: ''حضرت مولانا اشرف علی تھانوی ہمارے اور آپ کے مسلّم بزرگ و پیشوا تھے۔ ان کے متعلق بعض لوگوں کو یہ کہتے ہوئے سنا گیا کہ ان کو چھ سو روپیہ ماہوار حکومت کی جانب سے دیئے جاتے تھے۔ اسی کے ساتھ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو اس کا علم نہیں تھا کہ روپیہ حکومت دیتی ہے مگر حکومت ایسے عنوان سے دیتی تھی کہ ان کو شبہ نہ گزرتا تھا۔ اب اس طرح حکومت مجھے یا کسی شخص کو استعمال کرلے مگر اس کو یہ علم نہ ہو کہ اسے استعمال کیا جارہا ہے تو ظاہر ہے کہ وہ شرعا اس میں ماخوذ نہیں ہوسکتا۔''

(طاہر احمد قاسمی، مولوی مکالمۃ الصدرین مطبوعہ لاہور صفحہ ۱۶)

مرزا غلام احمد قادیانی بھی انگریزوں کا ایسا پالتو وفادار تھا جس نے قوم کی پیٹھ میں خنجر گھونپنے کا مقدس فریضہ ان نام نہاد علما سے بڑھ کر انجام دیا۔

اسلام دشمنی کے کارنامے کو یوں فخریہ انداز میں بیان کرتا ہے: ''میں نے ممانعتِ جہاد میں اور انگریزی اطاعت کے بارے میں اس قدر کتابیں لکھی ہیں اور اشتہار شائع کیے ہیں کہ اگر وہ رسائل اور کتابیں اکٹھی ہو جائیں تو پچاس الماریاں ان سے بھر سکتی ہیں۔'' (غلام احمد قادیانی۔تریاق القلوب صفحہ ۲۵)

علامہ اقبال غلام احمد قادیانی کا محاسبہ کرتے ہوئے کہتے ہیں ۔

کچھ غم نہیں جو حضرت واعظ ہیں تنگ دست — تہذیب نو کے سامنے سر اپنا خم کریں

ردِ جہاد میں تو بہت کچھ لکھا گیا — تردید حج میں کوئی رسالہ رقم کریں

عزیزانِ گرامی! یہ ہر عہد میں موجود ہوتے ہیں۔ عباؤں اور قباؤں میں چھپے ہوئے نیزے قوم کی پیٹھ میں اتارنے کا ان کا وطیرہ بہت پرانا ہے۔

اس موضوع پر علامہ عبدالحکیم اختر شاہ جہانپوری نے ایک ضخیم کتاب ''مشعل راہ'' لکھی۔ اہلِ ذوق اور حقیقت کو قریب سے دیکھنے کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ (اس کتاب کو فرید بک سٹال نے ''۱۸۵۷ء کے برطانوی مظالم کی داستان'' کے نام سے بھی چھاپا ہے)

انگریز کے اصل ایجنٹ مولانا احمد رضا نہیں بلکہ ان کے مخالفین ہیں، جو مولانا کی ذات پر یہ بے جا الزام لگا کر اُن کی شخصیت کو داغ دار کر کے مسلمانوں کو اُن سے بدظن کرنا چاہتے ہیں۔ مولانا احمد رضا انگریزوں سے سخت نفرت کرتے تھے۔ خطوط پر ٹکٹ چسپاں کرتے وقت وہ ملکۂ برطانیا کا سر ہمیشہ اُلٹا رکھا کرتے تھے، تاکہ ملکہ کا سر نیچے رہے۔ وہ انگریز حکومت کو ہی نہیں مانتے تھے، اس لیے انھوں نے کبھی انگریز کی عدالت میں جانا گوارا نہ کیا۔ یہاں تک کہ اپنے زمانے میں وہ انگریزی لباس سے بھی نفرت کرتے تھے اور انھوں نے فتویٰ دیا تھا کہ انگریزی لباس میں نماز نہیں ہوگی۔

جج: تمام شواہد کے بعد عدالت اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ مولانا احمد رضا خاں انگریزوں کے دوست یا خریدے ہوئے ایجنٹ ہرگز نہ تھے بلکہ مسلمانوں کے ہیرو اور ایک ایسی عبقری شخصیت کے مالک تھے جو ملّتِ اسلامیہ کے لیے ایک مضبوط ستون کی حیثیت رکھتا ہے اور ان کی تعلیمات آج بھی ملّتِ اسلامیہ کے لیے باعثِ نجات ہیں اور ان کی کتب وغیرہ میں جیسا کہ ڈاکٹر مسعود احمد صاحب اور مولانا عبدالحکیم اختر شاہ جہاں پوری نے اپنی کتب میں لکھا (امام احمد رضا کی تحریر کردہ کتب کے حوالے سے) کہ مولانا احمد رضا خاں انگریز گورنمنٹ کے سخت خلاف اور مسلمانوں کے خیر خواہ تھے۔

عدالت برخواست ہوتی ہے۔

دوسرا مقدمہ

جج: دانشوروں، اہلِ علم، اہلِ عدل اور عقل وفہم کے حامل، عصبیت سے پاک، اسلام کے مخلص لوگ

وکیلِ استغاثہ: مخالفینِ اہلِ سُنّت

وکیلِ صفائی: اہلِ حق

استغاثہ: مولانا احمد رضا خان بدعات کے نقیب تھے۔ نت نئی رسومات کو ایجاد کیا اور اُن کو فروغ دینے میں اپنا کردار ادا کیا۔

وکیلِ استغاثہ: عزت مآب جج صاحب! الزامات کی ان گنت فہرست میں سے اگر مولانا احمد رضا خاں صاحب کو کسی الزام سے باعزت یا اعزاز کے ساتھ بری بھی کر دیا جائے تب بھی ان کے اوپر ایسے الزامات کا پلندہ موجود ہے، جس سے وہ کسی طور بری نہ ہوسکیں گے۔

انہی الزامات میں سے ایک بہت بڑا الزام ان پر یہ بھی عائد ہوتا ہے کہ انہوں نے ملّتِ اسلامیہ میں نت نئے رسم و رواج کو جنم دیا۔

وکیلِ صفائی: محترم جج صاحب! وکیلِ استغاثہ ایک کے بعد ایک الزام کو ثابت کریں، ان شاء اللہ پچھلے مقدمے کی طرح یہ مقدمہ بھی محض الزامات کا پلندہ ہی ثابت ہوگا۔ وکیلِ استغاثہ ان کو بھی ثابت نہ کرسکیں گے۔

جج: کسی ایک نقطے پر بحث کی جائے۔

وکیلِ استغاثہ: جناب جج صاحب! بغیر تمہید کے عرض کروں گا کہ مولانا احمد رضا نے آج ہمارے یہاں سوئم، میت کا کھانا، چالیسویں کی دعوت ایک ایسا رجحان پیدا کر دیا کہ غریب آدمی کے لیے جینا تو مشکل تھا ہی مرنا بھی مشکل کر دیا۔ اور اس قبیح رسم کے بانی و موجد مولانا احمد رضا ہیں۔

وکیلِ صفائی: جناب جج صاحب! لفظوں کا سہارا لے کر، غریبوں کا رونا رو کر، روایتی سیاست دانوں کی طرح اور بیوہ عورت کے بین کی مانند وکیلِ استغاثہ نے محض الزام ہی لگایا، ثابت نہ کیا اور ثابت کریں بھی کیسے، مولانا نے جس طرح استعمار اور استعمار کے ایجنٹوں کے خلاف جو ایک طویل جنگ لڑی ہے، اس سے استعماری ایجنٹ بوکھلائے پھر رہے ہیں اور بغیر شواہد و ثبوت کے استغاثے دائر کرتے پھر رہے ہیں۔ اگر وکیلِ استغاثہ کے پاس دلیل ہے، تو پیش کریں۔

وکیلِ استغاثہ: (بوکھلائے ہوئے انداز اور ذرا عجلت میں) جج صاحب! وکیلِ صفائی الزام کا دفاع کریں۔ ضروری نہیں کہ ہر الزام پر ثبوت ہی پیش کیے جائیں۔ اگر ایسا نہیں تو الزام کے خلاف ثابت کر دکھائیں۔

(عدالت میں وکیلِ استغاثہ [illegible])

جج (مسکراتے ہوئے وکیلِ صفائی سے): آپ کچھ کہنا چاہ رہے ہیں۔

وکیلِ صفائی: جناب جج صاحب! وکیلِ استغاثہ تو ابھی مقدمے کی باقاعدہ کاروائی سے قبل ہی بوکھلا گئے اور تمام تعلیمی قابلیت ولیاقت اُڑن چھو ہوگئی۔ اور وہ یہ بھی بھول گئے کہ الزام لگانے والا ثبوت پیش کرتا ہے نہ کہ ملزم۔ یہ عقل و دانش کی عدالت ہے، رومیوں یا یونانیوں کا عدالتی اکھاڑا نہیں کہ جس کی لاٹھی اُس کی بھینس۔ لیکن مَیں اس کے باوجود اس الزام کی دھجیاں اُڑاتے ہوئے یہ کہنا چاہوں گا (پُر جوش انداز میں) ......

وکیلِ استغاثہ (مداخلت کرتے ہوئے): جج صاحب! ثبوت موجود ہے۔

جج: اگر ہے، تو عدالت میں پیش کیا جائے۔

وکیلِ استغاثہ: جناب جج صاحب! یہ کتاب (ایک کتاب جج کی طرف بڑھاتے ہوئے) ایک قابل ڈاکٹر خالد محمود کی ہے (ڈاکٹر پر زور)، جو مانچسٹر میں اسلامک اکیڈمی کے ڈائریکٹر اور پی ایچ ڈی Ph.D ہیں (Ph.D پر زور)۔ لکھتے ہیں: ''مولانا احمد رضا خاں بریلوی نے اپنی وفات سے دو گھنٹے سترہ منٹ قبل پُرتکلف کھانوں کی ایک فہرست تحریر فرمائی اور وصیت کی کہ اعزّہ سے بطیب خاطر ممکن ہو تو فاتحہ ہفتہ میں دو تین بار ان اشیا سے بھی کچھ بھیج دیا کریں۔ دودھ کا برف خانہ ساز اگر بھینس کا دودھ ہو تو، مرغ کی بریانی، مرغ پلاؤ، خواہ بکری کا ہو شامی کباب، پراٹھے اور بالائی فرنی، اُردکی پھریری دال بمع ادرک و لوازم، گوشت بھری کچوریاں، سیب کا پانی، انار کا پانی (جوس) سوڈے کی بوتل، دودھ کا برف۔ آخری وقت میں نیک لوگ توبہ و استغفار میں مشغول رہتے ہیں، ذکر وتلاوت کی فکر ہوتی ہے، آخرت کی طرف دھیان ہوتا ہے مگر خاں صاحب ہیں کہ اس وقت بھی چٹ پٹے کھانوں کی فہرست تیار فرمانے میں مصروف ہیں۔'' (مطالعۂ بریلویت ص۲۰،۲۱)

وکیلِ استغاثہ: ایک ڈاکٹر کے قلم سے نکلی ہوئی اس تحریر کے بعد کیا وکیلِ صفائی کو کسی اور ثبوت کی بھی ضرورت ہے۔

وکیلِ استغاثہ (زیرلب مسکراتے ہوئے): ؎ چراغِ علم جلاؤ بڑا اندھیرا ہے

وکیلِ صفائی: جناب جج صاحب! وکیلِ استغاثہ الزام کچھ لگا رہے ہیں، ثبوت کچھ پیش کر رہے ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ وکیلِ استغاثہ ذہنی طور پر دیوالیہ ہوچکے ہیں۔

جج صاحب! وکیلِ استغاثہ نے ثبوت پیش نہیں کیا بلکہ ایک اور الزام عائد کیا ہے۔ اس سے قبل کہ مَیں ان کے اس دوسرے الزام پر بحث کروں، ان کی پہلی الزام تراشی کی دھجیاں بکھیرنا چاہوں گا۔

جناب جج صاحب! قوم کا درد جس طرح مولانا احمد رضا خاں کے سینے میں موجزن تھا وہ تو

سوچا بھی نہیں جا سکتا۔ میت کا کھانا اور سوئم کے کھانے سے متعلق وکیلِ استغاثہ اور اُن کے حواریوں نے اگر اعلیٰ حضرت کی کتب کا مطالعہ ہی کرلیا ہوتا، تو انہیں یوں الزام تراشیوں کی ضرورت پیش نہ آتی۔

جناب جج صاحب! یہ فتاویٰ رضویہ کی جلد چہارم ہے (صفحہ ۱۴۸، باب الجنائز) اس میں ایک سائل نے سوال کیا کہ اکثر بلادِ ہندیہ میں رسم ہے کہ میت کے روزِ وفات سے اس کے اعزّہ واقارب و احباب کی عورات (عورتیں) اس کے یہاں جمع ہوتی ہیں، اس اہتمام کے ساتھ جو شادیوں میں کیا جاتا ہے پھر کچھ دوسرے دن، اکثر تیسرے دن واپس آتی ہیں، بعض چالیسویں تک بیٹھتی ہیں۔ اس مدتِ اقامت میں عورت کے کھانے پینے، پان چھالیا کا اہتمام اہلِ میت کرتے ہیں، جس کے باعث ایک صرفِ کثیر کے زیرِ بار ہوتے ہیں اگر اس وقت ان کے ہاتھ خالی ہوں تو اس ضرورت سے قرض لیتے ہیں۔ یوں نہ ملے تو سودی نکلواتے ہیں، اگر نہ کریں تو مطعون و بدنام ہوتے ہیں یہ شرعاً جائز ہے کیا؟

جناب جج صاحب! سائل نے سوال کے آخر میں یہ معلوم کیا کہ ''یہ شرعاً جائز ہے کیا''۔

(وکیلِ استغاثہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے)

اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں: ''سبحان اللہ اے مسلمان، یہ پوچھتا ہے جائز ہے کیا؟ یوں پوچھ کہ ناپاک رسم کتنے قبیح اور شدید گناہوں، سخت شنیع وخرابیوں پر مشتمل ہے۔''

جناب جج صاحب! وکیلِ استغاثہ جس رسم کا موجد مولانا احمد رضا کو ٹھہرا رہے ہیں، مولانا احمد رضا اُس رسم سے سخت بے زار ہیں اور ناپسندیدہ فرمارہے ہیں۔

جج صاحب: کیا وکیلِ استغاثہ، وکیلِ صفائی کے اس بیان اور مولانا احمد رضا پر عائد کردہ الزام پر مزید کچھ کہنا چاہیں گے۔

وکیلِ استغاثہ: جی نہیں! مگر خالد محمود صاحب کی عبارت پر وکیلِ صفائی کیا کہیں گے۔

وکیلِ صفائی: خالد محمود کے ڈاکٹر اور Ph.D ہونے پر جو غرہ وکیلِ استغاثہ کو ہے، اتنا شیطان کو اپنے علم پر نہیں ہوگا۔

جناب جج صاحب! (انتہائی پُرجوش انداز میں) ڈاکٹر اور Ph.D کی ڈگری پر اتنا غرہ۔

جنابِ والا! امام احمد رضا ملتِ اسلامیہ کی وہ عبقری شخصیت ہیں جن پر کئی لوگ Ph.D کرچکے ہیں، کئی کر رہے ہیں اور کئی لوگ کریں گے۔

جناب والا! خالد محمود صاحب کوئی غیر متنازعہ شخصیت نہیں بلکہ دیوبندی مکتبِ فکر سے تعلق رکھنے والے ایک متعصب شخصیت کے مالک ہیں۔ انہوں نے علمی خیانت کا جو طریقہ ایجاد کیا ہے، اس پر انہیں شیطان سے داد وتحسین مل [illegible] اٹھا ہوگا۔

محترم جج صاحب! عصبیت عقل وخرد کے چراغوں کو بجھا دیتی ہے۔قوتِ غضبیہ پڑھے لکھے شخص کو بھی جانور سے بدتر کر دیتی ہے۔ ڈاکٹر خالد محمود جو الزام ملتِ اسلامیہ کی عبقری شخصیت پر عائد کر رہے ہیں اس سے خود اُن کے اکابر کے دامن اس حد تک داغ دار ہیں کہ اگر وہ اپنے دامن پر ان داغوں کو دیکھ لیتے تو شاید مولانا احمد رضا پر الزامات عائد نہ کرتے۔

وکیلِ استغاثہ (تھوڑا سا طیش میں): جج صاحب! وکیلِ صفائی عدالت کو گمراہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور الزامات سے جان چھڑانے کے لیے الزامات عائد کر رہے ہیں۔

وکیلِ صفائی: جناب جج صاحب! عدالت کے سامنے صرف گواہ ہی اہم نہیں ہوتا، گواہ کا کردار بھی بہت اہم ہوتا ہے۔ وکیلِ استغاثہ اور اُن کے موکل اور گواہ خالد اگر ملتِ اسلامیہ کی عبقری شخصیت پر الزام عائد کر کے علم و دانش کی مسندوں پر بھنگڑے ڈالنا شروع کر دیں اور قلم و قرطاس کی عصمت کو بے آبرو کر کے اُمتِ مسلمہ کو گمراہ کرنے کی کوشش کریں تو ان میں اتنا حوصلہ بھی ہونا چاہیے کہ اہلِ دانش، اہلِ حق کی اس عدالت میں اپنے اکابرین کی قباؤں پر لگے ہوئے خونی دھبّوں کو بھی ملاحظہ کر سکیں۔

وکیلِ استغاثہ: چلیے (وکیلِ صفائی کی جانب دیکھتے ہوئے) اپنی جان چھڑانے کے لیے اور اعتراض کے جواب سے پہلو تہی کرتے ہوئے، آپ اس عدالت میں یہ خونی دھبّے دکھا دیجیے۔

وکیلِ صفائی: (وکیلِ استغاثہ کی جانب دیکھتے ہوئے)

جناب والا! وکیلِ استغاثہ آئینہ دکھانے سے پہلے ہی برا مان گئے۔ آج اس اہلِ دانش کی عادلانہ عدالت میں، مَیں وکیلِ استغاثہ اور اُن کے گواہ ڈاکٹر خالد محمود کے اعتراض سے پہلو تہی نہیں کروں گا بلکہ سخت جرح کرتے ہوئے اس اعتراض کی دھجیاں بکھیرنا چاہوں گا۔ ڈاکٹر خالد محمود صاحب نے سیاق و سباق سے ہٹ کر جس طرح اُمتِ مسلمہ کی عبقری شخصیت مولانا احمد رضا پر ہرزہ سرائی کی ہے، یہ مشقِ ستم، اہلِ ستم کو بہت بھائی ہوگی۔ مگر اہلِ علم کے سینوں کو داغ دار کر گئی ہے۔

مولانا احمد رضا خاں، وصایا شریف نمبر گیارہ میں لکھتے ہیں: ''فاتحہ کے کھانے سے اغنیا کو کچھ نہ دیا جائے صرف فقرا کو دیں اور وہ بھی اعزاز اور خاطر داری کے ساتھ، نہ جھڑک کر۔ غرض کوئی بات خلافِ سُنّت نہ ہو۔''

مزید آگے لکھتے ہیں: ''غربا اور مساکین کو عمدہ اور لذیز چیزیں کب میسر ہوتی ہیں تو وہ اشیا جو غربا کو میسر نہیں آتیں ان کے متعلق فرمایا جاتا ہے اعزا سے اگر بطیبِ خاطر ممکن ہو تو فاتحہ...... اشیا...... اگر روزانہ ایک چیز ہو سکے یوں کر دیا جیسے مناسب جانو مگر بطیبِ خاطر میرے کہنے پر مجبوراً نہ......''

(وصایا شریف ص ۲۴)

جج صاحب! نمبر گیارہ میں فاتحہ کا ذکر ہے کہ فاتحہ کے کھانے سے اغنیا کو کچھ نہ دیا جائے اور نمبر بارہ (۱۲) میں فاتحہ کی اشیا کو غربا کو دینے کا ذکر فرمایا، وہ بھی بطیب خاطر۔

جج صاحب! اسلام کی تاریخ کا مطالعہ کر لیجیے، ہر دَور کا امام، ہر زمانے کا مجدّد، ہر عہد میں مسلمانوں کے اسلاف کا یہ وطیرہ رہا ہے کہ خلقِ خدا کو وہ نوازتے رہے۔ جہاں تک اُن سے ہوسکا، مخلوقِ خدا کے کام آتے رہے۔ جب یہی کام مولانا احمد رضا نے کیا تو نہ جانے کیوں یہ عمل ڈاکٹر خالد محمود کو برا لگا اور انہوں نے سیاق و سباق سے ہٹ کر اس عبقری شخصیت کے اُجلے دامن کو داغ دار کرنے کی کوشش کی۔ محترم جج صاحب! وکیلِ استغاثہ کی شدید خواہش پر مَیں وہ خونی دھبے بھی دکھا دوں، جن سے مولانا احمد رضا کا دامن تو پاک ہے مگر علمائے دیوبند کی قبائیں اس خون میں ڈوبی ہوئی ہیں۔

ککڑی کی تلاش:۔

مولوی ظہور الحسن صاحب، مولوی اشرف علی صاحب کی تصدیق کے ساتھ تحریر فرماتے ہیں:

''خاں صاحب نے فرمایا کہ مولانا (محمد قاسم) نانوتوی جب مرضِ وفات میں مبتلاء ہوئے کہ کہیں سے ککڑی لاؤ۔ مولوی محمود الحسن صاحب فرماتے تھے کہ تمام کھیتوں میں پھرا مگر صرف ایک ککڑی چھوٹی سی ملی۔ اس کی خبر کسی ذریعہ سے لکھنؤ مولوی عبدالحیٔ صاحب فرنگی محلی کو ہوگئی کہ مولانا نانوتوی کا جی ککڑی کو چاہتا ہے۔ اس پر مولوی عبدالحیٔ صاحب نے لکھنؤ سے مولانا (نانوتوی) کی خدمت میں بذریعہ ریلوے ککڑیاں بھیجیں اور چند مرتبہ بھیجیں۔''

(ارواح ثلثہ۔ حکایت نمبر ۲۲۴۔ ص ۲۲۶۔ کتب خانہ امدادیہ سہارنپور)

سردے کے لیے بے چین:۔

اور لیجیے یہ ہیں شیخ الاسلام دارالعلوم دیوبند مولوی حسین احمد۔ ان کے متعلق ''شیخ الاسلام نمبر'' یوں رقم طراز ہے: ''کچھ عجیب اتفاق ہے کہ عموماً تمام مشائخ (دیوبند) اور خصوصاً مولانا محمد قاسم نے آخر وقت میں پھل کی خواہش کا اظہار فرمایا۔ چنانچہ مولانا محمد قاسم کے لیے لکھنؤ سے ککڑی منگائی گئی۔ حضرت حسین احمد مدنی نے بھی آخری وقت میں سردے کی خواہش کا اظہار فرمایا۔ اور منجانب اللہ اسلاف کی سنت پر طبیعت اس درجہ مجبور ہوئی کہ مولانا قاسم صاحب اور شاہد صاحب فاخری ملاقات کو تشریف لائے تو فرمایا کہیے کیا آج کل سردا نہیں مل سکتا؟ انہوں نے فرمایا ضرور مل جائے گا۔ (چونکہ اس سے قبل مولانا اسعد صاحب، مولانا فرید الوحیدی صاحب وغیرہ نے دہلی، سہارنپور، میرٹھ ہر جگہ تلاش کیا مگر کہیں دستیاب نہ ہوا) اس لیے حضرت نے فرمایا کہاں مل سکتا ہے؟ مولانا وحید الدین صاحب قاسمی نے عرض کی ان شاء اللہ دہلی میں مل جائے گا۔ مولانا شاہد صاحب نے عرض کیا جی ہاں! تلاش کے بعد

بہت امید ہے کہ مل جائے گا اور یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ حضرت نانوتوی کے لیے لکھنؤ سے لکڑی منگائی گئی تھی تو حضرت (حسین احمد) کے لیے مولانا سجاد حسین کی معرفت کراچی سے اور مولانا حامد میاں صاحب نے لاہور سے سردا بھیجا۔" (شیخ الاسلام نمبر، ص ۱۱۴۔ کالم ۲۔۳)

مرتے وقت چندہ مانگنا:۔

اور لیجیے! یہ آپ کے حکیم الامت مولوی اشرف علی صاحب تھانوی مرتے وقت اپنی اہلیہ کے لیے امداد مانگ رہے ہیں اور وصیت فرما رہے ہیں کہ: "میرے بعد بھی میرے تعلق کا لحاظ غالب ہو۔ وصیت کرتا ہوں کہ بیس (۲۰) آدمی مل کر اگر ایک ایک روپیہ ماہوار ان (بیوی صاحبہ) کے لیے اپنے ذمہ رکھ لیں تو اُمید ہے کہ ان کو تکلیف نہ ہوگی۔" (تنبیہاتِ وصیت، ص۲)

وکیلِ استغاثہ: جناب جج صاحب! مولانا احمد رضا خاں صاحب کو وکیلِ صفائی کے اس مختصر بیان پر اس الزام سے بری نہیں کر سکتے۔

جج (وکیلِ استغاثہ سے): کیا آپ مزید کوئی اعتراض داخل کرنا چاہتے ہیں۔

وکیلِ استغاثہ: جی ہاں! جج صاحب۔ مَیں کچھ اور اعتراض بھی داخل کرنا چاہتا ہوں۔

جج: اجازت ہے۔

وکیلِ استغاثہ: جنابِ والا! عورت کسی بھی قوم کے لیے ایک سرمایہ ہوتی ہے۔ قوم کا ایک حساس ادارہ ہوتی ہے، جس سے ملت کا مستقبل وابستہ ہوتا ہے۔ مولانا احمد رضا خاں بجائے اس کے، اس عورت کو اسلام کی تعلیمات کے مطابق چادر اور چار دیواری کا تحفظ فراہم کرتے، اسلامی تعلیمات کے مطابق اس کو تحفظ دیتے، اُسے مزارات پر حاضری دینے والی کنیز بنا دیا جو اپنے بچوں کو سنبھالے گرتی پڑتی، سات جمعراتیں پوری کرنے آرہی ہے۔ مگر مولانا احمد رضا مجاور کے گھر کی چاندنی کروانے اور ملتِ اسلامیہ کے مستقبل کو تاریک کرنے اور قوم کے اس ادارے کو تباہی کی جانب مائل کرنے میں مصروفِ عمل ہیں۔

وکیلِ صفائی: (وکیلِ استغاثہ کی جانب دیکھتے ہوئے): وکیلِ استغاثہ کا وہی بے سود تجسس، وہی بے کار سوال، وہی ذہنی مفلسی میں نکلا ہوا بے تکا اعتراض۔ جناب جج صاحب! وکیلِ استغاثہ اعتراض در اعتراض کے چنگل میں پھنس کر ذہنی طور پر دیوالیہ ہو چکے ہیں۔

وکیلِ استغاثہ: جناب جج صاحب! وکیلِ صفائی مجھ پر لفظوں کے تیر برسانے کے بجائے اپنے موکل کا دفاع کرنے میں یہ لفظوں کا خزانہ خرچ کر دیں تو زیادہ مفید ہوگا۔

وکیلِ صفائی: جنابِ والا! مَیں اس عدالت میں یہ درخواست کرنا چاہوں گا کہ وکیلِ استغاثہ اس اعتراض پر عدالت کے سامنے دلیل پیش کریں

وکیلِ استغاثہ: جناب والا! بجائے اس کے کہ مَیں اس عدالت میں تحریری یا لفظی ثبوت پیش کروں، مَیں مولانا احمد رضا کے عملی پیروکاروں کو اس ثبوت کے طور پر پیش کرتا ہوں اور آپ پاک وہند کے کسی بھی شہر میں، کسی بھی قصبے میں اور کسی بھی دیہات میں تشریف لے جایئے، آپ کو یہ بریلوی حضرات، مزاروں کو چومتے، ان کی عورتیں مزارات کی زیارت اوران کے مرد دھمال کھیلتے نظر آئیں گے۔ قوالی کی محفل میں رقص وسرود کرتے نظر آئیں گے، تعزیہ نکالنا اس قوم کا شعار ہے۔

وکیلِ صفائی: جناب والا! وکیلِ استغاثہ کی یہ دلیل اتنی بے ہودہ ہے کہ اس کو دیوار پر مار دینے کا دل چاہتا ہے۔ ان کی اس دلیل سے نہ صرف اس عدالت کا تقدس پامال ہوا بلکہ علم و دانش پر جہالت کی کیچڑ بھی اُچھالی گئی۔

جناب والا! یہودیوں کا کردار آپ کے سامنے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں فرعون سے نجات دی اور ابھی یہ دریائے نیل سے نکلے ہی تھے اور پانی سے ان کے پاؤں خشک بھی نہ ہونے پائے تھے کہ انہوں نے ایک قوم کو دیکھا جو کسی بت کی پرستش میں مصروف عمل تھی۔ تو موسیٰ علیہ السلام سے کہنے لگے کہ ہمیں بھی ایک ایسا ہی بت بنادو۔ اور جناب جج صاحب! کیا بنی اسرائیل میں سامری نے بچھڑا نہیں بنایا اور کیا یہودیوں نے اس کی پرستش نہیں کی؟ کیا کوئی مسلمان یا اہلِ حق اس کا الزام موسیٰ علیہ السلام پر عائد کرنے کی جرأتِ فاسدہ کرسکتا ہے؟

جواب سادہ سا ہے، جی نہیں۔ مگر باوجود اس کے کہ وکیلِ استغاثہ دلیل دینے میں مکمل طور پر ناکام ہوچکے ہیں۔ مَیں اہلِ عقل و دانش کی عدالت میں اس جھوٹے اور بے ہودہ اعتراض کی دھجیاں بکھیرنا چاہوں گا۔

جناب والا! مولانا احمد رضا خاں ہی وہ عظیم شخصیت ہیں، جنہوں نے بلادِ ہند میں ٹوٹی ہوئی چٹائی پر بیٹھ کر نہ صرف ملت کے مستقبل کو محفوظ کیا بلکہ عورت کو چادر اور چار دیواری کا تحفظ بھی عطا کیا۔ اعلیٰ حضرت سے سوال کیا گیا کہ حضور اجمیر شریف میں خواجہ کے مزار پر عورتوں کا جانا جائز ہے یا نہیں؟ تو جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں: ''یہ نہ پوچھو کہ عورتوں کا مزارات پر جانا جائز ہے یا نہیں بلکہ یہ پوچھو کہ اس عورت پر کس قدر لعنت ہوتی ہے اللہ کی طرف سے اور کس قدر صاحب قبر کی جانب سے، جس وقت وہ گھر سے ارادہ کرتی ہے لعنت شروع ہوجاتی ہے اور جب تک واپس آتی ہے، ملائکہ لعنت کرتے رہتے ہیں۔ سوائے روضۂ انور کے کسی مزار پر جانے کی اجازت نہیں۔''

(امام احمد رضا اور ردّ بدعات و منکرات صفحہ ۴۸۴ مطبوعہ ادارہ تحقیقاتِ امام احمد رضا بحوالہ الملفوظ حصہ دوم صفحہ ۱۰۶، ۱۰۷)

جناب والا! وکیلِ استغاثہ نے حساس لفظوں کے استعمال سے مولانا احمد رضا پر کیچڑ اچھالی تھی ان کا دامن اس سے نہ صرف پاک اور اُجلا ہے بلکہ وہ ملّت کی بیٹیوں کی چادر اور چار دیواری کا تحفظ بھی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

وکیلِ استغاثہ نے مقدمہ کے دوران عدالتی قواعد وضوابط کو نظر انداز کرتے ہوئے چند اور اعتراض وارد کیے تاکہ وہ اپنے سابقہ الزام کو مضبوط کرسکیں مگر کچی مٹی کی چھت کو ریت کے ستون سہارا نہیں دے سکتے۔ مجھے یقین ہے کہ وکیلِ استغاثہ، مولانا احمد رضا پر عائد کردہ نئے اعتراضات پر حسب معمول دلائل دینے سے ہچکچائیں گے۔

اگرچہ مَیں قانونی اور اخلاقی طور پر اس سے آزاد ہوں کہ اگر وکیلِ استغاثہ عائد کردہ الزامات پر دلائل نہ دیں تو مَیں اُن الزامات کا جواب نہ دوں، مگر ملّت کی اس عبقری شخصیت پر عائد کردہ جھوٹے الزامات سے قوم کے ذہنوں کو آلودہ کرنے کی سازش کے تاروپود بکھیر کر آج کی اس عدالت کو ضرور آگاہ کرنا چاہوں گا کہ مولانا احمد رضا خاں ان تمام الزامات سے پاک ہیں۔

وکیلِ استغاثہ نے جو استغاثہ جمع کرایا، وہ صرف بغض وحسد کا پلندہ ہے، اس کے علاوہ اس کی کچھ حقیقت نہیں۔ مَیں اس عدالت سے درخواست کروں گا کہ وکیلِ استغاثہ کو تمام اعتراضات جمع کرانے کا حکم دیں۔

جج صاحب: کیا وکیلِ استغاثہ کچھ کہنا چاہتے ہیں؟

وکیلِ استغاثہ: جناب والا! وکیلِ صفائی کی تقریر اگرچہ میرے خلاف ہی جاتی ہے مگر میں اسے کھلے دل سے تسلیم کرتا ہوں، مگر چند اعتراضات اب بھی داخل ضرور کرانا چاہوں گا۔

(۱) کیا مولانا احمد رضا نے سجدۂ تعظیمی کو جائز نہیں ٹھہرایا؟ قبروں پر سجدہ، پیر کو سجدہ مولانا نے جائز نہیں ٹھہرایا۔

(۲) قوالی سے متعلق مولانا کا موقف واضح کریں گے کیا وکیلِ صفائی؟

(۳) ۱۰ رمحرم الحرام کو تعزیہ داری کی رسم کو فروغ دینے میں کیا مولانا کے کردار سے انکار کیا جاسکتا ہے؟

(۴) (i) بعض اہلِ سُنّت وجماعت عشرۂ محرم میں نہ تو دن بھر روٹی پکاتے اور نہ جھاڑو دیتے ہیں، کہتے ہیں کہ بعد دفن تعزیہ روٹی پکائی جائے گی۔

(ii) دس دن کپڑے نہیں اتارتے۔

(iii) ماہ محرم میں کوئی شادی بیاہ نہیں کرتے۔ ان ایام میں سوائے امام حسن وامام حسین کے کسی کی نیاز وفاتحہ نہیں دلاتے۔ اس پر مولانا احمد رضا نے کہیں منع نہ کیا۔

(5) طوافِ قبر پر مولانا کا موقف کیا ہے؟

وکیلِ صفائی: رسی جل گئی مگر بل نہیں گئے۔ (زیرِ لب مسکراتے ہوئے)

جنابِ والا! وکیلِ استغاثہ نے سچائی کو تسلیم کرلیا۔ میں ان کو مبارک باد پیش کرتا ہوں اور ساتھ میں یہ بھی کہوں گا کہ آنکھیں بند کرنے سے سورج غروب نہیں ہوجاتا، بلکہ اس کی کرنیں عالم میں اُجالا کرتی رہتی ہیں۔

وکیلِ استغاثہ نے مجھ سے سجدۂ تعظیمی کے بارے میں سوال کیا کہ کیا مولانا احمد رضا نے اس کو جائز نہیں ٹھہرایا...... یا اعتراض وارد کیا؟

جنابِ والا! مولانا احمد رضا نے اس مسئلے پر جو موقف اپنایا ہے، وہ درج ذیل ہے: ''مسلمان !اے مسلمان !____ اے شریعتِ مصطفوی کے تابع فرمان ____ جان اور یقین جان ____ کہ سجدہ حضرت عزت جلالہ کے سوا کسی کے لیے اس کے غیر کو سجدۂ عبادت تو یقیناً اجماعاً شرک مہین وکفر مبین ____ اور سجدۂ تحیت حرام و گناہ کبیرہ بالیقین۔

(امام احمد رضا اور ردّ بدعات و منکرات، صفحہ ۴۶۰ بحوالہ الزبدۃ الزکیہ لتحریم سجود التحیہ صفحہ ۵)

جنابِ والا! اس مسئلے پر الزبدۃ الذکیہ کے نام سے پورا رسالہ رقم کیا، مزید آگے فرماتے ہیں: ''قرآنِ عظیم نے ثابت فرمایا کہ سجدۂ تحیت ایسا سخت حرام ہے کہ مشابہ کفر ہے والعیاذ باللہ تعالیٰ، صحابہ کرام نے حضور ﷺ کو سجدۂ تحیت کی اجازت چاہی، اس پر ارشاد ہوا، کیا تمہیں کفر کا حکم دیں معلوم ہوا کہ سجدۂ تحیت ایسی قبیح چیز ہے جسے کفر سے تعبیر فرمایا۔ جب حضور اقدس ﷺ کے لیے سجدۂ تحیت کا یہ حکم ہے، پھر اَوروں کا کیا ذکر؟'' (ایضاً، صفحہ ۴۶۱)

عزت مآب جج صاحب! وکیلِ استغاثہ نے دوسرا الزام قوالی اور بھنگڑوں کا بھی عائد کیا۔ مولانا احمد رضا ان مزامیر اور بھنگڑوں کے بارے میں یوں ارشاد فرماتے ہیں: ''ایسی قوالی حرام ہے۔ حاضرین سب گناہگار ہیں اور ان سب کا گناہ ایسا عرس کرنے والوں اور قوالوں پر ہے۔ اور قوالوں کا بھی گناہ اس عرس کرنے والے پر بغیر اس کے عرس کرنے والے کے ماتھے قوالوں کا گناہ جانے سے قوالوں پر سے گناہ کی کچھ کمی آئے یا اس کے اور قوالوں کے ذمہ حاضرین کا وبال پڑنے سے حاضرین کے گناہ کی کچھ تخفیف ہو۔ نہیں، بلکہ حاضرین میں ہر ایک پر اپنا پورا گناہ اور قوالوں پر اپنا گناہ الگ اور قوالوں کے برابر جدا۔ اور سب حاضرین کے برابر علیحدہ۔ وجہ یہ کہ حاضرین کو عرس کرنے والے نے بلایا یا کسی کے لیے اس گناہ کا سامان پھیلایا اور قوالوں نے انہیں سنایا، اگر وہ سامان نہ کرتا یہ ڈھول سارنگی نہ سناتے تو حاضرین اس گناہ میں کیوں پڑتے۔ اس لیے ان سب کا گناہ ان دونوں پر ہوا پھر قوالوں کے اس گناہ

کا باعث وہ عرس کرنے والا ہوا وہ نہ کرتا، نہ بلاتا تو یہ کیونکر آتے بجاتے، لہٰذا قوالوں کا بھی گناہ اس بلانے والے پر ہوا۔ الخ (ردّ بدعات و منکرات ص ۲۷۷ بحوالہ احکام شریعت ص ۲۹)

جنابِ والا! تیسرا اعتراض وکیلِ استغاثہ نے یہ داخل کیا کہ کیا ۱۰ محرم الحرام کو تعزیہ داری کی رسم کو فروغ دینے میں مولانا احمد رضا کے کردار سے انکار کیا جاسکتا ہے۔

اس پر میں کہوں گا کہ اگر وکیلِ استغاثہ اور مخالفینِ مولانا احمد رضا نے اعلیٰ حضرت کی کتابوں کا مطالعہ کرلیا ہوتا تو ان اعتراضات کی جرأت و ہمت نہ کرتے اور یوں بہتان و الزام تراشی کا طوق اپنے گلوں میں نہ ڈالتے۔

تعزیہ داری سے متعلق مولانا احمد رضا کے پاس سوال آیا، آپ فرماتے ہیں: ''وہ جاہل خطاوار مجرم ہے مگر کافر نہ کہیں گے۔ تعزیہ آتا دیکھ کر اعتراض و روگردانی کریں۔ اس کی جانب دیکھنا ہی نہ چاہیے۔ اس کی ابتدا سنا جاتا ہے کہ امیر تیمور بادشاہ دہلی کے وقت سے ہوئی، واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔'' (عرفانِ شریعت حصہ اوّل صفحہ ۱۵ مطبوعہ سُنّی دارالاشاعت لائلپور)

ایک اور جگہ پر آپ سے سوال کیا گیا کہ تعزیہ داری میں لہو و لعب سمجھ کر جائے، تو کیسا ہے۔ جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں: ''نہیں جائے ناجائز کام ہے، جس طرح جان و مال سے مدد کرے، یونہی سواد بڑھا کر بھی مددگار ہوگا۔ ناجائز بات کا تماشہ دیکھنا بھی ناجائز ہے۔ بندر نچانا حرام ہے، اس کا تماشہ دیکھنا بھی حرام ہے۔''

(ملفوظاتِ اعلیٰ حضرت حصہ دوم صفحہ ۱۰۰ ناشر مدینہ پبلشنگ کمپنی کراچی)

جنابِ والا! فتاویٰ رضویہ جلد ۲۱ سے ایک آخری حوالہ پیش کرنا چاہوں گا۔ مولانا احمد رضا تعزیوں کے حوالے سے لکھتے ہیں: ''حاشا تعزیہ ہرگز اس کی نقل نہیں، نقل ہونا درکنار بنانے والوں کو نقل کا قصد بھی نہیں، ہر جگہ نئی تراش، نئی گھڑت جسے اس اصل سے نہ کچھ علاقہ، نہ نسبت۔ پھر کسی میں پریاں، کسی میں براق، کسی میں اور بے ہودہ طمطراق۔۔ پھر کوچہ بکوچہ۔۔ دشت بدشت۔۔ اشاعتِ غم کے لیے ان کا گشت۔۔ اور اس کے گرد سینہ زنی، ماتم سازی کی شورافگنی۔۔ حرام مرثیوں سے نوحہ کنی۔ عقل و نقل سے جتی چھنی۔۔ کوئی ان پھپچیوں کو جھک جھک کر سلام کر رہا ہے۔۔ کوئی مشغولِ طواف، کوئی سجدہ میں گرا ہے۔۔ کوئی اس مایۂ بدعات کو معاذ اللہ جلوہ گاہِ حضرت امام عالی مقام سمجھ کر اس ابرک پنی سے مرادیں مانگتا ہے، منتیں مانتا، عرضیاں باندھتا، حاجت روا جانتا ہے۔۔ پھر باقی تماشے، باجے تاشے، مردوں عورتوں کا راتوں کو میل اور طرح طرح کے بے ہودہ کھیل۔۔ ان سب پر طرہ ہیں۔ غرض عشرۂ محرم الحرام کہ اگلی شریعتوں سے اس شریعت پاک کا نہایت بابرکت و محلِ عبادت ٹھہرا ہوا تھا، ان بے

بیہودہ رسموں نے جاہلانہ اور فاسقانہ میلوں کا زمانہ کردیا، پھر وبال ابتداع کا وہ جوش ہوا کہ خیرات کو بھی بطور خیرات نہ رکھا۔ ریاء و تفاخر اعلانیہ ہوتا ہے، پھر وہ بھی یہ نہیں کہ سیدھی طرح محتاجوں کو دیں، بلکہ چھتوں پر بیٹھ کر پھینکیں گے۔۔ روٹیاں زمین پر گر رہی ہیں، رزقِ الٰہی کی بے ادبی ہوتی ہے، پیسے ریتے میں گر کر غائب ہوتے ہیں، مال کی اضاعت ہو رہی ہے، مگر نام تو ہوگیا کہ فلاں صاحب لنگر لٹا رہے ہیں۔ اب بہار عشرہ کے پھول کھلے، تاشے باجے، بجتے چلے...... طرح طرح کے کھیلوں کی دھوم، بازاری عورتوں کا ہر طرف ہجوم...... شہوانی میلوں کی پوری رسوم...... جشنِ فاسقانہ یہ کچھ، اور اس کے ساتھ خیال وہ کچھ، گویا یہ ساختہ ڈھانچہ بعینہا حضرات شہدائے کرام علیہم الرضوان کے پاک جنازے ہیں۔

اے مومنو! اٹھاؤ جنازہ حسین کا گاتے ہوئے مصنوعی کربلا پہنچے۔ وہاں کچھ نوچ اُتار۔ باقی توڑ تاڑ دفن کردیے۔ یہ ہر سال اضاعتِ مال کے جرم و وبال جداگانہ رہے۔ اللہ تعالیٰ صدقہ شہدائے کرام کربلا علیہم الرضوان والثنا کا مسلمانوں کو نیک توفیق بخشے اور بدعات سے توبہ دے۔ آمین آمین۔"

مزید لکھتے ہیں: "تعزیہ داری کہ اس طریقہ نامرضیہ کا نام ہے قطعاً بدعت و ناجائز و حرام ہے، ان خرافاتِ شیوع نے اس اصل مشروع کو بھی اب مخدور و محظور کردیا کہ اس میں اہلِ بدعت سے مشابہت اور تعزیہ داری کی تہمت کا خدشہ...... اور آئندہ اپنی اولاد یا اہلِ اعتقاد کے لیے ابتلائے بدعات کا اندیشہ ہے، جو چیز ممنوع تک پہنچائے، وہ ممنوع ہے۔"

(فتاویٰ رضویہ جلد ۲۱ صفحہ ۴۲۳،۴۲۴۔ مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن لاہور مئی ۲۰۰۲)

وکیلِ استغاثہ نے چوتھا اعتراض کچھ اس طرح سے کیا کہ

(۱) بعض اہلِ سُنّت و جماعت عشرۂ محرم میں نہ تو دن بھر روٹی پکاتے اور نہ جھاڑو دیتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ بعد دفن تعزیہ روٹی پکائی جائے گی۔

(۲) دس دن کپڑے نہیں اتارتے۔

(۳) ماہِ محرم میں کوئی شادی بیاہ نہیں کرتے۔ ان ایام میں سوائے امام حسن و امام حسین کے کسی کی نیاز و فاتحہ نہیں دلاتے۔ اس پر مولانا احمد رضا نے کہیں منع نہ کیا۔

جنابِ والا! دکھتی آنکھوں کو سورج برا لگتا ہے، آنکھیں بند کر کے روشنی کو اندھیرے سے تعبیر کرنا باطل کا ایک پرزور ہتھکنڈہ ہے۔ مَیں پوچھنا چاہوں گا وکیلِ استغاثہ سے، کیا انہوں نے مولانا کی تمام کتب کا مطالعہ کرلیا ہے جو وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ "مولانا احمد رضا نے کہیں منع نہ کیا"۔

جنابِ والا! اگر علم و دانش کی عدالتوں میں فکر و بصیرت کا لہو یوں ہی چھلکے گا تو مستقبل کا مؤرخ کیا کہہ کر پکارے گا۔ جنابِ والا! اگر تحقیق کے بغیر الزام تراشیوں کا یہ گھناؤنا کاروبار یونہی چلتا

رہا تو ملّتِ اسلامیہ کے گلشن میں پھولوں کے بجائے ببول اُگنے لگیں گے۔

اے عقل و دانش کی مسندوں پر تشریف فرما ہونے والے بزرگو! وکیلِ استغاثہ کے اعتراض کو ایک سائل نے بہت پہلے ایسے ہی پوچھا تھا، تو امام نے جواب دیا تھا کہ

''پہلی تین باتیں سوگ ہیں اور سوگ حرام ہے اور چوتھی بات جہالت ہے۔ ہر مہینے میں، ہر تاریخ میں، ہر دلی کی نیاز اور ہر مسلمان کی فاتحہ ہو سکتی ہے۔''

(احکامِ شریعت حصہ اوّل صفحہ ۷۶)

جناب والا! وقت کی کمی کے سبب ان مسائل پر سیر حاصل بحث نہ ہو سکی۔ اگرچہ حقیقت حال کی وضاحت کے لیے ایک دلیل ہی کافی ہے۔ مگر اہلِ علم و دانش کی تشنگی کے لیے فتاویٰ رضویہ کا مکمل سیٹ اور یٰسین اختر مصباحی صاحب کی کتاب امام احمد رضا اور ردّ بدعات و منکرات پیش کروں گا۔

وکیلِ استغاثہ: وکیلِ صفائی کو ابھی آخری اعتراض کا بھی جواب دینا ہے۔

وکیلِ صفائی: جی ہاں! وکیلِ استغاثہ کے الزامات میں سے آخری الزام یا مولانا احمد رضا کی بلند و بالا شخصیت پر کھینچی ہوئی کمان سے چھوڑا ہوا حسد و کینہ کا پست تیر۔ کہ طوافِ قبر سے متعلق مولانا احمد رضا کا موقف کیا ہے؟

جناب والا! مولانا کا موقف میں بیان کیے دیتا ہوں اور اگر وکیلِ استغاثہ نے اس مسئلے کو اپنے بزرگ و پیشوا اشرف علی تھانوی صاحب کی کتاب میں پڑھ لیا ہوتا تو اس الزام کی جراُت نہ کرتے۔

مولانا احمد رضا فرماتے ہیں: ''بلاشبہ غیر کعبہ معظمہ کا طوافِ تعظیمی ناجائز ہے اور غیر خدا کو سجدہ ہماری شریعت میں حرام ہے۔'' (احکامِ شریعت حصہ سوم صفحہ ۳)

وکیلِ استغاثہ کے علم میں اضافے کے لیے اشرف علی تھانوی صاحب کا یہ اقتباس بھی سناتا چلوں۔ حصولِ برکت کے لیے مزار کے گرد پھرنا تو وہابیوں اور دیوبندیوں کے یہاں بھی جائز ہے۔ اشرف علی تھانوی، شاہ ولی اللہ کے حوالے سے لکھتے ہیں: ''مولانا شاہ ولی اللہ صاحب کا ارشاد سو اس میں کچھ حجت نہیں کیونکہ یہ طواف اصطلاحی نہیں ہے جو تعظیم و تقرب کے لیے کیا جاتا ہے اور جس کی ممانعت نصوصِ شرعیہ سے ثابت ہے بلکہ طواف لغوی ہے۔ یعنی محض اس کے گرد پھرنا واسطے پیدا کرنے مناسبت روحی کے صاحبِ قبر کے ساتھ اور لینے فیوض کے بلا قصد تعظیم و تقرب کے اور وہ بھی عوام کے لیے نہیں، جن کو فرق و مراتب کی تمیز نہیں بلکہ اہلِ سُنّت کے لیے جو جامع ہوں درمیانِ شریعت و طریقت۔'' (حفظ الایمان ص ۶)

جج: دلائل و براہین کے بعد عدالت اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ مولانا احمد رضا نے باطل رسم و رواج کو نہ

صرف ختم کرنے کے لیے جہاد کیا بلکہ آپ نے بدعات کو مٹانے میں بھی ایک بہت واضح کردار ادا کیا جیسا کہ ان کی کتب سے بھی ظاہر ہے۔

عدالت برخواست ہوتی ہے۔

تیسرا مقدمہ

وکیلِ استغاثہ: جناب والا آج کی اس عدالت کو یقیناً اس بات کی حقیقت سے کوئی انکار نہ ہوگا کہ مولانا احمد رضا، بریلوی فرقے کے امام اور مسلمانوں کو وہابی، دیوبندی اور بریلوی میں تقسیم کرنے والے ایک مذہبی اسکالر تھے۔ اور بریلی وہ شہر تھا جہاں انہوں نے کفر کی مشین لگائی ہوئی تھی، جب چاہتے اور جسے چاہتے کافر بنادیتے تھے۔ وہ اتحاد بین المسلمین کے مخالف تھے۔

وکیلِ صفائی: جنابِ والا! آج کی اس عدالت میں، مَیں وکیلِ استغاثہ کے طرزِ بیان اور اندازِ تکلم پر احتجاج کرتے ہوئے کہنا چاہوں گا کہ اہلِ عقل و دانش کی عدالت میں وکیلِ استغاثہ تہذیب و شرافت کے دامن کو نہ چھوڑا کریں (حالانکہ انہوں نے کبھی پکڑا نہیں) اور عدالت میں مقدمے سے قبل ہی انہوں نے عدالت کے معزز ججوں کو لفظوں (اس عدالت کو یقیناً اس بات کی حقیقت سے کوئی انکار نہ ہوگا) سے خریدنے کی جو سنگین خطا کی ہے وہ توہینِ عدالت کے زمرے میں آتی ہے۔

وکیلِ استغاثہ: آج کا مقدمہ اتنا آسان نہیں جتنا وکیلِ صفائی سمجھ رہے ہیں۔ آج وکیلِ صفائی لفظوں کے دریا اور جملوں کی شوخیاں بہا کر حقیقت کی اس شمع کو گل نہ کرسکیں گے۔

وکیلِ صفائی: آج وکیلِ استغاثہ کے غرور کو دیکھ کر شیطان بھی سہم گیا ہوگا۔ اگر حقیقتاً ایسا ہی ہے تو دماغ کی میان سے دلائل کی تلوار نکال کر میدانِ عمل میں کود پڑیں اور اگر پچھلے دو مقدموں کا حشر یاد ہے تو مَیں انہیں مشورہ دوں گا کہ وہ اس سے گریز کریں۔

وکیلِ استغاثہ: وکیلِ صفائی تو دلائل کے حملوں سے قبل ہی گھبرا گئے۔

وکیلِ صفائی: اگر وکیلِ استغاثہ تکبر کی شراب پی کر اتنے مدہوش ہوچکے ہیں کہ انہیں پچھلے دو مقدموں کا حشر یاد نہیں تو وقت ضائع کیے بغیر دلائل اس عدالت کے سامنے پیش کرنا شروع کریں۔

وکیلِ استغاثہ: جناب جج صاحب! آج دلیل نہیں دلائل ہیں، آج حوالہ نہیں حوالہ جات ہیں۔ آج مقدمے میں لفظوں کی جنگ نہیں، حقیقت کا رنگ ہے۔

جنابِ والا: آج اگر مولانا احمد رضا کو فرقہ واریت کا نقیب کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ محترم جج صاحب! ڈاکٹر خالد محمود صاحب جو کہ ایک مایہ ناز اسکالر ہیں، وہ اپنی کتاب مطالعۂ بریلویت میں

مولانا احمد رضا کی نقاب کشائی کرتے ہوئے وصایا شریف کے حوالے سے لکھتے ہیں: ''بانس بریلی ہندستان کے ایک صوبہ یوپی کا ایک شہر ہے جہاں مولانا احمد رضا خاں پیدا ہوئے، انہوں نے ایک مذہب ترتیب دیا اور اپنے پیرودں کو اس پر چلنے کی وصیت کی۔ میرا دین و مذہب جو میری کتب سے ظاہر ہے اس پر مضبوطی سے قائم رہنا، ہر فرض سے اہم فرض ہے، اللہ توفیق دے''۔

(مطالعۂ بریلویت، صفحہ ۱۹ مطبوعہ دارالمعارف لاہور ۱۹۸۶ء)

مزید آگے لکھتے ہیں: ''جس شخص نے ایک نیا مذہب بنا رکھا ہو اور لوگوں کو برملا کہے میرے دین و مذہب پر قائم رہنا، ہر فرض سے اہم فرض ہے۔'' (مطالعۂ بریلویت، ص ۲۷)

اس روشن مثال کے بعد کیا کسی دلیل کی حاجت رہ جاتی ہے کہ مولانا نے اسلام کو فرقہ واریت کی تلوار سے پارہ پارہ کر ڈالا اور ایک نئے دین جو ان کی کتب سے ظاہر ہے کی پیروی کی وصیت کی۔

وکیلِ صفائی: جب اہلِ علم، علم و دانش کی عدالتوں میں علمی خیانت کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیں اور حقایق کی شکل مسخ کرنے کا مقدس فریضہ انجام دینے لگیں تو ان کے لیے یہی کہا جاسکتا ہے۔

وکیلِ صفائی: وکیلِ استغاثہ نے ڈاکٹر خالد محمود کا وصایا شریف کے حوالے سے جو اقتباس نقل کیا ہے، وہ ادھورا اور سیاق و سباق سے ہٹ کر ہے۔ اصل عبارت یوں ہے:

> ''حتی الامکان اتباعِ شریعت نہ چھوڑو اور میرا دین و مذہب جو میری کتب سے ظاہر ہے اس پر مضبوطی سے قائم رہنا ہر فرض سے اہم فرض ہے۔''

عقل و دانش کی اس عدالت میں تشریف فرما ہونے والے بزرگو! اعلیٰ حضرت نے تو ''میرا دین و مذہب'' سے پہلے ہی یہ فرمایا کہ ''حتیٰ الامکان اتباعِ شریعت نہ چھوڑو۔''

اگرچہ اس جملے سے وضاحت ہوجاتی ہے، لیکن مَیں مثال دے کر بات آگے بڑھاتا ہوں۔

جنابِ والا! قبر میں فرشتے یہ سوال کرتے ہیں ما دینکَ تیرا دین کیا ہے؟ تو مسلمان جواب دے گا ''میرا دین اسلام ہے'' مولانا احمد رضا نے بھی تو یہی فرمایا ''حتی الامکان اتباعِ شریعت کو نہ چھوڑنا اور میرا دین و مذہب جو میری کتب سے ظاہر ہے اس پر مضبوطی سے قائم رہنا، ہر فرض سے اہم فرض ہے۔''

مولانا احمد رضا کی کتب میں یہی تو ہے کہ ہر گمراہی اور الحاد سے دور رہو اور بے دین گمراہوں سے دور بھاگو۔ اسی وصایا شریف میں ہے: ''تم مصطفیٰ ﷺ کی بھولی بھالی بھیڑیں ہو، بھیڑیئے تمہارے چاروں طرف ہیں۔ یہ چاہتے ہیں کہ تمہیں بہکادیں، تمہیں فتنہ میں ڈال دیں، تمہیں اپنے ساتھ جہنم میں لے جائیں۔ ان سے بچو اور دور بھاگو، دیوبندی ہوئے، رافضی ہوئے، نیچری ہوئے،

قادیانی ہوئے، چکڑالوی ہوئے۔ غرض کتنے ہی فرقے ہوئے اور اب سب سے نئے گاندھوی ہوئے، جنہوں نے ان سب کو اپنے اندر لے لیا۔ یہ سب بھیڑیے ہیں، تمہارے ایمان کی تاک میں ہیں۔ ان کے حملوں سے اپنے ایمان بچاؤ۔'' (وصایا شریف، ص ۱۸ مطبوعہ مکتبہ اشرفیہ)

مزید مولانا احمد رضا اپنے اسلاف اہلِ سنّت و جماعت کی طرح عشقِ رسول اور محبتِ مصطفیٰ کا درس یوں دیتے نظر آتے ہیں: ''اللہ عزوجل و رسول اللہ ﷺ کی سچی محبت اور ان کی تعظیم اور ان کے دوستوں کی خدمت اور ان کی تکریم اور ان کے دشمنوں سے سچی عداوت۔ جس سے اللہ عزوجل و رسول اللہ ﷺ کی شان میں ادنیٰ توہین پاؤ۔ پھر وہ کیسا ہی پیارا کیوں نہ ہو فوراً اس سے جدا ہو جاؤ جس کو بارگاہِ رسالت ﷺ میں ذرا بھی گستاخ دیکھو پھر وہ تمہارا کیسا ہی بزرگ معظم کیوں نہ ہو اپنے اندر سے اسے دودھ میں سے مکھی کی طرح نکال کر پھینک دو۔'' (وصایا شریف، صفحہ ۱۸، ۱۹)

محترم جج صاحب! یہ عبارت بتا رہی ہے کہ عاشقِ رسول محبِ مصطفیٰ ﷺ ایسے ہی ہوا کرتے ہیں اور ایسے ہی مومنوں اور عاشقوں کے لیے قرآن یوں ارشاد فرماتا ہے:

"لَا تَجِدُ قَوْماً يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ يُوَادُّونَ مَنْ حَادَّ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ وَلَوْ كَانُوا آبَاءَهُمْ أَوْ أَبْنَاءَهُمْ أَوْ إِخْوَانَهُمْ أَوْ عَشِيرَتَهُمْ أُولٰئِكَ كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ الْإِيمَانَ وَأَيَّدَهُم بِرُوحٍ مِّنْهُ."

(سورہ مجادلہ، آیت ۲۲)

یعنی تم نہ پاؤ گے ان لوگوں کو جو یقین رکھتے ہیں اللہ اور پچھلے دن پر کہ دوستی کریں ان سے جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول سے مخالفت کی اگرچہ وہ ان کے باپ یا بیٹے یا بھائی یا کنبے والے ہوں، یہ ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان نقش فرمایا اور اپنے طرف کی روح سے مدد کی۔

وصایا شریف کا مضمون قرآن کریم کے عین مطابق ہے مجھے یقین ہے کہ وکیلِ استغاثہ مطمئن ہو گئے ہوں گے۔ لیکن وکیلِ استغاثہ اور ان کے یارِ غار ڈاکٹر خالد محمود کے لیے میں مزید دلائل دینے کی اجازت چاہتا ہوں۔

جج: اجازت ہے۔

وکیلِ صفائی: جنابِ والا! ابھی تک تو ہم نے حقیقتِ حال سے پردہ اُٹھایا تھا لیکن اب ہم اس الزام و بہتان تراشی کی حقیقت کا جائزہ وکیلِ استغاثہ اور ڈاکٹر خالد محمود کے اکابرین کی کتب سے لیں گے۔ اس سے قبل کہ مَیں اکابرینِ دیوبند کی کتب سے اس الزام کے رد میں حوالے پیش کروں۔ ایک ایسا حوالہ پیش کرنا چاہوں گا کہ جس کا جواب وکیلِ استغاثہ اور ڈاکٹر خالد محمود پر اُدھار رہے گا۔

وکیلِ استغاثہ کے اکابر مولانا رشید احمد گنگوہی نے بارہا یہ کہا: "اور بقسم کہتا ہوں کہ میں کچھ نہیں ہوں مگر اس زمانے میں ہدایت ونجات موقوف ہے میرے اتباع پر۔"

(تذکرۃ الرشید، جلد دوم ص ۱۷)

وکیلِ استغاثہ اس عبارت پر کیا کہیں گے۔ رسول اللہ ﷺ کی اتباع کا درس دینے کے بجائے اپنی اتباع کا حکم دے رہے ہیں اور ہدایت ونجات بھی اسی پر موقوف ہے۔ (انا للہ وانا الیہ راجعون)

محترم جج صاحب! مولانا احمد رضا کا مسلک وہی تھا جو علمائے بدایوں کا تھا، مولانا اسی فکر کی ترویج و اشاعت میں مصروفِ عمل رہے جو فکر شاہ عبدالحق محدث دہلوی اور شاہ ولی اللہ کی تھی اور مسلمانوں کی راہ سے جدا راہ نہ چلے۔

سلیمان ندوی صاحب جو اہلِ حدیث مکتب فکر کے حامل ہیں، لکھتے ہیں: "حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے بعد دو گروہ نمایاں ہوئے:

(۱) علمائے دیوبند اور مولانا سخاوت علی جونپوری وغیرہ، اس سلسلے میں توحیدِ خالص کے جذبہ کے ساتھ حنفیت کی تقلید کا رنگ نمایاں رہا۔

(۲) میاں نذیر حسین، اس سلسلے میں توحید خالص اور ردّ بدعت کے ساتھ فقہ حنفی کی تقلید کے بجائے براہِ راست کتب حدیث سے بقدر فہم استفادہ اور اس کے مطابق عمل کا جذبہ نمایاں ہوا اور اسی سلسلے کا نام اہلِ حدیث مشہور ہوا۔

ان دو کے علاوہ ایک تیسرا سلسلہ بھی تھا۔ تیسرا فریق وہ تھا جو شدت کے ساتھ اپنی روش پر قائم رہا اور اپنے آپ کو اھل السنۃ کہتا رہا، اس گروہ کے پیشوا زیادہ تر بریلی اور بدایوں کے علما تھے۔"

(حیاتِ شبلی، ص ۴۶/۴۴ کا انتخاب)

سلیمان ندوی صاحب کے اس بیان سے روزِ روشن کی طرح یہ بات عیاں ہوگئی کہ مولانا احمد رضا قدیم مذہب اہلِ سُنّت و جماعت کے پیروکار تھے۔ جبکہ وکیلِ استغاثہ اور ڈاکٹر خالد محمود جس مذہب کے پیروکار ہیں وہ نیا مذہب ہے اور ان کے اکابر مسلمانوں میں فرقہ واریت کے بیج کی نمو کرنے والے ہیں۔

وکیلِ استغاثہ: جنابِ والا! وکیلِ صفائی ایک نئے مقدمے کی فائل کھولنا شروع کر رہے ہیں۔

وکیلِ صفائی: آئینہ اُن کو دکھایا تو برا مان گئے۔ جنابِ والا! میں نہ نئے مقدمے کی فائل کھول رہا ہوں اور نہ ہی کسی پر کیچڑ اُچھال رہا ہوں، بلکہ حقیقت کی حقیقی معنوں میں تصویر دکھا رہا ہوں۔

مسلکِ اہلِ حدیث کے نمائندہ اور بڑے عالمِ دین ثناء اللہ صاحب امرتسری نے ۱۹۳۷ء میں

اپنی کتاب ''شمع توحید'' میں اسی حقیقت کو یوں نقل کیا ہے: ''امرتسر میں مسلم آبادی غیر مسلم آبادی (ہندو، سکھ وغیرہ) کے مساوی ہے اسی ۸۰ سال قبل پہلے سب مسلمان اسی خیال کے تھے جن کو بریلوی حنفی خیال کیا جاتا ہے''۔　(شمع توحید، ص ۴۰)

اور مشہور مورخ شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں: ''انہوں (مولانا احمد رضا) نے نہایت شدت سے قدیم حنفی طریقوں کی حمایت کی۔''　(موج کوثر، ص ۷۰ طبع ہفتم ۱۹۳۰ء)

ان دلائل سے ثابت ہوتا ہے کہ امام احمد رضا اسی مسلک کے پیروکار تھے جو شاہ عبدالحق محدث دہلوی کا تھا، جو خواجہ غریب نواز کا تھا، جو سلف صالحین کا تھا۔ مولانا احمد رضا خاں اتحاد بین المسلمین کے داعی تھے۔

وکیلِ استغاثہ: وکیلِ صفائی کے ذہن پر اگر گراں نہ گزرے اور وہ پریشان نہ ہوں تو اس عدالت میں مولانا کے کفر کے فتوؤں کی حقیقت کو بھی آشکار کریں۔ اور اس عدالت کو بتائیں کہ کیا مولانا احمد رضا نے علمائے دیوبند کو کافر قرار نہیں دیا۔ کیا اتحاد بین المسلمین کے داعی کا کردار ایسا ہی ہوتا ہے؟

وکیلِ صفائی: وکیلِ استغاثہ کے اعتراض سے قبل مَیں یہ ثابت کر چکا کہ مولانا احمد رضا نے کسی نئے مسلک کی بنیاد ہرگز ہرگز نہیں رکھی بلکہ ہمیشہ مذہب اہلِ سُنّت و جماعت کے داعی رہے۔ لیکن وکیلِ استغاثہ نے دوسرا سوال یہ چھیڑ دیا کہ کفر کے فتوے دیے، اس سے قبل کہ اس پر بحث کروں، مَیں اس عدالت سے درخواست کروں گا کہ دیوبند کی تاریخ بیان کرنے کی اجازت دی جائے۔

جج: اجازت ہے۔

وکیلِ صفائی: جنابِ والا! دارالعلوم دیوبند کے استاذ الحدیث مولانا انظر شاہ کشمیری ابن مولانا انور شاہ کشمیری رقم طراز ہیں: ''میرے نزدیک دیوبندیت خالص ولی اللّٰہی فکر بھی نہیں اور نہ کسی خانوادہ کی لگی بندھی فکر دولت و متاع ہے۔ میرا یقین ہے کہ اکابرِ دیوبند جن کی ابتدا میرے خیال میں سیدنا الامام مولانا قاسم صاحب اور فقیہ اکبر مولانا رشید احمد گنگوہی سے ہے۔ دیوبندیت کی ابتدا حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ سے کرنے کے بجائے مذکورہ بالا دو عظیم انسانوں سے کرتا ہوں۔''

(ماہ نامہ البلاغ مارچ ۱۹۶۹ء ص ۴۸)

جنابِ والا! وکیلِ استغاثہ کے گھر کی شہادت سے یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہوگئی کہ دیوبندی مذہب بالکل نیا مذہب ہے، جس کے بانی قاسم نانوتوی اور رشید احمد گنگوہی تھے۔ یہی وہ فرقہ ہے جو اہلِ سُنّت کی راہ سے جدا راہ چلا۔

جج! عدالت کا وقت ختم ہوا جاتا ہے اس پر آیندہ تاریخ پر بحث کی جائے گی۔

دوسرا سیشن

وکیلِ استغاثہ: جنابِ والا! کسی مسلمان کو دوسرے مسلمان کے لیے کافر کہنے کا کوئی حق حاصل نہیں، لیکن مولانا احمد رضا نے نہ صرف اپنے مسلک کے سوا ہر مسلک کو کافر اور خصوصاً مسلکِ دیوبند اور وہابیت کے اکابرین پر کفر کے فتوؤں کے گولے داغے۔ اگر مولانا دوسروں کو برداشت کر لیتے تو آج ملتِ اسلامیہ یوں ٹوٹ پھوٹ کا شکار نہ ہوتی اور فرقہ واریت کا عفریت یوں دنگل نہ مچاتا۔

وکیلِ صفائی: جنابِ والا! وکیلِ استغاثہ کے اس استغاثہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وکیلِ استغاثہ مولانا احمد رضا پر صرف الزام ہی نہیں لگا رہے بلکہ فردِ جرم بھی عائد کر رہے ہیں۔ آج کی اس عدالت میں، میں چند ایک تاریخی واقعات پیش کروں گا۔

محترم جج صاحب! مٹی، سیمنٹ، بجری وغیرہ کا ملاپ عمارت کی تشکیل دیتا ہے لیکن یہ عمارت، یہ مٹی نہ تو معتبر ہوتی ہے اور نہ مقدس لیکن اگر یہی عمارت مسجد کی شکل اختیار کر لے تو انتہائی مقدس ہو جاتی ہے، خانۂ خدا قرار پاتی ہے۔ انسان ادب و احترام کے تمام قوانین بجا لاتا ہے اور توحید کے ڈنکے بجانے لگتا ہے۔

لیکن جنابِ والا! تاریخ کے صفحات کو اُلٹ دیجیے، آپ دیکھیں گے اللہ کا نام لے کر بنائی جانے والی مسجد کو، توحید کے (نام نہاد) ڈنکے بجانے والی عمارت کو ڈھایا گیا۔ واقعہ ہے عہد نبوی کا اور اس عمارت کا نام ہے مسجد ضرار مگر اس عمارت کو ڈھایا گیا۔

ایک انجان آدمی یہ سوال کرنے میں حق بجانب ہے کہ کیا اس عمارت میں لات و ہبل کی مورتیاں رکھی ہوئی تھیں؟

کیا اس مسجدِ ضرار میں خدا کے بجائے بتوں کی عبادت ہوتی تھی؟
کیا یہاں پر نماز کے بجائے لات و ہبل کی پوجا ہو رہی تھی؟
تو تاریخ جواب دیتی ہے۔ نہیں، ایسا نہیں تھا۔

تو پھر اس مسجد کو ڈھا کیوں دیا گیا؟ اس عمارت کے تقدس میں شبہ کیا تھا، یہ بھی اسی مٹی سے تشکیل دی گئی تھی جس مٹی سے دیگر مساجد معرضِ وجود میں آئیں۔

تو تاریخ جواب دیتی ہے کہ یہ سچ ہے کہ اس کی تعمیر اسی مٹی سے ہوئی تھی جس مٹی سے اور دیگر مساجد کی تعمیر ہوئیں۔ مگر یہاں وہ خلوص نہیں تھا جو مسجد کی تعمیر میں ہوتا، بلکہ یہ مسجد کے نام پر اسلام کی بنیادوں کو کھوکھلا کرنے کی منافقین کی وہ سازش تھی جس کو اللہ کے رسول ﷺ نے ڈھانے کا حکم دیا۔ یہ مسجد کے نام پر مسلمانوں میں انتشار پیدا کرنے کا وہ مرکز تھا جہاں سے افتراق و انتشار کے طوفان اُٹھنے والے تھے۔ لہٰذا اس مسجد کو ڈھانے کا حکم دیا گیا۔ اور اس کی جگہ کو کوڑے کا ڈھیر بنا دیا گیا۔ اور

اسے قرآن نے یوں بیان کیا:

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِداً ضِرَاراً وَّكُفْراً وَّتَفْرِيْقاً بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَإِرْصَاداً لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ وَلَيَحْلِفُنَّ إِنْ أَرَدْنَا إِلَّا الْحُسْنٰى وَاللّٰهُ يَشْهَدُ إِنَّهُمْ لَكَاذِبُوْنَ لَا تَقُمْ فِيْهِ أَبَداً

اور وہ لوگ جنہوں نے ایک مسجد بنائی تاکہ مسلمانوں کو ضرر پہنچائیں اور وہاں سے کفر پھیلائیں اور مسلمانوں میں پھوٹ ڈالیں اور اس شخص کے واسطے اسے کمین گاہ بنائیں جو پہلے سے خدا و رسول سے لڑ رہا ہے وہ قسم کھا کر یقین دلائیں گے کہ مسجد کی تعمیر سے ان کا مقصد سوائے بھلائی اور کچھ نہیں ہے اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ وہ جھوٹے ہیں آپ ہرگز ان کی مسجد میں نہ جائیں۔

(پارہ ۱۱، سورہ توبہ آیت ۱۰۷)

جنابِ والا! بالکل اسی طرح انسان بھی مٹی سے تخلیق ہوا اور یہی مٹی علم و فضل کے وصف سے متصف ہوجاتی ہے تو علامہ، حکیم الامت، عالمِ دین، شیخ الحدیث، مفسرِ قرآن جیسے مقدس القاب سے ملقب ہوجاتی ہے۔ پھر ان کی تعظیم و تکریم کی جاتی ہے بسبب نائب رسول، بسبب علم و فضل، بسبب مفسرِ قرآن، بسبب شیخ الحدیث۔

لیکن جب یہی حاملین دین و ایمان، محراب و منبر کے تقدس کو پامال کرنے لگیں، علم و فضل کی مسندوں پر بیٹھ کر مسلمانوں کے نظریات کو کچلنے لگیں، تو عالمِ دین نہیں علماے سوء قرار پاتے ہیں اور پھر ان کو ڈھانے کے لیے کہیں شیرِ خدا کسی خارجی کے ہاتھوں جامِ شہادت نوش کرتے ہیں، تو کہیں حسین ابن علی کربلا کے میدان میں یزیدیت کو فاش شکست دیتے ہوئے پیامِ اجل کو لبیک کہتے ہیں، تو کہیں برصغیر کے میدان میں شیخ سرہندی، اکبر کے درباری علما کے خلاف علمی و عملی جہاد کرتے نظر آتے ہیں۔

اور جب یہی مٹی کے تودے علم و فضل کی قباؤں اور عماموں کو پیچ در پیچ لپیٹے انگریزوں کے وفادار، ملتِ اسلامیہ کے نظریات پر شب خون مارتے نظر آتے ہیں تو مولانا احمد رضا، علماے حرمین شریفین کی حمایت کے ساتھ ان مٹی کے تودوں کو جو علم و فضل کی قبائیں پہنے ہیں، ڈھاتے نظر آتے ہیں۔

وکیلِ استغاثہ: بہت خوب، مَیں وکیلِ صفائی کو اس شاندار تقریر پر داد دیتا ہوں۔ اگر ایسا ہی ہے جیسا کہ وکیلِ صفائی نے اپنی طویل تقریر میں کہا تو سارے دیوبندی مکتب فکر کو کفر کی مشین تلے کیوں پیس دیا گیا؟ سارے مسلک کو کافر کیوں قرار دیا گیا؟

وکیلِ صفائی: جنابِ والا! وکیلِ استغاثہ نے ابھی جو کچھ کہا وہ جنون میں عقل کا جنازہ تو کہا جاسکتا ہے مگر سچائی کا تقاضا نہیں۔ اگر ایسا ہی ہے تو وکیلِ استغاثہ بتائیں کہ کب اور کہاں مولانا نے پوری ملتِ دیوبندیہ کو کافر کہا ہے؟ مولانا نے کب اور کہاں سارے مسلک کے لوگوں کو کافر قرار دیا؟

جناب والا! وکیلِ استغاثہ ہی بتائیں کہ کیا گستاخ رسول کافر ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو اس کو مسلمان جاننے والا کون ہوگا؟ یہ قانون نہ تو مولانا احمد رضا نے ایجاد کیا ہے اور نہ ہی یہ اُن کی اختراع ہے۔ یہ اصول وقواعد تو ہمیں رسول اللہ ﷺ نے دیے اور سلف صالحین نے قرناً بعد قرن اور نسلاً بعد نسلِ دار ورسن کے پھندوں کو چومتے ہوئے ہم تک پہنچائے۔ مولانا احمد رضا خاں کفر کا فتویٰ لگانے میں مسلمان سلف صالحین کی طرح نہایت محتاط تھے۔

وکیلِ استغاثہ: مجھے وکیلِ صفائی کے اس بیان پر کہ مولانا احمد رضا کفر کے فتویٰ لگانے میں بہت محتاط تھے، اعتراض ہے۔ مَیں اپنی بات نہیں کرتا، ڈاکٹر خالد محمود لکھتے ہیں: ''مولانا احمد رضا خاں مسلمانوں کی تکفیر میں واقعی بہت جری تھے۔ وہابی اور دیوبندی تو ایک طرف رہے، جو شخص ان میں سے نہ ہو لیکن انہیں کافر بھی نہ سمجھتا ہو مولانا احمد رضا خاں اسے بھی معاف نہیں کرتے۔ جو شخص ان حضرات کے کفر میں شک بھی رکھتا ہو اس کے بارے میں مولانا احمد رضا خاں کا فتویٰ درج ذیل ہے، اس فتویٰ میں تکفیر کے بجائے تفریق کا پہلو زیادہ غالب نظر آرہا ہے۔ یہ انداز مولانا احمد رضا خاں کے مقصد درونِ خانہ کا پتہ دیتا ہے۔ ہندستان میں انگریز حکومت یہ چاہتی تھی کہ مسلمان کہیں اکٹھے نہ بیٹھ سکیں۔ تکفیر اسی منزلِ تفریق کا ایک زینہ ہے۔'' (مطالعۂ بریلویت، ص ۹۷)

وکیلِ صفائی: جس طرح انگوروں کو سڑا کر اُم الخبائث تیار کی جاتی ہے اور اس سے بو آتی ہے۔ اسی طرح جب دماغ کی ہانڈی میں کتابی علم، بغض وحسد کی آتش میں پکنے لگتا ہے تو اس سے بھی ایسا ہی تعفن اُٹھتا ہے، جیسا کہ خالد محمود کی مذکورہ بالا عبارت سے اُٹھ رہا ہے۔

بجائے اس کے کہ ڈاکٹر خالد محمود مسلمانوں کو جوڑنے کے لیے اتحاد بین المسلمین کی حمایت میں کوئی کتاب رقم کرتے، انہوں نے انتشار کی آتش برپا کرنے کے لیے دیانت کا خون اور علمی خیانت کی علم برداری کرتے ہوئے ''مطالعۂ بریلویت'' لکھ ڈالی۔ اندازوں اور تخمینوں کی بنیاد پر الزام تراشیوں کا دیوان ترتیب دے کر اپنا نامۂ اعمال سیاہ کر ڈالا۔

جناب والا! وکیلِ استغاثہ کے معاون و مددگار جناب ڈاکٹر خالد محمود صاحب کی عبارت پر مَیں کیا تبصرہ کروں؛ ڈاکٹر خالد محمود ہی کے گھر سے اس عدالت کو دلیل فراہم کردیتا ہوں۔ جناب جج صاحب! دیوبند کے مشہور ومعروف اسکالر شبیر احمد عثمانی صاحب رقم طراز ہیں: ''مولانا احمد رضا خاں کو تکفیر کے جرم میں بُرا کہنا بہت ہی برا ہے کیونکہ وہ بہت ہی بڑے عالم دین اور بلند پایا محقق تھے۔ مولانا احمد رضا خاں کی رحلت عالم اسلام کا ایک بہت بڑا سانحہ ہے، جسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔''

(ھادی دیوبند، ص ۲۱ ذوالحجہ ۱۳۶۹ھ)

جناب جج صاحب! مولانا احمد رضا خاں نے اپنی زندگی میں صرف پانچ افراد پر لگے ہوئے کفر کے فتوے کی تصدیق کی اور حقیقتاً وہ فتویٰ مولانا احمد رضا خاں کا نہیں علماے حرمین شریفین کا تھا۔ مولانا احمد رضا اس قدر محتاط تھے کہ انہوں نے پہلے (علماے دیوبند کی گستاخانہ عبارتوں پر) حرمین شریفین کے مفتیانِ کرام سے فتوے منگوائے، پھر اس کی تصدیق فرمائی۔

وہ گستاخانہ عبارتیں کیا تھیں؟ میں دل پر پتھر رکھ کر چند ایک نقل کر دیتا ہوں۔ چاول کے چند دانے دیکھ کر دیگ کا اندازہ لگانا، اہلِ عقل کے لیے کچھ بھی مشکل نہ ہوگا۔

رشید احمد گنگوہی نے انگریز کی ایما پر کس طرح اسلامی نظریات پر شب خون مارا، اس کی صرف ایک ہی مثال کافی ہے۔ لکھتے ہیں: ''شیطان و ملک الموت کا حال دیکھ کر عالم محیط زمین کا فخرِ عالم کو خلافِ نصوصِ قطعیہ کے بلادلیل محض قیاسِ فاسدہ سے ثابت کرنا شرک نہیں تو کون سا ایمان کا حصہ ہے۔ شیطان و ملک الموت کو یہ وسعت نص سے ثابت ہوئی فخر عالم (ﷺ) کے وسعتِ علم کی کون سی نصِ قطعی ہے کہ جس سے تمام نصوص رد کر کے ایک شرک ثابت کرتا ہے۔'' (براہین قاطعہ، صفحہ ۵۱)

اشرف علی تھانوی صاحب رقم طراز ہیں: ''پھر یہ کہ آپ کی ذاتِ مقدسہ پر علمِ غیب کا حکم کیا جانا اگر بقول زید صحیح ہو تو دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس غیب سے مراد بعض غیب ہیں یا کل غیب، اگر بعض علومِ غیبیہ مراد ہیں تو اس میں حضور ہی کی کیا تخصیص ہے، ایسا علمِ غیب تو زید و عمر بلکہ ہر صبی و مجنون بلکہ جمیع حیوانات و بہائم کے لیے بھی حاصل ہے۔'' (حفظ الایمان، ص ۷)

جنابِ والا! مولانا احمد رضا خاں نے پانچ افراد کی تکفیر فرمائی جس پر پاک و ہند اور حرمین شریفین کے علما کی تصدیق بھی موجود ہیں اور وہ ''الصورام الہندیہ'' اور ''حسام الحرمین'' کے نام سے موسوم ہیں۔ اور ان پانچ افراد کے نام درج ذیل ہیں: (۱) مرزا غلام احمد قادیانی (۲) رشید احمد گنگوہی (۳) قاسم نانوتوی (۴) خلیل احمد انبیٹھوی (۵) اشرف علی تھانوی۔

جناب جج صاحب! یہ تصدیقات وکیلِ استغاثہ کے چھوٹے سے ذہن میں سما نہ سکیں گی، لہٰذا میں ان کو اُن کے گھر سے ایک اور دلیل فراہم کر دیتا ہوں۔

دار العلوم دیوبند کے مشہور عالم مولانا مرتضیٰ حسن صاحب، مولانا احمد رضا خاں صاحب کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں: ''اگر خاں صاحب کے نزدیک بعض علماے دیوبند واقعی ایسے ہی تھے جیسا کہ انہوں نے سمجھا تو خاں صاحب پر ان علماے دیوبند کی تکفیر فرض تھی، اگر وہ ان کو کافر نہ کہتے، تو خود کافر ہو جاتے۔'' (اشد العذاب، ص ۱۳۔ مطبوعہ دار العلوم دیوبند)

جنابِ والا! اگر علماے دیوبند کی وہ عبارتیں جن پر کفر کا فتویٰ لگایا گیا، کفریہ نہ ہوتیں تو مرتضیٰ حسن صاحب یوں تحریر نہ فرماتے، بلکہ یوں لکھتے۔ اگر خاں صاحب کے نزدیک بعض علماے دیوبند

ایسے ہی تھے جیسا کہ انہوں نے سمجھا اور وہ ایسے نہ تھے بلکہ واقعی مسلمان تھے تو مسلمان کی تکفیر کر کے وہ خود کافر ہو گئے۔ لیکن مرتضیٰ حسن صاحب نے ایسا نہیں لکھا۔ بلکہ یہ لکھا کہ 'خان صاحب پر علمائے دیوبند کی تکفیر فرض تھی اگر وہ ان کو کافر نہ کہتے تو خود کافر ہو جاتے۔'

وکیلِ استغاثہ ''المہند'' کی یہ عبارت ملاحظہ فرمائیں: ''ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ نبی کریم علیہ السلام کا علم، حکم و اسرار وغیرہ کے متعلق مطلقاً تمامی مخلوقات سے زیادہ ہے اور ہمارا یقین ہے کہ جو شخص یہ کہے کہ فلاں شخص نبی کریم ﷺ سے اعلم ہے، وہ کافر ہے۔ اور ہمارے حضرات اس شخص کے کافر ہونے کا فتویٰ دے چکے ہیں جو یوں کہے کہ شیطان ملعون کا علم نبی کریم علیہ السلام سے زیادہ ہے، پھر بھلا ہماری کسی تصنیف میں یہ مسئلہ کیا پایا جا سکتا ہے۔'' (المہند، ص ۲۵، ۲۶ از خلیل احمد انبیٹھوی)

اور ''براہین قاطعہ'' میں یہی خلیل احمد لکھتے ہیں: ''الحاصل غور کرنا چاہیے کہ شیطان ملک الموت کا یہ حال دیکھ کر عالمِ محیط زمین کا فخر عالم کو خلافِ نصوص قطعیہ کے بلا دلیل محض قیاسِ فاسدہ سے ثابت کرنا شرک نہیں تو کون سا ایمان کا حصہ ہے۔ شیطان و ملک الموت کو یہ وسعت نص سے ثابت ہوئی، فخر عالم کی وسعتِ علم کی کونسی نص قطعی ہے کہ جس سے تمام نصوص کو رد کر کے ایک شرک ثابت کرتا ہے۔''
(براہینِ قاطعہ، ص ۵۱، از خلیل احمد انبیٹھوی)

مذکورہ بالا دونوں عبارتیں عدالت کے معزز ججوں نے ملاحظہ کیں۔ کیا منافقین کا طرزِ عمل یہ نہیں تھا؟ تھا، بالکل یہی تھا۔ مسلمانوں کو دھوکا دینے کے لیے کچھ اور پیچھے کچھ۔

'المہند' کی مذکورہ بالا عبارت سے واضح ہوتا ہے کہ علمائے حرمین شریفین اور مولانا احمد رضا کا فتویٰ حق اور درست تھا۔ جناب والا! میں نے یہ ایک مثال پیش کی ہے، اسی طرح کئی مثالیں ایسی موجود ہیں۔

محترم جج صاحب! ڈاکٹر خالد محمود وہ شخصیت ہیں جن کو ملتِ اسلامیہ میں رہنے والا امن و سکون، بھائی چارہ، محبت ایک آنکھ نہیں بھاتی اور اُمت کو فرقہ واریت کی بھٹی میں جھونکنے کے لیے وہ اور ان جیسے دانا دشمن یا نادان دوست ''مطالعۂ بریلویت'' جیسی کتب لکھتے رہتے ہیں۔

مولانا احمد رضا خاں صاحب کے بارے میں دیوبند کے عالم سید سلیمان ندوی صاحب اس طرح اظہارِ خیال فرماتے ہیں: ''اس احقر نے جناب مولانا احمد رضا خان بریلوی مرحوم کی چند ایک کتابیں دیکھیں تو میری آنکھیں خیرہ ہو کر رہ گئیں۔ حیران تھا کہ واقعی مولانا بریلوی صاحب مرحوم کی ہیں جن کے متعلق کل تک یہ سنا تھا کہ وہ صرف اہلِ بدعت کے ترجمان ہیں اور صرف چند فروعی مسائل تک محدود ہیں۔ مگر آج پتہ چلا کہ نہیں ہرگز نہیں یہ اہل بدعت کے نقیب نہیں بلکہ یہ عالم اسلام کے اسکالر اور شاہ کار نظر آتے ہیں۔ جس قدر مولانا احمد رضا خاں مرحوم کی تحریروں میں گہرائی پائی جاتی ہے،

اس قدر گہرائی تو میرے استاد مکرم جناب مولانا شبلی نعمانی صاحب و حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی اور حضرت مولانا محمود الحسن صاحب دیوبندی و حضرت مولانا شیخ التفسیر علامہ شبیر احمد عثمانی کی کتابوں کے اندر بھی نہیں ہے۔ جس قدر مولانا بریلوی کی تحریروں کے اندر ہے۔"

(ماہ نامہ ندوہ۔ ص ۱۷ ار اگست ۱۹۱۳ء)

محترم جج صاحب! سید سلیمان ندوی صاحب کے استاد محترم اتحاد بین المسلمین کے داعی مولانا احمد رضا خاں صاحب کو یوں خراج تحسین پیش کرتے ہیں: "مولوی احمد رضا خاں صاحب بریلوی جو اپنے عقائد میں سخت ہی متشدد ہیں، مگر اس کے باوجود مولوی صاحب کا علمی شجرہ اس قدر بلند درجہ کا ہے کہ اس دور کے تمام عالمِ دین اس مولوی احمد رضا صاحب کے سامنے پرکاہ کی بھی حیثیت نہیں رکھتے اس احقر (شبلی) نے بھی آپ کی متعدد کتابیں بھی دیکھی ہیں جس میں احکامِ شریعت اور دیگر کتابیں بھی دیکھی ہیں اور نیز یہ کہ مولانا صاحب کی زیرِ سرپرستی ایک ماہ وار رسالہ "الرضا" بریلی سے نکلتا ہے، جس کی چند قسطیں بغور و خوض دیکھی ہیں۔ جس میں بلند پایہ مضامین شائع ہوتے ہیں۔"

(رسالہ الندوہ، ص ۱۷ اکتوبر ۱۹۱۴ء)

فرقہ واریت کے تباہ کن اثرات کی وجہ سے قوم خون کے آنسو رو رہی ہے۔ خودکش حملوں کی بہتات ہو یا بم دھماکوں کا تسلسل، مخالفین کا قتلِ عام ہو یا طرفین کے گرتے ہوئے علما کے لاشے، بیوہ ہوتی ہوئی قوم کی بیٹیاں، یتیم بچوں کی فوج اسلامی تہذیب و ثقافت سے عاری معاشرہ، مادیت کی کوکھ سے جنم لینے والی خودغرضی۔ یہ حالات جنگل کا نہیں بلکہ وحشیوں کا منظر نامہ پیش کر رہے ہیں اور ان حالات میں اچھی کتب کے بجائے 'مطالعۂ بریلویت' جیسی کتب چھاپی جا رہی ہیں۔

محترم جج صاحب! آج کی اس عدالت میں، مَیں اگرچہ یہ ثابت کر چکا کہ مولانا احمد رضا اتحاد بین المسلمین کے داعی تھے اور آپ نے قوم کو ان نام نہاد علما، حکیم الامت سے بچانے کی کوشش کی۔

سنگین مذاق کرنے والے کون تھے...... کس نے ہماری صفوں کو منتشر کیا...... کس نے ہمیں آپس میں لڑایا اور کس نے ہمارے نظریات کو تباہ و برباد کرنے کا گھناؤنا کھیل کھیلا...... کون تھا جس نے ہم کو فرقوں میں تقسیم کر کے کمزور کر ڈالا؟

جنابِ والا! اب مَیں ان حقائق سے پردہ اُٹھانا چاہوں گا، لیکن اس عدالت میں ایک مرتبہ پھر یہ بتاتا چلوں کہ یہ فرقہ واریت، دیوبندیت اور وہابیت مولانا احمد رضا خاں کی پیدائش سے پہلے کی ہیں، جو منظرِ عام پر تو بعد میں آئیں مگر پنپ پہلے ہی رہی تھیں۔ اور ملتِ اسلامیہ کے سانپوں کو انگریز بہت پہلے سے دودھ پلا رہے تھے، جسے ہم پہلے مقدمے میں ثابت کر چکے کہ کون انگریزوں کا وفادار تھا اور

کس کو انگریز حکومت ۶۰۰ روپے ماہ وار اس زمانے میں دیا کرتی تھی۔

انظر شاہ کشمیری لکھتے ہیں۔ اس حوالے کو میں پہلے بھی بیان کر چکا ہوں: ''میرے نزدیک دیوبندیت خالص ولی اللہی فکر بھی نہیں اور نہ کسی خانوادہ کی لگی بندھی فکر دولت و متاع ہے۔ میرا یقین ہے کہ اکابرِ دیوبند جن کی ابتدا میرے خیال میں سیدنا الامام مولانا قاسم صاحب اور فقیہ اکبر مولانا رشید احمد گنگوہی سے ہے۔ دیوبندیت کی ابتدا حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ سے کرنے کے بجائے مذکورہ بالا دو عظیم انسانوں سے کرتا ہوں۔''

(ماہ نامہ البلاغ مارچ ۱۹۶۹ء ص ۴۸)

اور دیوبندی مکتب فکر کے مولانا عبید اللہ سندھی صاحب رقم طراز ہیں: ''مولانا محمد اسحاق مکہ معظمہ میں اپنے بھائی مولانا محمد یعقوب دہلوی کو اپنے ساتھ لے گئے اور دہلی میں مولانا مملوک علی کی صدارت میں مولانا قطب الدین دہلوی مولانا مظفر حسین کاندھلوی اور مولانا عبدالغنی دہلوی کو ملا کر ایک بورڈ بنایا، جو اس نئے پروگرام کی اشاعت کر کے نئے سرے سے جماعتی نظام پیدا کرے۔ یہی جماعت جو آگے چل کر دیوبندی نظام چلاتی ہے۔ الغرض امام ولی اللہ کی اجتماعی تحریک کو نئی نہج پر ڈالنے میں شاہ محمد اسحاق کی اس اصابتِ رائے کا نتیجہ تھا کہ بعد میں دہلی مدرسہ کے نمونے پر دیوبند میں جو درسگاہ قائم کی گئی، اس نے پچاس سال کے عرصے میں غیر معمولی کامیابیاں حاصل کی۔''

(شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک ص ۱۳۴، ۱۳۵)

انگریز کی پالیسی پر مشتمل اصولوں پر عمل در آمد کس طرح کرایا گیا۔ مزید آگے لکھتے ہیں: ''مدرسہ دیوبند کی مرکزی فکر اور اس کی سیاسی مصلحت کے اصول امیر امداد اللہ اور ان کے رفقا مولانا قاسم، مولانا رشید احمد اور مولانا محمد یعقوب دیوبندی کی جماعت نے متعین کیے تھے۔ اس لیے دیوبندی پارٹی کی مرکزی جماعت میں وہ شخص شامل نہیں ہو سکتا جو یہ اصول کاملاً تسلیم نہ کرتا ہو۔''

(شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک، ص ۱۵۰)

جنابِ والا! مسلکِ وہابیت کے پہلے دور کے حوالے سے عبید اللہ سندھی رقم طراز ہیں: ''حکومت موقتہ کے امیر شہید سید احمد ۱۸۲۶ء تا ۱۸۳۱ء۔ اس سال اس تحریک کا پہلا دَور پورا ہوا اس دور میں حزب ولی اللہ میں ایک ایسا انسان بھی پیدا ہوا، جو نہ امیر تھا اور نہ امام۔ لیکن اپنی مبارک زندگی اور شہادت سے اپنے جدِ امجد کی تحریک کو زندہ کر گیا وہ مولانا محمد اسمٰعیل بن عبدالغنی بن ولی اللہ ہے۔''

(شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک، ص ۹)

جناب والا! اس تحریک کے دوسرے دَور کو اگر میں دیوبندیت سے موسوم کروں، تو غلط نہ ہوگا۔

مولانا عبید اللہ سندھی میرے اس موقف کی تائید کرتے ہوئے رقم طراز ہیں: ''اس تحریک کا دوسرا دَور امام محمد اسحاق نے ۱۸۳۱ء سے شروع کیا۔ آپ ۱۸۴۱ء تک دہلی میں رہے اور ۱۸۴۶ء تک مکہ

معظمہ میں، دہلی میں ان کے نائب مولانا مملوک علی اور ان کے بعد مولانا امداد اللہ بارہ برس تک دہلی میں رہے یعنی ۱۸۵۷ء تک، اس کے بعد مکہ معظمہ چلے گئے۔ ہندستان میں پہلے نائب مولانا محمد قاسم ۱۸۷۹ء تک پھر مولانا رشید احمد ۱۹۰۵ء تک اور ان کے بعد شیخ الہند مولانا محمود الحسن ۱۸۲۰ء تک اس تحریک کے سرپرست رہے۔ اس سال تحریک مذکورہ کا دوسرا دور ختم ہوا۔ تحریک کے تیسرے دَور کو مولانا شیخ ہند نے ۱۹۲۰ء سے تھوڑا عرصہ پہلے شروع کیا۔'' (شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک، ص ۹۔۱۰)

مزید لکھتے ہیں: ''جس دیوبندی جماعت کا ہم تعارف کرانا چاہتے ہیں وہ اسی جماعت کا دوسرا نام ہے، جو مولانا اسحاق کی ہجرت کے بعد اس کے متبعین نے ان کی مالی اعانت اور ان کے افکار کی اشاعت کے لیے بنائی تھی۔'' (ایضاً، صفحہ ۱۳۵)

جناب والا! مَیں اس موضوع پر اتنا ہی کہوں گا کہ مسلمانوں میں انتشار وتفریق پیدا کرنے میں مولانا احمد رضا کا ہاتھ نہیں، بلکہ سید احمد بریلوی، اسماعیل دہلوی، محمد بن عبدالوہاب نجدی جس نے لارنس آف عربیہ کے ایما پر خلافتِ عثمانیہ کے سقوط میں اہم کردار ادا کیا۔ اور برصغیر میں اسی کی تحریک کو سید احمد بریلوی اور اسماعیل دہلوی نے پروان چڑھایا۔ اور مسلمانوں کے اتحاد میں پھوٹ ڈالنے کی کامیاب کوشش کی۔

محترم جج صاحب! اسماعیل دہلوی کا زمانہ مولانا احمد رضا سے قبل کا ہے، لہٰذا یہ کہنا کہ وہابیت و دیوبندیت کی تقسیم مولانا احمد رضا نے کی، ایک دیوانے کی بڑ تو ہوسکتی ہے، مگر حقیقت نہیں۔

جج: دلائل و براہین کے بعد عدالت اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ وکیلِ استغاثہ کے دلائل بے جان اور محض الزامات کا پلندہ تھے۔ دیوبندیت اور وہابیت کی ابتدا اور اس کے بانی محمد بن عبدالوہاب نجدی، اسماعیل دہلوی اور سید احمد بریلوی ہیں۔ اور مولانا احمد رضا خاں نہ صرف اتحاد بین المسلمین کے داعی بلکہ نظریاتی سرحدوں کی حفاظت کرنے والے ایک عظیم مجاہد اور مسلمانوں کے خیر خواہ لیڈر تھے۔ اور یہ مولانا احمد رضا ہی تھے جنہوں الحاد و بے دینی کی سرکش موجوں کے سامنے بند باندھا اور نہ صرف ملّت کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو کنارے لگایا بلکہ اس کے نظریات کی حفاظت بھی کی۔ کیونکہ جسم نظریے کا غلام ہوتا ہے۔ اگر نظریہ تباہ ہوجائے تو قوم تباہ ہو جاتی ہے۔ اور یہی وہ زمانہ تھا جب علامہ اقبال نے اس الحاد اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شان میں کانگریسی مولویوں کی عبارات دیکھ لی تھی اور یہ کہا تھا کہ

یہ فاقہ کش جو موت سے ڈرتا نہیں ذرا
روحِ محمد اس کے بدن سے نکال دو

عدالت برخاست ہوتی ہے۔

فتاویٰ رضویہ کی طباعت واشاعت کے مراحل

محمد ساجد رضا مصباحی
ریسرچ اسکالر جامعہ اشرفیہ، مبارکپور

امام احمد رضا بریلوی قدس سرہ (۱۲۷۲ھ۔ ۱۳۴۰ھ) مکمل ۵۴ سال تک فتاویٰ تحریر فرماتے رہے، آپ کی بارگاہ میں ملک وبیرون ملک کے مختلف علاقوں سے بے شمار سوالات آتے اور آپ حسب ضرورت ان کے تفصیلی و اجمالی جوابات تحریر فرماتے۔ آپ کے فتاویٰ کی مجموعی تعداد کیا ہے اس کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے۔ کیوں کہ ابتدائی ۱۲ سال کے فتاوے کی نقل محفوظ نہیں رکھی جا سکیں اور بعد کے فتاویٰ میں بھی مکررات حذف کر کے عموماً ایک ہی جواب نقل ہوتا۔ یہ فتاویٰ العطایا النبویہ فی الفتاویٰ الرضویہ کے نام سے بارہ جلدوں تک پہنچ گئے۔ ان فتاویٰ کی طباعت و اشاعت میں کن کن مراحل سے گزرنا پڑا اور ترتیب وتصحیح ،تبییض و مقابلہ میں کن بزرگوں نے حصہ لیا ذیل میں، ہم اس تعلق سے ہر جلد کی اجمالی روداد پیش کرتے ہیں۔

جلد اوّل: امام احمد رضا بریلوی قدس سرہ (۱۲۷۲ھ۔ ۱۳۴۰ھ) کے فتاویٰ کی اشاعت کا سلسلہ ۱۳۲۷ھ سے شروع ہوا، پہلی جلد آپ کی حیات مبارکہ ہی میں ۱۳۲۵ھ میں مطبع اہل سنّت بریلی شریف سے چھپ کر منظر عام پر آ گئی، پہلی بار تعداد اشاعت ایک ہزار تھی، اس جلد کی خصوصیت یہ ہے کہ کتابت کی تصحیح اور اصلاح کا کام صدر الشریعہ حضرت علامہ امجد علی اعظمی علیہ الرحمہ (۱۲۹۶ھ۔۱۳۶۷ھ) نے کیا ہے اور پھر اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ نے بھی اس کو ملاحظہ فرمایا ہے۔ فہرست بھی آپ ہی کی تیار کی ہوئی ہے اور حاشیہ بھی خود ہی رقم فرمایا ہے۔ اس جلد میں کتاب الطہارۃ سے متعلق فتاوے ہیں ۸۸۰ صفحات پر مشتمل اس جلد میں ہزاروں مسائل کے علاوہ ۲۸ رسائل بھی شامل ہیں۔ (مقدمہ فتاویٰ رضویہ جلد نہم)

جلد دوم: پہلی جلد کی اشاعت کے تقریباً نو سال بعد ۱۳۳۴ھ میں حضرت صدر الشریعہ علامہ امجد علی علیہ الرحمہ (۱۲۹۶ھ۔۱۳۶۷ھ) نے دوسری جلد مطبع اہل سنت بریلی شریف سے شائع کی، اس کتاب کی کتابت کاتب فیض الحسن نے کی ہے۔ بقیہ اُمور صدر الشریعہ نے انجام دیے۔ اہتمام میں مولانا ابراہیم رضا خان کا نام مرقوم ہے۔ اشاعت اوّل میں اس جلد میں فہرست نہیں تھی۔ دوسری بار امام النحو علامہ غلام جیلانی میرٹھی علیہ الرحمہ نے مکتبہ سنانی اندرکوٹ میرٹھ سے شائع کی ہے۔ جس میں فہرست

بھی موجود ہے جو انہوں نے ترتیب دی ہوگی۔ اس جلد میں کتاب الطہارۃ کے باقی ابواب اور کتاب الصلاۃ کے باب الاذان تک کا حصہ شامل کیا گیا ہے۔ اس میں ۷؍رسائل بھی شامل ہیں۔

جلد سوم: تیسری جلد کی اشاعت کا سبب یہ ہوا کہ غالباً ۱۳۷۸ھ میں شہزادۂ اعلیٰ حضرت حضور مفتی اعظم ہند علامہ مصطفیٰ رضا خان بریلوی قدس سرہ (۱۳۱۰ھ۔۱۴۲۰) دارالعلوم اشرفیہ مبارک پور تشریف لائے۔ حضرت علامہ عبد الرؤف بلیاوی علیہ الرحمہ (متوفی ۱۳۹۱ھ/۱۹۷۱ء) ان دنوں یہاں کے نائب شیخ الحدیث تھے انہوں نے حضور مفتی اعظم ہند علیہ الرحمہ سے عرض کیا: حضور فتاویٰ رضویہ کی اشاعت کا کوئی انتظام ہوا یا نہیں؟ حضور مفتی اعظم ہند نے ارشاد فرمایا: تم لوگوں کے سوا کس سے اس کی توقع کی جاسکتی ہے۔ بس حضور مفتی اعظم ہند کا یہی جملہ علامہ عبد الرؤف صاحب کے لیے مہمیز ثابت ہوا۔ آپ بلند عزائم اور حکمت و تدبر والے شخص تھے۔ آپ نے فتاویٰ رضویہ کی غیر مطبوعہ جلدوں کی اشاعت کے لیے دار العلوم اشرفیہ کی رہنمائی میں سنی دار الاشاعت مبارکپور کی بنیاد ڈالی اور اس ادارے کے نظم وضبط کے لیے قاضی شریعت مولانا محمد شفیع اعظمی نائب ناظم دارالعلوم اشرفیہ اور قاری محمد یحیٰ صاحب ناظم اعلیٰ دارالعلوم اشرفیہ مبارکپور، مفتی عبد المنان اعظمی کو اپنا ہمدم وہم قدم بنایا۔

دو جلدیں پہلے ہی سے شائع ہو چکی تھیں ،علامہ عبد الرؤف بلیاوی علیہ الرحمہ (متوفی ۱۳۹۱ھ/۱۹۷۱ء) نے جلد سوم سے جلد ہشتم تک کا مسودہ حضور مفتی اعظم ہند سے حاصل کیا۔ جلد سوم کو مبیضہ کے لیے مفتی مجیب الاسلام نسیم اعظمی دامت برکاتہم کو دیا گیا۔ انہوں نے مبیضہ کے ساتھ پوری جلد کو مبوب و مفصل بھی کر دیا۔ کتابت کے لیے لکھنؤ کے ایک مشہور کاتب کی خدمات حاصل کی گئیں، پروف کی تصحیح اور اصل سے مقابلے کا کام حضرت علامہ عبد الرؤف بلیاوی علیہ الرحمہ (متوفی ۱۳۹۱ھ/۱۹۷۱ء) نے بحر العلوم مفتی عبد المنان اعظمی کے تعاون سے کیا، فہرست بھی خود ہی مرتب فرمائی، طباعت سرفراز پریس لکھنو میں ہوئی، محرم ۱۳۷۹ھ میں تیسری جلد کا کام شروع ہوا تھا ۱۳۸۱ھ میں کتاب منظر عالم پر آگئی۔ یہ جلد ۸۱۵؍صفحات پر مشتمل ہے جس میں، کتاب الصلاۃ کے باب شروط الصلاۃ تا باب الکسوف والاستسقا کے فتاویٰ شامل کیے گئے ہیں، ۱۶ رسالے بھی شامل ہیں۔ ۱۰ رسالے اور بھی تھے جنہیں اس جلد میں شامل ہونا تھا لیکن بروقت دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے انہیں شامل اشاعت نہیں کیا جا سکا۔ اس ایڈیشن کی مقبولیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ڈیڑھ سال کی قلیل مدت میں ساری جلدیں ختم ہوگئیں۔ (مقدمہ فتاویٰ رضویہ جلد دوازدہم)

جلد چہارم: جلد سوم کی شاندار مقبولیت کے بعد چوتھی جلد کا کام بھی سنی دارالاشاعت مبارکپور ہی کے زیر اہتمام شروع ہوا، مبیضہ اس بار بھی مفتی مجیب الاسلام نسیم اعظمی ادروی نے تیار کیا، کتابت میں

عمدگی لانے کے لیے اس بار کانپور کے مشہور کاتب صہبائی کانپوری سے معاملہ طے ہوا اور مسودہ ربیع الاول ۱۳۸۳ھ میں کاتب کے سپرد کیا گیا لیکن امید کے برعکس دو سال بعد ۱۸ صفر ۱۳۸۵ھ کو تقریبا تین سو صفحات کی کتابت کر کے کاتب نے مسودہ واپس کر دیا، پھر بقیہ حصہ کی کتابت لکھنؤ کے ایک کاتب نے کی، تصحیح میں اس دفعہ علامہ عبد الرؤف بلیاوی علیہ الرحمہ (متوفی ۱۳۹۱ھ/۱۹۷۱ء) اور مفتی عبد المنان اعظمی کے ساتھ دار العلوم اشرفیہ کے کچھ منتہی درجات کے طلبہ بھی شریک رہے، فہرست علامہ عبد الرؤف بلیاوی علیہ الرحمہ (متوفی ۱۳۹۱ھ/۱۹۷۱ء) نے تیار کی۔ اس طرح چوتھی جلد بھی زیور طبع سے آراستہ ہوکر منظر عام پر آ گئی، یہ جلد کتاب الجنائز، کتاب الزکوٰۃ، کتاب الصوم اور کتاب الحج کے فتاویٰ پر مشتمل ہے، ۲۷/رسالے بھی شامل ہیں، ۲/رسالے ''نقاء النیرۃ فی شرح الجوہرۃ'' اور ''معدل الزلال فی اثبات الہلال'' دستیاب نہ ہونے کے سبب شامل اشاعت نہیں ہو سکے، صفحات کی تعداد ۷۴۴ ہے۔
(مقدمہ فتاویٰ رضویہ جلد یازدہم)

جلد پنجم: پانچویں جلد کے کتاب النکاح کا ایک حصہ تین قسطوں میں حضور مفتی اعظم ہند نے اپنی حیات ہی میں مطبع حسنی واقع آستانہ عالیہ رضویہ بریلی سے شائع کیا تھا، جس کی کتابت فیض الحسن خوش رقم لوح نویس نے کی تھی، آپ نے اس جلد پر حاشیہ بھی رقم فرمایا تھا اور فہرست بھی خود ہی تیار کی تھی، سنی دار الاشاعت مبارکپور، کے ایڈیشن میں جلد پنجم کے مطبوعہ حصہ کو غیر مطبوعہ حصے کتاب الطلاق کے ساتھ ملا کر شائع کیا گیا۔ حسب دستور اس جلد کا مبیضہ بھی مفتی مجیب الاسلام اعظمی نے تیار کیا، ۱۳۷۸ھ میں یہ جلد نامی پریس لکھنؤ کے حوالے کی گئی، پریس والوں نے ۹۶/صفحات کی طباعت کے بعد کسی وجہ سے کام روک دیا، اسی دوران نامی پریس کے مالک خواجہ شمس الدین صاحب کا انتقال ہو گیا، ادھر شوال ۱۳۹۱ھ میں علامہ عبد الرؤف صاحب بھی مالک حقیقی سے جا ملے، عجب اتفاق کے ان ہی دنوں اس کتاب کے تیسرے کاتب بھی فوت ہو گئے، حضرت علامہ عبد الرؤف صاحب کی وفات کے بعد کچھ دنوں تک سنی دار الاشاعت تعطل کا شکار رہا، بقیہ جلدوں کی اشاعت سے مایوسی ہونے لگی پھر ڈھائی تین مہینے کے بعد سنی دار الاشاعت کی ذمے داریاں مفتی عبد المنان اعظمی کے سپرد کی گئیں، انہوں نے کتاب نامی پریس سے واپس لے کر سرفراز پریس لکھنو کے حوالے کر دی۔ یہاں کتابت کے لیے کاتب عبد المجید صاحب کی خدمات حاصل کی گئیں۔ مبیضہ کا اصل سے مقابلہ علامہ عبد الرؤف بلیاوی علیہ الرحمہ (متوفی ۱۳۹۱ھ/۱۹۷۱ء) اپنی حیات ہی میں کر چکے تھے جس میں چوتھی جلد ہی کی طرح حضرت مفتی عبد المنان اعظمی مدظلہ کے ساتھ دار العلوم اشرفیہ کے کچھ منتہی درجات کے طلبہ نے بھی حصہ لیا تھا۔ پروف کی تصحیح اور مقابلے میں مفتی صاحب کا تعاون ان کے منجھلے صاحب زادے مولانا

شکیب ارسلان مصباحی نے کیا اس جلد کی کتاب الطلاق کی فہرست علامہ عبد الرؤف بلیاوی علیہ الرحمہ (متوفی ۱۳۹۱ھ/۱۹۷۱ء) تیار کر چکے تھے۔ کتاب الطلاق و مابعد کی فہرست حضرت مفتی صاحب نے تیار کی یہ جلد ۶۹۷ر صفحات پر مشتمل ہے ۹ر رسالے بھی شامل ہیں۔ (حوالہ مذکورہ)

جلد ششم: چھٹی جلد کا مبیضہ مولانا سبحان اللہ امجدی بنارسی صاحب نے تیار کیا جو حضرت صدر الشریعہ علیہ الرحمہ کو خادم خاص اور ان کی بارگاہ کے حاضر باش تھے، کتابت مولانا شمس الحق بلیاوی، مولانا عبد المنان برکاتی، محبوب اعظمی اور قاری اسمٰعیل تبسم عزیزی نے کی، تصحیح و مقابلہ میں مولانا شکیب ارسلان مصباحی اور مولانا عبد السلام گونڈوی نے مفتی صاحب کا تعاون کیا، فہرست وغیرہ بقیہ امور حضرت مفتی صاحب نے خود انجام دیے۔ طباعت کے لیے نشاط پریس ٹانڈہ کا انتخاب کیا گیا۔ ۱۴۰۱ھ میں کتاب شائع ہو کر منظر عام پر آ گئی۔ یہ جلد فقہ کی چھ کتابوں پر مشتمل ہے۔ ۱۔ کتاب السیر ،۲۔ کتاب اللقیط ،۳۔ کتاب اللقطہ ،۴۔ کتاب المفقود، ۵۔ کتاب الشرکۃ، ۶۔ کتاب الوقف۔ ۵۳۶ر صفحات پر مشتمل اس جلد میں آٹھ رسالے بھی شامل ہیں۔ (مقدمہ فتاویٰ رضویہ جلد یازدہم)

جلد ہفتم: ساتویں جلد کی تبییض کتاب الکفالہ سے کتاب الکراہیۃ تک مولانا سبحان اللہ امجدی بنارسی اور کتاب الحجر سے کتاب العقیقہ تک مولانا مجیب الاسلام نسیم اعظمی نے کی ہے۔ کتابت نظام الدین مئو، حسام الدین گھوسی اور شمس الحق اوروی نے کی ہے، تصحیح مفتی عبد المنان اعظمی مدظلہ نے فرمائی ہے اور ان کے مدد معاونین مولانا محمد اسلام گھوسوی اور مولانا محمد رفیع احمد کٹیہاری رہے ہیں۔ یہ جلد ۱۴۱۲ھ میں مطبع جے۔اے۔ آفسیٹ پریس دہلی سے شائع ہوئی۔ یہ آخری مسودہ تھا جو سنی دارالاشاعت مبارکپور سے شائع کرنے کے لیے حضور مفتی اعظم ہند سے حاصل کیا گیا تھا، اس جلد میں کل ۵۲۱ر فتاوے اور ۷ رسائل شامل ہیں جو مندرجہ ذیل ابواب سے متعلق ہیں۔ وکالت، اقرار، صلح، امانت، عاریت، ہبہ، اجارہ، اکراہ وحجر، غصب، شفعہ، قسمت، مضاربت، ذبائح، صید، اضحیہ۔ صفحات کی مجموعی تعداد ۶۲۶ رہے۔ (مقدمہ فتاویٰ رضویہ جلد یازدہم)

جلد نہم: موجودہ نویں جلد کو دو جلدوں میں تقسیم کر کے جلد دہم نصف اول، جلد دہم نصف اخیر کے نام سے مکتبہ ایوان رضا بیسل پور، ضلع پیلی بھیت نے شائع کیا مگر بحر العلوم مفتی عبد المنان اعظمی مدظلہ کے مطابق مکتبہ ایوان رضا کے ذمہ داران نے اپنی لاعلمی کی وجہ سے نویں جلد کو دسویں جلد قرار دے دیا ہے، انہوں نے فتاویٰ رضویہ کے مقدمہ محررہ ۲۹ر جون ۱۹۹۴ء میں اس سلسلہ میں نفیس گفتگو کی ہے، رضا اکیڈمی ممبئی نے دونوں جلدوں کو جمع کر کے جلد نہم کے نام سے شائع کیا ہے، اس جلد کی تبییض ڈاکٹر فیضان احمد نے کی ہے۔ تصحیح و مقابلے میں جانشین حضور مفتی اعظم ہند علامہ اختر رضا خان ازہری مدظلہ

العالی، مولانا قاضی عبد الرحیم بستوی مولانا محمد صالح صاحب اور مفتی محمد اعظم صاحب شریک ہیں، نصف اول تاج آفسیٹ پریس الہٰ آباد سے شائع ہوا ہے، نصف اخیر کی کتابت و طباعت کے تعلق سے کوئی صراحت نہیں مل سکی۔ اس جلد میں کتاب الحظر والاباحت کے ۵۴۴ر مسائل اور ۱۲ر رسائل شامل ہیں۔ اس جلد کا ایک رسالہ الحجۃ المؤتمنہ فی آیۃ الممتحنۃ (۱۳۳۹ھ) ہے، جو طباعت میں شامل نہیں ہو سکا ہے یہ رسالہ علاحدہ مطبع حسنی پریس بریلی سے چھپ کر جماعت رضائے مصطفیٰ بریلی سا شائع ہو چکا تھا پھر بعد میں رضا فاؤنڈیشن لاہور کے مترجم ایڈیشن میں بھی شامل کر لیا گیا ہے، اس جلد کے صفحات کی تعداد ۵۸۴ر ہے۔ (مقدمہ فتاویٰ رضویہ جلد نہم از قربان علی)

جلد دہم: جلد دہم کو حضرت مولانا منان رضا خاں نے ادارہ تصنیفات رضا بریلی شریف سے جلد یازدہم کے نام سے شائع کیا ہے، اس جلد کی تصحیح و ترتیب اور فہرست سازی کا کام حضرت علامہ عبد المبین نعمانی مصباحی رکن المجمع الاسلامی مبارکپور نے انجام دیا۔ انہوں نے ایک مبسوط تقریب بھی رقم فرمائی ہے، ۵۲۷ر صفحات پر مشتمل اس جلد میں کتاب المداینات، کتاب الاشربۃ، کتاب الوصایا اور کتاب الرہن سے متعلق فتاوے ہیں، کچھ ابواب عدم دستیابی دے سبب شامل نہیں ہو سکے ہیں۔ مسائل کی تعداد ۱۵۷ر ہے جب کہ ۴ر مستقل رسائل بھی شامل اشاعت ہیں۔ (تقریب فتاویٰ رضویہ جلد دہم از علامہ عبد المبین نعمانی)

جلد یازدہم: اس جلد کی اشاعت سب سے پہلے مکتبہ ایوان رضا پیلی بھیت سے جلد نہم کے نام سے ہوئی، اس جلد میں کتاب المواریث کے جز حصہ کے علاوہ کلام وعقائد کے مسائل ہیں، بعد میں جب یہ جلد یازدہم کے نام سے رضا اکیڈمی ممبئی نے شائع کی تو حضرت مفتی عبد المنان اعظمی کے مشورے سے اس کے حصہ مواریث کو جلد دہم میں شامل کر دیا گیا ہے۔

جلد دوازدہم: یہ جلد غائب ہوگئی البتہ اس کا کچھ حصہ حضرت مولانا توصیف رضا ابن مولانا ریحان رضا خان کے توسط سے دستیاب ہوا اور اسے مرتب کر کے حضرت مولانا حنیف خان رضوی مصباحی نے رضا اکیڈمی ممبئی سے پہلی بار شائع کرایا، اس میں سابقہ جلد نہم کے مسائل بھی شامل ہیں، تمام جلدوں کی نئی ترتیب حضرت بحر العلوم مفتی عبد المنان اعظمی مدظلہ کے حکم و ارشاد کی مرہون منت ہے، جس کی تفصیل حضرت مفتی صاحب نے جلد دوازدہم کے مقدمے میں دے دی ہے۔

اس طرح فتاویٰ رضویہ کی بارہ جلدیں منظر عام پر آگئیں۔ پھر اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ کے پچھترویں عرس کے موقع پر رضا اکیڈمی ممبئی نے تمام جلدوں کی ایک ساتھ اشاعت کا ارادہ کیا تو مولانا محمد حنیف خاں رضوی مصباحی نے بحر العلوم مفتی عبد المنان اعظمی مدظلہ کی رہنمائی میں بعض ترتیبی

خامیوں کو دور کرنے کے لیے بڑی جد وجہد کی پھر ۱۴۱۵ھ میں تمام جلدیں ایک ساتھ رضا اکیڈمی ممبئی سے شائع ہوئیں۔ (تقریب جلد یاز دہم از مولانا حنیف خان رضوی)

۱۹۸۸ء میں لاہور پاکستان میں امام احمد رضا بریلوی قدس سرہ (۱۲۷۲ھ۔ ۱۳۴۰ھ) کی تصنیفات خصوصا فتاویٰ رضویہ کی جدید اشاعت کے لیے رضا فاؤنڈیشن کے نام سے ایک ادارے کا قیام ہوا۔ پھر مفتی عبد القیوم ہزاروی (وصال ۲۰۰۵ء) کی سرپرستی میں فتاویٰ رضویہ کی عربی و فارسی عبارات کے ترجمہ ماٰخذ ومراجع کی نشان دہی اور تحشیہ کا کام شروع ہوا، یہ عظیم کام تن تنہا ایک شخص نہیں کرسکتا تھا لہٰذا اس کے لیے ہند و پاک کے متعدد علما کی خدمات حاصل کی گئیں اور پھر ایک مختصر عرصہ میں تمام جلدوں کے ترجمہ اور تخریج وتحشیہ کا کام مکمل ہوگیا، اب فتاویٰ رضویہ مترجم کی ۳۰ جلدیں ہو گئیں، مترجم ایڈیشن میں ان رسالوں کو بھی شامل کیا گیا جو غیر مترجم ایڈیشن میں شامل ہونے سے رہ گئے تھے۔ اس اہم کام میں مفتی عبد القیوم ہزاروی (وصال ۲۰۰۵ء) علامہ عبد الحکیم شرف قادری (وصال ۱۴۲۸ھ/۲۰۰۷ء)، مولانا عبد الستار سعیدی، مولانا نذیر سعیدی، مولانا عمر ہزاروی اور ہندوستان کے مستند عالم دین خیر الاذکیا علامہ محمد احمد مصباحی صدر المدرسین جامعہ اشرفیہ، مبارکپور نے خاص طور پر حصہ لیا۔

۱۹۹۹ء میں رضا اکیڈمی ممبئی نے مترجم فتاویٰ رضویہ کی ۸/جلدیں شائع کیں پھر اس کے بعد ادارۂ نشر و اشاعت برکات رضا پوربندر گجرات نے اولاً ۲۴ جلدیں پھر ۳۰/جلدوں کا مکمل سیٹ شائع کیا جو بروقت دستیاب ہیں اور ابھی اسی سال (۱۴۲۸ھ/۲۰۰۷ء) رضا اکیڈمی ممبئی نے بھی مکمل ۳۰ رجلدیں نہایت ارزاں قیمت پر شائع کی ہیں۔

"کنزالایمان" پر اربابِ علم و دانش کے تاثرات

از: کلیم احمد قادری

رضائے مصطفےٰ اکیڈمی، دھرن گاؤں، ضلع جلگاؤں مہاراشٹر

قرآنِ کریم دینِ اسلام کا حقیقی منبع و سرچشمہ ہے اور اس کے مفہوم و مطلوب تک ترجمہ رہنمائی کرتا ہے۔ دنیا کی متعدد زبانوں میں اس کے ترجمے کیے جاچکے ہیں۔ اور قرآنِ کریم کے تراجم میں اردو زبان کو یہ شرف و امتیاز حاصل ہے کہ اس میں ترجموں کی تعداد دنیا کی ہر زبان سے زیادہ ہے۔ اس صنف میں زبردست عالم و فاضل عربی و اردو داں حضرات نے زور آزمائی کی ہے۔ مگر ان تراجم کا بغور جائزہ لینے پر یہ بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ متعدد تراجم سے صفاتِ باری تعالیٰ پر حرف گیری، شانِ انبیا و مرسلین میں گستاخی و بے ادبی اور عظمتِ اسلام مجروح ہوئی ہیں۔ ان کے خود ساختہ ترجموں سے حرمتِ قرآن، عصمتِ انبیا، عقائدِ مسلمین اور وقارِ انسانیت کو بھی ٹھیس پہنچی ہے۔ کیونکہ ان تراجم کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ معاذ اللہ اپنے بندوں سے خدا دل لگی کرتا ہے، ہنسی اڑاتا ہے، دھوکے میں ڈالتا ہے، مکروفریب کرتا ہے اور بعض اُمور کا علم اللہ رب العزت کو بھی نہیں ہوتا۔ وہ بھی اعضا کا محتاج ہے۔ انبیا و مرسلین بھی قبل اسلام گنہ گار، بھٹکے ہوئے اور بے راہ تھے۔ معاذ اللہ ثم معاذ اللہ۔ ان مترجمین نے بغیر تائیدِ ربانی کے مترجم کہلائے جانے کے شوق میں ایسی ایسی ٹھوکریں کھائیں کہ ان کے ایمان و اسلام ہی کی خیر نہ رہی۔

قرآن کریم جیسی لاریب کتاب کا مترجم بننے کے لیے تائیدِ ربانی و رحمتِ خداوندی اوّلین شرط ہے۔ اس ضمن میں بدرِ ملت علامہ مفتی بدرالدین احمد قادری علیہ الرحمہ رقم طراز ہے:

> "ایک انسان اپنی دماغی کوشش سے بلند پایہ مصنف و قابل صد افتخار ادیب تو بن سکتا ہے۔ اپنی ذاتی قابلیت کے زور سے اردو، عربی، فارسی، انگریزی وغیرہ مختلف زبانوں کا ماہر تو ہوسکتا ہے۔ اپنے ذہنِ ثاقب کی تیزی سے نحو و صرف، معانی و بیان، تاریخ و فلسفہ کا محقق تو ہوسکتا ہے۔ لیکن قرآن حکیم کا مترجم بننا تو یہ اس کے اپنے بس کی بات نہیں۔ قرآنِ مجید کی ترجمانی کرنا، کلامِ الٰہی کے اصل منشا و مراد کو سمجھنا، آیاتِ ربانی کے انداز کو پہچاننا، آیاتِ محکمات و متشابہات میں امتیاز کرنا یہ صرف اس عالمِ دین کا کام ہے جس کا دماغ انوارِ ربانی سے روشن، اس کا قلب عشقِ مصطفےٰ کا مدینہ اور اس کا

ذہن بصیرتِ دینیہ کا حامل ہو۔ رہے وہ لوگ جو زبان و ادب، نحو و صرف، فلسفہ و تاریخ وغیرہ علوم کے فاضل ہونے کے باوجود باطل پرستی کے حامی و طرف دار ہیں تو انھیں بارگاہِ رسالت ﷺ سے قرآنِ مجید کی ترجمانی کے لیے تائید رحمانی کا کوئی حصہ نہ ملا۔ کیوں کہ علمِ قرآن ہی وہ کسوٹی ہے جس سے کھرے کھوٹے کا فرق ظاہر ہوتا ہے۔ قرآن فہمی ہی وہ معیار ہے جو علمائے حق و علمائے باطل کے درمیان خطِ امتیاز کھینچتا ہے۔''

(سوانح اعلیٰ حضرت ص ۳۶۵ مطبوعہ رضا اکیڈمی ممبئی)

مترجمینِ قرآن کی فہرست میں ایک نام چودھویں صدی کی جامع العلوم و کثیر التصانیف عبقری شخصیت، عاشقِ رسول، مجددِ دین و ملت امام احمد رضا بریلوی کی بھی ہے۔ جنھوں نے صدر الشریعہ علامہ امجد علی اعظمی (مصنف بہارِ شریعت) کے پیہم اصرار پر بغیر کسی سابقہ تیاری کے قرآن مجید کا ایسا باادب و شاہ کار تفسیری ترجمہ املا کرایا جسے دیکھ کر اربابِ علم و دانش انگشت بدنداں ہیں۔ آپ نے اپنے اس ترجمے کا تاریخی نام ''کنز الایمان فی ترجمۃ القرآن'' ۱۳۳۰ھ تجویز فرمایا۔ کنز الایمان اپنے معنیٰ کے اعتبار سے ایمان کا خزانہ و علوم و معارف کا گنجینہ ہے۔ کنز الایمان تقدیس الوہیت و شانِ رسالت کا محافظ و نگہبان ہے، عظمت و عصمتِ انبیا کا نقیب و ترجمان ہے۔ احادیثِ مبارکہ صحابہ کرام، تابعین و تبع تابعین و اسلافِ کرام کی تفاسیر کا نچوڑ ہے۔ اردو زبان کی فصاحت و بلاغت، سلاست و روانی، اختصار و جامعیت، زبان و بیان کی لطافت سے مزین ہے۔ کنز الایمان، معاشیات، فلکیات، ارضیات، طبعیات و سائنس کے جدید مسائل کا بہترین حل پیش کرتا ہے۔ الغرض قرآنِ کریم کا عین منشائے ربّ العالمین کے اردو زبان میں منفرد و عظیم الشان ترجمہ ہے۔

این سعادت بزور بازو نیست   تانہ بخشد خدائے بخشندہ

کنز الایمان کی شہرت، مقبولیت اور کثرتِ اشاعت کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ بارگاہِ رسالت مآب ﷺ میں یہ قبولیت کی سند پاچکا ہے۔ برصغیر ہند و پاک کے پچاسوں ناشرین کنز الایمان کی اشاعت میں مصروف ہیں۔ دبئی کے وزیر اوقاف فضیلۃ الشیخ عیسیٰ بن مانع نے کنز الایمان کے ۵۰۰ نسخے اپنی وزارت کی مہر کے ساتھ تقسیم کیے۔ الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور کی تحریک پر جامعہ ازہر، مصر کے وائس چانسلر ڈاکٹر سید محمد طنطاوی کی سربراہی میں مجمع البحوث الاسلامیہ (مرکز تحقیقاتِ اسلامی) قاہرہ نے کنز الایمان کا بنظرِ عمیق مطالعہ کرنے کے بعد اس کو اردو زبان کا مستند ترجمہ قرار دیتے ہوئے اس کی صحت کی تصدیق و توثیق کردی ہے اور اسے مذہب اہلِ سنّت کے عین مطابق قرار دیا ہے۔ اس سلسلے میں جامعہ ازہر نے ایک سرٹیفکیٹ کا اجرا بھی کیا اور عامۃ المسلمین کے استفادے کے لیے اس کی

ترویج واشاعت کی ترغیب بھی دی ہے۔

اب تک کنزالایمان کا دنیا کی تقریباً دس زبانوں میں ترجمہ کیا جاچکا ہے۔ کنزالایمان کے علمی محاسن و معارف پر اب تک سو سے زاید کتب و رسائل و مقالات تحریر کیے جاچکے ہیں۔ عالمی جامعات میں بھی اس کو موضوعِ تحقیق بنایا جارہا ہے۔ ماہر رضویات پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعود احمد کی نگرانی میں ڈاکٹر مجید اللہ قادری نے کراچی یونی ورسٹی سے ۱۹۹۳ء میں ''کنزالایمان اور دیگر معروف قرآنی تراجم کا تقابلی جائزہ'' کے عنوان سے مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے، جو ادارۂ تحقیقاتِ امام احمد رضا کراچی سے شائع ہوچکا ہے۔ روہیل کھنڈ یونی ورسٹی، بریلی شریف سے لیڈی اسکالر مس حامدہ کے مقالۂ ڈاکٹریٹ ''اردو نثر اور مولانا احمد رضا خاں'' کے چوتھے باب میں کنزالایمان کی علمی و ادبی اہمیت پر ایک گوشہ شامل ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر غلام غوث قادری نے بھی اپنے پی ایچ ڈی مقالہ ''امام احمد رضا کی انشا پردازی'' میں کنزالایمان کی علمی و ادبی اہمیت کا تذکرہ کیا ہے۔ ڈاکٹر صابر سنبھلی نے کنزالایمان کی زبان و بیان میں انفرادیت اور لسانی خوبیوں پر تحقیقی مقالہ لکھا ہے۔ جو سہ ماہی افکار رضا میں قسط وار شائع ہوچکا ہے۔

قرآنِ مقدس علوم وفنون کا جامع ہے اور یہ بھی اعجازِ قرآن ہی ہے کہ کنزالایمان پر ہونے والے تحقیقی اُمور کا سلسلہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جارہا ہے۔ محققین و اربابِ علم و دانش اس کی جانب متوجہ ہے۔ علامہ محمد عبدالمبین نعمانی قادری کنزالایمان کے اسی وصف کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''بلکہ میں یہ کہوں تو غلط نہ ہوگا کہ جس طرح قرآنی اسرار و نکات ختم ہونے والے نہیں۔ جیسا کہ حدیث پاک میں فرمایا گیا ''**لا تنقضی عجائبه** (اس کے اسرار و عجائب ختم ہونے والے نہیں) اسی طرح اس ترجمہ کے محاسن پر بھی جس قدر غور کیا جارہا ہے اسی قدر اس کے اسرار و حکم واشگاف ہوتے جارہے ہیں۔

(خاتمۃ الطبع مشمولہ کنزالایمان، جدید نسخہ ص ۹۹۱ مطبوعہ دہلی)

دنیائے اہلِ سُنّت ممنون ہے علامہ محمد عبدالمبین نعمانی قادری کی کہ انھوں نے بڑی عرق ریزی اور شب و روز کی محنت سے کنزالایمان کی تصحیح کا کام انجام دیا۔ ان کے اس تصحیح شدہ نسخے کی اشاعت رضا اکیڈمی، مالے گاؤں نے کی اور اس کے بعد اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہوچکے ہیں۔ لہٰذا تمام ناشرین کو چاہیے کہ وہ اس جدید تصحیح شدہ ایڈیشن کو ہی شائع کرے۔

کنزالایمان حقائق و معارف کا اُمنڈتا ہوا سمندر ہے۔ برصغیر ہند و پاک کے بے شمار اربابِ علم و دانش نے کنزالایمان کی انفرادیت، جامعیت، ادبیت، معنویت، زبان و بیان کی چاشنی اور

سلاست و روانی اور متعدد خوبیوں کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے جو تاثرات رقم فرمائے ہیں وہ ہدیۂ قارئین ہیں:

(۱) محدث اعظم ہند:

''علمِ قرآن کا اندازہ اگر صرف اعلیٰ حضرت کے اس ترجمے سے کیجیے جو اکثر گھروں میں موجود ہے اور جس کی کوئی مثال سابق نہ عربی زبان میں ہے نہ فارسی میں ہے اور نہ اردو میں اور جس کا ایک ایک لفظ اپنے مقام پر ایسا ہے کہ دوسرا لفظ اس جگہ پر لایا نہیں جاسکتا۔ جو بظاہر محض ترجمہ ہے مگر درحقیقت وہ قرآن کی صحیح تفسیر اور اردو زبان میں قرآن ہے۔ اس ترجمہ کی شرح حضرت صدرالافاضل استاذ العلماء مولانا شاہ نعیم الدین صاحب علیہ الرحمہ نے حاشیہ پر لکھی ہے۔ وہ فرماتے تھے کہ دورانِ شرح میں کئی بار ایسا ہوا کہ اعلیٰ حضرت کے استعمال کردہ لفظ اٹل ہی نکلا۔ اعلیٰ حضرت خود شیخ سعدی کے فارسی ترجمہ کو سراہا کرتے تھے لیکن اگر حضرت سعدی اردو زبان کے اس ترجمے کو پاتے تو فرما ہی دیتے کہ ترجمہ قرآن شے دیگر است و علم قرآن شے دیگر است''۔

(المیزان، امام احمد رضا نمبر، ممبئی ۱۹۷۶ء ص ۲۴۵)

(۲) محبوبِ ملت محمد محبوب علی خاں:

''یہ ترجمہ (کنزالایمان) اس نائب رسول، عالمِ دین، مفتی شرع متین، ماہر شریعت، واقفِ طریقت، مجددِ اعظم دین وملت کا ہے جس کو مکہ معظمہ و مدینہ منورہ کے اکابر علمائے کرام و مفتیان عظام نے اپنا مقتدا و پیشوا مانا۔ جس کو اس صدی کا مجدد تسلیم کیا۔ جس سے حدیث شریف کے سندیں لیں۔ اور ان سندوں پر فخر و مباہات فرمایا۔ اور جن سے شرف بیعت حاصل کیا۔ وہ ہیں حضور پُر نور مرشدِ برحق سیدنا اعلیٰ حضرت تاج دارِ اہلِ سُنّت مجددِ اعظم دین وملت شیخ الاسلام والمسلمین، تاج الفحول الکاملین، راس العلما الراسخین مولانا مولوی حافظ و قاری الحاج مفتی شاہ علامہ عبدالمصطفیٰ محمد احمد رضا خاں قادری، جن کا مبارک ترجمہ حق وصحیح ہے اور جس ترجمہ کا تاریخی نام ہے ''کنزالایمان فی ترجمۃ القرآن'' یہی ایک ترجمہ ہے جو ایمان کو منور فرمانے والا اور دلوں کو چمکانے والا ہے''۔

(دیوبندی ترجموں کا آپریشن، ص ۹۹ مطبوعہ رضا اکیڈمی ممبئی)

(۳) مولانا سید شاہ محمد قائم رضوی چشتی...... سجادہ نشین آستانہ چشتیہ نظامیہ، دانا پور، بہار:

''قرآنِ عظیم کا ترجمہ اکثر زبانوں میں ہوا ہے اور ہوتا ہی رہتا ہے۔ ایک ترجمہ نائب رسولِ اعظم امام احمد رضا قدس سرہ کا بھی ہے۔ ترجمہ کرنا خود ایک مستقل فن اور بڑا ہی نازک فن ہے۔ ایک ایک لفظ کا صحیح معنی و مفہوم، محلِ استعمال، سیاق و سباق، شانِ نزول، مطلب و روئے سخن، ہمہ گیری کا پوری احتیاط کے ساتھ سمجھنا اور سمجھانا منزل ادق و دشوار ہے۔ اور تراجم سے اس ترجمہ کا مقابلہ کرنے سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت نے جس عالمانہ و محققانہ انداز میں پوری جز رسی و انسانی نفسیات کی کامل آگاہی کے ساتھ فنِ ترجمہ کی صبر آزما منزل کو طے کیا ہے، وہ کچھ آپ ہی کا حصہ ہے۔ اب تو بیرونی یونی ورسٹیاں بھی اس طرف متوجہ ہو رہی ہیں۔ اس ترجمہ میں جو احتیاط کی گئی قابلِ قدر ہے''۔

(المیزان، امام احمد رضا نمبر، ممبئی ۱۹۷۶ء، ص ۳۵۵)

(۴) مولانا عبدالحکیم اختر شاہ جہاں پوری:

''مسلمانو! اے شمع رسالت کے پروانو! اگر خدا نصیب کرے تو قرآن مجید کو سمجھنے کے لیے صرف اور صرف کنز الایمان ترجمۂ قرآن ہی پڑھنا۔ قرآن کریم کا اردو میں بھی سب سے صحیح ترجمہ ہے۔ اردو کے باقی جتنے ترجمے ہیں ان میں سے اکثر ترجمے بے دینوں نے کیے ہیں اور انہوں نے بعض آیات کا ترجمہ منشائے ربانی کے خلاف کر کے مقدس شجرا سلام میں غیر اسلامی عقاید و نظریات کی قلمیں لگائی ہوئی ہیں۔ خدا نہ کرے کہ آپ یا آپ کے گھر والے ان ترجموں کو پڑھ کر اپنی دولتِ ایمان کو ضائع کر بیٹھیں۔ ایمان کی حفاظت کے لیے بے ادبی و بے حرمتی سے مبرا ''کنز الایمان'' کو پڑھنا اشد ضروری ہے۔ کیونکہ یہ ترجمۂ قرآن تفاسیرِ معتبرہ کے عین مطابق ہے۔''

(سالنامہ معارف رضا، کراچی ۲۰۰۳ء، ص ۱۳۸)

(۵) مولانا عطا محمد بندیالوی، پاکستان:

''حضرت بریلوی قدس سرہ نے ایک ہزار کے لگ بھگ تصانیف ارقام فرمائیں اور جس مسئلے پر قلم اٹھایا الم نشرح کر کے چھوڑا۔ ان تمام تصانیف کا سرتاج اردو ترجمۂ قرآن پاک ہے، جس کی نظیر نہیں ہے۔ اور اس ترجمہ کا مرتبہ اسی کو معلوم ہوتا ہے

جس کی اعلیٰ درجے کی تفاسیر پر نظر ہے۔ اس ترجمۂ مبارک میں مفسرین کا اتباع کیا گیا ہے۔ اور جن مشکلات اور ان کے حل مفسرین نے صفحات میں جاکر بمشکل بیان فرمائے ہیں اس محسنِ اہلِ سنّت نے اس ترجمہ کے چند الفاظ میں کھول کر رکھ دیا ہے۔''

(حیاتِ مولانا احمد رضا خاں بریلوی از پروفیسر مسعود احمد، مطبوعہ ممبئی، ص ۲۱، ۲۲)

(۶) علامہ ارشد القادری:

''عربی زبان پھیلے ہوئے معانی کو اپنے اندر سمیٹنے کی جو صلاحیت رکھتی ہے اردو زبان بہت حد تک اس سے محروم ہے لیکن اسے زبان اور تعبیر پر امام احمد رضا بریلوی کی غیر معمولی قدرت ہی کہا جائے گا کہ اردو کی تنگ دامنی کے باوجود انہوں نے اپنے اردو ترجمے میں اختصار اور جامعیت کی نادر مثال قائم کی ہے۔ اختصار کا حال تو آپ حرفوں کو گن کر معلوم کرلیں گے لیکن جامعیت کا اندازہ اس بات سے لگائیں کہ پورے کنزالایمان میں آیت کا مفہوم واضح کرنے کے لیے انہیں عبارت میں ہلالین کا پیوند جوڑنے کی کہیں ضرورت پیش نہیں آئی۔ کیونکہ ترجمہ ہی اتنا جامع اور صاف ہے کہ وہی وضاحت کے لیے بہت کافی ہے۔''

(تجلیاتِ رضا۔ کنزالایمان کا مطالعہ تین رُخ سے، ص ۵۳ مطبوعہ دارالکتب دہلی)

(۷) مولانا عبدالحکیم شرف قادری...... جامعہ نظامیہ، لاہور، پاکستان:

''قرآن کو سمجھنے کے لیے صرف عربی زبان، صرف ونحو، علم معانی، بیان، بدیع وغیرہ علوم میں مہارت کافی نہیں، تفسیر وحدیث' عقاید وکلام اور تاریخ وسیرت کا وسیع مطالعہ ہی کافی نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ اور صاحبِ قرآن ﷺ سے صحیح ایمانی و روحانی تعلق بھی ضروری ہے۔ اور ترجمہ نگاروں میں امام احمد رضا بریلوی قدس سرہ العزیز ممتاز ترین مقام پر فائز ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں پچاس سے زیادہ علوم میں حیرت انگیز مہارت عطا فرمائی تھی۔ وہ عارف باللہ بھی تھے اور صبغۃ اللہ سے مزین بھی۔ ساتھ ہی آپ اللہ تعالیٰ اور اس کے حبیب اکرم ﷺ کی محبت میں فدا تھے۔ سرکارِ دو عالم ﷺ کے توسط سے ان کے دل پر فیوضِ الٰہیہ کی بارش ہوتی تھی۔ اسی لیے انھوں نے قرآن پاک کا بے مثل اردو ترجمہ ''کنزالایمان فی ترجمۃ القرآن'' کے نام سے کیا۔ مخالفین کی سازشوں کی بنا پر بعض ممالک میں اس پر پابندی عائد کی گئی لیکن بحمدللہ اس کی خداداد مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ اس کی مانگ سب تراجم سے زیادہ ہے۔''

(کنزالایمان کی عرب دنیا میں پذیرائی ص ۹، ۱۰ ادارۂ تحقیقاتِ امام احمد رضا کراچی)

(۸) مولانا کوثر نیازی:

''کنزالایمان تمام اردو تراجم میں عشق افروز اور ادب آموز ترجمہ ہے۔ یہ عشق رسول ﷺ کا خزینہ اور معارفِ اسلامی کا گنجینہ ہے۔''

(امام احمد رضا ایک ہمہ جہت شخصیت، مطبوعہ راج محل بہار، ص۲۲)

(۹) مولانا بدرالدین احمد قادری:

''دورِ حاضر میں اردو کے شائع شدہ ترجموں میں صرف ایک ترجمہ ''کنزالایمان'' ہے جو قرآن کا صحیح ترجمان ہونے کے ساتھ (۱) تفاسیر معتبرہ قدیمہ کے مطابق ہے (۲) اہلِ تفویض کے مسلک اسلم کا عکاس ہے (۳) اصحابِ تاویل کے مذہب سالم کا مؤید ہے (۴) زبان کی روانی اور سلاست میں بے مثل ہے (۵) عوامی لغات اور بازاری بولی سے یکسر پاک ہے (۶) قرآن حکیم کے اصل منشا و مراد کو بتاتا ہے (۷) آیاتِ ربانی کے اندازِ خطاب کو پہچنواتا ہے (۸) قرآن کے مخصوص محاوروں کی نشان دہی کرتا ہے (۹) قادرِ مطلق کی ردائے عزت و جلال میں نقص و عیب کا دھبہ لگانے والوں کے لیے شمشیر براں ہے (۱۰) حضراتِ انبیا کی عظمت و حرمت کا محافظ و نگہبان ہے۔ (۱۱) عامۂ مسلمین کے لیے بامحاورہ اردو میں سادہ ترجمہ ہے (۱۲) لیکن علما و مشائخ کے لیے حقائق و معرفت کا اُمنڈتا سمندر ہے۔

بس اتنا سمجھ لیجیے کہ قرآن حکیم قادرِ مطلق جل جلالہ کا مقدس کلام ہے اور کنزالایمان اس کا مہذب ترجمان ہے اور کیوں نہ ہو کہ یہ ترجمہ اس کا پیش کردہ ہے جو عظمتِ مصطفیٰ علیہ الصلاۃ والثناء کا علم بردار، تائید رحمانی کا سرمایہ دار، انوارِ ربانی کا حامل، حقائق قرآن کا ماہر، دقائق آیات کا عارف ہے۔''

(سوانح اعلیٰ حضرت، ص ۳۶۶ مطبوعہ رضا اکیڈمی ممبئی)

(۱۰) علامہ غلام رسول سعیدی......جامعہ نعیمیہ لاہور، پاکستان:

''اس ترجمہ (کنزالایمان) میں اردو، عربی کے اسلوب میں رنگی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور فصاحت و بیان کے آئینہ میں اعجازِ قرآن کا عکس نظر آتا ہے۔ اس ترجمہ میں علمِ کلام کی اُلجھی ہوئی گتھیاں سلجھا کر عبارت کے سلیس فقروں میں رکھ دی گئی ہیں۔

ذات و صفات، جبر و قدر اور نبوت و رسالت کے نازک مسائل کو جس عمدگی اور اختصار کے ساتھ ترجمہ کی سحر کاری سے سہل کیا ہے۔ امام رازی اگر اسے دیکھ

پاتے تو بے اختیار آفرین کہتے۔ ابن عطا و جبائی کے سامنے یہ ترجمہ ہوتا تو شاید اعتزال سے توبہ کر لیتے۔ خلۂ تصوف سے جس طرح اعلیٰ حضرت نے آیات کے بطن کو ترجمہ میں ڈھالا ہے، غزالی ہوتے تو دیکھ کر وجد کرتے۔ ابن عربی شاد کام ہوتے اور سہروردی دعائیں دیتے۔ ترجمے کے ضمن میں جو فقہی نگینے لائے ہیں اگر امام اعظم پر پیش کیے جاتے تو یقیناً مرحبا کہتے اور اگر ابن عابدین اور سید طحطاوی کے سامنے یہ فقہی آبگینے ہوتے تو اعلیٰ حضرت سے تلمذ کی آرزو کرتے۔

قرآن مجید کے علوم و فنون، اس کی فصاحت و بلاغت اور اس کی تاویل و تفسیر پر جو شخص نگاہ رکھتا ہو وہ جب اس ترجمہ کو پڑھے گا تو یقیناً سوچے گا کہ اگر قرآن مجید اردو میں اُترا ہوتا تو یہ عبارت اس کے قریب تر اور جو فصاحتِ زبان سے آشنا ہو اُسے کہنا پڑے گا کہ اس ترجمے میں زبان و بیان کی بلاغت اعجاز کی سرحدوں کو چھوتی معلوم ہوتی ہے۔"

(محاسنِ کنز الایمان، مطبوعہ مکتبہ الحبیب الہ آباد، ص ۷۔۸)

(۱۱) علامہ اختر رضا خاں ازہری...... جانشین حضور مفتی اعظم ہند

"معترض بہادر یہ سنتے چلیں کے امام احمد رضا کا وہ ترجمہ جسے انہوں نے اردو کے ترجموں کی بنا پر غلط بتایا تھا وہ علما کے نزدیک نہ صرف صحیح ہے بلکہ ایسا مشہور ہے کہ محتاجِ بیان نہیں۔ تو وہ جو ہم نے کہا تھا کہ ہر غیر مشہور غلط نہیں ہوتا محض تنزل تھا اور اردو کے ترجموں کی ہی حد تک تھا نیز ان ارشادات کے پیش نظر ترجمۂ رضویہ کو دیگر تراجم پر فوقیت ظاہر جیسا کہ ہم پہلے بیان کر آئے تو اس کے مقابل دیگر تراجم کو لانا جہل ہے"۔

(دفاعِ کنز الایمان، مطبوعہ ادارہ سُنّی دنیا، بریلی شریف، ص ۵۷)

(۱۲) ڈاکٹر محمد طاہر القادری:

"اعلیٰ حضرت کے ترجمۂ کنز الایمان میں فہم و تدبر کا وہ عالم ہے کہ وہ علوم و معارف اور مطالب و معانی جو تفسیر کے ان گنت اوراق پر بکھرے پڑے ہیں، کنز الایمان کے ایک ایک لفظ میں سمو دیے گئے ہیں۔ وہ فقہی مسائل جن کے لیے بڑی بڑی کتابوں کا مطالعہ کرنا پڑتا ہے، اعلیٰ حضرت کے ترجمے نے کمالِ اختصار کے ساتھ انھیں اپنے اندر سمولیا ہے۔ اسی طرح وہ لغوی مباحث اور مختلف اشتقاقات جن کے لیے لغت کی

بیسیوں کتب کا مطالعہ کرنا پڑتا ہے، کنزالایمان کا ایک ایک لفظ ان بحثوں کو اپنے دامن میں لیے ہوئے ہیں۔ یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ کنزالایمان پڑھنے کے بعد نہ تو قاری کو متعلقہ مسائل میں کتبِ فقہ کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت رہتی ہے اور نہ ہی لغت یا کتب تفسیر کی جانب۔"

(کنزالایمان کی فنی حیثیت، مطبوعہ دارالعلوم محمدیہ حیدرآباد الہند، ص ۲۳)

(۱۳) علامہ سید محمد مدنی کچھوچھوی...... جانشین حضور محدث اعظم ہند

"ان تمام مباحث کو بغور دیکھ لینے کے بعد امام احمد رضا کے ترجمے کی اہمیت کا اندازہ لگتا ہے کہ اس قدر طویل بحث و تمحیص کے بعد جو حقیقت سامنے آئی اس کو امام احمد رضا نے اپنے ترجموں کے مختصر سے فقروں میں سمو دیا ہے اور اس احتیاط سے یہ کام انجام دیا کہ نہ کسی اسلامی عقیدے پر آنچ آئی، نہ بارگاہِ رسالت کے آداب میں کوئی فرق ہوا، نہ محاورے کی پیشانی پر کوئی شکن پڑی، نہ اصحابِ تاویل کی روش پر ارشادِ ربانی کے مقصود کا دامن ہاتھ سے چھوٹا، نہ اصولی اور لغوی حقائق سے روگردانی کی اور نہ ہی اولیاے کاملین اور اسلاف متقدمین کے راستے سے ہٹے۔

بے شک ایں سعادت بزور بازو نیست ...... تا نہ بخشد خدائے بخشندہ"۔

(المیزان، امام احمد رضا نمبر ممبئی ۱۹۷۶ء، ص ۹۸)

(۱۴) پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعود احمد، کراچی:

"وہ ایک باخبر، ہوش مند اور باادب مترجم تھے۔ ان کے ترجمے کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے آنکھیں بند کر کے ترجمہ نہیں کیا بلکہ وہ جب کسی آیت کا ترجمہ کرتے تھے تو پورا قرآن، مضامینِ قرآن اور متعلقاتِ قرآن اُن کے سامنے ہوتے تھے۔ آپ کے ترجمۂ قرآن میں برسوں کی فکری کاوشیں پنہاں ہیں۔ مولیٰ تعالیٰ کا کرم ہے کہ وہ اپنے بندے کو ایسی نظر عطا فرمادے جس کے سامنے علم و دانش کی وسعتیں سمٹ کر ایک نقطہ پر آجائیں۔ فی البدیہہ ترجمۂ قرآن میں ایسی جامعیت کا پیدا ہوجانا عجائباتِ عالم میں سے ایک عجوبہ ہے۔"

("چشم و چراغ خاندانِ برکاتیہ" مشمولہ سالنامہ معارف رضا، کراچی ۲۰۰۴ء، ص ۸۷)

(۱۵) مولانا یٰسین اختر مصباحی...... دارالقلم دہلی

"کنزالایمان عظمتِ توحید کا محافظ ہے اور احترامِ انبیا و صالحین کا داعی بھی۔

کنزالایمان نے الفاظِ قرآن کے پیکر کو سامنے رکھتے ہوئے روحِ قرآن کو بڑی حد تک اپنے اندر جذب کرلیا ہے۔ کنزالایمان میں صحتِ مفہوم و معنی بھی ہے اور حسنِ ترجمہ بھی۔ کمال و جامعیت اس کا طرۂ امتیاز اور اختصار و سلاست اس کا خوبصورت زیور۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ کنزالایمان اردو زبان کے اندر صحیح معنوں میں موضحِ قرآن بھی ہے اور ترجمانِ قرآن بھی، تفہیمِ قرآن بھی ہے اور تذکیرِ قرآن بھی، تدبرِ قرآن بھی ہے اور بیانِ قرآن بھی، ضیاءِ قرآن بھی ہے اور انوارِ قرآن بھی، روحِ قرآن بھی ہے اور فیضانِ قرآن بھی، معارفِ قرآن بھی ہے اور محاسنِ قرآن بھی، نظمِ قرآن بھی ہے اور جمالِ قرآن بھی۔

اور اس کا بے مثال و باکمال مترجم ان عالمانہ صفات، مفسرانہ خصائص اور مومنانہ اوصاف و کمالات کا جامع ہے۔ جس کے بارے میں بڑے اعزاز و افتخار کے ساتھ یہ کہا جاسکتا ہے کہ

سالہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات تاز بزمِ عشق دانائے راز آید بروں

(معارفِ کنزالایمان، مطبوعہ رضوی کتاب گھر دہلی، ص ۵۷)

(۱۶) مفتی محمد مطیع الرحمٰن رضوی:

"امام احمد رضا نے صدر الشریعہ مولانا امجد علی کی درخواست اور مسلسل اصرار پر ۱۳۳۰ھ مطابق ۱۹۱۱ء کو قرآن کریم کا اردو زبان میں فی البدیہہ کرایا۔ مگر دوسرے مترجمین کی طرح لغت دیکھ کر لفظ کے نیچے لفظ نہیں رکھا۔ جس سے تقدیسِ باری پر حرف آئے یا شانِ رسالت کا خون ہو بلکہ کلامِ الٰہی کے تمام ممکنہ متقضیات کا لحاظ رکھتے ہوئے نہایت ہی پاکیزہ اور مقدس لفظوں میں صاف، سلیس اور شستہ ترجمہ کیا ہے۔"

(امام احمد رضا حقائق کے اجالے میں، مطبوعہ المجمع المصباحی مبارک پور، ص ۱۱)

(۱۷) مولانا محمد عبدالمبین نعمانی ...... دارالعلوم قادریہ چریاکوٹ مئو یوپی:

"قرآن پاک کے تراجم تو بہت سے منظر عام پر آئے اور آرہے ہیں مگر آپ نے عشق و ایمان میں ڈوب کر جو ترجمہ قرآن کنزالایمان اپنے خلیفہ و تلمذ صدر الشریعہ علامہ محمد امجد علی اعظمی علیہ الرحمہ کے ہاتھوں قلم بند کرایا ہے، وہ علوم و معارف اور عشق و محبت کا گنجینہ ہے۔ اس کی سطر سطر آپ کے علمی مقام و مرتبے کی سچی تصویر ہے۔ اس ترجمے کو دیکھنے کے بعد دیگر تراجم پھیکے نظر آتے ہیں۔ آپ کا یہ ترجمہ

ایک طرف اردو زبان و ادب کا شاہکار ہے تو دوسری طرف قرآنِ حکیم کی صحیح ترجمانی کا منہ بولتا ثبوت بھی اور ایجازِ بیانی میں بھی یہ ترجمہ قرآن اپنی مثال آپ ہے۔ یہ بات بھی توجہ کے لائق ہے کہ آج پوری دنیا میں کوئی ترجمۂ قرآن کثرتِ اشاعت میں اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ دنیا کی کئی زبانوں میں اس کا ترجمہ بھی ہوچکا ہے۔ طویل تفسیری مباحث کو چند لفظوں میں سمیٹ کر بیان کرنا بڑے کمال کی بات ہے اور یہ کمال اہل علم کو کنزالایمان میں جگہ جگہ بکھرا ملے گا۔''

(امام احمد رضا اور ان کی تعلیمات، نوری مشن مالے گاؤں، ص ۳)

(۱۸) مفتی ڈاکٹر محمد مکرم احمد......شاہی امام مسجد فتح پوری، دہلی:

''یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ فاضل بریلوی علمی اور ادبی صلاحیتوں میں معاصرین اور متاخرین میں بہت اعلیٰ مقام رکھتے ہیں۔ ان کے پایہ کا عالم نہ ان کے دور میں تھا نہ آج ہے۔ قرآن کریم کا محتاط اور جامع ترجمہ وہی عالم کرسکتا ہے جس کو عربی، فارسی اور اردو زبانوں میں مہارت ہو، جو محاورات اور ادبی فصاحت و بلاغت سے خوب واقف ہو۔ جو سیرتِ پاکِ مصطفےٰ ﷺ سے باخبر ہو۔ جس کو علومِ قرآنیہ کے ساتھ ساتھ فنِ حدیث پر بھی مکمل دسترس ہو۔ جو آیتِ کریمہ کے شانِ نزول اور اس وقت کے کوائف و حالات سے باخبر ہو۔ جس کے پاس عشقِ مصطفےٰ ﷺ کا خزانہ ہو۔ جو مکمل خشوع و خضوع کے ساتھ بین الخوف والرجا لکھنے کا عادی ہو۔ جب ہم فاضل بریلوی کی حیات اور علمی مقام و مرتبہ کا جائزہ لیتے ہیں تو صرف وہ ہی مجمع الکمالات کے پیکر میں سامنے آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ''کنزالایمان'' دنیا بھر میں مقبول ہے۔ نہ صرف عوام و خواص بلکہ ہر طبقۂ فکر کے علما اس سے استفادہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔''

(سہ ماہی افکار رضا ممبئی، جولائی تا دسمبر ۲۰۰۰ء، ص ۱۱)

(۱۹) ڈاکٹر عبدالنعیم عزیزی:

''کنزالایمان خزانۂ ایمان بھی ہے اور خزانۂ علم و عرفان بھی۔ بدمذاہب کے تراجمِ قرآن نے تقدیسِ الوہیت، عصمتِ رسالت اور صداقتِ اسلام پر ضرب کاری لگا کر مسلمانوں کو گمرہی کے دلدل میں ڈھکیلنے اور اعدائے اسلام کو اسلام کو بدنام کرنے کا جو سامان فراہم کیا تھا، امام احمد رضا کے ترجمۂ قرآن نے ان کے تارو پود بکھیر دیے۔ مسلمانوں کے عقیدہ و ایمان کے شہرستان میں اُجالا برپا کردیا اور زمانہ پر

اسلام کی حقانیت واضح کردی۔ پیغمبر اسلام علیہ السلام کی عظمت و رفعت کا سکہ بٹھا دیا اور شہر شہر سے لیکر گھر گھر اور قلب و جگر اور فکر و نظر میں محبتِ الٰہی اور عشق و احترام رسالت پناہی کی شمعیں فروزاں کردیں۔

کنزالایمان کا لفظ لفظ معتبر اور منشاے قرآن کے مطابق ہے اور اس ترجمہ سے امام احمد رضا کی قرآن فہمی، علمی و ادبی شان، تجدیدی آن بان اور عشقِ مصطفوی کے تب و تاب اور توانائی کی شعاعیں مچلتی نظر آتی ہیں۔ ترجمۂ قرآن کا یہ تقدیسی کارنامہ بھی اُمتِ مسلمہ پر بلکہ عالمِ انسانیت پر بھی امام احمد رضا کا ایک عظیم احسان ہے"۔

(کنزالایمان اور تحقیقی امور۔ غلام مصطفےٰ رضوی، ص۲)

(۲۰) ڈاکٹر غلام یحیٰ انجم...... ریڈر شعبۂ اسلامیات، ہمدرد یونی ورسٹی، نئی دہلی:

''فاضل بریلوی مولانا الشاہ احمد رضا قادری کو فتاویٰ رضویہ کے علاوہ اور جن تصانیف نے شہرتِ دوام بخشی، ان میں ''کنزالایمان'' کا خصوصی مقام ہے۔ قرآنِ حکیم کے اس ترجمے نے حق و صداقت کی دنیا میں اپنا وقار اور معیار صرف برقرار ہی نہیں رکھا، بلکہ اس نے ایوانِ باطل میں تہلکہ مچا دیا ہے۔ اس ترجمہ میں توحید ربانی اور ناموسِ رسالت کا پاس ہر انداز میں موجود ہے۔''

(چند سطریں بعد) ''امام احمد رضا نے قرآنِ حکیم کا ترجمہ کر کے ملتِ اسلامیہ پر احسانِ عظیم کیا ہے اور وہ اس لیے کہ جتنے قرآنی تراجم موجود تھے اس میں کسی نہ کسی طرح شانِ رسالت میں تنقیص کے پہلو نمایاں تھے اور کماحقہٗ عظمتِ توحیدِ ربانی کا اظہار نہیں ہوا تھا۔ مگر آپ کا ترجمہ ان تمام خامیوں سے قطعاً مبرا ہے۔ اس ترجمے کے سلسلے میں خاص بات یہ ہے کہ قرآن حکیم کے جتنے تراجم اردو زبان میں کیے گئے ہیں، ان میں سے چند ہی تراجم ایسے موجود ہیں براہ راست قرآن کی عربی عبارات سے جو منتقل ہوئے ہیں۔ ان میں سے آپ کا ترجمہ کنزالایمان بھی ہے۔ بیش تر تراجمِ قرآن ایک دوسرے تراجم کی نقل یا اس کا چربہ ہیں۔''

(پیغام رضا کا امام احمد رضا نمبر۔ ۱۹۹۷ء ص ۷۷)

(۲۱) سیّد وجاہت رسول قادری...... صدر ادارۂ تحقیقات امام احمد رضا، کراچی:

''کنزالایمان، احادیثِ مبارکہ، صحابۂ کرام، تابعین، تبع تابعین اور اسلاف کرام کی تفاسیر کا نچوڑ ہے اور یہ کہ اس میں کوئی خلاف شرع یا خلاف اسلام مواد نہیں ہے۔

یہاں ہم امام احمد رضا سے علمی اور مسلکی اختلافات رکھنے والے علما اور اسکالرز سے بھی درخواست گزار ہیں کہ آپ علم و تحقیق کے میدان میں ذاتی بغض و عناد، گروہی حسد اور مسلکی تعصب کی عینک اتار کر "نگاہِ عشق و مستی" کی ٹھنڈی روشنی میں "کنزالایمان" کا مطالعہ کریں ان شاء اللہ آپ کو یہاں "ایمان" کا بیش بہا خزانہ" اور عشقِ مصطفوی ﷺ کی "دولتِ بیدار" ملے گی۔ امام احمد رضا محدث بریلوی کو ہر قسم کے تعصب سے بالاتر ہو کر علم کی کسوٹی پر رکھیں۔ ان شاء اللہ اُن کو کھرا پائیں گے اور فکری اتحاد و یگانگت کی راہ پیدا ہوگی۔ جس کی آج ہمیں شدید ضرورت ہے۔ "دانشِ نورانی" کی روشنی میں ان کی شخصیت و تصانیف کا مطالعہ کریں ان شاء اللہ اندھیروں سے اُجالوں میں آ جائیں گے۔ اس لیے کہ نورِ بصیرت سے مزین مطالعہ اندھیروں سے اجالے کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔"

(سہ ماہی افکار رضا، ممبئی جولائی تا دسمبر ۲۰۰۰ء، ص ۱۴)

(۲۲) ڈاکٹر مجید اللہ قادری:

"امام احمد رضا بریلوی کے ترجمہ قرآن کا ایک امتیازی پہلو دیگر معروف اردو قرآنی مترجمین کے مقابلے میں یہ ہے کہ جو جامعیت، معنویت اور مقصدیت قرآن کے کلمات میں پوشیدہ ہے اس کی مکمل جھلک امام موصوف کے ترجمے میں نمایاں ہے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے کہ مترجم کے ذہن میں وہ تمام تفاسیر، لغوی معنیٰ، اس کے متعلق احادیثِ مبارکہ اور اقوالِ صحابہ موجود ہو۔ اور ساتھ ہی ساتھ قوتِ حافظہ بھی اتنا قوی ہو کہ وہ کمپیوٹر کی طرح کام کرے، جس طرح کمپیوٹر کا بٹن دبا کر مطلوبہ معلومات (Information) یکجا طور پر ایک ہی نظر میں اسکرین پر دیکھی جاسکتی ہے۔ اسی طرح مترجم کا ذہن بھی اتنا قوی اور فعال ہو کہ فوراً ان تمام کلمات کے مقامات کو یکجا کر کے اور ان کی جامعیت، معنویت اور مقصدیت کے پیشِ نظر ایسے الفاظ کا انتخاب کرے کہ ترجمہ میں کسی قسم کی تشنگی باقی نہ رہے اور نہ عبارت میں کوئی جھول۔ حقیقت میں بلا امتیاز اگر امام احمد رضا کے ترجمہ کا بغور مطالعہ کیا جائے تو محسوس ہوگا کہ یہ ترجمہ تفاسیر اور لغات کی مستند کتب کی عکاسی کرتا ہے۔"

(کنزالایمان اور معروف قرآنی تراجم، ادارۂ تحقیقات امام احمد رضا کراچی، ص ۵۳۲، ۵۳۳)

(۴۳) ڈاکٹر صابر سنبھلی ...... صدر شعبۂ اردو ایم۔ایچ (پی جی) کالج مرادآباد:

"یہ ترجمۂ قرآن امام احمد رضا علیہ الرحمہ کا مسلمانوں کے لیے عمدہ تحفہ ہے۔ عام طور سے یہ بات بھی لوگوں کی معلوم نہیں کہ اس ترجمے کے لیے کوئی خاص اہتمام نہیں کیا گیا تھا۔ جولوگ امام احمد رضا کی تصنیفی اور خاص کر فتاویٰ نویسی کی مصروفیات سے واقف ہیں وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ ان کے پاس وقت کی کتنی کمی تھی۔ ان کے عزیز شاگرد و صدرالشریعہ مولانا امجد علی اعظمی مصنف بہار شریعت چاہتے تھے کہ اگر امام احمد رضا قرآن کریم کا اردو میں ترجمہ کردیں تو وہ اُن کے علم و فضل اور عشق رسول کی وجہ سے ایک لاثانی ترجمہ بن جائے گا۔ انہوں نے اس کے لیے کئی بار فاضلِ بریلوی سے عرض کیا لیکن باوجود وعدوں کے اس کے لیے وقت نہیں نکل سکا۔ آخر یہ طے پایا کہ صدر الشریعہ دوپہر کو قیلولہ کے وقت یا رات کو سوتے وقت فاضلِ بریلوی کے پاس پہنچ جایا کرے اور ایسا ہی ہوا۔ ترجمہ کا طریقہ یہ رہا کہ صدر الشریعہ آیاتِ قرآنی پڑھتے جاتے اور آپ ان کا ترجمہ املا کراتے جاتے۔ مترجم کے پاس نہ تفاسیر قران دیکھنے کی فرصت تھی، نہ ترجمہ کی زبان پر نظر ثانی کرنے کا وقت، چاہیے تھا کہ ایسی رواداری (بلکہ بھاگ دوڑ) میں کیا گیا ترجمہ معمولی ترجمہ ہوتا، لیکن یہ مترجم علیہ الرحمہ پر اللہ رب العزت کا کرم خاص تھا کہ یہ ترجمہ اردو ترجمہ میں شاہ کار ہوگیا۔ یہ کام ۱۳۳۰ھ مطابق ۱۹۱۲ء میں مکمل ہوا۔"

(سہ ماہی افکار رضا، ممبئی جولائی تا دسمبر ۲۰۰۰ء، ص ۱۶)

(۴۴) سید صابر حسین شاہ بخاری:

"یوں تو قرآن کریم کے کئی تراجم ہیں لیکن اعلیٰ حضرت بریلوی علیہ الرحمہ کے ترجمہ "کنزالایمان" کو بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ اس کی اشاعت کئی لاکھوں تک پہنچ چکی ہے۔ اسے کئی زبانوں میں بھی منتقل کردیا گیا ہے۔ اس کے محاسن پر درجنوں مقالات منظر عام پر آچکے ہیں۔ اس کی مقبولیت کی وجہ صرف یہ ہے کہ یہ عشق مصطفےٰ علیہ التحیۃ والثناء ﷺ میں ڈوب کر لکھا گیا ہے۔"

(سہ ماہی افکار رضا ممبئی، جولائی تا ستمبر ۱۹۹۹ء، ص ۴۲)

(۴۵) مولانا رضاء المصطفےٰ اعظمی ...... مہتمم المجد داحمد رضا اکیڈمی، کراچی:

"یوں تو آپ کے علمی کارناموں کی تفصیل بڑی طویل ہے لیکن ان میں سب سے

بڑا علمی کارنامہ ترجمۂ قرآن مجید ہے۔ ترجمہ کیا ہے قرآن حکیم کی اردو میں ترجمانی ہے۔ بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ آپ کا یہ ترجمہ الہامی ترجمہ ہے تو کچھ غلط نہ ہوگا۔
اعلیٰ حضرت نے جملہ مستند و مروج تفاسیر کی روشنی میں قرآن حکیم کی ترجمانی فرمائی ہے۔ جس آیت کی وضاحت مفسرین کرام کئی کئی صفحات میں فرمائیں۔ مگر اعلیٰ حضرت کو اللہ تعالیٰ نے یہ خوبی عنایت فرمائی کہ وہی مفہوم ترجمہ کے ایک جملہ یا ایک لفظ میں ادا فرمایا۔ قلیل جملہ کثیر مطالب اسی کو کہتے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ اعلیٰ حضرت کے ترجمے سے ہر پڑھنے والے کی نگاہ میں قرآنِ کریم کا احترام، انبیا کی عظمت اور انسانیت کا وقار بلند ہوتا ہے۔"

(قرآن شریف کے غلط ترجموں کی نشاندہی، ص۴ مطبوعہ رضوی کتاب گھر بھیونڈی)

(۲۶) ڈاکٹر محمد ہارون...... سابق استاذ آکسفورڈ یونی ورسٹی برطانیہ

"امام احمد رضا نے رسولِ اکرم ﷺ پر کسی بھی طرح کی تنقید کرنے یا اُن کی عظمت و کمال میں کوئی بھی شک پیدا کرنے کی اجازت دینے سے انکار کیا۔ انہوں نے پیغمبر اسلام ﷺ کے مرتبہ و کمال کو گھٹانے والے وہابی تراجم قرآن کے مقابلے میں اردو زبان میں قرآن حکیم کا بہت ہی خوبصورت ترجمہ پیش کیا۔

(پیغامِ رضا کا خصوصی شمارہ مارچ ۲۰۰۷ء، ص۶۲)

(۲۷) ڈاکٹر ظہور احمد اظہر...... چیرٔ مین شعبہ عربی پنجاب یونی ورسٹی لاہور:

"فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت ہشت پہلو ہی نہیں ہمہ جہت ہے۔ اُن کی سیرت و شخصیت کے تمام پہلوؤں کا احاطہ واستیعاب بہت مشکل کام ہے۔ ان کا خوبصورت ترجمۂ قرآن کریم کنز الایمان تمام قدیم و جدید تراجم میں منفرد ہے۔ شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین کے وقتوں میں بھی ابھی اردو زبان ناپختہ تھی لیکن مولانا احمد رضا خاں کے عہد تک اردو زبان کافی منجھی ہوئی زبان بن چکی تھی پھر چونکہ وہ اہلِ زبان تھے، اس لیے اردو کے ساتھ ہندی پر بھی انھیں قدرت حاصل تھی اور عربی زبان میں بھی انھیں کمال حاصل تھا۔ اس طرح عربی اور اردو دونوں زبانوں کا عالم اور شاعر و ادیب ہونے کے باعث انھیں ترجمۂ قرآن کرتے وقت ہر دو زبانوں پر قدرت کے عملی مظاہرہ کا موقع ملا اور بے ساختہ ترجمۂ قرآن مکمل ہوگیا تو آپ نے اسے کنز الایمان فی ترجمۃ القرآن کا خوبصورت نام دیا۔ مولانا کے اس ترجمے میں

مناسب الفاظ کی آمد اور حسین اسلوب بیان کا امتیازی رنگ دکھائی دیتا ہے۔ ٹھیٹھ اردو الفاظ کے ساتھ قرآن کریم کے عربی الفاظ کا نہایت عمدہ اور موزوں امتزاج ملتا ہے۔''

(ماہنامہ معارف رضا کراچی جولائی ۲۰۰۵ء، ص۲۲)

(۲۸) **ڈاکٹر جمیل احمد ...... چیئر مین شعبۂ عربی کراچی یونی ورسٹی:**

''امام احمد رضا بریلوی کا ترجمۂ قرآن بڑا محتاط، مثالی، بامحاورہ اور سلیس ہے''۔

(حکیم محمد موسیٰ امرتسری نمبر۔ جہانِ رضا لاہور اکتوبر نومبر ۲۰۰۰ء ص۱۳۲)

(۲۹) **ڈاکٹر رشید احمد جالندھری ...... ڈائریکٹر ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، پاکستان:**

''سورۂ والضحیٰ میں آں حضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بارے میں ارشادِ خداوندی ہے:

''ووجدک ضالا فھدی'' مولانا (احمد رضا) اس کا ترجمہ یوں کرتے ہیں: اور تمہیں اپنی محبت میں خود رفتہ پایا تو اپنی طرف راہ دی۔ آں حضرت ﷺ کے بارے میں ہمیں معلوم ہے کہ زمانۂ نبوت سے پہلے بھی ان کے دامنِ وقار و تمکنت پر قبائلی رسم و رواج یا اہلِ مکہ کی بُت پرستی و گمراہی کا کوئی داغ نہیں ہے، اس لیے اس آیت کریمہ میں لفظ ضلال کا وہی ترجمہ زیادہ مناسب ہے جو مولانا نے کیا ہے۔''

(پیغامِ رضا کا امام احمد رضا نمبر۔۱۹۹۷ء ص ۱۹۱)

(۳۰) **پروفیسر رفعت جمال صاحبہ ...... صدر شعبۂ اردو بنارس ہندو یونی ورسٹی، بنارس انڈیا:**

''انہوں نے عشقِ رسول سے سرشار ہوکر قرآن مجید کا ترجمہ فصاحت و بلاغت کو مدنظر رکھ کر بہت ہی محتاط انداز میں نہایت سلیس، شگفتہ اور روز مرہ کی زبان میں کیا جو اردو نثر کا عظیم شاہ کار ہے۔''

(ماہنامہ معارف رضا کراچی جولائی ۲۰۰۵ء ص ۳۱)

(۳۱) **مولانا سعید بن یوسف زئی ...... امیر جمعیت اہلحدیث، پاکستان:**

''یہ (کنز الایمان) ایسا ترجمۂ قرآن مجید ہے جس میں پہلی بار اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ جب ذاتِ باری تعالیٰ کے لیے بیان کی جانے والی آیتوں کا ترجمہ کیا گیا ہے تو بوقتِ ترجمہ اس کی جلالت، علوت، تقدس و عظمت و کبریائی کو بھی ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے جب کہ دیگر تراجم خواہ وہ اہلِ حدیث سمیت کسی بھی مکتب فکر کے علما کے ہوں، ان میں یہ بات نظر نہیں آتی۔ اس طرح وہ آیتیں جن کا تعلق محبوبِ خدا، شفیع روزِ جزا، سید الاولین والآخرین، امام الانبیا حضرت محمد مصطفےٰ ﷺ سے ہے

یا جن میں آپ سے خطاب کیا گیا ہے تو بوقتِ ترجمہ مولانا احمد رضا خاں صاحب نے یہاں پر بھی اوروں کی طرح نقلی ولغوی ترجمے سے کام نہیں لیا۔ بلکہ صاحب ما ینطق عن الھوی' اور ورفعنا لک ذکرک کے مقامِ عالی شان کو ہر جگہ ملحوظ خاطر رکھا ہے۔ یہ ایک ایسی خوبی ہے جو دیگر تراجم میں بالکل ہی ناپید ہے۔''

(کنزالایمان اہلِ حدیث کی نظر میں، مشمولہ معارفِ رضا ۱۹۸۳ء، ص ۹۰)

(۳۲) ماہ نامہ الحسنات (جماعتِ اسلامی ہند کا ترجمان) رام پور۔ انڈیا:

''فقہ میں جدالممتار اور فتاویٰ رضویہ کے علاوہ ایک اور علمی کارنامہ ترجمۂ قرآن مجید ہے جو ۱۳۳۰ھ/۱۹۱۱ء میں ''کنزالایمان فی ترجمۃ القرآن'' کے نام سے منظرِ عام پر آیا اور جس کے حواشی ''خزائن العرفان فی تفسیر القرآن'' کے نام سے مولوی نعیم الدین مرادآبادی نے تحریر فرمائے۔ یہ ترجمہ اس حیثیت سے ممتاز نظر آتا ہے کہ جن چند آیاتِ قرآنی کے ترجمے میں ذرا سی بے احتیاطی سے حق جل مجدہ اور آنحضرت ﷺ کی شانِ اقدس میں بے ادبی کا شائبہ نظر آتا ہے۔ احمد رضا خاں نے ان کے بارے میں خاص احتیاط برتی ہے۔''

(شخصیات نمبر۔ ماہ نامہ الحسنات، رام پور ۱۹۷۹ء، ص ۵۴-۵۵)

(۳۳) ڈاکٹر صالحہ عبدالحکیم شرف الدین:

''امام احمد رضا قرآن میں غیر معمولی بصیرت رکھتے تھے۔ امام احمد رضا کا شمار عالمِ اسلام کے اُن خواص علما میں ہوتا ہے جن کی قامت پر ''رسوخ فی العلم'' کی قبا راست آتی ہے۔ قرآنِ کریم سے اُن کو غیر معمولی شغف تھا۔ انھوں نے اللہ کے کلام میں غیر معمولی تدبّر کیا۔ اسی مسلسل تدبر وفکر کا نتیجہ تھا کہ امام احمد رضا کو قرآن پاک سے خاص نسبت ہوگئی۔ ان کا ترجمۂ قرآن ان کے برسوں کے فکر و تدبر کا نچوڑ ہے۔''

(کنزالایمان اور معروف قرآنی تراجم، ادارۂ تحقیقات امام احمد رضا کراچی، ص ۳۳۶)

منظومات

امام احمد رضا بریلوی قدس سرہٗ پر نثری و شعری اظہاریے اتنے زیادہ ہیں کہ تعداد و شمار اُس کا بوجھ مشکل ہی سے اُٹھا سکتے ہیں۔ ہند و پاک اور دیگر ممالک میں امام احمد رضا سے عقیدت رکھنے والا کون ایسا شعری ذوق کا حامل سُنّی مسلمان ہوگا جس نے امام احمد رضا کی عقیدت میں اپنے احساس کی لہروں کو اشعار میں مجسّم نہ کیا ہوگا۔ جو مناقب ہمیں موصول ہوئیں وہ زیرِ نظر باب میں شامل ہیں۔ خاص طور سے گلِ گلزارِ برکاتیت حضرت حسنین میاں نظمی مدظلہ العالی کا شعری اظہاریہ اس بات کی زینت ہے اور جناب ڈاکٹر صابر سنبھلی صاحب نے امام احمد رضا کے تعلق سے اپنا نیا شعری تجربہ پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ دو شعرا کے مناقب اور شامل ہیں۔

.... **ص۔ ر۔ مصباحی**

باب ہشتم

یا الٰہی مسلکِ احمد رضا خاں زندہ باد

از: سید آلِ رسول حسنین میاں نظمی مارہروی

نور احمد کی ضیا ہے مسلکِ احمد رضا
شمعِ دینِ مصطفیٰ ہے مسلکِ احمد رضا

لوگ کہتے ہیں کہ کیا ہے مسلکِ احمد رضا
مسلکِ احمد رضا ہے، مسلکِ احمد رضا

مذہب حنفی ہو یا ہو مشربِ غوث و علی
ہم تلک پہنچا رہا ہے مسلکِ احمد رضا

رب کو مانو اور حبیبِ رب سے تم اُلفت کرو
ہاں یہی تو کہہ رہا ہے مسلکِ احمد رضا

اک مثلث تھے رضا علم و عمل اور عشق کے
زاویہ در زاویہ ہے مسلکِ احمد رضا

یہ سکھاتا ہے شریعت اور طریقت کے اُصول
دین و ایماں کی جلا ہے مسلکِ احمد رضا

فی زمانہ سُنّیت کی بس یہی پہچان ہے
سکہ رائج وقت کا ہے مسلکِ احمد رضا

پوری سُنّی دنیا میں سچے عقیدے کے لیے
ابتدا اور انتہا ہے مسلکِ احمد رضا

اعلیٰ حضرت کا یہ احساں ہم مسلمانوں پہ ہے
عشقِ احمد دے رہا ہے، مسلکِ احمد رضا

نام کے سیّد جو جلتے ہیں رضا کے نام سے
اُن کے دل میں چبھ رہا ہے مسلکِ احمد رضا

سامنا ہوتا ہے جب بھی دشمنانِ دین سے
ڈھال بن کر آ گیا ہے مسلکِ احمد رضا

مرشدِ مارہرہ نے نسبت رضا کو ایسی دی
شرحِ دینِ حق بنا ہے مسلکِ احمد رضا

خاندانِ برکت اللّٰہی کا یہ فیضان ہے
نور سرتاپا بنا ہے مسلکِ احمد رضا

نظمی تم کو کیوں نہ برکاتی رضا پر ناز ہو
تم نے گھٹی میں پیا ہے مسلکِ احمد رضا

ممبئی، ۲۵ جنوری ۲۰۰۸ء

تضمین بر کلامِ اعلیٰ حضرت

سید نصیر الدین نصیر گولڑوی

دل کے آنگن میں یہ ایک چاند سا اُترا کیا ہے
موج زن آنکھوں میں یہ نور کا دریا کیا ہے
ماجرا کیا ہے یہ آخر یہ معما کیا ہے
"کس کے جلوے کی جھلک ہے، یہ اُجالا کیا ہے
ہر طرف دیدۂ حیرت زدہ تکتا کیا ہے"

زائرِ گنبدِ خضریٰ، تجھے اب فکر ہے کیا
سامنے وہ بھی ہیں، اللہ کا در بھی ہے کھلا
چپ نہ رہ، کھول زباں، دامنِ مقصد پھیلا
"مانگ من مانتی، منھ مانگی مرادیں لے گا
نہ یہاں ناں ہے، نہ منگتا سے یہ کہنا، کیا ہے؟"

خود نگر ہے، نہ وہ گستاخ، نہ وہ ظالم ہے
بد عقیدہ ہے نہ وہ چربِ زباں عالم ہے
نسلِ خدّام سے منسوب کوئی خادم ہے
"یوں ملائک کریں معروض کہ ایک مجرم ہے
اُس سے پرسش ہے: بتا تو نے کِیا کیا ہے"

روبرو داورِ محشر کے ہے اک عصیاں کیش
ہے اُدھر مالکِ کل اور اِدھر یہ درویش
معصیت کار، خطاوار، گنہ بیش از بیش
" سامنا قہر کا ہے دفترِ اعمال ہے پیش
ڈر رہا ہے کہ خدا حکم سناتا کیا ہے"

نوحہ زن ہے دلِ برباد کہ یا شاہِ رُسل

اب کہاں جائے یہ ناشاد کہ یا شاہِ رُسل
وقتِ امداد ہے، امداد! کہ یا شاہِ رُسل
" آپ سے کرتا ہے فریاد کہ یا شاہِ رُسل
بندہ بے کس ہے شہا! رحم میں وقفہ کیا ہے"

ہے عنایت، جو مَیں مصروفِ ثنا ہوتا ہوں
ورنہ اوقات مری کیا ہے، مَیں کیا ہوتا ہوں
غم تو بس یہ ہے کہ محرومِ نوا ہوتا ہوں
"اب کوئی دم میں گرفتارِ بلا ہوتا ہوں
آپ آجائیں تو کیا خوف ہے، کھٹکا کیا ہے"

عرصۂ حشر میں تھا بیم و رجا کا عالم
سخت مشکل میں گھری تھی مری جانِ پُر غم
ہاتھ میں تھامے ہوئے حمدِ الٰہی کا علم
" لو! وہ آیا مرا حامی، مرا غم خوارِ اُمم
آگئی جاں تنِ بے جاں میں، یہ آنا کیا ہے"

یوں مرے سر سے بلا خوف کی ٹالیں سرور
حشر کی بھیڑ میں چپکے سے بلا لیں سرور
پہلے قدموں میں ذرا دیر بٹھا لیں سرور
" پھر مجھے دامنِ اقدس میں چھپالیں سرور
اور فرمائیں ہٹو! اس پہ تقاضا کیا ہے"

تیرے اشعار میں ہے عشقِ نبی کی مہکار
نعت کے باغ میں آئی ہے،ترے دم سے بہار
تجھے کرتا ہے نصیرؔ، اہلِ ولایت میں شمار
"اے رضاؔ! جانِ عنادل ترے نغموں کے نثار
بلبلِ باغِ مدینہ! ترا کہنا کیا ہے"

منقبت اعلیٰ حضرت

از: ڈاکٹر صابر سنبھلی

(نوٹ: اس منقبت کو چار طریقوں سے پڑھنا چاہیے: (۱) پورے پورے مصرعے پڑھنے چاہئیں۔ (۲) بریکٹ سے پہلے کا جز بریکٹ کے اندر مندرج عبارت کے ساتھ پڑھنا چاہیے۔ (۳) بریکٹ میں مندرج عبارت کو اُس کے بعد والی عبارت کے ساتھ ملا کر پڑھنا چاہیے۔ (۴) صرف وہ الفاظ پڑھنے چاہئیں جو بریکٹوں کے اندر مرقوم ہیں۔)

صاحبِ عظمت (صاحبِ عزت، صاحبِ نسبت) اعلیٰ حضرت
پیارے حضرت (میرے حضرت، سب کے حضرت) اعلیٰ حضرت

مفتیِ عالم! (بحرِ فضیلت! فخرِ کرامت!) اعلیٰ حضرت!
بیکس ہوں میں (بہرِ خدا ہو مجھ پہ عنایت) اعلیٰ حضرت!

ہر ہر لمحہ (یادِ خدا یا، دین کی خدمت) اعلیٰ حضرت!
جو بھی قدم تھا (جو بھی عمل تھا، وہ تھا عبادت) اعلیٰ حضرت!

سچ کہتا ہوں (مجھ جیسے سے، ناممکن ہے) ناممکن ہے
حیراں ہوں میں (کیسے بیاں ہو، آپ کی عظمت) اعلیٰ حضرت!

علم کے آگے (سارے مخالف، گُم صُم گُم صُم) سے رہتے تھے
کوئی کہیں تھا (سب پہ طاری، آپ کی ہیبت) اعلیٰ حضرت!

حق کی طرف سے (دینِ خدا کے آپ مجدّد) ہوکر آئے
آپ تھے بے شک (شرک کے قاتل، قاطعِ بدعت) اعلیٰ حضرت!

میری دعا ہے (میرے آقا، سایہ فگن ہو) شامِ ابد تک
آپ کی پیاری (قبر کے اوپر، ربّ کی رحمت) اعلیٰ حضرت!

منگتا ہے یہ (صابؔر کو بھی، کاش بھی عطا) کاش عطا ہو
نام پہ رب کے (میرے آقا، علم کی دولت) اعلیٰ حضرت!

منقبت در شانِ امام احمد رضا

نتیجۂ فکر: محمد توفیق احسنؔ برکاتی مصباحی

الجامعۃ الغوثیہ، ممبئی ۳

یہ ذوقِ طلب کی گزارش ہے کیسی، عطا ہوں عقیدت کے موتی خدارا
زمانے کو معلوم ہے یہ حقیقت، طلب نے ہے کیوں بس تمہیں کو پکارا

خدا نے چنا ہے تمہیں جب مجدد، یہ علماے عرب و عجم ہیں مؤید
کہ احیاے دین محمد کی خاطر حیات جہاں کا ہے لمحہ گزارا

عطا کیں ہزاروں کتابیں جہاں کو، جھنجھوڑا ہے جس نے خیال و گماں کو
عطاے الٰہی ہے یہ کارنامہ، نہ پایا زمانے نے جس کا کنارا

یہ حُسام الحرمین کیوں معتدر ہے؟ یقیناً یہ فضل شہِ بحر و بر ہے
جو اہلِ سنن ہیں وہ رکھتے ہیں دل میں، عقیدے میں ہوگا کبھی نہ خسارا

عطاے نبی ہیں فتاویٰ تمہارے، عیاں ہے جو نام مبارک سے اس کے
تبحر مسلم ہے سب کو تمہارا، کیا سر ثریا سے اونچا ہمارا

دیا نام ہے کنزالایمان اس کا، لکھایا کلامِ الٰہی کا معنیٰ
یہ صدرالشریعہ کی اک التجا تھی، بنا جو شریعت کا دلکش منارا

بریلی بنا مرکز عشق و الفت، یہ ہے آپ کی ایک زندہ کرامت
جھکائے جبینِ عقیدت زمانہ، دیا پیر و مرشد کا عمدہ دُوَارا

پئیں گے شرابِ محبت دکھا کر، خدا کے کرم سے بریلی میں جاکر
نشانِ مدینہ نظر آئے گا تو لگائیں گے ہم اعلیٰ حضرت کا نعرا

نبی کے عدو کو ملی ہے ہزیمت، ترے نام پر ان کی آئی ہے شامت
یہ خامہ رضا کا بہت قیمتی ہے، عجب پیش کرتا ہے دلکش نظارا

یہ فکرِ رضا کی ضیا پاشیاں ہیں، یہ تذکار کی جلوہ سامانیاں ہیں
ترے نام سے اس نے پائی ہے عزت، کرم ہو کہ چلتا رہے یہ ادارا

برستی ہیں فیض و کرم کی گھٹائیں، عجب کیف و مستی میں ہیں یہ فضائیں
کیا ذکرِ احمد رضا تم نے احسنؔ کہ جس نے دیا شاعری کا اشارا

منقبتِ اعلیٰ حضرت

از حافظ مطلوب بیگم پوری

ہم تمہارے ہیں تمہارے اے امام احمد رضا
تم ہمارے ہو ہمارے اے امام احمد رضا

پیشوائے اہلِ سُنّت، نائب شاہِ عرب
آپ ہیں میرے سہارے اے امام احمد رضا

آپ کی تقریر ہو یا آپ کی تحریر ہو
علم کے بہتے تھے دھارے اے امام احمد رضا

غوثِ اعظم کا نرالا فیض پایا مرحبا
آپ ہیں اُن کے دُلارے اے امام احمد رضا

اے رضا، پیارے رضا، اچھے رضا مجھ پر کرم
اہلِ سُنّت کے سہارے اے امام احمد رضا

علم کے دریا بھی ہو کنزالکرامت بھی ہو تم
درجے ہیں اعلیٰ تمہارے اے امام احمد رضا

آپ کا مطلوبؔ ہے بے شک سگِ دَر آپ کا
کیوں نہ خود کو دَر پہ وارے اے امام احمد رضا

افکارِ رضا کے دھنک رنگ

(اشاریہ)

(سہ ماہی "افکارِ رضا" کے اشاعتی نشانات)

سہ ماہی افکارِ رضا

شمارہ: ۱ - ۴۹

(جولائی ۱۹۹۵ء تا ستمبر ۲۰۰۷ء)

مرتب: سید صابر حسین شاہ بخاری القادری

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ' ونصلی علی رسولہ الکریم

کیا مبارک نام ہے یہ نامِ افکارِ رضا سُنّیت کا ہے چھلکتا جامِ افکارِ رضا

دنیاے رضویت کے شاہین، برادرم جناب محمد زبیر قادری نے جو ایک دردمند اور فعال کارکن ہیں، انہوں نے اپنے مخلصین کے ساتھ ۱۹۹۲ء میں ممبئی میں "تحریکِ فکرِ رضا" کی بنیاد رکھی۔

اس تحریک کے اغراض و مقاصد درج ذیل تھے:

☆ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا کے افکار و نظریات کو زیادہ سے زیادہ متعارف کرانا۔

☆ علماے اہلِ سُنّت و جماعت کی رہنمائی میں مفکرین اور محققین کی ایک ٹیم کا فکرِ رضا کی ترویج و اشاعت میں دن رات کوشاں رہنا۔

☆ امام احمد رضا کی تصانیف کو سہل انداز میں جدید اسلوب کے ساتھ شائع کرنا۔

☆ امام احمد رضا کی تصانیف کو ملک کی مختلف اور بین الاقوامی زبانوں میں شائع کرنا۔

☆ اربابِ فکر و دانش کو امام احمد رضا کی تحقیقات کی طرف متوجہ کرنا۔

☆ ہر اُٹھتے ہوے سوال کا امام احمد رضا کی تحقیقات کی روشنی میں جواب دینا۔

کسی بھی تحریک کی کامیابی کے لیے لٹریچر انتہائی ضروری ہے۔ محمد زبیر قادری نے بھی تحریکِ فکرِ رضا کو کامیاب بنانے کے لیے لٹریچر کی طرف خصوصی توجہ دی۔ کتابیں شائع کیں اور اسٹیکرز شائع کر کے تقسیم کیے۔ امام احمد رضا کی طرف لوگوں کو متوجہ کرنے کے لیے انھوں نے اہلِ سُنّت کو ایک نعرہ دیا **"آپ سُنّی ہیں اور امام احمد رضا کو نہیں جانتے؟ تعجب ہے!!!"** یہ نعرہ انھوں نے اسٹیکر کی شکل میں شائع کر کے عام کیا اور آج برسوں بعد بھی اُن کا یہ نعرہ دنیا بھر میں لوگوں کو اعلیٰ حضرت کی طرف راغب کر رہا ہے۔ یہ نعرہ اتنا مقبول ہوا کہ ہند و پاک کے بہت سارے ناشرین اسے شائع کر رہے ہیں۔ ایک دوست اللہ بخش مکاندار رضوی (جہلم) نے تو کہا کہ زبیر قادری کا یہ نعرہ بارگاہِ رضویت میں مقبول

ہوگیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ایک ایسے رسالے کی ضرورت تھی جو تحریکِ فکرِ رضا کا ترجمان بن کر سامنے آئے۔ محمد زبیر قادری کو افکارِ رضا کے اجرا کا خیال کیسے آیا؟ علامہ پیرزادہ اقبال احمد فاروقی (مدیرِ اعلیٰ، جہانِ رضا، لاہور) کی زبانی سماعت فرمایئے:

''ایک زمانہ تھا۔ ممبئی میں ہمارے ایک دوست معین الدین احمد، مالک اجمیری کتب خانہ مطبوعات منگوایا کرتے تھے۔ ہم ان کتابوں میں ''جہانِ رضا'' کے چند شمارے رکھ دیا کرتے تھے۔ محمد زبیر قادری چلتے پھرتے ''جہانِ رضا'' اُٹھاتے اور اوّل سے آخر تک پڑھتے اور اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کے افکار کو دل کی گہرائیوں میں سمیٹتے۔ یہ مطالعہ، یہ محبت، یہ عشق انہیں کشاں کشاں بریلی کی گلیوں میں لے گیا۔ اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کے مزار پر لے گیا۔ اعلیٰ حضرت کی کتابوں کے ذخیروں میں لے گیا۔ افکارِ رضا کی وادیوں میں لے گیا۔ پھر گلستانِ رضا کے باغوں میں لے گیا۔ اور انہوں نے اعلان کیا کہ تحریک فکر رضا ممبئی ''افکارِ رضا'' جاری کرے گی اور لوگوں کو آواز دے کر کہا کہ:

''رضا کی زباں تمہارے لیے رضا کی فغاں تمہارے لیے

ممبئی سے ''افکارِ رضا'' دراصل ''جہانِ رضا، لاہور'' کے باغوں کا ایک پھول بن کر نکلنے لگا۔'' (۱)

محمد زبیر قادری خود بھی اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

'' ہمیں ''جہانِ رضا'' کا انداز پسند آیا کہ جس میں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا کی حیات و خدمات کے پہلوؤں کو علمی و تحقیقی مثبت طریقے پر پیش کیا جاتا تھا، جس کے پڑھنے سے کالج دیونی ورسٹی کے افراد ضرور متاثر ہو سکتے تھے اور ہم نے مرکزی مجلسِ رضا کے سابقہ کام کی روشنی میں اندازہ لگایا کہ اب تک مجلسِ رضا نے پڑھے لکھے حلقوں میں اچھے اثرات مرتب کیے۔ میرے دل میں بار بار یہ خیال آتا کہ اس طرح کا کوئی رسالہ ہمیں بھی شائع کرنا چاہیے۔ گو کہ ہم بالکل ہی ناتجربہ کار تھے، اس سلسلے میں رہنمائی کے لیے کئی علمائے کرام کو خطوط لکھے مگر ایک دو حضرات کے علاوہ کسی نے جواب تک نہیں دیا۔ تب مَیں نے علامہ اقبال احمد فاروقی صاحب کو لاہور خط بھیجا اور اپنی تنظیم کا تعارف کرا کر تعاون و رہنمائی طلب کی۔ حضرت کا بہت حوصلہ افزا خط آیا، مجھے آج تک اس مختصر سے خط کا متن یاد ہے کہ:

''آپ بے فکر ہو کر کام شروع کریں، ہم نے تو جب کام شروع کیا تھا تو صرف ایک رجسٹر اور قلم لے کر بیٹھے تھے، اگر آپ کو مالی تعاون کی بھی ضرورت پیش آئے تو ہم حاضر ہیں۔'' (۲)

المختصر علامہ فاروقی کا یہی محبت نامہ محمد زبیر قادری کے لیے محرک بنا اور انہوں نے نہایت بے

سروسامانی کی حالت میں سہ ماہی مجلہ افکارِ رضا کے اجرا کا اعلان کردیا۔ ستمبر ۱۹۹۵ء میں افکارِ رضا کا مختصر شمارہ مطلع صحافت پر طلوع ہوا۔ فاضل مدیر کو احساس تھا کہ اس راہ میں کتنی مشکلات حائل ہوں گی لیکن اس کے باوجود آپ پُر اعتماد تھے۔ چنانچہ اس کا اظہار آپ نے پہلے شمارے کے اداریے میں ان الفاظ میں کیا تھا:

''تحریکِ فکرِ رضا، امام احمد رضا محدث بریلوی کے افکار و نظریات کو عام کرنے کے لیے وجود میں آئی ہے، بلاشبہہ اس راہ میں بہت دشواریاں ہیں اور ہماری ناتجربہ کاری بھی کوششوں میں حائل ہے، لیکن ہمارا مقصد خالص ہے اور ہمیں اللہ رب العزت اور اس کے پیارے محبوب ﷺ پر مکمل اعتماد ہے کہ ہم اپنے مقصد میں کامیاب رہیں گے۔ ان شاء اللہ۔'' (۳)

افکارِ رضا تیزی سے اپنی منزل کی طرف رواں دواں رہا۔ اگرچہ اس کی تیز رفتاری میں کئی رکاوٹیں آئیں، لیکن فاضل مدیر نے نہایت ثابت قدمی کا مظاہرہ کیا، جب افکارِ رضا میں تاخیر ہو جاتی تو فاضل مدیر کے جذبات و احساسات کچھ اس طرح سامنے آتے تھے:-

''افکارِ رضا کا زیرِ نظر شمارہ بہت تاخیر سے آپ کے ہاتھوں میں پہنچ رہا ہے۔ قارئین سمجھ سکتے ہیں کہ موجودہ دور میں رسالہ جاری کرنا کس قدر دشوار طلب کام ہے۔ چہ جائیکہ اسے شائع کر کے مفت تقسیم کرنا، قارئین دعا فرمائیں کہ فروغ فکر رضا کے اس مشن کو مستقل جاری رکھ سکیں۔'' (۴)

مزید ملاحظہ فرمایئے:

''افکارِ رضا کا موجودہ شمارہ کافی تاخیر سے شائع ہو رہا ہے، آج تک اس قدر تاخیر کبھی نہیں ہوئی۔ ہمیں کچھ مسائل درپیش تھے جو آہستہ آہستہ دور ہو رہے ہیں۔ ترقی کی جانب گامزن ہونے کے لیے ہم نے کچھ اقدامات کیے تھے، اس لیے ہماری ساری توجہ اس طرف ہی مبذول ہوگئی تھی۔ ان شاء اللہ قارئین اگر ہمارے لیے دعا گو رہے تو ہم ضرور واپس آپ کی خدمت میں افکارِ رضا کو مزید بہتر طور پر پیش کرسکیں گے۔'' (۵)

دیکھا! جذبات میں کس قدر کرب پنہاں ہے۔ زبیر قادری نے نہایت مشکل حالات میں بھی صبر و تحمل کا مظاہرہ کیا اور افکارِ رضا کو بند نہ ہونے دیا اور امید واثق ہے کہ آیندہ بھی آپ کے پایۂ استقلال میں لغزش نہ آئے گی۔ ان شاء اللہ

دنیاے رضویات میں ''معارفِ رضا'' (کراچی)، جہانِ رضا (لاہور) اور افکارِ رضا (ممبئی) کو

شہرتِ عام اور بقاے دوام حاصل ہے۔ جہاں جہاں معارفِ رضا اور جہانِ رضا پہنچا، وہاں وہاں افکارِ رضا نے بھی دستک دی۔ جب بھی کوئی محقق فکرِ رضا کا ارتقائی سفر ترتیب دے گا تو ان رسائل کو نظر انداز نہیں کر سکے گا۔

علامہ فاروقی جو دنیاے رضویات کے مایہ ناز ادیب ہیں، افکارِ رضا کے بارے میں فرماتے ہیں:

"مَیں افکارِ رضا کا قاری ہوں۔ اس کا صفحہ صفحہ میرے سامنے کھلتا ہے تو دل و جان وجد کرنے لگتے ہیں۔ اس کے اداریۓ افکارِ رضا کی روشن تحریریں ہیں، بلند پایہ مضامین اور علمی مقالات مجھے دعوتِ مطالعہ دیتے ہیں، مجھے افکارِ رضا کے رضا نامے اور اداریۓ گلہاے رنگا رنگ دکھائی دیتے ہیں، رضا ناموں میں تنقید و تحسین کے نقش و نگار افکارِ رضا کا حسن دوبالا کرتے ہیں۔ یہ واحد جریدہ ہے جو سارے ہندستان میں فکرِ رضا کی ترجمانی کرتا ہے اور دنیاے رضویت کے اہلِ علم و فضل اسے نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔" (٦)

افکارِ رضا کے اب تک ۴۹ شمارے شائع ہو چکے ہیں، ان شماروں میں اداریات، مقالات، متفرقات، منظومات، تبصرۂ کتب اور رضا نامے شامل ہیں۔ مجموعی طور پر ان شماروں کے ۳۸۷۲ صفحات بنتے ہیں۔ فاضل مدیر اس کا پچاسواں شمارہ ایک خاص نمبر کے طور پر سامنے لا رہے ہیں جو رضویات پر ایک عظیم احسان اور ضخیم نمبر کے طور پر یاد رکھا جائے گا۔ ان شاء اللہ۔

راقم بعض مجبوریوں کے پیشِ نظر اس عظیم نمبر کے لیے کچھ نہ لکھ سکا، جس کا قلق تھا۔ لیکن جب خلیل احمد رانا صاحب نے جہانیاں سے، شکیل احمد قادری عطاری نے خانیوال سے اور سید منور علی شاہ بخاری رضوی نے امریکہ سے راقم کو افکارِ رضا کے خاص نمبر میں شمولیت کے لیے اصرار کیا اور آخر الذکر منور شاہ نے کہا کہ کم از کم افکارِ رضا کا اشاریہ ہی ترتیب دے دیں تا کہ خاص نمبر کی افادیت میں اضافہ کیا جائے۔ یہ حسنِ اتفاق ہے کہ معارفِ رضا کے سالناموں کا اشاریہ بھی راقم نے ترتیب دیا تھا اور اب افکارِ رضا کے اشاریۓ کے لیے بھی منور شاہ بخاری نے اس فقیرِ بے نوا کا انتخاب فرمایا۔ یہ ایک اچھا خیال اُن کو آیا اور راقم نے اپنی دیگر معروفیات ترک کر کے اپنی توجہ افکارِ رضا کے اشاریۓ پر مرکوز کر دی۔

یہ اشاریہ نہایت عجلت میں صرف ایک ہفتے میں مرتب ہوا۔ مَیں مشکور ہوں جناب حسن نواز شاہ (اسلام آباد) کا کہ انہوں نے میری گزارش پر کمپوز کر کے مدیرِ مجلّہ کو ای-میل کر دیا۔

پیشِ نظر اشاریہ چھ حصص پر مشتمل ہے:-

۱- اداریات: عنوانات کی ترتیب سے اداریات کا اشاریہ ترتیب دیا گیا ہے اور جن اداریوں پر عنوانات نہیں تھے انہیں سرسری نظر سے پڑھ کر اپنی طرف سے عنوانات قائم کر دیے ہیں۔ ترتیب

الفبائی ہے۔ تقریباً تمام ہی اداریے مدیر محترم محمد زبیر قادری نے لکھے ہیں، البتہ کچھ اداریے دوسروں کے بھی شائع کیے گئے ہیں۔ لہٰذا صرف اُن اداریوں کے آگے اُن کے نام لکھ دیے گئے ہیں۔

۲-**مقالات**: مقالہ نگار کا نام، اس کے نیچے عنوانِ مقالہ، شمارہ نمبر اور قوسین میں ماہ و سال، آخر میں وہ صفحات جن پر مقالہ موجود ہے۔ اندراجات کی ترتیب مقالہ نگاروں کے اعتبار سے الفبائی ہے۔

۳-**متفرقات**: اس میں شذرات، اعلانات وغیرہ شامل ہیں۔

۴-**منظومات**: سب سے پہلے شاعر کا تخلص، قوسین میں پورا نام اور صنفِ سخن کا پہلا مصرعہ، جبکہ باقی ترتیب حسب سابق ہے۔

۵-**تبصرہ ہائے کتب**: سب سے پہلے کتاب کا نام، پھر مصنف کا نام اور قوسین میں مبصر کا نام۔ بقیہ ترتیب حسب سابق ہی ہے۔

۶-**رضا نامے**: سب سے پہلے خط لکھنے والے کا نام، قوسین میں مقام، جبکہ دیگر ترتیب حسب سابق۔

راقم نے افکارِ رضا میں تمام مشمولات کا جامع اور مفصل اشاریہ ترتیب دیا ہے۔ یقیناً رضویات میں کسی رسالے کا یہ مکمل اشاریہ ہے۔ امید ہے اہلِ قلم ضرور اس سے مستفید ہوں گے اور اس فقیر بے نوا کو اپنی دعاؤں میں ضرور یاد رکھیں گے۔ اللہ تعالیٰ اپنے حبیب پاک ﷺ کے صدقے میں ہم سب کو دین و دنیا میں کامرانی عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین بجاہ سید المرسلین ﷺ و اصحابہٖ اجمعین۔

احقر **صابر حسین بخاری**

۲۷ر محرم ۱۴۲۹ھ / ۶ر فروری ۲۰۰۸ء

حوالہ جات

۱- جہانِ رضا : لاہور، دسمبر ۲۰۰۷ء، ش ۱۵۰، ص ۶۲-۶۳

۲- افکارِ رضا : ممبئی، جنوری/ جون ۲۰۰۲ء، ش ۲۷، ۲۸، ص ۹۰

۳- افکارِ رضا : ممبئی، ستمبر ۱۹۹۵ء، ش ۱، ص ۲

۴- افکارِ رضا : ممبئی، جولائی/ ستمبر ۱۹۹۷ء، ش ۹، ص ۴۲

۵- افکارِ رضا : ممبئی، جنوری/ جون ۲۰۰۲ء، ش ۲۷، ۲۸، ص ۹۴

۶- جہانِ رضا : لاہور، دسمبر ۲۰۰۷ء، ش ۱۵۰، ص ۶۲

اداریات

مقالات

الف

انوار محمد عظیم آبادی

اولادِ رسول قدسی مصباحی، سید

ب

بیت اللہ قادری، ڈاکٹر

ت

تاج محمد خان ازہری

ترک ولی محمد قادری

توفیق احمد نعیمی، مولانا محمد

ج

جلال الدین قادری، علامہ محمد

خلیل احمد قادری، علامہ سید (ترتیب: شفقت عثمانی، خلیل احمد رانا)

خورشید احمد سعیدی

رابعہ جمیل

ش

شبنم خاتون

شرافت حسین رضوی

شکیل احمد قریشی اعظمی برکاتی شمسی

شمس الہدیٰ مصباحی، مولانا

شیراز مقصود قادری، مولانا

ص

صابر حسین شاہ بخاری، سید

صابر سنبھلی، ڈاکٹر

صغیر حسین شاہ، سید

ط

طٰہٰ رضوی برق داناپوری، پروفیسر سید

ع

عبدالرحمٰن بخاری، سید

عبدالستار طاہر مسعودی

عبدالستار مصروف ہمدانی، علامہ

عبدالسلام رضوی، مولانا

عبدالمالک رضوی مصباحی، مولانا

عبدالمبین نعمانی قادری، علامہ محمد

عبدالنعیم عزیزی، ڈاکٹر

غلام مصطفیٰ رضوی (نوری مشن، مالے گاؤں)

غلام مصطفیٰ قادری رضوی (باسنی، ناگور شریف، راجستھان)

غلام یحییٰ انجم، ڈاکٹر

ک

کوثر نیازی، مولانا

کوکب نورانی اوکاڑوی، علامہ

کلیم احمد قادری

کلیم اشرف شریفی، محمد

م

متین کاشمیری

مجید اللہ قادری، ڈاکٹر

محبوب اختر مصباحی ماہر ویشالوی

محمد حسن قادری بریلوی، ڈاکٹر

محمد حسین مشاہد رضوی

محمد حسینی اشرفی مصباحی، سید

محمد رضا عبدالرشید

محمد زبیر قادری

محمد صادق رضا مصباحی، مولانا

محمد صدیق ہزاروی، مولانا

محمد طاہر القادری، ڈاکٹر

عبد القادر رضوی امجدی، مولانا

محمد علی رضا برکاتی قادری، مولانا

محمد عمر ریاض عباسی

محمد فاروق القادری، سید

محمد فروغ القادری، مولانا

محمد ہارون، ڈاکٹر

محمد یونس قادری، ڈاکٹر

مظفر الدین احمد مصباحی، مولانا

منیر الحق کعبی، پروفیسر

میر طیب علی شاہ بخاری، سید

ن

نامعلوم الاسم

نوشاد عالم چشتی، محمد

متفرقات

الف

ب

ت

ج

ح

خ

د

ذ

س

ض

ع

ف

م

ی

منظومات

الف

اشک (ابراہیم اشک)

حمد	ش۲۹،۳۰ (جولائی-دسمبر۲۰۰۲ء)	ص۳
حمد	ش۲۹،۳۰ (جولائی-دسمبر۲۰۰۲ء)	ص۳

اعجاز (مولانا سید اعجاز کامٹوی)

منقبت	ش۴۴ (اپریل-جون۲۰۰۶ء)	ص۳
قطعہ	ش۴۴ (اپریل-جون۲۰۰۶ء)	ص۷۲

ب

بدر (علامہ بدر القادری)

حمد	ش۴۸ (اپریل-جون ۲۰۰۷ء)	ص۲
منقبت	ش۴۸ (اپریل-جون ۲۰۰۷ء)	ص۵۰
منقبت	ش۴۱ (جولائی-ستمبر۲۰۰۵ء)	ص۳

ج

جمیل (مولانا جمیل الرحمٰن جمیل رضوی قادری)

حمد	ش۴۲ (اکتوبر-دسمبر۲۰۰۵ء)	ص۲

حامی (مولانا محمد توفیق احمد حامی)

منقبت	ش۳۹ (جنوری-مارچ۲۰۰۵ء)	ص۳

خ

خوشتر (مولانا محمد ابراہیم خوشتر صدیقی قادری)

منقبت	ش۲۴ (اپریل-جون۲۰۰۱ء)	ص۲۲

ر

رضا (امام احمد رضا محدث بریلوی)

منقبت	ش۴ (مارچ۱۹۹۶ء)	ص۶۴
نعت	ش۴۳ (جنوری-مارچ۲۰۰۶ء)	ص۲

ز

زماں (محمد شاہ زماں برداہوی

منقبت	ش۲۱،۲۲ (جنوری-جون۲۰۰۲ء)	ص۱۷

ش

شکیل (شکیل احمد اعظمی)

نعت	ش۳۸ (اکتوبر-دسمبر۲۰۰۴ء)	ص۲

ص

صابر (ڈاکٹر صابر سنبھلی)

نعت	ش۴۶ (اکتوبر-دسمبر۲۰۰۶ء)	ص۳

ض

ضیائی (محمد میکائیل ضیائی)

نعت	ش۴۷ (جنوری-مارچ۲۰۰۷ء)	ص۳
نعت	ش۴۷ (جنوری-مارچ۲۰۰۷ء)	ص۳

ط

طارق (محمد عبدالقیوم طارق سلطانپوری)

قطعۂ تاریخ	ش۱۵ (جنوری-مارچ۱۹۹۹ء۹	ص۱۴

ع

عارف (غیاث الدین احمد عارف مصباحی نظامی)

نعت	ش۴۰ (اپریل-جون۲۰۰۵ء)	ص۳

غ

غازی (قاری محمد مسلم غازی)

دعا	ش۴۵ (جولائی-ستمبر۲۰۰۶ء)	ص۳

ف

فروغ (فروغ احمد اعظمی)

منقبت	ش۱۵ (جنوری-مارچ۱۹۹۹ءء)	ص۳

ق

قاسم (محمد قاسم حسین ہاشمی مصطفائی)

تضمین	ش۴۳ (جنوری-مارچ۲۰۰۶ء)	ص۳-۵

قادری (غلام مصطفیٰ رمزی قادری)

منقبت	ش۴۲ (اکتوبر-دسمبر ۲۰۰۵ء)	ص ۶۸

قادری (ڈاکٹر بیت اللہ قادری)

منقبت	ش۴۰ (اپریل-جون ۲۰۰۵ء)	ص ۸۷

قربان (ایم قربان علی کشن گنجوی

منقبت	ش۲۶ (اکتوبر-دسمبر ۲۰۰۱ء)	ص ۲۸

ل

لئیق (م، لئیق انصاری)

حمد	ش۴۸ (اپریل-جون ۲۰۰۷ء)	ص ۳
نعت	ش۴۸ (اپریل-جون ۲۰۰۷ء)	ص ۳

م

مشاہد (محمد حسین مشاہد رضوی)

منقبت	ش۲۳ (جولائی-دسمبر ۲۰۰۰ء)	ص ۶۷
قطعہ	ش۲۰ (اپریل-جون ۲۰۰۰ء)	ص ۱۰

مضطر (محمد شریف رضا عطاری مضطر)

نعت	ش۴۵ (جولائی-ستمبر ۲۰۰۶ء)	ص ۳

ن

نثار (نثار کریمی)

نعت	ش۴۹ (جولائی-ستمبر ۲۰۰۷ء)	ص ۳

نجم (مولانا غلام مصطفیٰ نجم القادری)

نظم	ش۲ (دسمبر ۱۹۹۵ء)	ص ۲

تبصرہ ہائے کتب

الف

نام کتاب/مصنف و مؤلف کا نام	مبصر کا نام	صفحات
اردو زبان میں تصوف: ولی سے اقبال تک/ڈاکٹر اعجاز مدنی (وارث جمال قادری)	ش۸ (اپریل-جون ۱۹۹۷ء)	۸۴-۷۴
الصلوٰۃ والسلام (مجموعۂ نعت)/محمد علی صدیقی شیدا (بیکل اتساہی)	ش۲۹، ۳۰ (جولائی-دسمبر۲۰۰۲ء)	۸۹-۸۷
الکوثر (سہ ماہی) (مولانا محمد وارث جمال قادری)	ش۸ (اپریل-جون ۱۹۹۷ء)	۸۹-۸۵
امام احمد رضا اور عشق مصطفیٰ ﷺ/ڈاکٹر مولانا غلام مصطفیٰ نجم القادری (غلام مصطفیٰ قادری رضوی)	ش۳۹ (جنوری-مارچ ۲۰۰۵ء)	۱۱۷-۱۱۵
امام احمد رضا اور علمِ حدیث/محمد عیسیٰ رضوی (شمیم اختر رضوی)	ش۲۵ (جولائی-ستمبر۲۰۰۱ء)	۷۴-۷۰
امام احمد رضا کے ۱۹۱۲ء منصوبہ کا تجزیہ/ڈاکٹر محمد ہارون (محمد زبیر قادری)	ش۶ (اکتوبر-دسمبر۱۹۹۶ء)	۵۲-۵۱
امتیازِ حق وباطل/مولانا عبدالمالک مصباحی (غلام مصطفیٰ قادری رضوی)	ش۴۴ (اپریل-جون ۲۰۰۶ء)	۷۷-۷۵

ب

نام کتاب/مصنف و مؤلف کا نام	مبصر کا نام	صفحات
برصغیر میں سلسلہ قادریہ کے بانی سیدنا عبدالوہاب جیلانی/ڈاکٹر غلام یحییٰ انجم (مولانا محمد ملک الظفر سہسرامی)	ش۲۶ (اکتوبر-دسمبر۲۰۰۱ء)	۶۸-۶۵
اقبال احمد فاروقی، جن کی باتوں سے خوشبو آئے (خواجہ عابد نظامی)	ش۴۸ (اپریل-جون ۲۰۰۷ء)	۱۰۵-۱۰۳

پ

نام کتاب/مصنف و مؤلف کا نام	مبصر کا نام	صفحات
پیغامِ رضا، امام احمد رضا نمبر (ڈاکٹر سید جمال الدین قادری)	ش۸ (اپریل-جون ۱۹۹۷ء)	۹۴-۹۰

ت

ج

ح

د

ڈ

س

ع

ک

گ

م

ن

و

ی

رضانامے

الف

نام مکتوب نگار	شمارہ	صفحات
ابوالحسن واحد رضوی، صاحبزادہ (مدیرِ اعلیٰ، ریاض العلم، اٹک)	ش ۳۹ (جنوری، مارچ ۲۰۰۵ء)	۱۲۰
احمد حسین قادری (کسٹم آفیسر، کوسہ، ممبرا)	ش ۲۵ (جولائی ستمبر ۲۰۰۱ء)	۸۶-۸۵
اختر حسین فیضی مصباحی، مولانا (دارالعلوم غوثیہ سلیم پور، دیوریا)	ش ۲۱، ۲۲ (جولائی دسمبر ۲۰۰۰ء)	۸۹-۸۸
اختر حسین قادری، مفتی (دارالعلوم علیمیہ جمدا شاہی، بستی، یوپی)	ش ۲۵ (جولائی ستمبر ۲۰۰۱ء)	۸۷
اراکین مجلس المدینۃ العلمیہ دعوتِ اسلامی کراچی	ش ۴۴ (اپریل، جون ۲۰۰۶ء)	۱۱۲-۱۱۰
ارشد الرحمٰن قادری، مولانا (کڑہ نیل، آگرہ)	ش ۹ (جولائی، ستمبر ۱۹۹۹ء)	۶۲-۶۱
اسرار احمد (ہزاری باغ، جھارکھنڈ)	ش ۲۶ (اکتوبر، دسمبر ۲۰۰۱ء)	۷۴
اقبال احمد اختر القادری (کراچی)	ش ۴ (مارچ ۱۹۹۶ء)	۵۹
اقبال احمد فاروقی، پیرزادہ (مدیر اعلیٰ، جہان رضا، لاہور)	ش ۱ (ستمبر ۱۹۹۵ء)	۱۷
	ش ۳ (جون ۱۹۹۶ء)	۵۵
	ش ۴ (مارچ ۱۹۹۶ء)	۵۸
	ش ۱۲ (اپریل، جون ۱۹۹۸ء)	۵۹
	ش ۱۷ (ستمبر ۱۹۹۹ء)	۸۰
	ش ۲۳ (جنوری، مارچ ۲۰۰۱ء)	۹۱
	ش ۳۷ (جولائی، ستمبر ۲۰۰۴ء)	۱۱۲
	ش ۱۲ (اپریل، جون ۱۹۹۸ء)	۵۹
	ش ۱۷ (ستمبر ۱۹۹۹ء)	۸۰
	ش ۲۳ (جنوری، مارچ ۲۰۰۱ء)	۹۱
	ش ۳۷ (جولائی، ستمبر ۲۰۰۴ء)	۱۱۲
	ش ۴۶ (اکتوبر، دسمبر ۲۰۰۶ء)	۱۰۴، ۱۰۳
اللہ بخش مکاندار رضوی (ہبلی، کرناٹک)	ش ۳ (جون ۱۹۹۶ء)	۵۶، ۵۵
	ش ۶ (اکتوبر، دسمبر ۱۹۹۶ء)	۵۶
امجد رضا، مولانا (پٹنہ، بہار)	ش ۱۵ (جنوری، مارچ ۱۹۹۹ء)	۷۸

ز

س

ش

ص

ع

ک

م

میرے رضا کا پاکستان (آخری قسط)

از: محمد زبیر قادری

اورینٹل پبلی کیشنز ایک اشاعتی ادارہ ہے اور داتا دربار کے قرب میں واقع یہ مکتبہ اورینٹل پبلی کیشنز کے نام سے ہی سیل سینٹر کے طور پر کام کررہا ہے۔ برادرم عثمان رضوی صاحب سُنیت کا درد رکھنے والے نوجوان ہیں۔ جنہوں نے ابتدا میں دعوتِ اسلامی سے متاثر ہوکر دینی رجحان پایا۔ لیکن بوجوہ تنظیم سے علیحدہ ہوگئے۔ ان دنوں اس مکتبہ کے مینیجر کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

اُن کے مکتبہ صرف دینی کتب کا نہیں ہے، یہاں مختلف موضوعات پر تاریخی، سیاسی، سماجی، اصلاحی کتب کا وافر ذخیرہ دست یاب تھا۔ ایک معتد بہ تعداد میں تاریخی شخصیات پر کتابیں بھی تھیں۔ وہاں رضا اکیڈمی، برطانیا کی شائع کردہ انگریزی کتب کے تراجم بھی موجود تھے۔

برادرم عارف جامی صاحب نے عثمان رضوی سے احقر کا تعارف کرایا اور ''افکارِ رضا'' پیش کیا۔ رسالہ کی ورق گردانی کرکے وہ کافی متاثر ہوئے۔ افکارِ رضا کی تعریف کی۔

محترم خلیل رانا بھی ہم راہ تھے۔ اُن کی اہلیہ کو ملتان شریف میں دعوتِ اسلامی کے سالانہ اجتماع میں شرکت کے لیے جانا تھا۔ اس لیے اُن کو اپنے گھر خانیوال جانے کی جلدی تھی، اُنھوں نے مختصراً ضروری باتیں کی، کچھ کتب عنایت فرمائیں اور رخصت ہوگئے۔

عثمان بھائی کے مکتبہ پر ہماری نشست جم گئی۔ یکے بعد دیگرے جن احباب کو احقر کے آنے کی اطلاع ملتی وہ ملنے وہاں چلا آتا۔ عثمان بھائی نے بھی اپنے کچھ احباب کو بلایا جو انجمن طلبۂ اسلام کے ذمہ داران میں سے تھے۔ انھوں نے اپنی خدمات کی کارگزاری سُنائی، احقر نے اپنے کام کی روداد بتائی۔ پھر ہم نے اپنے رابطے استوار رکھنے کے لیے پتوں کے تبادلے کیے، تاکہ خدمتِ دین کے لیے باہم منسلک رہ کر کچھ کام کرسکیں۔

نعیم طاہر صاحب رضوی، ایڈیٹر ماہ نامہ کنزالایمان، لاہور بھی اطلاع ملنے پر فوراً تشریف لے آئے۔ گزشتہ سفر ۲۰۰۱ء میں اُن سے صرف بھاگم بھاگ ٹرین میں واپسی کے وقت ملاقات ہوئی تھی اور تشنہ رہ گئی تھی۔ وہ اپنے ہمراہ کنزالایمان کے چند اہم شمارے بھی لائے اور عنایت کیے۔ جس میں اُن کے رسالے کے کئی خاص نمبر بھی موجود تھے۔

میرے لاہور کے قیام کے دوران فاروقی صاحب کافی پریشان ہوتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ

مَیں اُن کے یہاں کھانا کھاؤں، آرام کروں اور زیادہ دن قیام کروں تاکہ وہ مزید دوستوں سے ملاقات کرا سکیں جو اپنے اپنے حلقے کے نامور محقق و قلم کار ہیں۔ لیکن احقر محدود چھٹیوں کی وجہ سے وہاں زیادہ دن قیام نہیں کر پاتا۔

اس وقت بھی وہ دوڑے ہوئے آئے اور پیار سے سب کو ڈانٹا کہ ذرا مہمان کو کھانا تو کھانے دو۔ چونکہ محفل جمی ہوئی تھی وہ بھی ساتھ میں شریک ہوگئے۔ اس وقت اُن کی عمر تقریباً ۸۰ سال ہوگی لیکن باوجود اس کے اُن کی یادداشت بہت قوی ہے۔ اُن کا مطالعہ بھی وسیع ہے اور پڑھ کر حافظے میں محفوظ رکھتے ہیں۔ انھوں نے افکارِ رضا کے مشمولات پر گفتگو کی۔ مجھے وہ ہدایت دینے لگے کہ آپ خورشید سعیدی صاحب کے تنقیدی خطوط نہ شائع کریں۔ وہ اپنے تنقیدی تیروں سے ہر کسی کو زخمی کردیتے ہیں۔ اس سے لوگ افکارِ رضا کے لیے لکھنے سے کترائیں گے۔

یہ محفل رات بھر جاری رہی۔ اس دوران اور بھی احباب آئے لیکن احقر کو تفصیل یاد نہیں۔ کیونکہ باقاعدہ کوئی ڈائری مرتب نہیں کی یا سفرنامہ نہیں لکھا۔ پھر کب آنکھ لگ گئی کچھ پتہ نہیں چلا۔

بروز جمعہ ۲۳ر ستمبر ۲۰۰۵ء صبح اُٹھ کر حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کے دربار میں حاضری دی۔ وہاں مزار شریف پر سلام پیش کیا، اپنے اور سب کے لیے دعائیں کیں۔

اگلے دن مجھے دعوتِ اسلامی کے سالانہ اجتماع میں شرکت کے لیے ملتان شریف جانا تھا۔ اس لیے میرے پاس وقت بہت محدود تھا۔ ۲۳، ۲۴، ۲۵ ستمبر اجتماع کی تاریخیں تھیں اور آج نمازِ جمعہ سے اجتماع شروع ہونے والا تھا۔

علامہ اقبال فاروقی صاحب نے احقر کی آمد کی اطلاع جناب ملک محبوب الرسول قادری کو کردی۔ وہ بے چارے بڑی دور رہتے تھے، احقر سے ملنے کے لیے سب کام چھوڑ کر تشریف لائے۔ جناب ملک محبوب الرسول قادری صاحب ایک باصلاحیت نوجوان ہیں۔ ماہ نامہ "انوارِ رضا" کے ایڈیٹر ہیں۔ وہ اس رسالے کے کئی ضخیم خاص نمبر شائع کرچکے ہیں مثلاً تاج دارِ بریلی نمبر، شاہ احمد نورانی نمبر، مجاہدِ ملّت (عبدالستار خان نیازی) نمبر وغیرہ۔ اس کے علاوہ بھی بے شمار کتابوں کی تصنیف و تالیف میں اُن کا ہاتھ ہیں۔ وہ آئے تو اپنے ہمراہ اپنے کاموں کے کچھ نمونے یعنی کتابیں و رسالے ساتھ لائے۔

رابطے کتنی اہمیت رکھتے ہیں، مجھے یہاں آکر احساس ہوتا ہے۔ اللہ کے فضل و کرم سے ہم اہلِ سُنّت و جماعت کا تصنیفی و تالیفی کام تو بہت ہو رہا ہے مگر ہم آپس میں رابطے نہ رکھنے کی بدولت اپنی جماعت کی کارکردگی سے ناواقف رہتے ہیں۔ آپ اگر یہاں آئیں تو دیکھیں گے کہ ہر طرف نئے نئے موضوعات پر کتابوں سے دکانیں بھری پڑی ہیں۔ قدیم کتب کے نئے نئے تراجم، سیرتِ رسول ﷺ پر

نئی کتابیں، قرآن و احادیث کی جدید تفاسیر و شروحات، قدیم و جدید علما کی سوانح حیات وغیرہ غرض کہ آئے دن کچھ نہ کچھ نئی کتاب منظر عام پر آتی رہتی ہے۔ پہلے وہاں کی تمام تازہ مطبوعات انڈیا نہیں آتی تھیں اس لیے ہند کے لوگوں کو استفادے کا موقع نہیں ملتا تھا۔ لیکن اب تو دہلی کے ناشرین اس تاک میں لگے رہتے ہیں کہ کب کوئی نئی کتاب پاکستان میں چھپے، اور وہ اُسے حاصل کر کے فوراً شائع کردیں۔ لیکن اس کے باوجود کچھ کتابیں ایسی ہوتی ہیں جو ہند کے لوگوں کے کام کی تو ہوتی ہیں مگر اسے شائع نہیں کیا جاسکتا۔ اور اس طرح کی کتب ہندستان میں آتی بھی نہیں ہیں۔ مثلاً پاکستان کے علما پر شائع ہونے والی کتب اور خصوصی نمبر یہاں شائع نہیں کیے جاسکتے۔ اُن کی اپنی افادیت ہوتی ہے لیکن وہ ہند میں نہیں پہنچتیں۔ اس کے علاوہ چھوٹے چھوٹے کتابچے اور کم صفحات پر مشتمل کتابیں جو کسی خاص موضوع پر ہوں یا کسی تازہ اعتراض کا جواب ہوں، وہ بھی یہاں نہیں پہنچتی یا اگر پہنچتی ہیں تو ہندستان کے کتب فروش تاجر اُن کتابوں کو اس لیے شائع نہیں کرتے کہ یہ اُن کے لیے منافع بخش نہیں ہوتیں۔ میری پاکستان کے دینی اداروں سے گزارش ہے کہ وہ اپنے شائع کردہ لٹریچر کو ہندستان کے دینی اداروں کو ضرور بھیجا کریں۔ تاکہ یہ ادارے اُس لٹریچر کو یہاں شائع کر کے عام کرسکیں۔ اسی طرح ہمیں بھی اپنا لٹریچر اُنہیں بھیجنا چاہیے تاکہ وہ اپنے یہاں اس کی ترویج و اشاعت کا کام کرسکیں۔ دین کی تبلیغ و اشاعت کا کام تو ایسے ہی پھیلتا ہے۔

محبوب الرسول صاحب کے کاموں سے واقفیت ہوئی تو خوشی ہوئی کہ احقر کی ملاقات ایک اور مجاہدِ سُنّیت سے ہوگئی۔ اُن کے کارنامے سُن کر پہلے تو مَیں حیرت میں پڑ گیا کہ ایک آدمی اتنے سارے کام کس طرح انجام دے لیتا ہے۔ وہ واقعی قابلِ تعریف ہیں۔

وہ مجھے اپنے ہمراہ لاہور کی ایک اہم شخصیت جناب عبدالمصطفیٰ گلزار حسین رضوی صاحب سے ملاقات کے لیے لے گئے۔ اُن کا لاہور کے ایک کمرشل علاقے میں اچھا خاصا آفس تھا۔ گلزار رضوی صاحب کے بارے میں مجھے بتایا گیا کہ یہ حضور مفتیِ اعظم کے خلیفہ ہیں۔ تصنیف و تالیف سے بھی شغف رکھتے ہیں۔ انھوں نے ''اعلیٰ حضرت امام احمد رضا'' نامی کتاب کا ترجمہ سندھی زبان میں کر کے ۱۹۷۸ء میں شائع کیا تھا۔ اس کے علاوہ فروغِ رضویات میں تعاون کرتے رہتے ہیں۔

وہ احقر سے ہندستان میں سُنّیوں کے حالات اور اشاعتِ سُنّیت کے کاموں کے بارے میں سوالات کرتے رہے اور مَیں اپنی محدود معلومات کے مطابق جواب دیتا رہا۔ پھر ہم وہاں سے رخصت ہوئے۔ محبوب الرسول صاحب کو اپنے کام سے کہیں جانا تھا، اس لیے وہ مجھے گنج بخش روڈ پہنچا کر چلے گئے۔ جمعہ کی نماز کے لیے عثمان صاحب مجھے وہاں ایک مسجد لے گئے، جہاں پر نماز لاؤڈ اسپیکر سے

نہیں ہوتی۔ نماز سے فراغت کے بعد آج کچھ اور مکتبوں کا رُخ کیا اور اپنے ذوق کے مطابق کتابیں جمع کرتا رہا۔ شام تک کتابیں جمع کر کے کچھ فاروقی صاحب کو اور کچھ مسلم کتابوی کے سیّد منیر شاہ صاحب کو دے دیں کہ وہ احقر کے ممبئی ایڈریس پر پوسٹ کر دیں۔

رات کو میرے پاس ممبئی سے میرے بھائی کا فون آیا۔ وہ فکرمند تھے کہ ٹی وی کی خبروں میں بتایا گیا تھا کہ لاہور میں ۲ بم دھماکے ہوئے ہیں۔ یہ دھماکے انارکلی بازار اور مینارِ پاکستان کے قرب میں ہوئے تھے۔ مَیں نے اُن کو اپنی خیریت سے مطلع کیا اور فکرمند نہ ہونے کا مشورہ دے کر مطمئن کر دیا۔

رات ہمیں برادرم عثمان اور ہارون صاحبان لاہور کی فوڈ اسٹریٹ لے گئے اور پُرتکلف ضیافت کرائی۔ پنجابی لوگ کھانے اور کھلانے کے بڑے شوقین ہوتے ہیں۔ اس کا مظاہرہ اس فوڈ اسٹریٹ میں دیکھنے میں آیا۔

آج رات قیام کے لیے فاروقی صاحب نے دارالعلوم نعمانیہ (اندرون ٹکسالی گیٹ) میں انتظام کیا تھا۔ یہیں مرکزی مجلسِ رضا کا رابطہ آفس ہے۔ رات دیر تک باتیں ہوتی رہیں پھر مَیں تھکن سے مجبور ہو کر سو گیا۔

بروز سنیچر ۲۴؍ستمبر ۲۰۰۵ء صبح آنکھ کھلتے ہی دیکھا کہ برادرم سیّد صابر حسین شاہ بخاری اٹک (برہان شریف، پنجاب) سے تشریف لائے ہیں اور برادرم خورشید سعیدی پاکستان کے دارالخلافہ اسلام آباد سے تشریف لائے ہیں۔ اعلیٰ حضرت سے نسبت کا یہ فیضان ہے کہ یہ دونوں حضرات صرف احقر سے ملاقات کی غرض سے اپنی ملازمت سے چھٹی لے کر، کئی گھنٹوں کا سفر کر کے لاہور آئے تھے۔ دنیائے رضویت سیّد صابر حسین شاہ بخاری صاحب کو اچھی طرح جانتی ہے۔ وہ کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ وہ ایک دور اُفتادہ گاؤں اٹک (Attock) میں رہتے ہیں، جہاں بجلی اور پانی کی سہولیات بھی ڈھنگ سے میسّر نہیں۔ اور وہیں ایک اسکول میں تدریس کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ سہولیات کی عدم دست یابی کے باوجود وہ فروغِ رضویات میں ہمہ دَم لگے رہتے ہیں۔ انھوں نے ادارہ فروغِ افکارِ رضا قائم کیا ہے۔ رضویات پر اُن کی چھوٹی بڑی تالیفات کی ایک لمبی فہرست ہے، جو مختلف اداروں سے شائع ہو کر عام ہو چکی ہیں۔

جناب خورشید سعیدی صاحب سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ حالانکہ انٹرنیٹ کے توسط سے ہمارا رابطہ تین چار سال سے تھا۔ خورشید سعیدی متحرک، محقق، مدقق نوجوان کا نام ہے۔ ان کی ظاہری حالت دیکھ کر یہ اندازہ ہو گیا کہ یہ اپنے آپ کی پرواہ نہیں کرتے اور ہمہ دم تحقیق و تفحص کے کاموں میں لگے رہتے ہیں۔ ان کی دل چسپی کا موضوع ہے ردِّ عیسائیت۔ اس موضوع پر وہ پی ایچ ڈی

کر رہے ہیں۔ انھوں نے جب پہلی بار ای میل سے ردِّ عیسائیت پر اپنا مضمون ''قرآن میں تضاد نمبر ۱۶'' بھیجا تو پہلے یہ سوچ کر اسے شائع نہ کرنے کا فیصلہ کیا گیا کہ افکار رضا، رضویات پر مشتمل پرچہ ہے، اس میں کیوں شائع کیا جائے۔ لیکن غور کرنے پر فیصلہ تبدیل کرلیا گیا کہ ردِّ عیسائیت بھی فکرِ رضا کا ہی حصّہ ہے۔ اور اُن کا یہ مضمون جنوری-مارچ ۲۰۰۳ء کے شمارے میں شائع کردیا گیا۔ پھر اس کے بعد انھوں نے اپنے کئی مضامین بھیجے جو مختلف شماروں کی زینت بنے۔ خورشید سعیدی صاحب اردو، عربی، انگریزی پر یکساں عبور و مہارت رکھتے ہیں۔ اُنھوں نے احقر کی فرمائش پر مبلغ اسلام علامہ عبدالعلیم صدیقی میرٹھی علیہ الرحمہ کی انگریزی تالیف "How to Preach Islam?" کا ترجمہ بنام ''تبلیغ اسلام کے اصول و فلسفہ'' کرکے دیا۔ جو ہم نے اپنے ادارے سُنّی یوتھ فیڈریشن سے شائع کیا۔ پھر یہ ترجمہ دارالعلوم علیمیہ کے ترجمان ماہ نامہ ''پیامِ حرم'' میں قسط وار شائع کیا گیا۔

خورشید سعیدی صاحب نے پھر ''افکارِ رضا'' پر تنقیدی تبصرے لکھنے کا سلسلہ شروع کیا۔ اُن کے تبصرے پڑھ کر اُن کی دقّتِ نظر کا اندازہ ہوا۔ کوئی معمولی غلطی بھی وہ نظرانداز نہیں کرتے۔ وہ اپنی حسّاس طبیعت کی وجہ سے بعض اوقات مضمون نگار کو بھی سخت سُست کہہ دیتے ہیں اور کمپوزنگ کی غلطی کو بھی غلط فہمی کی بنا پر مضمون نگار کے سر ڈالتے ہیں۔ مجھے اُن کے تبصرے بہت پسند آتے تھے۔ اس طرح ہمارے کئی قلم کار حضرات محتاط ہوگئے۔

پھر خورشید صاحب نے اپنا رُخ فتاویٰ رضویہ (جدید) اور اعلیٰ حضرت کی مطبوعہ کتب کی طرف موڑ لیا۔ اور اُن میں اشاعت پذیر غلطیوں کی نشان دہی کرنے لگے۔ وہ ہر چیز کا بنیادی مأخذ سے موازنہ کرتے اور غلط و صحیح کو قارئین کے سامنے لاتے۔ اعلیٰ حضرت کی کتب کے انگریزی تراجم کو بھی انھوں نے اپنی تحقیق کی روشنی میں پرکھا اور انھیں بھی غیر مستند ٹھہرایا۔ رضویات کے باب میں وہ بہت حسّاس ہیں۔ اُن کے یہ تحقیقی و تنقیدی تبصرے ماہ نامہ معارف رضا اور افکار رضا میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ اُن کے اس عمل سے بعض حضرات ناراض ہونے لگے کہ اپنے ہی لٹریچر کی غلطیوں کو کیوں منظر عام پر لایا جارہا ہے۔ اس سے ''غیر'' فائدہ اُٹھائیں گے۔ مگر احقر اور بے شمار علما اُن کے حامی ہیں اس لیے کہ غلطیوں کی اصلاح پھر کس طرح ہوگی۔ ناشر حضرات کا مقصد تو پیسہ کمانا ہوتا ہے۔ وہ غلطیوں کی درستی کرنے کی محنت اور سرمایہ لگانے پر کبھی تیار نہیں ہوتے۔

خورشید سعیدی صاحب کی ان کوششوں کا اثر یہ ہوا کہ فتاویٰ رضویہ جدید جو تیس جلدوں پر مشتمل ہے، کی دوبارہ کمپوزنگ کا کام شروع کیا گیا اور ہندستان کے کچھ علما اس کی تصحیح کرکے دوبارہ شائع کرکے منظر عام پر لانے کے لیے کوشاں ہوگئے۔

ان دونوں حضرات سے ملاقات مختصر رہی چونکہ احقر کو ملتان شریف کے لیے روانہ ہونا تھا۔
اس لیے میں اور عارف جامی صاحب تیار ہوئے اور احباب سے مل کر رخصت ہوئے۔ اور ملتان شریف جانے والی ایک لگژری بس میں بیٹھ کر روانہ ہوئے۔

ہم ظہر کے وقت ملتان شریف پہنچے۔ اجتماع گاہ پر نظر پڑی تو اس کا کوئی کنارہ نظر نہیں آرہا تھا۔ بہت ہی وسیع وعریض میدان میں اجتماع گاہ بنائی گئی تھی۔ دور دور تک پنڈال ہی پنڈال نظر آرہے تھے۔ نہایت ہی سخت حفاظتی بندوبست موجود تھا۔ اجتماع گاہ میں جانے والے ہر فرد کی مکمل چیکنگ ہوتی، پھر داخلے کی اجازت ہوتی۔

داخلی دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی ہر طرف کتابوں کے اسٹالز نظر آئے۔ اس عظیم الشان پنڈال کو مختلف گلیوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ پاکستان اور دنیا بھر سے آئے ہوئے لوگوں کے لیے اُن کے علاقوں کے مطابق گلیاں تقسیم کر کے حلقے بنائے گئے تھا۔ تا کہ ایک علاقے کے افراد ایک ہی جگہ رہیں۔ اس سے بہت آسانی یہ ہوتی تھی کہ کوئی اپنے ساتھیوں سے بچھڑ جائے تو اپنے علاقے کے حلقے میں اُسے پاسکتا تھا۔ یہاں اس میدان میں لاکھوں لوگوں کے قیام کا بندوبست کیا گیا تھا۔ افراد کی تعداد کے حساب سے ہی کثیر تعداد میں غسل خانے، بیت الخلا وغیرہ سب انتظامات موجود تھے۔

دعوتِ اسلامی نے مختلف کاموں کے لیے مختلف مجالس بنائی ہیں۔ یعنی مجلس العلمیہ، مجلس کتب تفتیش و رسائل، مجلس جیل خانہ وغیرہ وغیرہ۔ ان مجلسوں کے تحت مختلف ذمہ داریاں تقسیم کی گئی ہیں۔ اسی پنڈال میں ایک جگہ گونگے بہروں کے لیے بھی اشاروں میں بیانات ہو رہے تھے۔ یعنی وہ افراد جو قوّتِ سماعت سے محروم ہوتے ہیں اور اجتماع کے بیانات نہیں سُن سکتے، اُن کے لیے تربیت یافتہ مبلغ اشاروں کے ذریعے بیانات سمجھاتے ہیں۔ دعوتِ اسلامی نے ہر سطح پر اپنا نیٹ ورک پھیلا دیا ہے۔

دعوتِ اسلامی کی مجلسِ علمیہ کے تحت اعلیٰ حضرت کی کتب پر جدید انداز میں کام ہو رہا ہے۔ جد الممتار کی دو جلدیں نئی کمپوزنگ کر کے شائع کردی گئی ہیں۔ اعلیٰ حضرت کے کئی رسائل نئی تشریح کے ساتھ خوب صورت گیٹ اپ میں شائع کی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ حضور صدر الشریعہ کی ''بہارِ شریعت'' کو بھی شرح کے ساتھ جدید انداز میں مختلف حصص کی صورت میں شائع کیا جارہا ہے۔

گزشتہ کئی سالوں سے انعقاد پذیر ہونے والا یہ سالانہ اجتماع بہت کامیاب ہو رہا ہے۔ اس اجتماع میں لاکھوں لوگ شرکت کرتے ہیں۔ پاکستان میں تبلیغی جماعت کا اجتماع رائے ونڈ، پنجاب میں ہوتا ہے۔ جو دعوتِ اسلامی کے اجتماعات سے کئی برس پہلے سے جاری ہے۔ لیکن اب اُن کا اجتماع اس قدر کامیاب نہیں رہتا۔ دعوتِ اسلامی کے کام کی بدولت تبلیغیوں کا بہت نقصان ہوا ہے اور ہو رہا ہے۔

کیونکہ یہ لوگ بھی انہی کی طریقے پر کام کرتے ہیں مگر اُن کی جماعت گمراہیت کی طرف لے جاتی ہے اور دعوت اسلامی دین حق کی طرف۔

مکتبوں کی طرف جانا ہوا تو علمی پبلشرس کا مکتبہ نظر آیا۔ اس کے مالک ایک نوجوان حافظ محمد وسیم ہیں، جو مولانا الیاس قادری کے مرید ہیں۔ اُنھوں نے اپنے پیر کی نسبت سے ایک رسالہ ''فیضانِ امیرِ اہلِ سُنّت'' جاری کیا ہے، جو گزشتہ کئی سالوں سے کام یابی سے جاری ہے۔ حافظ وسیم صاحب نے رضا اکیڈمی، برطانیا کی تمام انگریزی مطبوعات شائع کی ہیں اور اُن کتابوں کے اردو تراجم بھی شائع کرر ہے ہیں۔ مجھے اُن کتابوں کے حصول کے لیے اُن سے ملنا تھا۔

ویسے تو ہمارا غائبانہ تعارف تھا ہی۔ احقر نے اپنا تعارف کرایا اور مدعا بیان کیا۔ ہم میں کتب کی اشاعت کے سلسلے میں دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ وہ دعوتِ اسلامی اور مولانا الیاس قادری کے تئیں بہت ہی جذباتی ہیں۔ باتوں باتوں میں انھوں نے اقرار کیا کہ ہم لوگ امیرِ دعوتِ اسلامی کو مجدّد مانتے ہیں۔ مَیں نے جب اُن سے اس کی دلیل اور نشانیاں مانگی تو وہ کہنے لگے کہ وقت کا انتظار کیجیے آپ خود جان جائیں گے۔

اتوار کے روز صبح گیارہ بجے امیر دعوتِ اسلامی مولانا الیاس قادری صاحب کا خصوصی بیان ہوا۔ جس میں حضرت نے ''نیت کی برکت'' کے موضوع پر تقریر کی۔ اُن کی تقریر کا لُبّ لُباب یہ تھا کہ ہر کام کے لیے اچھی نیت کرنی چاہیے، تو اس میں برکت ہوگی۔ اور کام بنتے جائیں گے۔

بیان کے بعد ذکر اور خصوصی دعا ہوئی۔ آخری دن دعا کے وقت عوام کا اس قدر ہجوم تھا کہ ہر طرف صرف سر ہی سر نظر آرہے تھے۔ کافی لوگ اونچائی پر چڑھ کر ہجوم کا اندازہ لگانے کی کوشش کرر ہے تھے۔ اجتماع دوپہر ۲ بجے اختتام پذیر ہوا۔ تو ہم فوراً باہر کی طرف روانہ ہوئے۔

مجھے دوپہر چار بجے کی فلائٹ سے کراچی کے لیے جانا تھا۔ میرے پاس وقت بہت محدود تھا اس لیے فلائٹ سے جانا پڑا۔ کیونکہ ٹرین پورے ایک دن میں کراچی پہنچاتی۔ اگلے دن پیر کے روز مجھے واپسی کی انٹری کرانی تھی اور سامان کی پیکنگ باقی تھی۔ اور منگل کی صبح میری ممبئی کو روانگی تھی۔

رات بارہ بجے کے قریب مَیں اپنے ماموں کے گھر نارتھ کراچی پہنچ گیا۔ اگلی صبح پیر (۲۶ر ستمبر) مَیں نے کراچی کے دوست ضمیر قادری صاحب کو بلایا اور اُن کے ہمراہ واپسی کی انٹری کرائی۔ پھر محترم صبیح رحمانی، علامہ کوکب نورانی سے ملاقات کی۔ ضروری کام سے فارغ ہوکر گھر روانہ ہوگیا۔

پیر کی صبح فوراً ہی تیار ہوکر ایرپورٹ پہنچے اور ممبئی کے لیے روانہ ہوگئے۔ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے کرم سے میرا یہ سفر بھی خوش گوار گزرا۔ وہاں دوستوں نے خوب محبتیں دیں۔ صرف اس لیے

کہ یہ حقیر اعلیٰ حضرت کے در کا ادنیٰ غلام ہے۔ فیضانِ رضا کے صدقے سے فکرِ رضا کے فروغ میں لگا ہوا ہے۔ وہاں کے لوگ اعلیٰ حضرت کے دیوانے ہیں۔ بریلی شریف کا کوئی تبرک بھی اُن کو مل جاتا ہے تو وہ اسے سنبھال کر رکھتے ہیں۔ اسی وجہ سے وہاں ہندستانی علما اور مشائخ کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اُن کی عزت افزائی اور توقیر کی جاتی ہے۔ وہاں سے واپسی کے بعد بھی لوگ مسلسل رابطے میں رہتے ہیں اور مجھے وہاں کی تازہ مطبوعات بھیجتے رہتے ہیں۔

یہ سب نسبتوں کا فیضان ہے۔ اللہ تعالیٰ ان نسبتوں کو قائم رکھے اور مجھ سیاہ کار کو قوت، ہمت، حوصلہ اور وسائل عطا فرمائے کہ میں زیادہ سے زیادہ دین کی خدمت کر کے اپنی آخرت سنوار سکوں۔

اُن کا احساں ہے خدا کا شکر ہے
دل ثنا خواں ہے خدا کا شکر ہے
دولتِ عشقِ نبی سینے میں ہے
پاسِ ایماں ہے، خدا کا شکر ہے

✦ ✦ ✦ ✦ ✦ ✦

ایک نام ہے میرے اعلیٰ حضرت مولانا شاہ احمد رضا خان بریلوی (رحمۃ اللہ علیہ) کا، سمتوں میں یہ ایک نام کروڑوں کے صحیح عقائد کا ترجمان اور اُن کا کام حق و اہلِ حق کا پاس بان ہے۔ کوئی حیرانی سی حیرانی ہے، ایک شخص میں کتنے علوم جمع تھے اور کس قدر تھے! ایک صدی ہورہی ہے مگر اُن کے متنوع علوم و معارف اور افکار کے عمق اور تبحر کا سیکڑوں مدارس اور ہزاروں علما بھی پوری طرح احاطہ نہیں کر سکے۔ کریں بھی کیسے؟ کوئی یونہی تو ''اعلیٰ حضرت'' نہیں ہوجاتا۔

نوبل پرائز پانے والوں کے نام ضرور کہیں محفوظ ہوں گے اور گنتی کے کچھ لوگ شاید ان ناموں سے آگاہ بھی ہوں مگر اعلیٰ حضرت کا چرچا تو نگر نگر ہے۔ ''غیر'' بھی اُن کی عبقری مرتبت کے معترف ہیں۔ ایک شخص اور اتنا حاوی! افکارِ رضا کی یہ دمک ''**ورفعنا لك ذكرك**'' ہی کی جلوہ گری ہے۔ اعلیٰ حضرت کو جو علم و ہنر عطا ہوا، اسے انہوں نے اپنے پیارے نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عصمت و عظمت کی خدمت میں لگا دیا، وہ دین کی حقانیت ہی کے بیان میں مگن رہے۔ احقاقِ حق اور ابطالِ باطل ہی ان کا وظیفہ رہا۔ وہ مرکزِ عقیدت و محبت ہوگئے۔

آج ''افکارِ رضا'' کی تابانی سے ۷۲ باطل فرقوں کو پریشانی ہے۔ انھیں اعلیٰ حضرت کے دلائلِ ثقہ سے انکار اور فرار کی تاب و مجال نہیں۔ ''بریلوی'' کا عنوان دے کر وہ صحیح العقیدہ اہلِ سُنّت کو کوئی نیا فرقہ بتانے کا جتن کر رہے ہیں۔ انھیں نہیں معلوم کہ ابھی تو بادل چھٹنا شروع ہوئے ہیں اور اس آفتاب کی کرنوں ہی سے آنکھیں خیرہ ہوئی جارہی ہیں۔ افکارِ رضا کی پوری روشنی ہوئی تو ہر دَر اور گھر میں اسی کی جگ مگ ہوگی۔

ممبئی کے ایک ناتواں سے نوجوان محمد زبیر قادری نے کچھ برس پہلے ''تحریکِ فکرِ رضا'' کا توانا عزم کیا تھا۔ افکارِ رضا کا فیضان ہی اُس کی پہچان ہے۔ یہ خاص شمارہ اس نوجوان کے وَل وَلے اور حوصلے کی ایک جھلک ہے۔ یقین کی پختگی اور جذبے کی فراوانی اسے بہت کچھ کر گزرنے کو مہمیز کرتی ہے۔ اللہ کریم جل شانہ اس نوجوان کی کاوشیں بار آور بنائے، اسے اپنی تائید و نصرت سے نوازے، آمین

افکارِ رضا کا یہ شمارہ ''اہلِ فکر و نظر'' کے نزدیک شاید کوئی اہم اضافہ نہ ہو لیکن عقیدت و محبت کے ایک والہانہ سلسلے سے عبارت ہے۔ یہ سلسلہ تو اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ سے نسبت کے داعیوں کا کب سے جاری ہے اور بڑھتا ہی رہے گا..........

کوکب نورانی اوکاڑوی غفرلہ

المرقوم: ۲۷ر محرم ۱۴۲۹ھ

TEHREEK-E-FIKR-E-RAZA

C/o Ajmeri Book Depot
251-253, Maulana Azad road, Shop No. 8
Zainab Tower, Mumbai-400 008